گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

جولائی 2018

نگران اعلیٰ

معراج رسول

عید مبارک



ناہید سلطانہ اختر، شگفتہ بھٹی، شمیم فضل خالق کے خوب صورت افسانے

معروف فنکارہ لیلیٰ زبیری کی پُر رونق آمد

فوٹو گرافی :موسیٰ رضا
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
سرورق ماڈل:افراء صائمہ

پاکیزہ
کراچی

ان اعلیٰ : معراج رسول

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیرہ : نزہت اصغر

معاون : آمنہ حماد



رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
بد منیر حسین
0333-3285200

... 700 روپے
... 120 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات
... 900 روپے ...... جلد:46......شمارہ04......جولائی2018ء

www.bookspk.site

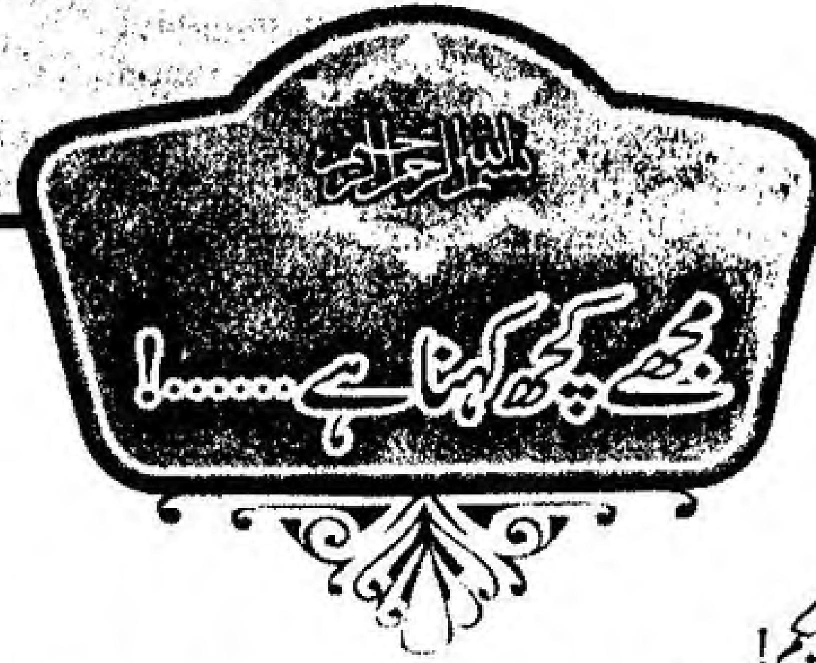
پبلشر و پرو پرائٹر: نشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ھاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313-35802552 , E-mail address: jdpgroup@hotmail.com



قارئین کرام السلام علیکم!

ماہِ شوال، عید الفطر کی خوشیاں بکھیر کر اپنے سفر پر گامزن ہے عید کی رونقیں صرف تین دن کی نہیں بلکہ پورے مہینے پر محیط ہوتی ہیں کیونکہ عید الفطر کا پیغام یہی ہے کہ مسلمان اپنے خدائے بزرگ و برتر کی عبادت و اطاعت اور اس کے بندوں کی حاجت روائی اور دادرسی کے ذریعے خوشنودیِ الٰہی حاصل کریں۔ عید مسرتوں کا پیغام لاتی ہے جس میں سرفہرست پیامِ محبت و یگانگت شامل ہوتا ہے۔

عید کے روز تمام مسلمانانِ عالم کے اپنے رب کریم کے حضور شکرانے کے نوافل...... یک جہتی، مساوات، رواداری اور بھائی چارے کا پیغام دیتے نظر آتے ہیں...... جب ایک مسلمان بھائی اپنے دوسرے مسلمان بھائی سے بغل گیر ہوتا ہے، مصافحہ کرتا ہے تو ان کی یہ ظاہری قربت، باطنی اخلاص و اُنسیت کے جذبات بیدار کرتی ہے، دلوں کی وقتی رنجشیں، کدورتیں اور نفرتیں دور ہوتی ہیں اور قلوب طمانیتِ حقیقی پاتے ہیں اور جب ضرورتمندوں اور مساکین و یتامیٰ کے سروں پر ہاتھ رکھا جاتا ہے تو یہی عمل پروردگار کی بارگاہ میں مقرب قرار پاتا ہے۔ دلی اطمینان تو بے شک ذکرِ الٰہی اور اپنے جیسے انسانوں کے چہروں پر حقیقی خوشیاں لانے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

ربِ کائنات کے حضور دعا گو ہیں کہ صرف انہی ایام میں نہیں بلکہ سارا سال ایسی ہی نیکیوں کی توفیق عطا ہوتی رہے......آمین......!

اس مرتبہ ماہ جولائی ہم پاکستانیوں کے لیے کافی اہم ہے کہ اب تک کی اطلاعات کے مطابق قومی و صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہونے جا رہے ہیں۔ اگلے پانچ سالوں کے لیے ملک کے مستقبل کی باگ ڈور سنبھالنے والوں کو منتخب کیا جائے گا اور وہ ظاہر ہے کوئی آسمانی مخلوق تو ہیں نہیں، ہم۔ آپ جیسے انسان ہی ہیں جنہیں ہم ووٹ دیں گے۔

کہتے ہیں جیسی قوم ویسے حکمران تو بحیثیت قوم تو ہم بہت غیور، بہادر، ایماندار، راست باز، محنتی باصلاحیت اور روشن بین لوگ ہیں تو پھر حکمران......؟ کیوں نہیں، حکمران بھی انشاء اللہ ہم ایسے ہی پائیں گے۔ اس میں ہم خواتین کا کردار بھی بہت اہم ہے کہ ہمیں اپنے شعور اور سمجھ بوجھ سے فیصلہ کرنا ہے کہ آگے کے پانچ سال اندھیروں، خشک و بنجر زمینوں، گندگی کے ڈھیروں کے ساتھ گزارنے ہیں یا پھر تعلیمی ترقی......خوشحالی اور فارغ البالی کے ساتھ...... فیصلہ ہم عوام کو ہی کرنا ہے لہٰذا اپنے، اپنے حقوق و فرائض پہچانیں اور ایک زندہ، باشعور و ہوش مند قوم ہونے کا ثبوت بھی دیں۔

مدیرہ

نزہت اصغر

جو لوگ زمین پر ناحق تکبر کرتے ہیں، میں ان کو عنقریب اپنی آیتوں سے پھیر دوں گا۔ اور اگر وہ کُل نشانیاں بھی دیکھ لیں تو بھی وہ ان پر ایمان نہ لائیں گے۔ اور اگر وہ نیکی کا راستہ دیکھ لیں، تو اسے اپنا راستہ نہ بنائیں گے۔ اور اگر وہ گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اسے اپنا راستہ بنا لیں گے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے یقیناً ہماری آیتوں کو جھٹلایا، اور ان سے غافل رہے۔ (۱۴۶) اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا۔ ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔ کیا ان کو سوائے اس کے جو وہ عمل کرتے تھے، کچھ اور بدلہ دیا جائے گا۔ (۱۴۷) اور موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنا لیا، وہ ایک جسم تھا جس میں گائے کی سی آواز تھی کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ وہ ان سے نہ تو بات کرتا تھا اور نہ انہیں راستہ بتاتا تھا۔ (پھر بھی) انہوں نے اسے (معبود) اختیار کر لیا۔ اور وہ ظالم ہو گئے۔ (۱۴۸) اور جب وہ حد سے زیادہ نادم ہوئے اور انہوں نے دیکھا کہ وہ واقعی گمراہ ہو چکے ہیں کہنے لگے اگر ہمارا پروردگار ہم پر رحم نہ کرے گا اور ہمیں معاف نہ کرے گا تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ (۱۴۹) اور جب موسیٰ اپنی قوم کی طرف غضبناک اور سنجیدہ واپس لوٹا، تو کہنے لگا میرے بعد تم نے میری بہت بُری جانشینی کی۔ کیا تم نے اپنے پروردگار کے حکم میں جلدی کی۔ اور لوحیں ڈال دیں۔ اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ وہ بولا اے میرے ماں جائے، یقیناً قوم نے مجھے کمزور سمجھا، اور قریب تھا کہ وہ لوگ مجھے قتل کر دیتے۔ پس تو مجھ پر دشمنوں کو ہنسی کا موقع نہ دے۔ اور مجھے ظالموں کی قوم کے ساتھ نہ قرار دے۔ (۱۵۰) اس نے کہا اے میرے پروردگار! مجھے اور میرے بھائی کی پردہ پوشی کر۔ اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر۔ اور تو تو رحم کرنے والوں میں سے سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ (۱۵۱) یقیناً جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنا لیا۔ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے عنقریب غضب اور دنیا کی زندگی میں ہی ذلت پہنچے گی۔ اور ہم اسی طرح افترا کرنے والوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔ (۱۵۲) اور وہ لوگ جنہوں نے برے کام کیے پھر اس کے بعد انہوں نے توبہ کر لی۔ اور ایمان لائے۔ یقیناً تیرا پروردگار اس کے بعد ضرور بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ (۱۵۳) اور جب موسیٰ کا غضب فرو ہوا، اس نے تختیاں لے لیں۔ اور اس کی تحریر میں ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت تھی، جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔ (۱۵۴) اور موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ہمارے مقررہ وقت کے لیے ستر آدمی چن لیے۔ پھر جب زلزلہ نے ان کو آلیا تو (موسیٰ نے) کہا، اے میرے پروردگار! اگر تو چاہتا ہے تو ان کو اور مجھے پہلے ہی ہلاک کر دیتا۔ کیا تو ہمیں اس فعل کے بدلہ میں ہلاک کرتا ہے جو ہم میں سے بے وقوف لوگوں نے کیا ہے۔ یہ تو تیری آزمائش ہی ہے۔ تو اس سے جسے چاہے ہلاک کر دے اور جسے چاہے توفیقِ ہدایت دے دے۔ تو ہمارا سرپرست ہے پس ہماری مغفرت کر اور ہم پر رحم کر۔ اور تو بہترین مغفرت کرنے والا ہے۔ (۱۵۵)

(سورۂ اعراف ۷، پارہ ۹۔ آیات ۱۴۶ تا ۱۵۵)

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِ نِ السَّیِّدِ الرَّحِیْمِ عَلَی الْاُمَّۃِ ؕ

سید کونین، ختم المرسلین، افضل الانبیا رسول پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الٰہی صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام سیدنا رحیم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے۔ جس کے معنی و مفہوم رحم کرنے والے کے ہیں۔

1۔ **القرآن**: ترجمہ: اور جو مومن تمہارے پیروکار ہو گئے ہیں ان کے لیے اپنے رحمت کے بازو جھکا دو۔ (سورۂ شعراء، آیت (۲۱۵)

2۔ **الحدیث**: حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک صاحبزادی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیغام بھیجا کہ میرا بیٹا قریب المرگ ہے۔ اس لیے آپؐ ہمارے ہاں تشریف لائیں۔ آپؐ چند صحابہؓ کے ہمراہ تشریف لے گئے۔ بچے کی سانس اکھڑی ہوئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سعد بن عبادہؓ نے کہا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی روتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ یہ وہ رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دل میں رکھی ہے اور اللہ اپنے انہی بندوں پر رحم فرماتا ہے جو دوسروں پر رحم کھاتے ہیں۔

(بخاری)

3۔ **الرائے**: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت شفیق اور رحم دل تھے بلاشبہ آپؐ کا یہ منشا تھا کہ غلاموں کی اصلاح کریں۔ آپؐ نے موجودہ غلاموں سے نیک برتاؤ کی ہدایت فرمائی۔ اس بارے میں آپؐ کی آخری نصیحت ایسی اہم اور وقیع ہے کہ اس سے قطع نظر ممکن ہی نہیں...... آپ نے فرمایا۔ ”دیکھو غلاموں کو وہی کھانا کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور ایسے کپڑے پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔“

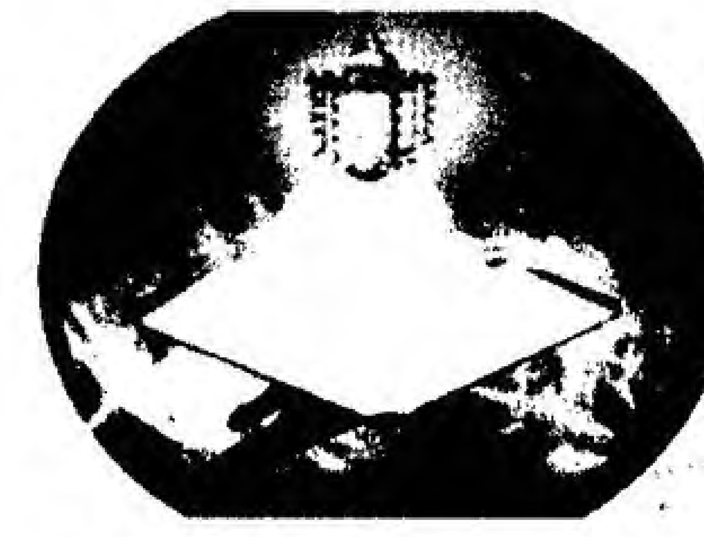
(ڈاکٹر مارکس ڈاون)

4۔ **الفضائل**: ۱۔ جو کوئی اس بات کا خواہاں ہو کہ اس پر رحمتِ الٰہی کا نزول ہو تو وہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد یا مغرب کی نماز کے بعد تیس مرتبہ یہ اسم مبارک سیدنا رحیمؐ پڑھ کر مطلوبہ دعا مانگے اسے مقصد میں کامیابی ہوگی۔

[illegible] ی کا قلب بہت زیادہ سخت ہو اور اسے کسی پر رحم اور ترس نہ آتا ہو اور وہ چاہے کہ اس کے دل کی سختی [illegible] باوضو حالت میں نمازِ عصر کے بعد سو مرتبہ یہ اسم مبارک پڑھ لیا کرے، انشاء اللہ تعالیٰ دل کی یہ سختی دور [illegible]

(قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی ﷺ سے اقتباس)

اللہ اور اس کا نور





قرآن پاک سے عشق کی پُرنور داستان ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے قلم سے

باب ہجدھم

قرآن مجید فرقان حمید پوری کائنات کے لیے سر چشمۂ ہدایت

قرآن پاک کی سورتوں سے لیے گئے احکامات پچھلے کئی ماہ سے مسلسل درج کیے جارہے ہیں...... یہ مضامین ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی قرآنی تحقیق کا نچوڑ ہیں۔ یہ کتابی شکل میں بعنوان ''اللہ اور اس کا نور'' کے تحت شائع ہوچکے ہیں۔ پاکیزہ قارئین کے بے حد اصرار پر ہم ان مضامین کا اعادہ کررہے ہیں جو بلاشبہ ہر دفعہ نیا مضمون ہی معلوم ہوتا ہے۔ اللہ پاک مصنفہ کو صحت کے ساتھ طولِ حیات دے اور یہ مضامین ان کے لیے زادِ آخرت بنیں اور اس سے استفادہ کرنے والوں کے عملِ خیر میں اضافہ ہو، الٰہی آمین...... اب ہم اختتامی اسباق کی طرف گامزن ہیں۔ آپ سب بہنوں کے سلام، دعائیں اور قیمتی آرا ذکیہ آپا تک پہنچا دی جاتی ہیں، وہ بھی اپنی تمام بہنوں، بیٹیوں کے لیے خلوص دل سے دعا گو رہتی ہیں...... یہ سطور انہی کی جانب سے جواب سمجھیے، انشاء اللہ ان کی صحت بہتر ہوتے ہی ہم ان سے آپ سب بہنوں کے لیے قرآن کی تحقیق کے حوالے سے مزید گفتگو کریں گے۔ فی الحال آپ یہ باب پڑھیں...... (مدیرہ)

آج ہم **سورۂ صف 61** سے آغاز کرتے ہیں۔

388۔ ''اے ایمان والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں ہو۔'' (2)

389۔ ''اللہ کو وہ بات سخت ناپسند ہے کہ ایسی

بات کہو جو کرتے نہیں ہو۔'' (3)

390۔ ''یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو پھونک مار کر بُجھا دیں اور اللہ تو اپنے نور کو پیدا کر کے رہے گا چاہے کافر ناپسند کریں۔'' (8)

391۔ ''اے ایمان والو! کیا میں تم کو ایسی تجارت بتادوں جو تم کو درد ناک عذاب سے بچا دے۔'' (10)

392۔ ''(وہ یہ ہے کہ) تم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کرو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔'' (11)

393۔ ''اے ایمان والو! اللہ کے مددگار ہوجاؤ۔ (14)

سورۂ جمعہ 62 :

394۔ ''اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کی یاد کی طرف چل پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے کہ اگر تم جان جاؤ۔'' (9)

395۔ ''پھر جب نماز ہوچکے تو اپنی، اپنی راہ لو اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو بہت، بہت یاد کرتے رہو، تاکہ نجات پاؤ۔ (10)

سورۂ منافقون 63 :

396۔ ''تم ان (کافروں) کے حق میں دعائے مغفرت مانگو یا نہ مانگو ان کے لیے برابر ہے، اللہ ان کو ہرگز نہ بخشے گا، بے شک اللہ نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتا۔'' (6)

397۔ ''اے ایمان والو! تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کردیں اور جو لوگ ایسا کریں گے وہ خسارہ اٹھانے والے ہوں گے۔'' (9)

398۔ ''اور جو مال ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے اس وقت سے پیشتر خرچ کرلو کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے۔

سورۂ تغابن 64 :

399۔ ''اے ایمان والو! تمہاری بعض بیویاں اور اولاد تمہارے دشمن ہیں، سو ان سے بچتے رہو اور تم اگر معاف کردو اور درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ بھی بخشنے والا مہربان ہے۔'' (14)

400۔ ''تمہارا مال اور اولاد تو ایک آزمائش ہے، اور اللہ کے ہاں بڑا اجر ہے۔'' (15)

سورۂ تحریم 66 :

401۔ ''اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔'' (4)

402۔ ''اے ایمان والو! اللہ کے آگے صاف دل سے توبہ کرو۔ امید ہے تمہارا رب تمہارے گناہ تم سے دور کردے گا۔'' (8)

سورۂ ملک 67 :

203۔ ''جو لوگ اللہ سے بن دیکھے ڈرتے ہیں تو ان کے لیے بخشش ہے اور بڑا صلہ ہے۔'' (12)

404۔ ''تم لوگ چاہے پوشیدہ باتیں کرو یا ظاہر کرو، وہ تو دل کے بھیدوں سے بھی واقف ہے۔'' (13)

سورۂ معارج 70 :

405۔ ''(یوم حشر) عذاب جس روز ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہوگی۔'' (4)

406۔ جنتی لوگ

1) نمازگزار۔

2) جو نماز کا اہتمام کرتے ہیں اور بلاناغہ پڑھتے ہیں۔

3) اور جن کے مال میں حصہ ہے، مانگنے والے اور نہ مانگنے والے کا۔

(4) جو روزِ جزا کو سچ سمجھتے ہیں۔

(5) جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

(6) جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

(7) جو اپنی امانتوں اور عہدوں کا پاس کرتے ہیں۔

(8) اور جو اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں۔

(9) اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔

(جاری ہے)

......یہ کہاں کی بچپن کہ دل ہے

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالر، پونڈ، یورو، درہم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔
دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں . . .
سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے . . .
دل کو رویا جاتا ہے، جگر کو پیٹا جاتا ہے . . .
کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، یا رہاں ٹوٹ جاتی ہیں۔
الزام تراشیوں کا ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو جاتا ہے۔
دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے . . .
آج کا انسان بہ راہ سٹیلائٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
دل اور سونے کا بچھڑا . . .
عبادات، معاملات . . .
جنت گم گشتہ کے بے دخل باسیوں کی ازلی کہانی . . .

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قسط 24

تاجور انتہائی حیرت سے زارا کا جائزہ لے رہی تھیں، آنکھوں میں صرف حیرت ہی نہیں تھی بلا کی تشویش بھی تھی...... وہ زارا کا اہتمام دیکھ کر اندر ہی اندر جیسے لرزہ براندام سی تھیں...... وہ تو کہیں جانے کے لیے بڑی تک سک سے تیار تھی۔ ”لیکن یہ جا کہاں رہی ہے؟......“ الفاظ زبان تک نہیں آپا رہے تھے...... راستے میں ہی کہیں گم ہو رہے تھے۔ ان کی نظریں بے اختیار وال کلاک کی طرف اٹھ گئیں جو زارا کے عقب میں دیوار پر آویزاں تھا...... ”یہ اس وقت بہت اہتمام سے تیار ہو کر کہاں جانے لگی ہے......“ اب تو بات، بات پر دل دہلتا تھا کہ اعتبار ایک دفعہ کا ہوتا ہے...... ہزار معافیاں تلافیاں ہو جائیں...... ہزار رنجشیں ہو جائیں...... ہزار عذر قبول کر لیے جائیں...... لیکن جس کا اعتبار ایک دفعہ ٹوٹ جائے وہ ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے بڑا چوکس اور چوکنا ہو جاتا ہے...... بقول شاعر......

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیندیں گئیں
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

''کہیں جا رہی ہو......؟'' بہ مشکل انہوں نے چند الفاظ ادا کیے......اس اندیشے کے تحت کے آگے جانے کیا سننے کو ملے۔

زارا کی اپنی حالت بہت غیر ہو رہی تھی...... بولنا محال تھا اسے تو سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ اچانک یہ کیا ہو گیا...... بالکل یوں کہ جیسے جان بچانے کے لیے مسافر ڈوبتے ہوئے جہاز کے عرشے پر جا کھڑے ہوں......اور عرشے پر پہنچتے ہی یوں لگے جیسے سب سے پہلے عرشہ ہی چکنا چور ہونے جا رہا ہے......اور جان بچانے کی اب کوئی سبیل نہیں......ڈوبنا قسمت کا لکھا ہوا نظر آ رہا ہو۔

''جی...... وہ اماں...... جی وہ مجھے کچھ ضروری چیزیں لینا تھیں میں نے سوچا کہ دیر سے جاؤں گی تو رش ہو جائے گا......اور......ابھی جانے میں یہ فائدہ ہے کہ زیادہ رش بھی نہیں ہوگا اور میں جلدی گھر واپس آ جاؤں گی۔''

''کیا چاہیے تھا تمہیں......ایسی کیا ضروری چیزیں تھیں؟'' تاجور کو اس کے جواب سے قطعاً تسلی نہیں ہوئی تھی...... کیونکہ بازار جانے والی تیاری اور بازار کے علاوہ کسی سے ملنے کے لیے جانے والی تیاری میں بہت فرق ہوتا ہے...... وہ...... وہ کیوں بھولتیں...... آخر بھولنے کی کوئی وجہ بھی ہوتی.... آخر کوئی زمانوں پرانی تو بات نہیں تھی......کل ہی کی تو بات تھی کہ وہ کچھ لینے کے لیے گئی تھی......اور اس کا انداز ایسا تھا کہ بس بستر سے اٹھتے ہی اس نے باہر کا رخ کیا ہو...... بال تک اس نے کیچر میں لپیٹے ہوئے تھے...... بہت رف ٹف سے کپڑے اس نے پہنے ہوئے تھے......وہ ہی جو وہ عموماً گھر میں پہنے نظر آتی تھی......کبھی ٹائٹس یا کبھی جینز یا پھر سگریٹ پینٹس اور اس کے ساتھ کوئی لوز ٹاپ' یہ اس کا عام سا حلیہ ہوتا تھا اسی حلیے میں وہ بازار بھی چلی جاتی تھی......اور جب جاتی تھی تو کبھی انہیں بتائے بغیر نہیں جاتی تھی...... بغیر بتائے اگر کہیں گئی تھی......تو پرنس کے گھر گئی تھی......اور آج پھر وہ دوسری مرتبہ ان کو بغیر بتائے بقول اس کے وہ بازار جا رہی تھی۔

''لیکن تم نے مجھے تو نہیں بتایا کہ تمہارا ایسا کوئی پروگرام ہے؟ حالانکہ میں کل تمہیں بتا چکی ہوں کہ ساحل کی بہن صبح پہنچ گئی ہوں گی اور وہ شام کو چائے پر ہمارے ہاں آ رہی ہیں۔''

''جی اماں......میں اسی وجہ سے ہی تو جا رہی تھی۔'' زارا سے بات بنائے نہیں بن رہی تھی لیکن بات بنانا تو تھی۔

''اسی وجہ سے کیا مطلب؟'' تاجور نے پہلے سے زیادہ حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھا تھا۔

''وہ اماں......وہ میں ناں......شام کو جو ڈریس پہننا چاہ رہی ہوں تو میں نے دیکھا کہ میرے پاس اس کے ساتھ پہننے کے لیے کوئی میچنگ جیولری نہیں ہے حتیٰ کہ بینگلز بھی نہیں ہیں تو......تو میں نے سوچا جلدی سے لے آتی ہوں۔'' اس نے اٹک، اٹک کر جس انداز میں بات کی اس نے تو گویا شعلوں کو ہوا ہی دے دی۔

تاجور کا شک اب ان کے ذہن میں جڑیں پکڑ رہا تھا۔''صرف میچنگ جیولری کے لیے اتنے اہتمام کے ساتھ تیار ہو کر وہ باہر جا رہی ہے...؟'' دل مان کر نہیں دے رہا تھا۔

''تمہارے پاس اور بھی تو بہت سے ڈریسز ہیں جن کی میچنگ جیولری بھی موجود ہے......تم ان میں سے کوئی پہن سکتی ہو......ایسی بھی کیا آفت آئی ہے کہ تمہیں وہی پہننا ہے......وہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو......تمہاری تو اپنی فرینڈز کی آئے روز برتھ ڈیز اور پکنک پارٹیز وغیرہ ہوتی رہتی ہیں اور تمہیں آئے دن کپڑوں کی ضرورت رہتی ہے......اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ڈریس پہلے کبھی تم نے نہیں پہنا اسی لیے آج تمہیں میچنگ جیولری کی بھی ضرورت



پڑی ہے......چلو پھر کبھی استعمال کر لینا۔''

''جی ٹھیک ہے اماں بس ویسے ہی اماں وہ......تھوڑا سا ٹائم بھی تھا......اور آج میں کالج بھی نہیں گئی تھی......تو میں نے سوچا......کہ......باہر کا ہی چکر لگا لوں۔''

''بہت شوق ہو گیا ہے تمہیں باہر کے چکر لگانے کا......بس ختم کرو یہ چکر وکر......'' تاجور نے اب بات کو بڑھانا یا مزید سوال کرنا ضروری نہیں خیال کیا اور وہاں سے چل پڑیں۔

ڈرائیور ان کا بیگ جس میں ان کا لیپ ٹاپ ہوتا تھا اور دوسرا بیگ جس میں ان کی فائلیں وغیرہ ہوتی تھیں لے کر ان کے بیڈ روم کی طرف جا چکا تھا......اور شاید ان کا انتظار کر رہا تھا......تاجور کو بھی یاد آ گیا کہ ڈرائیور ان کا انتظار کر رہا ہوگا کیونکہ وہ ان سے پہلے ان کے بیڈ روم میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ تیزی سے اس راستے کی طرف بڑھیں جو راستہ ان کے بیڈ روم کی طرف جاتا تھا لیکن آدھے راستے پر جا کر رکیں......اور پلٹ کر پھر زارا کی طرف دیکھا...... یوں جیسے کہ اچانک چھاپا مارا جاتا ہے......اس پلٹ کر دیکھنے میں ایک خواہش تھی کہ شاید وہ کچھ پکڑ لیں...... لیکن زارا سر جھکائے پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کو رگڑتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ اس کے چہرے سے اب کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی تھیں کیونکہ چہرہ کافی حد تک جھکا ہوا تھا۔

وہ اپنے ڈوبتے دل اور لرزاں قدموں کو بہ مشکل سنبھالتی ہوئی بیڈ روم کی طرف جا رہی تھیں....اور سوچ رہی

تھیں کہ انہوں نے بہت اچھے وقت پر...... بالکل درست فیصلہ کیا ہے...... یہ لڑکی اب کنٹرول سے باہر ہو چکی ہے۔

☆☆☆

ساحل بہت اہتمام سے تیار ہوا تھا...... یہ بھی بہتر ہوا آپا بستر پر گرتے ہی گہری نیند میں چلی گئی تھیں۔ اس نے اچھا خاصا ٹائم اپنی تیاری پر صرف کیا تھا...... آج وہ سامنے والے کو چاروں شانے چت کر دینے کے تمام ترجتن کر رہا تھا۔ اس نے اپنا وہ قیمتی سوٹ نکالا جو وہ بہت ہی خاص قسم کی تقریبات میں استعمال کرتا تھا...... وگرنہ وہ اچھی طرح سے ملفوف وارڈ روب میں ہی لٹکا نظر آتا تھا...... کیونکہ اس نے اچھا خاصا ٹائم تیار ہونے پر خرچ کر دیا تھا...... آفس پہنچا تو اب وہاں سے نکل بھاگنے کی جلدی ہوئی...... جلدی، جلدی چند احکامات صادر کیے...... اور اپنا بہت سارا بوجھ جونیئرز پر ڈال دیا تاکہ واپس آنے کے بعد جو ٹائم بھی اسے ملے وہ اپنی تمام تر کارکردگی کا لوہا منوانے میں کامیاب ہو جائے...... اور حکامِ اعلیٰ کو یہ شکایت نہ ہو کہ آج کام ادھورا رہ گیا جس کا مطلب یہ ہوتا کہ ساحل اپنی پرفارمنس اب نبھانے کے بجائے کچھ لوز کرنے لگا ہے۔

اس نے ساری حفاظتی تدابیر اختیار کی تھیں اس نے پوری کوشش کی تھی کہ سارے کام ہو جائیں اور اس کی کارکردگی پر آنچ نہ آئے...... کار کی چابی اٹھائی، موبائل ابھی تک جیب میں ہی تھا...... اس نے جان بوجھ کر نہیں نکالا تھا کہ کہیں ٹیبل پر رکھا ہی نہ وہ بھول جائے...... اور راستے میں یاد آئے تو بہت کوفت ہو...... پھر وہ اس وقت آن ڈیوٹی تھا...... کہیں سے بھی کوئی کال آ سکتی تھی، یہ اس کی زیرکی، ہوشیاری اور حاضر دماغی کی انتہا تھی کہ وہ کہیں پر بھی کوئی ایسا نشان نہیں چھوڑنا چاہتا تھا جس سے پتا چلتا کہ اس نے آج کی تاریخ میں کوئی غلطی کر ڈالی ہے...... اسی ہبڑ دبڑ میں وہ اپنی کار کی طرف دوڑا تھا...... ابھی ریموٹ کی سے کار کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ جیب میں موجود سیل فون کی وائبریشن نے...... ایک عجیب سی کوفت میں مبتلا کر دیا۔ ”اُف خدایا کوئی ایسی کال نہ ہو جس کی وجہ سے گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے واپس جانا پڑے......“ اسے رات سے عجیب سی بے چینی اور بے قراری لاحق تھی...... جو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے انہوں نے مدعو کیا تھا اور یہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی...... خوشی...... اندیشے...... وہم...... گمان...... مختلف قسم کے جذبات گڈمڈ ہو رہے تھے...... اس نے بادلِ ناخواستہ اپنا سیل فون جیب سے نکالا اور حیرت سے اپنی جگہ سے اچھل گیا یوں جیسے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے ہوں...... زارا کی کال آ رہی تھی۔

”او مائی گاڈ...... اسے تو مجھ سے بھی زیادہ جلدی ہے۔“ عجیب سی الجھن بھری کیفیت میں اس نے کال ریسیو کی تھی...... دل بری طرح دھک، دھک کرنے لگا تھا...... ”جانے اب محترمہ کو کیا کہنا یاد آیا ہے...... اللہ رحم کرے میرے حال پر......“ اس نے بہت محتاط انداز میں ”ہیلو“ کہا۔

”جی میں زارا بات کر رہی ہوں، آپ اس وقت کہاں ہیں؟“ زارا کی آواز سماعت سے ٹکرائی تو کچھ حوصلہ سا بڑھتا ہوا محسوس ہوا اور ہوش ٹھکانے آنے لگے...... لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری...... یعنی کہ میرا خیال درست نکلا...... اسے تو مجھ سے بھی زیادہ جلدی اور بے چینی ہے۔

”جی...... بس میں گاڑی میں بیٹھ رہا ہوں...... میرا خیال ہے کہ ایک گھنٹے سے پہلے، پہلے میں آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ آپ کو پتا ہے ناں آج کل میں سائٹ آفس میں ہوتا ہوں آپ کے گھر کا فاصلہ یہاں سے اچھا خاصا ہے۔“ اس نے تو اتر سے بولنا شروع کیا مگر اسے بیچ میں روک دیا گیا۔

”اچھا...... اچھا ٹھیک ہے پلیز پہلے آپ میری بات سن لیں۔“ زارا کی آواز میں ایک عجیب جھنجلاہٹ تھی...... کوئی ایسا احساس اس کی آواز سے دل کے اندر نہیں اتر رہا تھا جس سے دل میں کوئی خوش فہمی پیدا ہوتی ہے۔

”جی فرمائیے میں سن رہا ہوں۔“ اس نے اپنے اوسان سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”وہ ایسا ہے کہ آپ پلیز نہ آئیں۔“

زارا کی آواز سماعت سے ٹکراتے ہی اسے یوں لگا جیسے 7.8 کا زلزلہ برپا ہو گیا ہو...... ہر چیز اپنی جگہ سے ہلتی ہوئی محسوس ہوئی...... وہ اپنی صبح کی بھاگ دوڑ، وہ اعصابی تناؤ...... وہ ادھورا ناشتا، وہ خطرہ مول لینے والی رفتار کے ساتھ دفتر تک گاڑی چلانا...... کیا کچھ ایک پل میں یاد آ گیا...... مارے کوفت کے اس کی بری حالت ہو گئی۔

”اگر آپ کا پروگرام چینج ہو گیا تھا تو آپ صبح ہی مجھے فون کر دیتیں۔“ وہ مارے کوفت کے بس اتنا ہی کہہ سکا...... کیونکہ اب اسے اپنے آپ سے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں برس نہ پڑے...... اور شام ہونے تک وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا...... ابھی ایک شام بھی تو باقی تھی جس کے ساتھ بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔

”خیریت تو ہے ناں......؟“ زارا اس کے جواب میں خاموش رہی تو اسے دوبارہ بولنا پڑا۔

”جی...... بس...... کچھ ایسا ہے کہ میں نہیں کر سکی آپ کو فون...... اس کے لیے سوری مگر ابھی آپ کو نہیں آنا، اماں نے آپ کو جو ٹائم دیا ہے آپ اسی پر آئیں۔“

اس کے ساتھ ہی زارا کی آواز خاموش ہو گئی...... ساحل سامنے اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھ رہا تھا، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی پہلوان کو پہلے راؤنڈ میں ہی چاروں شانے چت کر دیا گیا ہو۔

☆☆☆

لیڈی صوفیہ نے آج صبح اپنے مخصوص اوقات پر ناشتا کرنے سے انکار کر دیا تھا...... ناشتا پرنس نے اکیلے ہی کیا تھا...... سال میں دو، چار مرتبہ ایسا ہو جاتا تھا کہ لیڈی صوفیہ اپنے مخصوص وقت پر ناشتا نہیں کرتی تھیں...... اور اس روز وہ بہت ہلکا ناشتا اپنے کمرے میں ہی کیا کرتی تھیں جس میں جوس اور کچھ پھل وغیرہ شامل ہوتے تھے...... کیونکہ آج لیڈی صاحبہ ڈائننگ ٹیبل پر نہیں آئی تھیں تو پرنس کی دادی سے ملاقات بھی نہ ہو پائی تھی...... اور جس دن صبح کو اس کی ملاقات دادی سے نہیں ہو پاتی تھی...... گویا اس دن صبح دیر سے ہوتی تھی...... حالانکہ ناشتے کے وقت جب وہ ڈائننگ کی طرف آ رہا تھا تو یہ سوچتا ہوا آ رہا تھا کہ اب لیڈی صاحبہ اس سے رات کی کارروائی کی باز پرس کریں گی...... اور جاننا چاہیں گی کہ رات اس کی سفینہ سے کیا بات ہوئی، وہ اس سے ناراض تو نہیں تھی...... وغیرہ...... وغیرہ جیسا کہ وہ عموماً دوستانہ انداز میں اب سفینہ کے حوالے سے اس سے باتیں کیا کرتی تھیں...... ناشتے کی ٹیبل پر لیڈی صوفیہ پرنس سے پہلے موجود ہوتیں...... اور اس کا انتظار کرتی ہوئی پائی جاتیں...... زندگی میں بہت ہی کم ایسا ہوا تھا کہ وہ لیڈی صاحبہ سے پہلے ڈائننگ ایریا میں موجود ہوتا۔

کیونکہ اس کی صبح کی کچھ مخصوص مصروفیات تھیں جنہیں نمٹائے بغیر وہ وہاں نہیں آتا تھا اور لیڈی صوفیہ اپنی صبح کی نماز اور تسبیحات سے فارغ ہوتے ہی ڈائننگ ایریا میں آ جایا کرتی تھیں۔

پرنس ناشتے کے بعد اسٹوڈیو میں آ گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس وقت تو سفینہ کلاس لے رہی ہوگی...... اسٹوڈیو میں داخل ہوا تو آپ ہی آپ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی...... ایک بڑا دلچسپ خیال اسے مسکرانے پر مجبور کر رہا تھا۔

”لگتا ہے مجھے بھی ایک سیل فون لینا ہی پڑے گا اور اپنے کچھ قیمتی اصول توڑنا پڑیں گے...... کیونکہ خطرہ ہے کہ اصول نہ توڑے گئے...... تو کسی کا دل ٹوٹتا رہے گا اور ابھی تو ابتدا ہے...... اپنی کلاس کیا لے رہی ہوگی دل ہی دل میں میری کلاس لے رہی ہوگی......“ پرنس کے ہونٹوں پر اب مسکراہٹ معنی خیز نہیں شرارتی تھی۔

اس کے قدموں کا رخ اب فون سیٹ کی طرف تھا۔ ”دنیا کو بتا دینے کی کیا ضرورت ہے کہ آپ سیل فون [illegible] ہیں...... یہ تو صرف سفینہ کے ساتھ رابطے کا ایک ذریعہ بنے گا۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ میرے معاملات اور سفینہ [illegible] ٹائمنگ اسی طرح سے ٹکراتے رہے تو کوئی بدگمانی دل میں جگہ نہ بنا لے اور نتیجتاً سفینہ روٹھ جائے تو اسے منانا

مشکل ہو...... سمجھانا مشکل ہو...... کیونکہ سنتے چلے آئے ہیں کہ روٹھے رب کو منانا بہت آسان ہے لیکن یار روٹھ جائے تو بس اِک قیامت برپا ہو جاتی ہے مان کے نہیں دیتا...... پہلا، پہلا پیار ہے' پہلا یار ہے پہلی بار اس کی خاطر سیل فون بھی رکھ لیتے ہیں لوگ تو محبوب کو خوش کرنے کے لیے جان دے دیتے ہیں...... تو کیا ہم ایک سیل فون بھی نہیں رکھ سکتے۔''

وہ منیجر کو فون کرنے کے لیے ریسیور اٹھاتے ہوئے سوچ رہا تھا کیونکہ سیل فون مہیا کرنا بھی اسی کی ذمے داری تھی اور جب وہ پہلی بار اپنے فون سے ایک خوب صورت سا میسج سفینہ کو سینڈ کرے گا تو وہ کتنا حیران ہو گی...... اسی میسج میں اسے یہ بتانا پڑے گا کہ خدا کے لیے یہ خبر اپنے تک محدود رکھنا کہ پرنس نے اپنی محبوبہ کا دل ٹوٹنے سے بچانے کے لیے اپنا ایک بڑا قیمتی اصول توڑا ہے اور بالآخر سیل فون لے لیا ہے...... حتیٰ کہ اس کی دادی کو بھی پتا نہیں چلنا چاہیے۔

اس نے منیجر کو بلانے کے لیے آپریٹر سے بات کی اسی وقت آپریٹر نے اسے منیجر سے ملا دیا۔

''جی سر!'' منیجر کی مؤدبانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''وہ ایسا ہے کہ مجھے آج کی ڈیٹ میں سیل فون چاہیے...... اور صرف سیل فون نہیں کیونکہ یہ مجھے گفٹ نہیں کرنا، اپنے لیے لے رہا ہوں۔''

''جی...... سر؟'' پہلی بار شاید منیجر نے قطع کلامی کی بے اختیارانہ جرأت کی تھی...... یوں کہ جیسے اسے اپنے کانوں پر اعتماد نہ آیا ہو......

''جی جناب مجھے ایک عدد سیل فون چاہیے اور سم کے ساتھ چاہیے۔''

''تو سم کے لیے تو سر آپ کے NIC کی کاپی بھی چاہیے ہو گی۔''

''تو کیا ضروری ہے کہ میرے نام سے سم لی جائے آپ اپنے نام سے ایک سم لے لیں...... مجھے تو بس ایک دو میسج کرنے کے لیے، کام چلانے کے لیے یہ سیل فون چاہیے ورنہ آپ جانتے ہیں مجھے اس جدید ترین ایجاد سے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں ہے۔''

منیجر پوچھنا تو چاہتا تھا مگر رتبہ ایسا تھا کہ مجال نہیں تھی کہ اپنی طرف سے کوئی سوال کرتا کہ...... ''سر آخر ایسی بھی کیا مجبوری آ گئی کہ آپ کام چلانے کے لیے کسی کے نام سے بھی سم لینے پر مجبور ہو گئے ہیں؟''

''او کے...... سر میں اپنے نام سے لے لیتا ہوں You don't worry'' منیجر نے جو کہنا چاہا تھا وہ روک لیا...... اور بس اپنی طرف سے بات ختم کی۔

''او کے۔''

پرنس کو بھی اس کے علاوہ کوئی بات نہیں کرنا تھی۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔

''یہ لیجیے جناب ہو گئے عشق کے امتحان شروع سفینہ...... یہ میں تو نہیں ہوں، تم نے پلک جھپکتے میں کیا، کیا معجزے دکھانا شروع کر دیے...... مجھے کیا خبر تھی کہ محبت اسے کہتے ہیں۔''

وہ ایک خوب صورت سی دُھن دھیمی آواز میں گنگناتا ہوا...... اپنی وہ دراز کھولنے لگا جس میں اس کی بہت پرانی تخلیقات جمع ہوتی رہی تھیں اور مدتوں سے اس دراز کو نہیں کھولا تھا...... کیونکہ اسے اپنی ایک پینٹنگ یاد آ گئی تھی جسے پینٹ کرتے ہوئے اس نے فخریہ انداز میں کئی بار سوچا تھا کہ محبت کو اتنا خوب صورت اسکیچ شاید ہی کسی نے کیا ہو...... اور اب خیال آ رہا تھا کہ وہ اسکیچ تو ابھی تک ادھورا ہے۔

☆☆☆

جیولری تو اس نے کمرے میں گھستے ہی جیسے نوچ کھسوٹ کر ایک طرف اچھال دی تھی اور دانت پیستی ہوئی بستر پر اوندھی گر گئی تھی۔ ''کچھ بھی تو ایسا نہیں ہوتا جو میری مرضی کا ہو۔ وہ کون لوگ ہیں...... جو چاہتے ہیں وہ ہو جاتا ہے جو میں سوچتی ہوں وہ نہیں ہوتا...... اتنے بے شمار انسانوں کی وشز پوری ہوتی ہیں...... میں نے کیا، کیا ہے...... جو سوچتی ہوں اس کے بالکل الٹ ہوتا ہے...... بس ایسا لگتا ہے...... جیسے مجھے اس دنیا میں جب تک جینا ہے دوسروں کی مرضی سے جینا ہے...... لوگ کیا پسند کرتے ہیں...... کس بات پہ خوش ہوتے ہیں کس بات پہ ناخوش ہوتے ہیں...... مجھے بس ہر وقت یہی سوچتے رہنا ہے۔'' غصے سے زارا کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ دماغ میں جیسے پٹاخے سے چل رہے تھے...... چند ثانیے اوندھی لیٹی رہی...... مگر اندر جو آگ بھڑک رہی تھی وہ ایک پل بھی چین کب لینے دیتی تھی۔ ایک جھٹکے سے پہلے دائیں طرف کروٹ لی پھر فوراً ہی اس سے بھی زوردار جھٹکے سے بائیں طرف کروٹ لے لی...... تب بھی کوئی افاقہ نہ ہوا تو اٹھ کر بیٹھ گئی، آلتی پالتی مار لی...... تکیے اور کشن گود میں بھر لیے اور کہنیاں ٹکا کر دونوں ہتھیلیوں کا پیالہ بنا کر اپنا چہرہ ٹکا لیا...... جی تو چاہ رہا تھا کہ بس کچھ ایسا ہو جائے کہ وہ ہر طرف آگ لگا کر رکھ دے...... اونچے، اونچے شعلوں کو دیکھ کر پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگے۔ ہنس، ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگے...... دنیا خوف زدہ ہو کر وحشت ناک چیخیں مار رہی ہو اور اس کا ہنس، ہنس کر برا حال ہو...... کیا اس کا یہ خواب پورا ہو سکتا ہے؟

اس نے تکیے اور کشن اب پھینک دینے کے انداز میں ایک طرف رکھ دیے اور بڑی سرعت کے ساتھ پاؤں بیڈ سے نیچے لٹکا کر اٹھ کھڑی ہوئی...... جو پورا ہو جائے وہ زارا کا خواب کہاں...... زارا کے خواب تو بس جلتے رہیں گے...... اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اب اپنا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا...... فیروزی رنگ کا خوب صورت ڈریس منہ چڑا رہا تھا۔ ''مجھے جو ساحل سے کہنا ہے وہ اب کبھی نہیں کہہ سکتی...... چند گھنٹے گزریں گے اور شام ہو جائے گی...... شام ہوتے ہی وہ ہو گا جو سب چاہ رہے ہوں گے...... وہ ہرگز بھی نہیں ہو گا جو میں چاہوں گی...... یااللہ میرے، خواب یوں ہی اگر جلتے رہے تو مجھے ڈر ہے کہ آہستہ، آہستہ میں لوگوں کے خواب جلانا نہ شروع کر دوں...... میرے خوابوں کی اچھی تعبیر نہیں ہے تو پھر کسی کو بھی حق نہیں ہے کہ وہ اچھے خواب دیکھے اور پھر ان کی تعبیریں بھی پائے۔''

وہ ایک زخمی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی اس نے اپنا شکست خوردہ وجود آئینے میں دیکھا۔ آئینہ بھی اس کا مذاق اڑا رہا تھا جی تو چاہ رہا تھا کہ کوئی اچھی وزنی سی پرفیوم کی بوتل اٹھائے اور آئینے پر دے مارے...... ایک عجیب سی بے بسی کی کیفیت تھی...... کچھ کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ ایسا کچھ کرے کہ سب روتے ہوئے نظر آئیں اور صرف وہ ہنس رہی ہو...... پھر اس نے ایک نگاہ غلط آئینے پر دوڑائی۔ ''کیسی، کیسی عجیب و غریب شکلیں ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ ان کو صرف خوشیاں منانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے...... مجھ میں کیا کمی ہے...... میرے لیے زبردستی کا جینا کیوں ہے؟'' ناکامی اور شکست اتنی بری طرح آنچ دے رہی تھیں کہ دل پگھل کر آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت بہہ نکلا اور وہ اپنے بھیگتے ہوئے گال آئینے میں دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ واپس آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ تو گیا تھا مگر ذہن کام کی طرف متوجہ ہی نہیں ہو رہا تھا...... پلٹ، پلٹ کر زارا کی طرف اڑان بھرتا تھا...... ''یااللہ یہ صرف آج ہی کی بات نہیں ہے، عمر بھر کا سوال ہے...... اس لڑکی نے تو شام سے پہلے، پہلے مجھے پاگل کر دیا...... کسی کام کا نہیں رکھا، سنا ہے جنہیں عشق ہوتا ہے، وہ نکمے ہو جاتے ہیں کسی کام کے نہیں رہتے...... یااللہ تو گواہ رہنا مجھے عشق وشق کچھ بھی نہیں ہوا...... تو نے میرے حال پر رحم فرمایا اور مجھے اس بڑے

عذاب سے ابھی تک محفوظ رکھا...... کچھ دن پہلے ہونے جا رہا تھا مگر چونکہ تو بڑا رحمان و رحیم ہے تو نے مجھے راستے سے ہی واپس لوٹا دیا اور میں تیرا شکر ادا کرتے نہیں تھکتا...... لیکن اب تو عشق بھی نہیں ہے لیکن عذاب عشق جیسا کیوں ہے۔'' وہ بری طرح جھنجلا رہا تھا کیونکہ ایک پھانس تو دل میں اٹکی ہوئی تھی کہ وہ آخر اسے بلا کیوں رہی تھی اور اتنی جلدی میں تھی کہ آدھی رات کو سوتے میں سے اٹھا دیا صرف یہ بات بتانے کے لیے کہ اس سے صبح لازمی ملاقات کرنی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے یہ لڑکی سائیکو ہے اور ہوسکتا ہے، میرا خیال درست ہو...... آخر کوئی تو بات ایسی ہوگی کہ میڈم تاجور اتنی خوب صورت، پڑھی لکھی بیٹی ایک مڈل کلاسیے کو دینے کو تیار ہوگئیں...... کیا کروں میں...... انکار کرتا ہوں تو دور تک سراب نظر آتا ہے۔ ایسا سراب جس کا سفر کبھی تمام نہ ہو...... اور بھٹکنے والا پانی کی تلاش میں...... انگلیوں سے ریت کھود، کھود کر پہلے اپنی انگلیاں لہولہان کرے پھر گدھوں کو دعوتِ طعام دے۔

ساحل ایک عجیب سی بے بسی کی کیفیت میں ڈوبا ہوا تھا...... ایک طرف رئیس ابنِ رئیس کہلوانے کے وہ مضبوط خواب جنہوں نے اسے پوٹھوہاری زمین سے لڑھکا کر اس ساحلی شہر میں پہنچا دیا...... اب اس شہر سے آگے وہ کہاں جائے گا...... اس شہر میں تو ایک وسیع سمندر ہے...... جو مایوس اور نامراد لوگوں کی آخری پناہ گاہ بننے پر ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا تھا...... کیونکہ اب تو کوئی نئی بات نیا خیال نیا غصہ بھی نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

حفظِ ماتقدم کے تحت پرنس نے آپریٹر کو دو، تین مرتبہ ٹرائی کرنے کے لیے کہہ دیا تھا...... کیونکہ اسے یقین تھا کہ سفینہ کلاس سے باہر آتے ہی سب سے پہلے اپنا فون چیک کرے گی اور اس کا اسمارٹ فون جب یہ بتائے گا کہ پرنس نے اسے دو تین دفعہ ٹرائی کیا تو وہ ذرا مطمئن ہوجائے گی اور آنے والے بے شمار ناپسندیدہ خیالات سے خود بخود بچت ہوجائے گی۔

یہ کام بھی اس نے نہایت ضروری کام کی طرح نمٹایا تھا، اب وہ خاصا مطمئن نظر آرہا تھا مگر انٹر کام کی گھنٹی نے اس کی مطمئن کیفیت کو زیادہ دیر قرار پکڑنے نہ دیا آگے بڑھ کر اس نے انٹر کام کا ریسیور اٹھایا۔

''یس!'' اس نے مخصوص انداز میں متوجہ کیا...... دوسری طرف سے انجیلا بات کررہی تھی۔

''سر...... آپ کو لیڈی صاحبہ اپنے بیڈروم میں بلارہی ہیں۔'' انجیلا نے پیغام دیا تھا۔

''اوکے...... میں آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر پرنس نے ریسیور واپس رکھ دیا اور اپنے بھرے، بھرے ہونٹوں کو بھینچنے کے انداز میں دبا کر چند لمحے کے لیے دیوار کی طرف ٹکٹکی باندھی...... ظاہری بات ہے رات کی رپورٹ تو دینا ہوگی۔

اس وقت بڑا امتحان آپڑا تھا...... آخر اب وہ لیڈی صوفیہ کو کیا کہے گا کہ رات سفینہ سے اس کی بات نہ ہوسکی اور یا پھر وہ ان کو وجہ بتائے گا کہ کیوں نہ ہوسکی...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... یہ بات تو وہ کسی بھی صورت انہیں نہیں بتا سکتا تھا کہ رات وہ صندل کی خیریت پتا کرنے چلا گیا تھا...... اس لیے سفینہ سے بات نہ ہوسکی۔ اگر وہ لیڈی صوفیہ سے سچ کہہ دیتا تو اس کے بڑے خوفناک نتائج نکلنا تھے...... سب سے پہلے تو وہ ملازمین جو انجیلا کے فلیٹ میں خدمات انجام دیتے تھے...... لیڈی صوفیہ نے پہلی فرصت میں انہیں فارغ کردینا تھا...... اس کے بعد پرنس کی خوب اچھی طرح جھاڑ پونچھ ہونا تھی...... اس وجہ سے نہیں کہ وہ انسانیت کے ناتے کسی کی مدد کرنے کیوں گیا تھا۔ اس وجہ سے کہ انہیں کیوں بے خبر رکھا گیا...... خدانخواستہ کوئی اور بات ہوجاتی، معاملہ زیادہ سیریس ہوجاتا تو کس طرح سے اسے سنبھالتا...... لیڈی صوفیہ کے ذہن میں یہ بات کبھی خود سے نہیں آسکتی تھی کہ ان کا پوتا ان سے اتنا پیار کرتا ہے کہ انہیں انجانے میں بھی اپنی طرف سے کوئی تکلیف پہنچانا اس کے لیے ایسا ہی ہے جیسا

کوئی گناہِ کبیرہ جان بوجھ کر کرنا...... وہ چند لمحے تو وسیع و عریض اسٹوڈیو میں یہاں سے وہاں تک ٹہلتا رہا کہ شاید کوئی ایسا خیال گرفت میں آجائے جو اسے اس موقع پر کسی روحانی اذیت سے بچالے...... یا کوئی ایسا معجزہ ہوجائے کہ کوئی اور بات شروع ہوجائے اور یہ والی بات گم ہوجائے...... مگر پانچ سات منٹ ٹہلنے کے باوجود کچھ بھی نہ ہوا۔ بے بسی کی جو کیفیت تھی ہنوز برقرار تھی...... اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ لیڈی صوفیہ کے سامنے کیسے جا کھڑا ہو اور ان کے متوقع سوالات کے جواب کس طرح سے دے...... جبکہ اسے خود ہی معلوم نہیں تھا کہ وہ اس وقت کس موڈ کس کیفیت میں اس سے مل رہی ہیں۔

ان کے سامنے جانے سے پہلے وہ کوئی مضبوط اندازہ لگا ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ کس ردِعمل کا مظاہرہ کرنے کو بے چین بیٹھی ہیں۔

کیونکہ ایک اندیشہ اپنی جگہ موجود تھا مبادا سفینہ نے انتظار سے عاجز آکر لیڈی صوفیہ سے خود ہی رابطہ کرلیا ہو۔

وہ اس ننھے بچے کی طرح متذبذب تھا جو نقصان کرنے کے بعد سہما کھڑا ہو۔

☆☆☆

گہری نیند خود بخود ٹوٹ گئی تھی...... یوں جیسے...کسی نے کاندھا ہلا کر جگا دیا ہو...... پٹ سے آنکھ کھلی اور جھٹ سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''او میرے خدایا کیا ٹائم ہورہا ہے؟'' اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا...... کھڑکیوں کے پردے ذرا سے سرکے ہوئے تھے جو غالباً ماہین جاتے ہوئے سرکا گئی تھی۔ شیشوں پر پڑنے والی دھوپ سے اندازہ ہورہا تھا کہ اچھا خاصا دن چڑھ چکا تھا...... پہلا خیال آتے ہی اس کی عجیب سی کیفیت ہونے لگی...... پھر ایک دم یاد آیا کہ وہ صبح ہی تو سوئی تھی، ساری رات تو آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ پوری رات آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح چل پڑی...... اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے موبائل کی طرف بڑھا تھا۔ یوں جیسے اس کے دل نے کہا کہ رات تو گزر گئی ہے...... اس نئے دن میں شاید کوئی خوب صورت سا پیغام چھپا ہوا ہو...... سونے سے پہلے اس نے فون آف کردیا تھا اور یہ بات وہ بھولی نہیں تھی کیونکہ اس نے خاصے ڈپریشن کی کیفیت میں فون آف کیا تھا یوں جیسے وہ خاموشی کی زبان میں اعلانِ جنگ کررہی ہو کہ پرنس اگر لیٹ ہوگئے ہیں اور اسے بعد میں کال کریں تو ان کو اس کا فون آف ملے...... تاکہ جس کوفت سے وہ گزری ہے اب وہ بھی صبح تک اسی کوفت میں بتلا رہیں۔

اس نے دھڑکتے دل سے فون آن کرنے کے بعد آپشن چیک کیے...... دو مسڈ کالز آنکھوں کے سامنے تھیں۔ جو پرنس کے لینڈ لائن نمبر سے آئی تھیں...... جو ظاہر ہے وہیں سے آنا تھیں کیونکہ پرنس کے پاس تو سیل فون نہیں تھا...... اس نے کالز کا ٹائم دیکھا تو پتا چلا کہ یہ تو صبح کے ٹائم میں کی گئی تھیں۔ رات کو تو کوئی کال نہیں آئی...... معاً اسے خیال آیا کہ شاید اس کا خیال صحیح تھا۔ لیڈی صوفیہ کی طبیعت خراب ہوگئی ہوگی اس وجہ سے پرنس نے اسے فون نہیں کیا...... یہ خیال آتے ہی کوفت کی جمی ہوئی گرد غبار کی طرح اُڑ گئی تھی...... مگر اگلے ہی لمحے اسے آپریٹر کی بات فوری یاد آگئی کہ پرنس تو ثوبان کی مدر کی خیر گیری کے لیے نکل گئے تھے۔

اسے آج چھٹی کرنے کا بالکل بھی افسوس نہیں تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ صبح ہی صبح کالج چلی جاتی اور کلاسیں لینے کے دوران اگر اسے اپنا سیل فون چیک کرنے کا موقع نہ ملتا تو بھی اس نے کون سا پڑھ کر دینا تھا۔ پروفیسر اپنی سی کہہ سن کر چلے جاتے...... اور وہ بیٹھی پرنس کو ہی سوچتی رہتی...... آپریٹر کی بات اس کے دماغ سے چپک گئی تھی۔ اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس نے ساری زندگی جان بوجھ کر کبھی چھٹی کی ہو۔ اسکول، کالج اور پھر اب

یونیورسٹی‘ اس کا حاضری کا ریکارڈ ہمیشہ امتیازی رہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اپنے کالج اور اب LUMS جیسے بڑے ادارے میں ہمیشہ سے اپنے اساتذہ کی فیورٹ رہی تھی۔ کیونکہ اللہ کے فضل و کرم سے۔ اس کی صحت بھی اچھی رہتی تھی...... سال میں کبھی فلو ہو جاتا تھا، وہ بھی زیادہ تر سردیوں میں تو وہ بڑے آرام سے اسے سنبھال لیتی۔ صرف فلو کی وجہ سے تو اس نے کبھی چھٹی نہیں کی تھی لیکن آج پرنس کی وجہ سے اس نے چھٹی ضرور کی تھی۔ وہ اپنے فون اسکرین پر نظریں جمائے مسڈ کالز کی طرف یوں تک رہی تھی جیسے پرنس وہاں سے اسے کوئی خوب صورت سندیسہ ارسال کر رہا ہو...... اگر یہ کالز وہ نہ دیکھتی...... یا یوں کہنا چاہیے اگر پرنس نے اسے صبح ٹرائی نہ کیا ہوتا تو شاید وہ آج اپنا سیل فون کھڑکی سے باہر ہی پھینک دیتی کہ اس کے کسی کام کا نہیں کسی اور کے کام آ جائے کیونکہ اس کے نزدیک اب فون کا مقصد یہی رہ گیا تھا کہ پرنس کی کالز آئے تو وہ ان خوب صورت دھڑکنوں کے ترنم کو یوں سنے جیسے دل پر مقدس صحیفے اتر رہے ہوں...... عجیب سی لذت تھی ان خیالات میں، بڑی بے خودی اور سرشاری سی...... ایک ایسا نشہ جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ بس خیال پرنس سے شروع ہوتا تھا اور پرنس کے گرد ہی گھومنے لگتا تھا نہ اسے واش روم جانے کی جلدی تھی نہ فریش ہونے کی آرزو...... آنکھ کھلتے ہی پرنس کا خیال دل کو تر و تازہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ کہتے ہیں انتظار میں لذت ہے۔ مگر موجودہ صورتِ حال میں وہ ان کالز کے انتظار سے ہرگز بھی لطف اندوز نہیں ہو سکتی تھی بلکہ اِک نامعلوم سی بے چینی اس کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

☆☆☆

تاجور تو آفس سے جلدی اٹھ آئی تھیں کیونکہ شام کو انہوں نے ساحل کی بہن کا سواگت کرنا تھا...... ان کے ذہن میں ساحل کی بہن کے بارے میں کوئی واضح تصویر نہیں تھی لیکن یہ تو تھا کہ ایک لڑکے کی بہن لڑکی دیکھنے پہلی مرتبہ ان کے گھر آ رہی ہے...... لیکن گھر میں داخل ہوتے ہی زارا سے جو ملاقات ہوئی...... ذہن بالکل ہی تلپٹ ہو کر رہ گیا...... اب اپنے کمرے میں بیٹھی بالکل خالی الذہنی سے دیوار کو تک رہی تھیں۔

سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی...... ”یہ اتنا اچھا تیار ہو کر آخر جا کہاں رہی تھی......؟“ زارا نے جو کچھ انہیں کہا تھا انہیں بالکل بھی یقین نہیں آ رہا تھا...... پتا نہیں کیوں ذہن کے ایک کونے میں...... ایک وہم اچھی طرح چپک کر بیٹھ چکا تھا کہ زارا کو جھوٹ بولتے ہوئے قطعاً کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی...... اور اب بھی بار، بار یہ سوچے جا رہی تھیں کہ زارا نے ان سے کچھ دیر پہلے سچ نہیں کہا...... پتا نہیں کیوں جب وہ بول رہی تھی وہ مسلسل اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ رہی تھیں اور زارا کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ ان سے سچ نہیں بول رہی...... اس خیال کے ساتھ ان کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔

”وہ کہاں جا رہی تھی؟ کیا پھر پرنس کے گھر جا رہی تھی......؟ نہیں...... نہیں۔“ وہ گھبرا کر ایک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہوئیں مگر فوراً ہی بیٹھ گئیں...... وہ یہ بات کرنا تو دور کی بات سوچنا بھی نہیں چاہتی تھیں کہ زارا اپنے منہ سے اعتراف کر چکی ہے کہ وہ پرنس کو پسند کرتی ہے اور کتنی ڈھٹائی اور بے حسی سے اس نے یہ اعتراف کیا تھا...... چند سیکنڈز کے لیے تو ان کے ذہن نے کام ہی کرنا بند کر دیا تھا مگر انہوں نے اپنی قوتِ ارادی کو کام میں لاتے ہوئے جس طرح سے اس صورتِ حال سے خود کو نکالا تھا...... اور یہ کہہ کر اپنے ذہن کو سمجھا لیا تھا کہ یہ بے وقوف سی لڑکی کو کچھ پتا نہیں چلتا جب یہ بول رہی ہوتی ہے...... تو کیا یہ پرنس کے گھر جانے کے لیے تیار تھی؟ یہ سوچتے ہی ان کا دل ڈوبنے لگا...... لیکن جب ساری بات طے ہو چکی تو پھر یہ پرنس کے گھر کیوں جائے گی...... اس کا پرنس سے اب کیا لینا دینا...... ساری باتیں طے ہو چکیں، وہ اسے اچھی طرح سمجھا چکیں کہ اگر وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے تو یہ دیوانے کا خواب ہے۔ ”اوہ میرے خدایا!“ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

”یہ لڑکی تو میرے لیے بہت بڑا خطرہ بنتی جا رہی ہے...... اگر ساحل کی بہن کے ساتھ معاملات طے ہو جاتے ہیں تو میں اس کی شادی میں بالکل بھی دیر نہیں کروں گی۔ چاہے سفینہ کی شادی اس کے دو سال بعد بھی ہو...... مجھے پروا نہیں......“ انہوں نے گویا حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ ”میرا بس چلے تو نکاح پڑھا کر آج ہی اسے رخصت کر دوں۔“ وہ سوچ رہی تھیں اور فیروزی کپڑوں میں ملبوس بہت اہتمام سے تیار ہوئی زارا ان کے ذہن کے پردے پر یوں دستک دے رہی تھی جیسے اسے سوچنے کے علاوہ انہیں کوئی اور کام ہی نہ ہو۔

☆☆☆

پرنس کے اندر ایک یقین کی روشنی تو ہمیشہ دوڑتی رہتی تھی جو اسے نہال اور تر و تازہ رکھتی تھی کہ اس کے دل سے نکلی ہوئی دعا قبول ہوتی ہے...... کسی بھی انسان کے لیے یہ خوشگوار احساس بہت قیمتی ہوتا ہے کہ دعا انسان کا واحد سہارا اور چمکتی ہوئی کرن ہوتی ہے۔ جیسے ہی وہ لیڈی صوفیہ کے سامنے حاضر ہوا لیڈی صوفیہ نے اس کا چہرہ دیکھتے کے ساتھ ہی بڑے خوشگوار انداز میں کہا۔

”تمہارے چہرے سے لگتا ہے کہ تم اس وقت بہت خوش ہو۔“

”جی...... جی......!“

وہ جلدی سے بولا اور دل ہی دل میں گھبرایا کہ خدا جانے وہ اب آگے کیا کہنے جارہی ہیں...... کوئی ایسی بات نہ کہہ بیٹھیں کہ اسے ایک سانس میں کئی جھوٹ بولنا پڑ جائیں لیکن قدرت اس پر مہربان رہی...... لیڈی صوفیہ نے فوراً ہی کہنا شروع کر دیا تھا۔

''آج رات میں نے تمہارے grand father کو خواب میں دیکھا بہت خوب صورت نظارہ تھا۔''
وہ ایک کھوئی، کھوئی کیفیت میں یادداشت پر زور ڈالتے ہوئے پرنس کو اپنا خواب سنانے لگیں۔

''میں نے دیکھا دور تک سبزہ ہی سبزہ ہے اور آسمانوں پر زمینی پرندے اُڑتے ہوتے دکھائی نہیں دیے کیونکہ جو پرندے میں نے اڑتے ہوئے دیکھے...... وہ تو سب کے سب بہت کلرفل تھے...... اور ایک جیسے نہیں تھے...... چھوٹے، بڑے اور کچھ بہت ہی چھوٹے تھے...... بہت خوب صورت نظارہ تھا...... میں ابھی تک اسی کے سحر میں مبتلا ہوں...... تمہارے گرینڈ فادر نے میری طرف دیکھا...مسکرائے اور اپنا ہاتھ بڑھایا میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔''

یہ کہتے، کہتے لیڈی صوفی نے اپنا دایاں ہاتھ پرنس کے سامنے پھیلا دیا۔

''میرے ہاتھ کو چھو کر دیکھو یہ ابھی تک گرم ہے اور اس گرمی کو محسوس کرتے ہوئے مجھے بار، بار یہ خیال آرہا ہے کہ یہ میری روح کی، میرے وجود کی گرمی نہیں ہے...... یہ تو وہ گرمی ہے جو میں نے تمہارے دادا کا ہاتھ چھوتے ہی محسوس کی تھی......''

''you are most lucky grand mom...... یعنی آپ نے میرے لیے ایک نیکی کا کام کیا اور آپ کی اسی رات گرینڈ فادر سے ملاقات ہوگئی۔''

پرنس نے فوراً کہا تھا وہ چاہتا تھا کہ اب اسی خواب پر بات ہوتی رہے اور پھر جب وہ وہاں سے اٹھ کر چلنے لگے تو لیڈی صوفیہ کے ذہن میں سفینہ کا نام ہی نہ ہو...... پتانہیں کیوں اسے بچپن ہی سے محسوس ہوتا تھا کہ جھوٹ بولنے سے اس کے اعصاب بوجھل ہو جاتے ہیں اور وہ کئی گھنٹے اپنے آپ کو کمزور اور بیمار محسوس کرتا ہے...... اس خیال اور احساس کے پس پردہ لیڈی صوفیہ کا ہی ہاتھ تھا...... جنہوں نے پرنس کے احساسات میں کوٹ، کوٹ کر بھر دیا تھا کہ جھوٹ سے بڑی بیماری دنیا میں کوئی نہیں...... اور جھوٹ تو تمام برائیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ بہت چھوٹا سا تھا...... اسے یاد ہے کہ لیڈی صوفیہ کہانیوں کے ذریعے، کسی خوب صورت واقعے کے ذریعے اس کی تربیت کرتی رہتی تھیں...... وہ چاہتی تھیں کہ پرنس وہ نظر آئے جو وہ دیکھنا چاہتی ہیں اور پرنس کے ساتھ کے لمحوں میں وہ اپنا سارا زور لگا دیتی تھیں کہ پرنس ان کے جذبات ان کے خیالات اچھی طرح اوڑھ پہن لے۔

''مجھے تو سن کر ہی ایسا لگ رہا ہے جیسے میں آپ کے ساتھ گرینڈ فادر کو دیکھ رہا ہوں...... آپ نے بہت اچھا scenario پیش کیا بس میں تو پلک جھپکتے میں اس ماحول میں پہنچ گیا اور اب بیٹھے، بیٹھے محسوس کر رہا ہوں جیسے میں اپنی ان کھلی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا ہوں۔''

''ہاں...... وہ بہت خوب صورت لگ رہے تھے اور بہت خوش بھی...... آج سارا دن میرا بہت خوشگوار گزرے گا...... انشاءاللہ تعالیٰ......!''

لیڈی صوفیہ اپنے عشق کی بلندیوں پر محوِ پرواز تھیں اور پرنس کو اپنے اللہ پر ٹوٹ، ٹوٹ کر پیار آرہا تھا کہ کیسے اللہ نے اس کی جان بچائی اور وہ جھوٹ بولنے سے بچ گیا...... کیونکہ لیڈی صوفیہ نے اسے طلب کر لیا تھا تو اسے آنا پڑا اور نہ ذہن میں تو یہی تھا کہ ان سے ملاقات سے پہلے سفینہ سے بات ہو جائے اور وہ لیڈی صوفیہ کے پاس جاتے ہی سفینہ کی باتیں کرنے لگے اور درمیان میں انہیں احساس ہی نہ ہونے دے کہ یہ باتیں رات ہوئی تھیں یا کچھ دیر پہلے ہوئی ہیں۔ اب تو سارا مسئلہ ہی حل ہو گیا تھا...... لیڈی صوفیہ اس وقت اس کے دادا کے سوا کسی موضوع پر بات

کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر ہلکی، ہلکی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں دلبرانہ اور محبوبانہ جذبات کی چمک...... وہ ستر سال پہلے کے اس عشق میں سر سے پاؤں تک ڈوبی ہوئی تھیں...... جس کی گہرائیوں سے باہر آنا اس وقت تو ممکن نظر نہیں آرہا تھا...... وہ ان کی تمام باتیں سننے کے بعد فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا...... اس خیال سے کہ کہیں موضوع نہ بدل جائے۔

''کہاں جارہے ہو؟'' لیڈی صوفیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ ایک دوست کی ضروری فون کال آنی ہے اس سے بات کر کے پھر آپ سے ملتا ہوں۔''

''اوکے ڈیئر!''

کمٹ منٹ کی بات تھی لیڈی صوفیہ اس پر زیادہ بات نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ ساری زندگی ان کا یہی تو مسئلہ رہا تھا کہ لوگ بہت uncommitted ہوتے ہیں۔ وہ سر جھکا کر پھر اپنے خیالوں میں کھو گئی تھیں۔ پرنس چلتے ہوئے بہت احتیاط کر رہا تھا کہ کہیں وہ اس کے قدموں کی آہٹ سے چونک کر پھر کوئی بات شروع نہ کر دیں۔

☆☆☆

بے چینی کی کیفیت تو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ بڑی بے اختیاری کی کیفیت میں زارا کے کمرے تک آئیں اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی، پتانہیں وہ اس وقت کیا دیکھنا اور سننا چاہ رہی تھیں۔ شام تھی کہ سر پر آکھڑی ہوئی تھی...... چند گھنٹے یوں گزر جاتے تھے جیسے ہوا کے دوش پر پرندے اڑ کر کہیں دور افق میں غائب ہو جاتے ہیں۔

انہیں شاید تیس، پینتیس سیکنڈ انتظار کرنا پڑا اور دروازہ کھل گیا تھا۔ زارا انہیں اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر بری طرح چونک پڑی تھی اور جلدی سے خود کو سنبھالنے کی کوششوں میں لگ گئی تھی۔ نظریں چرا کر اس نے دروازہ پورا کھول دیا۔

''آیئے اماں!''

تاجور میکانکی انداز میں یوں کمرے میں داخل ہوئیں جیسے کسی نے انہیں پیچھے سے دھکا دیا ہو...... زارا ابھی تک اسی لباس میں ملبوس تھی جس میں کچھ دیر پیشتر انہوں نے دیکھا تھا...... اب وہ سوالیہ نظروں سے تاجور کو دیکھ رہی تھی۔

''ہاں! وہ میں تمہیں یہ کہنے آئی تھی کہ تم اس ڈریس میں بہت اچھی لگ رہی ہو...... اور تم شام کو یہی ڈریس پہننا...... اور دیکھو خیال کرنا کہ ساحل کی بہن کے سامنے تم کوئی ایسی ویسی بات نہ کر بیٹھو وہ جو کہتے ہیں ناں کہ first impression is the last impression...... وہ تمہیں پہلی بار دیکھیں گی اور ہو سکتا ہے کہ آج ہی کی سٹنگ میں بہت سارے معاملات طے پا جائیں...... کیونکہ کافی ساری باتیں تو میں ساحل سے کر ہی چکی ہوں...... اس نے ضرور اپنی بہن سے شیئر کی ہوں گی۔''

تاجور بولتی چلی گئیں یوں جیسے پیراگراف پڑھ رہی ہوں اور لاشعوری طور پر زارا کی طرف سے کوئی ایسی بات سننا چاہ رہی ہوں جس کے بعد عذاب کی طرح مسلط یہ بے چینی کی کیفیت ان کی جان چھوڑ دے...... بار، بار زبان کی نوک پر ایک سوال آتا تھا اور وہ روک لیتی تھیں...... سوال یہ تھا کہ کیا اس نے ان سے جھوٹ تو نہیں بولا......؟ وہ سچ، سچ بتا دے کہاں جارہی تھی...... پھر خود ہی اپنے سوال کو ایک طرف اٹھا کر رکھ دیا کہ اب یہ سوال کرنے کا کیا [illegible] وہ بھی گھر میں ہیں اور زارا ابھی گھر میں ہے اور زارا کو پتا ہے کہ وہ ان کی موجودگی میں اب گھر سے باہر [illegible]...... تو ایسا سوال نہ ہی کیا جائے تو بہتر ہے جس کا جواب سننے کے بعد بے چینی کم ہونے کے بجائے

مزید بڑھ جائے...... بے چینی نہ بڑھے تو غصے کی کیفیت طاری ہو جائے...... اب وہ ہر قسم کی کیفیات سے بچنے کی شعوری کوشش کر رہی تھیں...... اس وقت ان کے ذہن میں صرف اور صرف یہ تھا کہ بس آج کی شام خیریت سے اور بہت اچھی طرح گزر جائے۔

''ٹھیک ہے اماں، آپ کہتی ہیں تو میں یہی پہن لوں گی ابھی میں چینج کرنے ہی جا رہی تھی۔''

''ہاں...... ہاں ٹھیک ہے...... ابھی تو ریسٹ کرو، میرا خیال ہے وہ پانچ بجے کے بعد ہی گھر آئیں گے پھر بھی میں ساحل کو فون کر کے معلوم کر لوں گی۔ بہت اچھی طرح سے تیار ہونا۔''

تاجور جانے کے لیے پلٹ گئی تھیں مگر جاتے، جاتے رک کر انہوں نے یہ جملہ کیوں کہہ دیا...... آج سے پہلے وہ کبھی غیر ضروری بات کرتی ہی نہیں تھیں...... ضروری بات کرنے سے پہلے کئی مرتبہ چھان پھٹک لیتی تھیں...... لیکن اس وقت پتا نہیں کیا ہو رہا تھا...... بس کچھ نہ کچھ بولتی چلی جا رہی تھیں اور یہ بات ان کی اپنی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ ذہنی طور پر بہت منتشر تھیں۔

☆☆☆

آپا، ساحل کے ساتھ تاجور کے محل نما گھر میں داخل ہوئیں تو ان کی حالت غیر ہونے لگی...... وسیع و عریض قطعۂ اراضی پر بنا ہوا یہ محل نما گھر انہیں وحشت زدہ سا کرنے لگا...... وہ زبان جو ہر وقت کتر، کتر چلتی رہتی تھی گنگ سی ہو کر رہ گئی۔

''ارے یہ ان کا اپنا گھر ہے یا کرایے کا ہے۔'' بہ مشکل ان کے منہ سے نکلا تھا۔

ساحل پورچ میں گاڑی آگے تک لے گیا تھا...... کیونکہ ایک گاڑی کے پیچھے تاجور کی گاڑی کھڑی تھی جسے وہ پہچانتا تھا...... پورچ اتنا وسیع تھا کہ اس میں ایک ہی وقت میں آٹھ گاڑیاں کھڑی ہو سکتی تھیں...... اس نے تاجور کی گاڑی کے پیچھے گاڑی لگانے کے بجائے...... گاڑی دوسری رو میں کھڑی کی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے آپا آپ کو...... میں نے آپ کو بتایا کہ یہ رئیس ابن رئیس لوگ ہیں اور اتنے رئیس لوگ کرایے کے گھر میں کیوں رہیں گے؟''

''ارے...... مانو میرے تو ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں...... یااللہ جن کا گھر ایسا ہے وہ خود کیسی ہوں گی...... مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے وہ سیر دو سیر سونا پہنے کھڑی ہوں گی...... ارے بھیا کہاں یہ، کہاں ہم...... مجھے تم ان سے ملانے سے پہلے کچھ تو سوچ لیتے...... اب پتا نہیں کس طرح کی باتیں کرتے ہیں یہ لوگ...... کتنی انگریزی بولتے ہیں یہ لوگ، میری تو انگریزی بھی ایسی لولی لنگڑی ہے بلکہ اب تو صحیح سے یاد بھی نہیں ہے...... میٹرک میں گرامر کے ساتھ پڑھی تھی کچھ گزارے لائق کام چلانے کے لیے بول لیتے تھے اب تو...... اپنے مسئلوں میں وہ بھی گئی۔''

''آپ فکر نہ کریں، یہ اس طرح کی امیر زادی نہیں ہیں کہ جن لوگوں کے ساتھ انگریزی بولنا ضروری ہوتا ہے...... یہ اچھی صاف ستھری اردو میں ہی بات کرتی ہیں۔'' ساحل نے ہاتھ کے ہاتھ آپا کو تسلی دی تو آپا کو بھی قدرے سکون محسوس ہوا۔ کیونکہ اکثر ٹی وی ڈراموں میں دیکھا کرتی تھیں کہ بڑے، بڑے محل جیسے گھروں میں رہنے والی بیگمات بہت فراٹے کے ساتھ انگریزی میں بات کرتی ہیں...... یعنی ڈراما تو اردو میں ہی ہوتا تھا لیکن آدھی بات، آدھے ڈائیلاگ انگلش میں ہوتے جو زیادہ تر تو ان کے سر سے ہی گزر جاتے اسی خیال سے ان کی خود اعتمادی ہوا ہو رہی تھی...... بہرحال ساحل کی تسلی کے بعد وہ قدرے پُرسکون نظر آنے لگیں۔

''ارے میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ ایسے محل میں رہنے والی لڑکی ہم لوگوں کے ساتھ کیسے رہے گی؟''

''افوہ آپا آپ کو بتایا ہے ناں وہ میرے فلیٹ میں تھوڑی رہے گی وہاں رہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......

وہ مجھے بھی اپنے اسٹیٹس کا گھر لے کر دیں گے...... آپ فکر نہ کریں...... آپ سے زیادہ ان کو فکر ہو گی۔''

''اچھا تمہارا بھی اتنا بڑا گھر ہو گا۔''

''اب میں آپ کو یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اتنا بڑا ہو گا یا اتنا بڑا ہو گا بہرحال گھر تو ایسا ہو گا ناں جس گھر کو دیکھ کر ان کی اپنی عزت محفوظ ہو جائے اور ان کے داماد کو کوئی گیا گزرا نہ سمجھے......''

''داماد......!'' آپا نے ہڑبڑا کر ساحل کی شکل دیکھی۔

''ابھی تو ہم بات کرنے آئے ہیں۔''

''ہاں...... ہم بات کرنے نہیں آئے، ہم بات بڑھانے آئے ہیں۔ آپا بات ہو چکی ہے...... میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا کہ میڈم تاجور نے مجھے بٹھا کر کتنی detail میں بات کی ہے۔''

''ارے ہاں...... بھئی میرے تو ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں...... میں تو بھول گئی بتایا تو تھا تم نے...... توبہ اللہ...... اب ذرا تھوڑی دیر گاڑی میں بیٹھو میں ذرا اپنے آپ کو سنبھال لوں...... میرا تو دل ایسا پتے کی طرح کانپ رہا ہے...... یااللہ ان کے تو در و دیوار میں جیسے سونا گڑا ہوا ہے...... تیری شان ہے مولیٰ کسی، کسی کو تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے...... ارے ہمارا تو پورا مہینہ تمہارے بھائی جان کی تنخواہ پر نظریں جمائے، جمائے گزر جاتا ہے...... ابھی اتنے نوٹ تھے اب اتنے رہ گئے تیس تاریخ دور پڑی ہے اور کون ستائیس تاریخ کو تنخواہ مل جاتی ہے...... پہلی کا آسرا ہوتا ہے تنخواہ تو وہی سات، آٹھ کو ہاتھ میں آتی ہے...... ارے اللہ کہنے کو مہینہ تیس دن کا ہوتا ہے پر ہمارا تو چالیس دن کا ہوتا ہے۔''

''ارے آپا آپ کیا باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔'' ساحل کو عجیب سی کوفت ہوئی...... اتنے بڑے محل جیسے گھر کے پورچ میں پہنچ کر تنخواہوں کی باتیں ہو رہی ہیں۔

''اس وقت تو آپ میڈم تاجور کی بات کریں، ذرا ان کی بات کریں آنے والے دنوں کا سوچیں کہ اللہ تعالیٰ ہم پر کتنا مہربان ہو گیا ہے ہمارا وقت بدلنے جا رہا ہے...... آج کی تاریخ کے بعد امیر الدین ساحل صرف نام کا امیر نہیں ہو گا...... آپا سچ میں امیر ہو جائے گا۔''

''ارے امیر الدین کا مطلب یہ تھوڑی ہوتا ہے...... امیر الدین کا مطلب ہوتا ہے جو دین میں امیر ہو جس کا ایمان پختہ ہو...... مومن ہو......''

''افوہ۔'' اب ساحل نے اب اپنا الٹا ہاتھ اٹھا کر اپنا سر تھام لیا۔

''اچھا تو اب آپ میرے نام کا مطلب سمجھائیں گی...... چلیں آپ مجھے امیر ساحل ہی کہہ لیں۔''

''کیوں بھئی، ماں باپ کا رکھا ہوا نام ہے ہم کیوں تبدیل کرتے پھریں، نام تو تمہارا امیر الدین ہی رہے گا اب تم ساحل رکھ لو کشتی رکھ لو منجدھار رکھ لو...... جو تمہارا دل چاہے کرتے پھرو تمہیں کون روکنے ٹوکنے والا ہے...... لیکن ماں باپ کا رکھا ہوا نام کوئی نہیں بدلتا...... ارے یہ نام تو سب کو پیارا ہوتا ہے...... جب بچہ دنیا میں آتا ہے تو ماں باپ کی طرف سے سب سے پہلا تحفہ...... نام کی صورت میں ہی تو ملتا ہے...... اور تم اپنی اوقات بدلنے جا رہے ہو تو کیا نام بھی بدل لو گے...... نہیں...... نہیں نام بدلنے کا تو کبھی سوچنا بھی نہیں...... اماں نے کتنا سوچ سمجھ کر اور کتنے پیار سے تمہارا نام رکھا تھا...... ارے بڑی اللہ والی عورت تھیں وہ، تم تو پتا نہیں کس پر پڑ گئے...... شروع ہی سے بس امیر بننے کے خواب اونچے، اونچے خیالات......'' آپا نے اچھی خاصی جھاڑ پلا دی۔

''اچھا آپا...... تھوڑا سا رک کر یاد کر لیں کہ اس وقت آپ کہاں ہیں......؟'' ساحل نے انہیں یاددہانی بڑے چڑے ہوئے انداز میں کرائی تھی آپا یہ سنتے کے ساتھ ہی حواس باختہ نظر آنے لگیں۔

''اچھا...... اچھا چلو ٹھیک ہے...... ارے عزت، ذلت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے...... اللہ نے قسمت میں عزت

لکھی ہے تو پھر عزت ہی ملے گی۔''
''ہاں......بس آپ یہ خیال رکھیے گا کہ زیادہ باتیں نہیں کرنی......کام کی بات کرنی ہے۔''
ساحل نے گاڑی کا لاک کھول کر انہیں گاڑی سے اترنے کا اشارہ کیا۔
''اب یہ تو سامنے والے پر ہے کہ وہ کیا بات چھیڑتا ہے......اب جو سامنے والا بات کرے گا تو اسے جواب دینا پڑیں گے ناں......ہمیں کیا پتا کس کے دل میں کیا چھپا ہوا ہے۔'' آپا بڑبڑانے والے انداز میں کہہ رہی تھیں۔
ساحل اپنی طرف کا ڈور کھول کر اترا اور آپا دوسری طرف سے اتر گئیں......اور اترنے کے بعد انہوں نے نئے سرے سے گھر کے بیرونی حصے کا جائزہ لینا شروع کیا......انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنے عالیشان گھر میں وہ اپنے اکلوتے بھائی کے لیے لڑکی دیکھنے آئی ہیں......مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچ رہی تھیں......اگر اللہ کسی پر مہربان ہو تو اسے کون روک سکتا ہے......ساحل نے آپا کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے آگے چلنے کے لیے کہا۔
''ارے تم ان کو بتا تو دو کہ ہم آگئے ہیں۔''
آپا نے آگے قدم بڑھانے کے بجائے ساحل کے قریب آکر خاصے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا......وہ بار، بار خود کو سنبھالنے کی کوشش تو کر رہی تھیں مگر پتا نہیں کیوں......بار، بار ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوئے جارہے تھے۔
''انہیں پتا ہے آپا......آپ اندر چلیں......نوکر ہمیں بٹھا کر انہیں بتا آئے گا کہ ہم آگئے ہیں اور وہ تیار ہوں گی......کیونکہ ہم ان کے دیے ہوئے ٹائم پر آئے ہیں...آپ آئیں۔''
ساحل نے اب بہت محبت سے بہن کا ہاتھ تھام لیا......اسے تھامنا ہی پڑا......کیونکہ اسے لگ رہا تھا کہ اسے آپا کو گھسیٹ کر اندر لے جانا پڑے گا۔

☆☆☆

ماہین ٹینس کھیلنے باہر گئی ہوئی تھی......اس کا آج کھیلنے کا موڈ نہیں تھا......ماہین اپنی طرف سے جتنا زور لگا سکتی تھی اس نے لگایا تھا بلکہ اسے حیرت تھی کہ آج صبح سے وہ کمرے میں بند ہے جبکہ اسے یہ یقین بھی تھا کہ جتنی دیر وہ کالج میں رہی اتنی دیر سفینہ نے پرنس سے فون پر باتیں کی ہوں گی۔ پرنس سے باتیں کرنے کے بعد تو اسے بہت خوشگوار موڈ میں نظر آنا چاہیے تھا......سفینہ، ماہین کے سامنے خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی......اس نے اپنے چہرے سے ماہین کو ہوا بھی لگنے نہ دی تھی کہ اس کی پرنس سے ابھی تک بات نہیں ہوئی......اس سے اگر وہ یہ کہتی کہ اس کی بات نہیں ہوئی تو ویسے ہی ماہین کو یقین نہیں آنا تھا کہ رات سے چکر چل رہا ہے اور ابھی تک بات نہیں ہوئی......وہ یہی سمجھی کہ اس کی چھیڑ خانی سے بچنے کے لیے وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ سفینہ نے اپنے طور پر کئی مرتبہ یہ کوشش کی تھی کہ وہ خود پرنس کو ڈائل کرے......لیکن جیسے ہی اسے یہ خیال آتا تھا کہ پرنس نے تو اس کا ٹائم ثوبان کی ماں کو دیا تھا......عجیب سا بوجھ دل پر آپڑتا تھا......وہ کیوں اسے فون کرے، وہ کیوں اسے بتائے رات سے اب تک وہ اس کے فون کا انتظار کر رہی ہے......پرنس کو خود فون کرنا چاہیے......اسے بتانا چاہیے کہ وہ رات کیوں اس سے بات نہیں کر سکا......اور وہ ثوبان کی ماں کو اس پر کیوں ترجیح دے رہا ہے۔
عیش و آرام میں پل بڑھ کر جوان ہونے والے کسی ذی نفس میں اعلیٰ درجے کی انسانیت کا وصف ہونا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ فطری نرم دلی ہونے کے باوجود بہت سے انسان شرفِ انسانیت کا شعور نہیں رکھتے......کوفت اٹھانے سے پہلے ہی ہر طرح کی سہولت میسر آنے سے زندگی میں بہت کمی سی رہ جاتی ہے......عیش و نشاط نفس کو مضبوط اور روح کو کمزور کرتے ہیں۔

عمر و تجربے کی کمی کے باعث بدگمانی جلدی غلبہ پالیتی ہے......منفی خیالات کی یلغار کے باوجود دل پرنس کو مجرم گردانے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا......نرم سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں فرشتوں کی سی معصومیت لیے آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔
اور اسی باعث اس نے بدگمان ہونے سے پہلے یہی سوچا تھا کہ لیڈی صوفیہ کی طبیعت اچانک خراب ہونے کا خطرہ تو ہر وقت ہی رہتا ہے......پرنس کے فون نہ کرنے کی واحد وجہ یہی ہو سکتی تھی مگر آپریٹر سے بات ہونے کے بعد عجیب سی ذہنی اذیت نے اسے آلیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ دل کھول کر رو دے......ماں نے اتنی احتیاط و محبت سے پرورش کی تھی کہ اسے یاد نہیں تھا کہ زندگی میں کبھی ایسا موقع آیا ہو کہ کسی کونے میں چھپ کر رونے کو جی چاہا ہو۔
مگر اس وقت تو بے کلی کے عذاب سے جان ہلکان ہو رہی تھی۔
شاید اب بھی اسے ادراک نہیں ہو رہا تھا کہ ''اسی کا نام محبت ہے۔''
اور انا کو رہن رکھے بغیر یہ سودا بنتا نہیں......!
زندگی ختم ہونے تک حساب چکتا نہیں......

☆☆☆

وسیع و عریض لاؤنج دیکھنے کے بعد عالیشان ڈرائنگ روم دیکھتے ہی آپا کے تو گویا اوسان جواب دینے لگے۔ صوفے پر بیٹھتے ہی ساحل کی طرف بدحواس ہو کر دیکھا تھا جو بڑے اعتماد و شاہانہ انداز میں ان کے ساتھ ہی بیٹھ چکا تھا۔
''بھیا......میری تو بولتی ہی بند ہو گئی ہے......ارے کہاں ہم، کہاں یہ......'' آپا نے ساڑی کے آنچل سے پیشانی پر چمکتا پسینہ پونچھنا شروع کر دیا۔

''آپ کا اسٹیٹس ان سے بڑا ہے اطمینان رکھیں...... آپ لڑکے والی ہیں اور لڑکا انہوں نے خود پسند کیا ہے۔'' ساحل نے تسلی دی۔

''ارے...... اتنے عیش و آرام میں پلی لڑکی ہمیں تو جوتے کی نوک پر رکھے گی' اپنی شرطوں پر رشتہ نبھائے گی...... اب بھی سوچ لو۔'' آپا کا احساسِ کمتری کسی صورت کم نہ ہوتا تھا...... کہاں ان کا بارہ فٹ چوڑا دس فٹ لمبا ڈرائنگ روم...... کہاں ان کے پورے گھر جتنا یہ عظیم الشان ڈرائنگ روم...... ان کی تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ تاجور سے بات کیا کریں گی۔

اسی وقت تاجور ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں...... سرمئی شیفون کی ساڑی' گھنے بالوں کا سادہ سا جوڑا...... ہونٹوں پر ہونٹوں ہی کی ہم رنگ چمک دار پیازی لپ اسٹک، کانوں میں ہیرے کے ٹاپس، گلے میں طلائی چین، سیدھے ہاتھ کی درمیانی انگلی میں صرف ایک عدد انگوٹھی تھی باقی انگلیاں خالی تھیں۔

ساحل تو تاجور کو دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا تھا۔ آپا نے بھی گھبرا کر تقلید کی۔

''السلام علیکم!......'' ساحل نے پہل کی تھی آپا کا سلام حلق میں پھنس گیا۔ بدحواسی میں انگلیاں یوں پیشانی پر رکھیں جیسے رنگروٹ اچانک سامنے آنے والے افسر کو سلیوٹ کرتا ہے۔

تاجور کی جہاں دیدہ نگاہوں نے آپا کی سادگی فوراً نوٹ کی تھی۔

''ارے آپ کھڑی کیوں ہوگئیں پلیز تشریف رکھیے۔'' تاجور نے آگے بڑھ کر آپا کے کندھے پر بڑی اپنائیت سے ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا آپا فوراً اچھے بچوں کے انداز میں بیٹھ گئیں۔

''آپ کی سسٹر تو بہت سیدھی سادی سی ہیں۔'' تاجور نے مقابل نشست پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔

''مہربانی ہے آپ کی...... اب آپ کے سامنے نہ شیخی مار سکتے ہیں نہ اپنے مرحومین پر نواب ہونے کا الزام دھر سکتے ہیں...... سات پشتوں نے پیسہ زیادہ نہیں دیکھا مگر اللہ نے عزت بہت دی۔''

آپا نے بدحواسی میں پورا پیراگراف پڑھ ڈالا...... اب ساحل نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھنے کے لیے جیب سے رومال نکالا۔

''interesting......'' تاجور نے معصوم سی آپا کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بے ساختہ کہا...... ساحل کی قدرے جان میں جان آئی۔

''آج کے زمانے میں بہت سی چیزیں آسانی سے مل جاتی ہیں مگر سچائی اور سادگی بہت مشکل سے نظر آتی ہے...... آپ سے مل کر بہت نہیں بہت زیادہ خوشی محسوس ہورہی ہے۔'' تاجور نے بھی صدقِ دل سے آپا کی سادگی کو سراہا...... بس یہ جملہ سنتے ہی آپا کے حواس بحال ہونے لگے۔ یعنی شہر کی رئیس عورت نے انہیں بھائی سمیت قبول کرلیا تھا۔

''لڑکی کو تو بلائیں...... رات سے بے چینی ہے کب صبح ہو اور لڑکی دیکھنے جائیں، ایک ہی ایک بھائی ہے...... اولاد کی طرح سنبھالا ہے...... درجنوں رشتے دیکھے ایک سے ایک حسین لڑکی...... مگر اس کی سمجھ میں کوئی نہ آئی...... ارے میں تو پریشان ہوگئی...... کیسے گھر بساؤں اس کا...... کون عرشِ معلیٰ سے اترے گی...... مگر وہ کہتے ہیں ناں کہ جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔'' آپا کی قینچی کی طرح چلتی زبان کو ایک دم بریک لگ گئے...... زارا ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی۔ آپا پر ایک نگاہ ڈال کر بے اختیار ساحل کی طرف دیکھا۔ نگاہیں چار ہوئیں...... ساحل کی نگاہ میں اتنی شرارت و معنی خیزی تھی کہ زارا نے گھبرا کر نظروں کا رخ موڑ کر دوبارہ آپا کی طرف کردیا...... جو کم عمر اور حسین دوشیزہ کو ٹکٹکی باندھ کر یوں دیکھ رہی تھیں گویا پلک جھپکنے پر جرمانہ عائد ہوجائے گا۔

(جاری ہے)

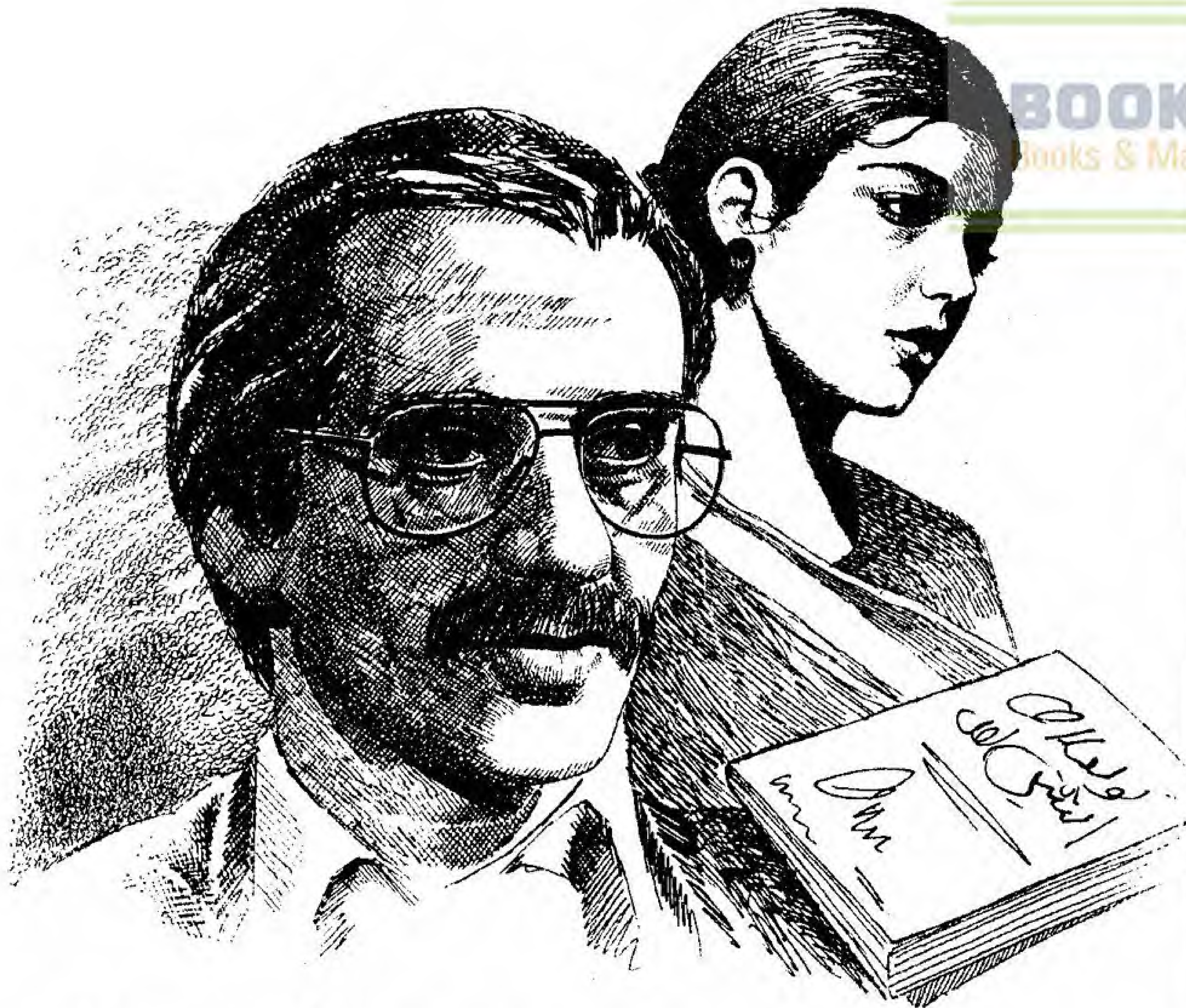
دانا دیوانہ

ناہید سلطانہ اختر

وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ میرے دفتر میں داخل ہوئے اور کمرے کی مشرقی دیوار کے ساتھ دھرے دو سنگل سیٹر صوفوں میں سے ایک پر ڈھیر ہوگئے۔

''میں اپنی پوتی کو لینے آیا ہوں۔'' ہانپتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''آپ کو پانی.. پلواؤں؟'' میں نے پہلے یہ پوچھنا ضروری سمجھا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔



''کس کلاس میں پڑھتی ہے آپ کی پوتی......؟''
میں نے پوچھا۔
''دسویں کا امتحان دینے آئی ہے۔''
''امتحان......؟'' میں چونکی...... ''مگر ہمارے ہاں تو امتحان نہیں ہو رہا۔''
''یہاں سینٹر بنا ہے اس کا۔'' ان کی سانس اب کچھ قابو میں تھی۔
''نہیں، نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے...... ہمارے ہاں کوئی سینٹر نہیں......'' میں نے کہا۔
''غلط فہمی آپ کو ہوئی ہے...... وہ یہیں امتحان دینے آئی ہے۔''
''جناب......! میں اس ادارے کی پرنسپل ہوں...... ہمارا ادارہ امتحانی مرکز ہی نہیں بنا تو آپ کی پوتی یہاں امتحان دینے کیسے آسکتی ہے۔''
وہ رونے لگے۔
میں پریشان ہوگئی۔
''میں آپ کو پاگل نظر آتا ہوں۔'' انہوں نے عینک اتار کر ایک ہاتھ میں لی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھنے لگے۔
''جی......'' میں نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔
''میری بہو نے بھیجا ہے مجھے اسے پک کرنے کے لیے صبح میرا بیٹا یہیں ڈراپ کر گیا تھا اسے۔'' انہوں نے پُریقین لہجے میں کہا۔
''میں نے عرض کیا ناں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمارا اسکول اس سال سینٹر ہی نہیں بنا۔''
''تو پھر میں کہاں جاؤں اسے لینے کے لیے؟''
مجھے ان کا یہ سوال بہت عجیب لگا۔ کیا بتاتی میں انہیں کہ وہ کہاں جائیں۔ وہ مسلسل رو رہے تھے...... بچوں کی طرح...... سسک سسک کر...... مجھے احساس ہوا کہ میرا واسطہ آج کسی فاتر العقل بڑے میاں سے پڑ گیا تھا۔
''محترمہ......! میرا نام چوہدری عبدالرشید ہے، ریٹائرڈ ڈی جی......'' انہوں نے ایک سرکاری محکمے کا نام لیا...... مجھے غلط بیانی لگی۔ اس عہدے کا افسر خواہ ریٹائرڈ ہی سہی نہ تو اتنی بے بسی سے رو سکتا تھا نہ ہی اتنی فاتر العقلی کا مظاہرہ کرسکتا تھا کہ میں انہیں بتا رہی تھی کہ ہمارا ادارہ امتحانی مرکز ہی نہیں بنا تھا اور وہ مصر تھے کہ ان کی پوتی یہیں امتحان دینے آئی تھی۔
''آپ غلط جگہ آگئے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''آپ بھی مجھے پاگل سمجھ رہی ہیں۔''
''جی......'' میں پھر چونکی۔ اس سے قبل بھی وہ اس سے ملتا جلتا جملہ ادا کر چکے تھے مگر اس بار جملے میں لفظ ''بھی'' کا اضافہ معنی خیز تھا۔
''آپ نے یہ بات دوسری مرتبہ کہی ہے...... میں پوچھ سکتی ہوں کیوں؟''
ان کے آنسو رک نہیں رہے تھے...... میرے سوال پر وہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگے۔ دفتر کے دروازے پر مامور نوجوان چپڑاسی باہر سے اندر جھانکنے لگا۔ ان کے رونے کی آواز اس تک بھی پہنچ گئی تھی۔ میں نے گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو کمرے میں طلب کیا اور اشارے سے اسے بڑے میاں کو پانی پلانے کی ہدایت کی...... پانی کا جگ اور گلاس کمرے ہی میں موجود تھے اس نے لپک کر گلاس میں پانی انڈیلا اور ان کے نزدیک جا کر انہیں پانی کا گلاس پیش کیا۔
''میں تمہیں پاگل نظر آتا ہوں۔'' وہ رونا بھول کر چپڑاسی کو غصے سے دیکھتے ہوئے بولے۔ وہ مجھے دیکھنے لگا۔
''ٹھیک ہے...... رہنے دو......'' میں نے کہا۔ چپڑاسی نے گلاس واپس رکھا اور انہیں حیران پریشان نظروں سے دیکھتا کمرے سے چلا گیا۔
''میری بہو اور اس کے بچے بھی یہی سمجھتے ہیں کہ میں پاگل ہوں بلکہ اب تو بیٹا بھی یہی سمجھنے لگا ہے۔'' وہ پھر رونے لگے۔ آنسوؤں کے ساتھ ان کی ناک بھی ٹپکنے لگی۔ میں نے سائڈ پر رکھا ٹشو پیپر باکس اٹھایا اور اپنی کرسی سے اٹھ کر اُن کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے دو ٹشو پیپر کھینچے اور انہیں تہ کیے بنا اپنے چہرے پر پھیرا۔
''دو بیٹوں کا باپ ہوں محترمہ......'' انہوں نے دونوں بیٹوں کے عہدے بتائے، دونوں اعلیٰ مراتب پر تھے...... ''ایک بیٹی بھی ہے، گورنمنٹ کالج کی پرنسپل...... شادی کی تھی اس کی مگر ناکام رہی، اکیلے زندگی گزاری ہے، ہاسٹل میں رہتی ہے۔ میں بڑے بیٹے کے ساتھ رہتا ہوں، چھوٹا بیٹا دوسرے شہر میں رہتا ہے۔ جس بیٹے کے ساتھ میں رہتا ہوں اس کی بیوی، بچے مجھے پاگل سمجھتے ہیں، بہو کہتی ہے بڈھا پاگل ہے، پوتے پوتیاں کہتے ہیں دادا پاگل ہیں، میں بیٹے سے شکایت کرتا ہوں تو پہلے تو وہ خاموش رہا کرتا تھا مگر اب وہ بھی مسکرا دیتا ہے۔ بہو کہتی ہے بڑے میاں کبھی لاہور بھی چلے جایا کریں۔ اپنے دوسرے بیٹے کے پاس...... کیوں جاؤں میں لاہور......؟ گھر تو میرا یہاں ہے، جس گھر میں بڑا بیٹا اور اس کی فیملی رہتی ہے، میرا گھر ہے، میں نے بنوایا تھا۔ پرانے وقتوں میں پچاس ساٹھ لاکھ لگ گیا تھا۔ اب تو سات آٹھ کروڑ کا ہے، بہو اور بچے چاہتے ہیں میں اس گھر سے چلا جاؤں بلکہ بیٹے کی مرضی بھی یہی لگتی ہے۔''
مجھے ان سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ میں بھول گئی کہ وہ اپنی پوتی کو امتحانی مرکز سے گھر واپس لے جانے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ انہیں اس کے پاس پہنچنا لازم تھا۔ شاید اپنے آنسوؤں کی روانی میں وہ خود بھی بھول گئے تھے۔
''تو آپ ان سے کہتے کیوں نہیں کہ کیوں چلا جاؤں گھر تو میرا ہے۔'' میں نے کہا۔
''نہیں کہہ سکتا۔''
''کیوں نہیں کہہ سکتے؟''
''گھر بڑے بیٹے کے نام کر چکا ہوں...... میں نے چھوٹے کو بھی اس کا حصہ دے دیا ہے اور بیٹی کو بھی...... اپنی زندگی ہی میں تینوں کو ان کا حصہ اس لیے دے دیا کہ میری موت کے بعد بھی تو انہی کو ملنا ہے اپنے ہاتھ سے ان کو دے جاؤں...... بیٹی کو تو خیر میری کسی چیز

کفایت شعاری

ڈاکٹر نے پوری تفصیل سے اس کا معائنہ کر کے نفی میں سر ہلایا اور کہا کہ وہ صرف چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ یہ حالات دیکھ کر اس نے اپنے جملہ عزیز ان کو اپنے گرد جمع کرلیا اور آخری سفر کی باتیں کرنے لگا۔ اس کے ایک بیٹے نے کہا۔ ''ابا جی ہم نے آج تک کسی کے باپ کو اتنا مشفق اور مہربان نہیں دیکھا جتنا آپ کو دیکھا ہے، ہم آپ کے بہت ہی احسان مند ہیں، اب چونکہ آپ آخری سفر کے لیے تیار بیٹھے ہیں، ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تجہیز و تکفین کا انتظام ایسے عظیم الشان طریقے پر کیا جائے جو اس سے قبل کسی اور شخص کو نصیب نہ ہوا ہو، آپ کے جنازے کے ساتھ کم از کم ایک سو کاریں عزیز و اقارب اور پھولوں سے لدی ہوئی ٹوکریاں ہوں گی۔''

دوسرے بیٹے نے کہا۔ ''ذرا ٹھہرو یہ تم کیا کہہ رہے ہو، معلوم ہوتا ہے کہ عقل کے ساتھ تم نے ہمیشہ کے لیے تعلقات بگاڑ لیے ہیں، پاگلوں کی طرح باتیں مت کرو، کسی ڈھنگ سے چلنے کی کوشش کرو، تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ابا جی نے کتنی محنت اور مشقت سے دولت جمع کی ہے لیکن تم اسے صرف جنازے کے اہتمام میں ہی اُڑا دینا چاہتے ہو، میں کہتا ہوں صرف چار کاریں اور چند ایک احباب کافی ہوں گے۔''

منجھلے نے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے تم دونوں کا دماغ ٹھیک نہیں رہا، ایک کار ہی کافی ہے۔''

سب سے چھوٹا بولا۔ ''میرے خیال میں تو ایک کار کی بھی ضرورت نہیں۔'' یہ دیکھ کر مرنے والے نے کہا۔ ''ابھی وقت کافی ہے ذرا میرا کفن وغیرہ ادھر لے آؤ۔ میں قبرستان کو پیدل ہی چلا جاؤں گا۔''

مرسلہ: سمیرا عنایت، منڈی بہاء الدین

سے دلچسپی نہیں تھی...... اس کے لیے تو اس کی ناکام ازدواجی زندگی کا دکھ ہی بہت ہے مگر میں نے اسے بھی اس کا حصہ دیا۔''

''چھوٹے بیٹے کا کیا حال ہے؟'' مجھے تجسس ہوا۔

''خوش ہے، مست ہے اپنی زندگی میں، اپنے بیوی بچوں کے ساتھ۔''

''آپ کا خیال کرتے ہیں وہ؟''

''کبھی نہیں......''

''ایسے بیٹوں کو تو آپ کو کچھ بھی نہیں دینا چاہیے تھا۔'' مجھے اس بوڑھے آدمی کی کہانی یاد آنے لگی جس نے آخر عمر بیٹے، بہو سے اپنی خدمت کروانے کو ایک بھاری صندوق اپنے پلنگ کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ بیٹا، بہو سمجھتے اس صندوق میں بوڑھے باپ نے خزانہ جمع کر کے رکھا ہوا ہے سو اس کی خوب تندہی سے خدمت کرتے کہ مرنے کے بعد اس کا خزانہ ہاتھ آنے کی امید بھی بڈھے کے مرتے ہی انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ صندوق کو لگا قفل توڑا۔ صندوق کے اندر بھاری اینٹیں دھری تھیں۔

''آپ کو میں پاگل دکھائی دیتا ہوں۔''

ان سے بے تکلفی ہوتی تو میں یہی کہتی......

''آپ ایک اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہونے کے باوجود پاگل ہیں، آپ سے اچھا تو وہ بوڑھا ٹھہرا جو صندوق میں اینٹیں بھر کر بہو بیٹے سے خدمت لے گیا۔''

''میں آپ کی جگہ ہوتی تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دیتی ایسی اولاد کو......'' میں نے اپنے دل کی بات دل میں رکھتے ہوئے ان سے کہا۔

''اچھا ہے کہ آپ میری جگہ نہ ہوئیں ورنہ آپ کو بھی یہی سننا پڑتا۔''

''کیا......؟''

''بڈھا پاگل ہے...... ویسے ایمانداری سے بتائیں کیا میں واقعی پاگل دکھائی دیتا ہوں؟'' انہوں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا اور گھبرا کر بولے۔ ''لاحول ولاقوۃ بچی کو لینا تو بھول ہی گیا...... پرچہ تو ختم ہوگیا ہوگا؟''

میں نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''جی ہاں، بارہ بجے پرچہ ختم ہوجاتا ہے اب تو بارہ بیس ہونے والے ہیں۔''

''آپ فرماتی ہیں کہ آپ کا ادارہ امتحانی مرکز ہی نہیں بنا تو پھر میں اسے لینے کے لیے کہاں جاؤں؟'' وہ نہایت فکرمند دکھائی دینے لگے۔

''یہ تو آپ اپنی بہو سے پوچھیے جنہوں نے آپ کو بچی کو لینے کے لیے بھیجا ہے یا پھر اپنے بیٹے سے پوچھیے کہ صبح انہوں نے بچی کو کس سینٹر پر چھوڑا تھا۔''

''وہ تو یہی کہیں گے بڈھا پاگل ہے...... ایسا کریں اپنے کسی آدمی کو باہر گیٹ پر بھیجیں سفید رنگ کی گاڑی میں ٹوپی والا ڈرائیور بیٹھا ہوگا اسے بلا لائے۔ شاید وہ بتا سکے کہ میں غلط ہوں یا آپ......''

میں نے گھنٹی بجا کر اپنے چپڑاسی کو بلایا اور اسے مذکورہ شخص کو بلا لانے کی ہدایت کی۔

''لیکن میاں یہ خیال رہے کہ تم کسی دوسری گاڑی کے ڈرائیور کو نہ بلا لاؤ۔'' انہوں نے میرے چپڑاسی سے کہا۔ وہ مسکرا دیا۔

''میں تمہیں پاگل لگتا ہوں۔'' وہ نہایت غصے سے اسے گھورتے ہوئے بولے۔ میں نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھایا کہ وہ جائے اور وہ کرے جو اس سے کہا گیا تھا۔

ڈرائیور آگیا۔

''ہاں بھئی رحیم داد، محترمہ کو بتاؤ کہ تمہاری بیگم صاحبہ نے فروا کو کہاں سے پک کرنے کو کہا تھا۔''

''چوکی کے نزدیک والے اسکول سے۔''

''چوکی کے نزدیک ایک نہیں دو اسکول ہیں۔''

''یہ میرے کو نہیں معلوم جی...... صاب نے بولا اِدھر گاڑی روکو میں نے رکا دی جی۔''

''میں تمہیں پاگل دکھائی دیتا ہوں۔'' وہ ڈرائیور پر بھبکے۔

''توبہ بڑے چوہدری صاب......'' ڈرائیور نے

کانوں کا ہاتھ لگایا۔

''میرا خیال ہے آپ کی پوتی ہمارے ساتھ والے اسکول میں امتحان دینے آئی ہوگی۔''

''بڑے صاب بیگم صاب کو فون کر کے پوچھ لو جی۔'' ڈرائیور دبی زبان سے بولا۔

''جواب معلوم ہے ناں بیگم صاحبہ کا۔'' انہوں نے ڈرائیور پر آنکھیں نکالیں۔

''ہاں جی...... وہ تو میرے کو معلوم ہے۔''

وہ صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''چلو دوسرے اسکول چلتے ہیں۔'' انہوں نے ڈرائیور سے کہا پھر روئے سخن میری طرف کیا۔ ''معاف کیجیے گا محترمہ آپ کو تکلیف دی۔''

''کوئی بات نہیں......''

''میں آپ کو اپنی کتاب بھجواؤں گا۔ یہ رحیم داد آپ کو دے جائے گا ایک سیٹ آپ کے لیے ہوگا، ایک آپ کی اسکول لائبریری کے لیے...... لائبریری تو ہوگی آپ کے ادارے میں؟''

''جی ہاں......''

''گڈ......! افسوس کہ ہمارے ہاں لوگوں میں کتاب بینی کا شوق ہی نہیں رہا۔ ترقی یافتہ ملکوں میں جسے دیکھیے کتاب کا بھوکا، علم کا پیاسا......''

''صاب میں جاؤں......؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''کہاں جاؤں، میں بھی چل رہا ہوں...... اچھا محترمہ......''

''شکریہ......'' میں احتراماً اپنا دایاں ہاتھ پیشانی تک لے گئی۔

''میرے لیے دعا کیجیے گا۔''

''انشاءاللہ......!''

''ویسے...... کیا میں آپ کو واقعی پاگل دکھائی دیتا ہوں؟''

''آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔''

''سن لو......'' انہوں نے ڈرائیور سے کہا۔ ''اپنی بیگم صاحبہ کو کسی بھلے وقت میں بتانا کہ جس بوڑھے آدمی کو تم اور تمہارے بچے پاگل کہتے ہو اسے پڑھے لوگ اچھا آدمی کہتے ہیں۔''

وہ رخصت ہوئے مگر اپنی آنکھوں سے زار و قطار بہتے آنسوؤں کی یاد چھوڑ گئے۔

☆☆☆

کافی دن گزر گئے۔ میں اپنی شبانہ روز بھاگ دوڑ میں ان کی آمد، غیر حاضر دماغی، بیٹوں اور بہوؤں کی بابت ان کا شکوہ اور آنسو بھول گئی۔

ایک صبح میرے دفتر کے دروازے پر ایک شخص اپنے ہاتھوں میں علیحدہ، علیحدہ دو بنڈل لیے وارد ہوا۔

''سلامالیکم میڈم......''

اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے میں نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے یہ یاد کرنے کی کوشش کی کہ میں نے اسے پہلے کہاں دیکھا تھا...... مجھے یاد آنے تک وہ میری میز کے نزدیک پہنچ کر دونوں بنڈل میز پر رکھ چکا تھا۔

''میڈم میں چوہدری صاب کے گھر سے آیا ہوں، آپ کو یاد ہوگا بڑے چوہدری صاب غلطی سے بچی کو لینے واسطے آپ کے اسکول آ گئے تھے۔''

''ہاں، ہاں مجھے یاد ہے۔''

''اس میں سے ایک بنڈل آپ کی اپنی ذات واسطے دوسرا اسکول واسطے ہے۔ آپ رسید دے دو گے جی مجھے۔''

''ایک منٹ......'' میں نے قلمدان سے قلم نکالا اور نوٹ پیڈ پر شکریہ کے ساتھ رسید لکھ دی۔

''مہربانی......''

''چوہدری صاحب کو میرا اسلام کہنا...... ٹھیک تو ہیں ناں؟''

''چلے گئے جی......'' وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔

''کہاں......؟'' میں نے سوال کیا اور جواب ملنے سے بیشتر ہی قیاس سا کہا۔ ''لاہور چھوٹے بیٹے کے پاس؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے بولا۔ ''فوت ہو گئے جی......''

''کب......؟'' میں چونکی۔

"مہینہ ہوگیا جی......"

"کیا ہوا تھا؟ کچھ بیمار ہوگئے تھے؟"

"نہ جی......بس سوتے ہی رہ گئے......اچھا ہوا جو بیمار نہیں ہوئے کس نے کرنی تھی ان کی دیکھ بھال......"

"مسئلہ کیا تھا ان کے ساتھ؟ کیا واقعی دماغی توازن کچھ خراب تھا ان کا؟"

"نہ جی نہ......وڈے عقل والے بندے تھے......اولاد اچھی نہیں دی رب سوہنے نے......بہت ستاتے تھے گھر والے انہیں......کھانا صرف ایک وقت دیتے تھے انہیں۔"

"کیوں......؟"

"بس......گھر اُن کا تھا ساری چیزیں اناں (انہی) کی تھیں پھر بھی کھانا انہیں ایک وقت دیتے تھے۔"

"انہیں تو پنشن ملتی ہوگی۔"

"ہاں جی...... پہلی تریخ (تاریخ) بیگم صاب اناں دے نال بینک جا کے لے لیندی سی......دوسری بہو اور بیٹے سے بولتی تھی اساں بڈھے کو رکھتے ہیں پنشن اساں لینی ہے۔"

"دوسرا بیٹا بہو کیوں نہیں لے جاتے تھے انہیں اپنے ساتھ؟"

"میڈم جی یہ بڑے لوگ ہیں، خود غرض تے سیانے...... بڑی بہو اور اس کے بچے بولتے تھے بڈھا پاگل ہے......چھوٹی بہو بولتی تھی، بڈھا گندا ہے کھنگ بہت کردا ہے......توبہ......توبہ......" اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "ایس تراں دی اولاد رب سوہنا کسی دشمن کو وی نہ دیوے......میڈم جی! ان امیر فیشنی لوگوں سے اسی گریب (غریب) اچھے......راتی ڈیوٹی توں واپس گھر مڑ کے جب تک میں ماں تے ابا جی کو گھنٹا، گھنٹا دبا نہ لوں تاں جی میں اپنے بستر تے ہی نہیں جاتا۔"

"یہ بنڈل کس نے بھجوائے؟"

"او آپی بندھ کے چھوڑ گئے تھے جی......بیگم صاب نے ویکھیا تے مجھے بولیا رحیم داد کسی روز پہنچا دیویں......خبرے بڈھا کس، کس نوں کتاباں ونڈ داسی۔" (معلوم نہیں بڈھا کس، کس کو کتابیں بانٹتا ہے)

"خدا ان کی مغفرت کرے......" میں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

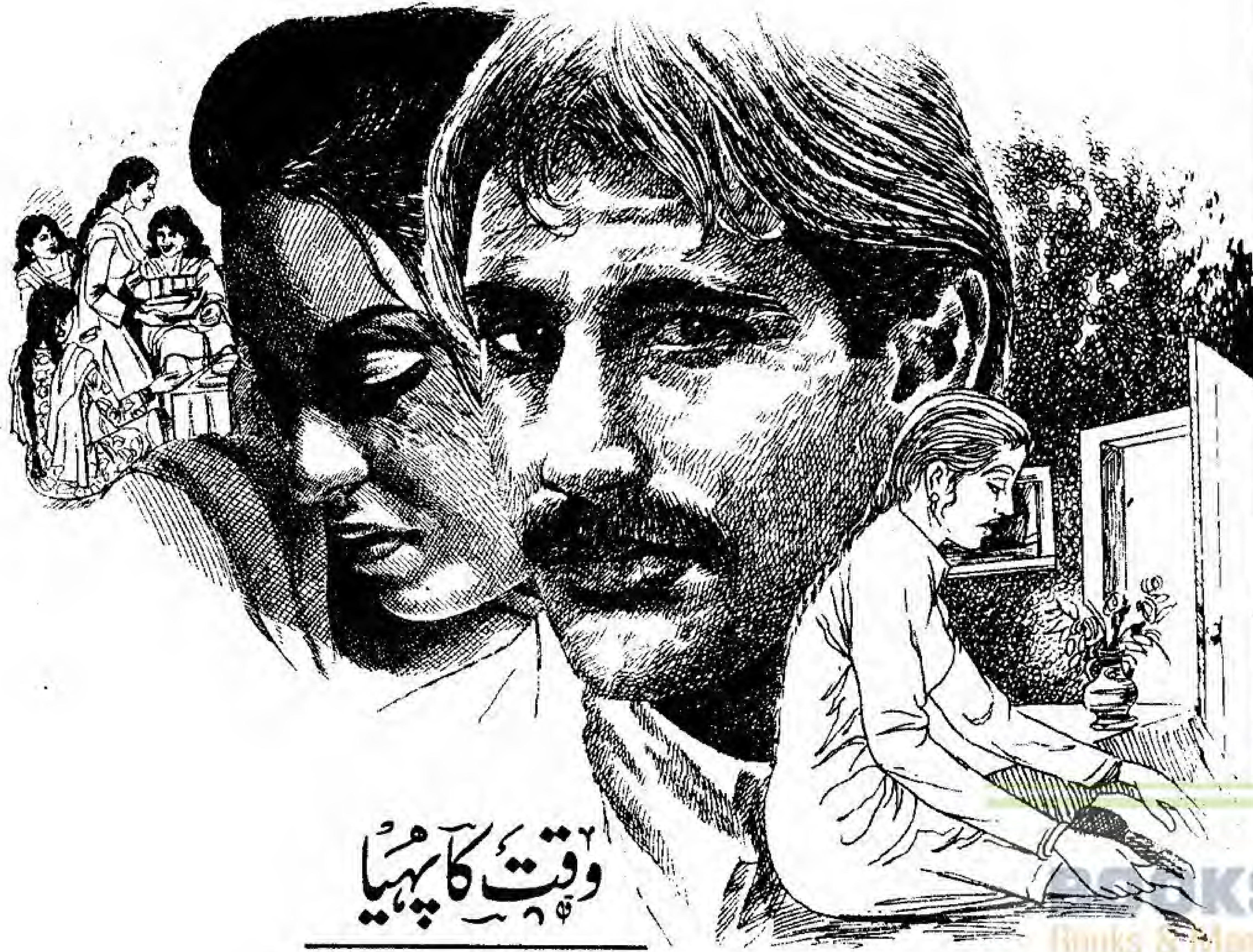
"سلاما لیکم......" آنے والے نے اجازت چاہی۔

میں نے بیگ سے ایک نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔

"نہ جی نہ......بالکل نہیں...... کسے قیمت تے نہیں......" وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور مجھے اپنی عنایت پر شرمندہ و پشیمان چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

ہر بنڈل میں ایک ہی تصنیف کی تین، تین جلدیں تھیں۔ عنوان سے ظاہر تھا کہ وہ کوئی تحقیقی تصنیف تھی......لائبریری والا بنڈل میں نے لائبریرین کے حوالے کر دیا۔ میرا ذاتی بنڈل بہت دنوں میرے سائڈ ریک کے نچلے حصے میں رکھا رہا۔ تعطیلات شروع ہوئیں تو ایک دن میں نے ایک جلد اٹھائی اور سرسری سی ورق گردانی شروع کر دی۔ تصنیف غیر معمولی محسوس ہوئی۔ دفتر سے گھر جاتے ہوئے ایک جلد اٹھا لائی۔ رات کو پڑھنا شروع کی اور ضخیم تصنیف دو دن میں ختم کرنے پر مجبور ہوئی۔ کیا معلوماتی تصنیف تھی، مصنف چوہدری عبدالرشید کے دیباچے کے مطابق ان کی تیس سالہ علمی تحقیق کا حاصل، الفاظ کا چناؤ، بیان، تسلسل...کوئی پہلو تشنہ نہ تھا، اس پائے کا تحقیقی کام کر جانے والا شخص اپنی ذاتی زندگی میں اپنے انتہائی قریبی رشتوں کے ہاتھوں آخرِ عمر کس کرب سے دوچار رہا تھا۔

ایک مختصر سی پہلی اور اتفاقی ملاقات میں ان کا زار و قطار رونا اور بار، بار یہ کہنا۔ "کیا میں آپ کو پاگل دکھائی دیتا ہوں۔" ان کی تصنیف کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے بار، بار یاد آتا رہا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہوئی کہ وہ اولاد جس کے لیے ماں تو جو صعوبت اٹھاتی اور قربانیاں دیتی ہی ہے باپ بھی پیچھے نہیں رہتا اتنی خود غرض، بدتمیز اور سفاک کیوں ہو جاتی ہے کہ ایک اچھا بھلا، عالم فاضل اور اعلیٰ مرتبے سے سبکدوش ہونے والا شخص آخر عمر دانا سے دیوانہ ہونے کے شش و پنج کا شکار ہو جاتا ہے۔



وقت کا پہیا

طیبہ عنصر مغل

اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا، سر چکرا رہا تھا...... وہ مسلسل کام نبٹانے کی کوشش میں مصروف تھی لیکن کام تھے کہ نبٹ نہیں پا رہے تھے، عید کی وجہ سے میڈ بھی چھٹی پر تھی۔

"رانیہ! اب بس کرو یار، تم صبح سے اتنی مصروف ہو، عید کا دن ہے اگر طبیعت خدانخواستہ بگڑ گئی تو ڈاکٹر بھی دستیاب نہیں ہوگا۔" احمد نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔ اس کے پیلے پڑتے چہرے کو دیکھ کر انہوں نے جلدی سے کچن ٹیبل کی کرسی کو گھسیٹ کر اسے زبردستی بٹھا دیا۔ وہ ارے، ارے، ہی کرتی رہ گئی۔

"تم یہاں بیٹھو، میں باقی کا کام کرتا ہوں، بس تم بتاتی جاؤ۔" احمد نے نئے پہنے ہوئے کرتے کی آستین کو جلدی سے فولڈ کرتے ہوئے کہا۔

"پلیز! یہ نہ کیجیے گا، کھانا الگ خراب ہوگا اور

کپڑوں کا ستیاناس تو پکا ہے۔ بس اب تھوڑا کام باقی ہے۔ میں کرلوں گی آپ جاکر ٹی وی دیکھیں۔'' رانیہ نے احمد کو بیڈ روم کی طرف دھکیلا تو وہ بادلِ ناخواستہ بیڈ روم کی جانب بڑھ گئے۔

کھانا تقریباً تیار تھا، وہ نڈھال ہوکر چاول... دم پر رکھ کر لاؤنج کے صوفے پر آکر پانی کا گلاس غٹاغٹ خالی کرگئی۔ تھکن سے نڈھال تھی، پیروں میں کھڑے رہنے سے شدید درد ہورہا تھا۔ پانی کے خالی گلاس پر نظریں گاڑے مزید پانی کی طلب کے باوجود اٹھنے کی ہمت نہ تھی۔ آنکھوں کے آگے کچھ مناظر فلم کی طرح چلنے لگے۔

''ماہم بیٹا! ذرا پانی تو پلا دو چندا......''

''جی ماما۔'' اور دو منٹ تو کیا لمحوں میں ہاتھوں میں گلاس لیے ماہم اس کے قریب کھڑی ہوتی۔ اگلے منظر میں ماہم ایک ہاتھ سے سلیقے سے اس کی روزانہ کی دوائیں اور دوسرے ہاتھ میں پانی لیے کھڑی ہوتی، وہ اٹھنے میں سستی کرتی یا کبھی بیٹھ نہ پاتی تو ماہم اس کے سر کے نیچے یوں ہاتھ رکھتی جیسے بچپن کے دنوں میں ماہم کو رانیہ دوا دینے کے لیے کرتی تھی۔

پیروں سے اٹھتی ٹیس نے یہ منظر دھندلا کردیا تو اس کی نظر اپنے بے تحاشا سوجے ہوئے پاؤں کی طرف اٹھ گئی۔ بے ساختہ دھیان ماہم سے ہٹ کر نینا کی طرف بھٹک گیا۔

''افوہ......! ماں یار......! تم بھی ناں، ہزار بار کہا ہے شوگر ہے، شوگر تمہیں، کھیر کو دیکھ کر آپے سے باہر مت ہوجایا کرو......'' یہ رانیہ کی کوئی دیورانی' جیٹھانی یا دوست سمجھے آپ......جی نہیں، ہرگز نہیں یہ رانیہ کی لیے تو دوست ہی لیکن دراصل یہ بہت زیادہ فری دوست رانیہ کی چھوٹی بیٹی ہے......نینا احمد......اور نینا کی اس عادت سے احد کو بہت چڑ تھی۔ احد، رانیہ کا بے حد پیارا بیٹا جو اس کے دل کے بہت قریب تھا۔ اب جوان ہوگیا تھا لیکن دیگ کی کھرچن تھی اب بھی ماں کی گود پہ قبضہ جمائے رہتا تھا۔

رانیہ کی بڑی بیٹی ماہم بہت دھیمے مزاج اور معصوم سی مسکراہٹ والی کم گو سی... تھی لیکن وہیں نینا اس کے گھر کی بلبل تھی' ہر طرف چہچہاتی پھرتی......اپنی بات دھونس...... زبردستی سے بھی منوالیتی یہ اور بات کہ احمد نے تینوں بچوں کے درمیان ایک توازن رکھا تھا۔ ان کی ضروریات سے خواہشات تک میں کسی قسم کی ناانصافی نہیں ہوتی تھی۔ احد اور نینا کے پیار بھرے جھگڑے اور ماہم کی ان کے درمیان صلح صفائیاں گھر کی رونق تھیں۔

''اُف یار ماں! پاؤں آگے کرو میں زیتون کے تیل سے مالش کردوں۔ (نینا، رانیہ کی ڈاکٹر بیٹی جو ابھی مکمل ڈاکٹر نہیں بنی تھی) ابھی درد یوں غائب ہوجائے گا۔'' اس نے مسکاتی آنکھوں سے ماں کو دیکھا۔ لاشعوری طور پر رانیہ نے پاؤں آگے کیے تو سینٹر ٹیبل سے ٹکرا کر پاؤں اسے ہوش کی دنیا میں واپس لائے۔ نینا تو اس کے آس پاس کہیں نہ تھی۔

اداسی نے اس کو گھیرا لیکن وہ یہ سوچ کے مسکرا دی کہ آج نینا نے ہی نہیں ماہم نے بھی اس کے پاس ہونا تھا۔ آج بہت دن بعد بچوں نے اکٹھا ہونا تھا ماں کے گھر......اس بار کی عید کتنی سعید تھی کہ رانیہ کا گھر آنگن ایک بار پھر مہکے گا ماہم کے وجود سے......نینا کی چہچہاہٹ سے اور احد کی چھیڑ خانیوں سے۔

ماہم کی شادی تو اس کے بیس سال مکمل ہوتے ہی احمد نے اپنے دوست کے بیٹے شہروز سے کردی تھی۔ اور کم وبیش اتنی ہی عمر میں نینا کی شادی عالیان سے ہوگئی تھی۔ اور احد کی شادی سال بھر پہلے حیا کے ساتھ خوب دھوم دھام سے انجام پائی تھی۔ ماہم کی سسرال بہت بڑی تھی سب جوائنٹ فیملی میں رہ رہے تھے، اس لیے ماہم بہت مصروف زندگی گزار رہی تھی۔ نینا شادی کے بعد بیرونِ ملک شفٹ ہوگئی تھی۔ عالیان اور نینا دونوں ہی اسپیشلائزیشن میں بھی مصروف تھے۔ سالوں سے اس کی کھری کھوٹی سننے کو رانیہ ترس گئی تھی۔ بہو اچھی تھی لیکن کم گو تھی اور ابھی سب میں گھل مل نہیں پائی تھی۔

''رانی کیا چاولوں کے کباب بنانے ہیں یا چولہا بند کردوں۔'' احمد کی آواز پہ وہ خیالات سے چونکی۔

''اوہ میں ابھی بند کردیتی ہوں۔'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو درد سے سسکی نکل گئی۔

''بیٹھی رہو......میں نے بند کردیا ہے، میں ذرا دوستوں سے مل کر آتا ہوں، احد ابھی آجائے گا اس کا فون آیا تھا وہ سسرال میں رات کو نہیں رکے گا کیونکہ اسے پتا ہے نینا...نے بھی اس عید پر آنا ہے، تم بھی اٹھ کر فریش ہولو ورنہ وہ تمہاری کٹ کھنی بلی نینا لازمی میرے سر ہوگی کہ آپ میری اس بونگی اماں کا خیال نہیں رکھتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، آپ خیر سے جائیں، میں ذرا دم لے لوں پھر فریش ہوتی ہوں۔'' احمد نے مسکرا کر دیکھا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

زندگی کیسے دبے پاؤں گزر جاتی ہے۔ اس کا احساس تب ہوتا ہے جب ہم زندگی کو کبھی فرصت میں بیٹھ کر سوچیں تو معلوم ہوتا ہے زیست تو مٹھی میں دبی ریت تھی جو پل، پل سرکتی چلی گئی۔

کل کی بات لگتی تھی ماہم کی پیدائش پھر نینا اور احد کا جنم لینا سسرال کی ذمے داریوں کے ساتھ، ساتھ بچوں کی تربیت کا ایک، ایک پل ہر روز ایک نئی کسوٹی تھا۔ کتنی تیزی سے بھاگتی رہیں گھڑی کی سوئیاں اور اسی کے ساتھ رانیہ کی زندگی......کب رانیہ کے بال سنوارتے ہاتھوں نے بچیوں کو اتنا بڑا کردیا کہ پھر اس کے بالوں کو بیٹیوں کے ہاتھ سلجھانے لگے۔ وہ بیمار رہنے لگی تو بازار میں بچوں کے کھوجانے کے ڈر سے ان کی ننھی منی ہتھیلیوں کو اپنے ہاتھوں میں دبائے رکھنے والی رانیہ کو تینوں بچوں نے اپنے بازوؤں کا سہارا دینا شروع کردیا۔

وہ اٹھ کر کچن میں آئی تو سلاد کے لیے چیزیں کاؤنٹر پر رکھنے لگی۔ سر چکرا رہا تھا، مایوسی سی مایوسی تھی۔ دل گرفتگی کا یہ عالم تھا کہ بے تحاشا رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ ابھی اس نے کھیرا چھیل کر رکھا ہی تھا کہ اسے زور کا چکر آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ تیورا کر گرجاتی دو نرم و نازک ہاتھوں نے اس کو سہارا دے دیا۔

وہ لاؤنج میں بیٹھی منتظر تھی کہ پہلے کون سا بچہ آتا ہے۔ پوری امید تھی کہ ماہم سب سے پہلے آئے گی وہ تو بے حد قریب ہی رہتی تھی اور سچ میں اسی لمحے ماہم دروازہ کھول کر اندر آئی اور عید مبارک کہتی ماں کی جانب بڑھی......رانیہ نے دونوں بازو وا کردیے اور ماہم نے ماں کے سینے میں منہ چھپالیا۔ ماہم اس دم بالکل پہلے ہی والی ماہم لگ رہی تھی۔ رانیہ کی بے چین ممتا کو عجیب سا سکون ملا......بیٹی کو مل کر اسے احساس ہوا شہروز ساتھ نہیں ہے۔

''ماہم شہروز نہیں آئے بیٹا......''

''مام وہ ساری فیملی اکٹھی ہوئی تھی اور میں بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی ہوں۔ آپ کو تو پتا ہے۔ دوسرے شہروں سے میری نندیں اور شہروز کی خالائیں، پھپو آئی ہیں تو میں بھی صرف عید ہی ملنے آسکتی ہوں، ہر بار کی طرح......''

''لیکن ماہو! تمہیں معلوم ہے ناں اس بار نینا بھی امریکا سے آئی ہوئی ہے......اور یہ طے ہوگیا تھا کہ تم اس بار عید اس طرف ہی کروگی اتنے سالوں بعد میں اپنے بچوں کو اکٹھا ہوتے دیکھوں گی۔'' رانیہ کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی تلخی بھر گئی۔

''مام آپ ناراض نہ ہوں، آپ تو میری مجبوری جانتی ہیں ناں...... مجھے سب سے اچھے طریقے سے سمجھتی ہیں، پلیز مام......'' وہ رانیہ کو منا رہی تھی یا شاید سمجھا رہی تھی۔

''لیکن کم از کم کھانا تو اکٹھے کھالو......'' رانیہ نے سرد آہ بھری اور تھکے، تھکے لہجے میں اسے تجویز دی یا درخواست کی۔

''نہیں مام......! یہاں کھالیا تو وہاں کا کام کون دیکھے گا......اور مجھے تو آج اور بھی جلدی جانا ہے اس بار میری دونوں دیورانیاں بھی اپنے میکے چلی گئی ہیں کل ہی......'' اس نے چپکے سے آنکھ کے گوشوں میں اٹکے آنسوؤں کو اندر دھکیلا......رانیہ کے دل کو کچھ ہوا لیکن دیکھے کو ان دیکھا کرنے والی مائیں ہی اپنی بیٹیوں کا گھر بسا سکتی ہیں۔ ماہم کو تو یہ ورثے میں ملا تھا۔ بیٹی کی اس بات نے اسے ماضی کے ایک دن میں پہنچا دیا تھا۔

لیں امی ایک قرض تو وقت نے چکا دیا۔

''رانیہ بیٹا، ثمینہ بھی آرہی ہے اور روزینہ بھی اِدھر ہی ہے ابھی بھائی بھی آجائے گا۔ اس بار میری چندا کھانا اکٹھے ہمارے ساتھ کھالو' پتا نہیں اگلی عید پہ میں رہوں یا نہ رہوں۔'' جمیلہ بیگم نے اپنی بیٹی رانیہ کو محبت پاش نظروں سے دیکھا۔

''اماں نہیں رک سکتی میں' گھر میں ساس، سسر اکیلے ہیں، میں نے ان کے ساتھ کھانا نہ کھایا تو وہ لوگ کیسے کھائیں گے۔''

''اے لو......! رانیہ جب سے تمہاری شادی ہوئی ہے، ایک عید بھی ہمارے سنگ نہیں کی ہے تم نے اور وہ تمہارے جیٹھ اور دیوران کی بیویاں کدھر ہیں؟'' اماں کو غصہ ہی آگیا۔

''اماں وہ سب تو خود غرض ہیں۔ اپنے، اپنے میکے چل دیں تو احمد کی امی نے مجھے چلتے ہوئے کہا تھا بیٹا تم لوٹ آنا، ہر بار کی طرح' میں واپس جاؤں گی اماں......'' اماں نے منہ نیچے کرلیا ان کے سفید براق کپڑوں پر دھرے ان کے سانولے کمزور ہاتھوں پر آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ رانیہ نے مدد طلب نظروں سے ابا کو دیکھا۔

''ارے جمیلہ بیگم! ہمارے تو باقی بچے ہمارے پاس ہیں ناں اسے جانے دیں۔ اس کے فرائض میں ہے احمد کے والدین کا خیال رکھنا۔'' پھر اماں نے اسے گلے لگایا اور اجازت دی۔

''جاؤ بچہ اللہ کی امان میں، سدا آباد رہو۔'' قدم دماغ کے حکم پر آگے بڑھ رہے تھے لیکن دل کی ضد تھی کہ رک جاؤ شاید یہ وقت...... یہ گھڑی انمول ہے......لیکن رانیہ نے دل کی نادانی پہ کان نہ دھرے اور لوٹ آئی۔ گھر میں گھسی تو ساس' سسر کھانا کھا چکے تھے۔ بڑی نند آئی ہوئی تھیں۔ رانیہ کے بنائے کھانے مزے سے کھا کر اب سب خوش باش گپ شپ کر رہے تھے۔ اس نے بھی دل کا درد چھپا کر چہرے پر خیر مقدی مسکراہٹ سجالی اور نند سے گلے ملی۔

''ارے آپی میں آکر سب کو کھانا کھلا دیتی آپ کیا آکر جھمیلوں میں پڑ گئیں......'' اس نے پست سے لہجے میں شرمندگی سے نند کو کہا۔

''ارے بھابی بیگم ہم نے کہا آپ بھی کہاں آئیں گی میکے سے اتنی جلدی' ہم کیوں بوڑھے والدین کو بھوکا بٹھائیں۔ مجھ سے تو دیکھا نہیں گیا۔ ذمے داری نبھانا سیکھو بھاوج۔''

اور رانیہ اپنی ساس کو دیکھ کر رہ گئی کہ شاید وہ ہی کچھ انصاف کر دیں کہ سارا کام کر کرا کے آدھے گھنٹے میں وہ میکے جا کر واپس بھی آگئی تو اس میں غیر ذمے داری کہاں تھی۔ لیکن وہاں تو لفظ کیا بولتے چہرے پر بیچارگی کے ایسے آثار تھے جیسے سب سے زیادہ ظالم بہو رانیہ ہی تو تھی۔

اور پھر وہی ہوا اگلی عید پہ رانیہ کے میکے سے بلانے والی ہستی کا فون ہی نہ آیا۔ اتنی ناراضی تو ساس بھی نہ دکھاتی جتنی اماں دکھا گئی تھیں۔ وہ الوداعی بوسے آج بھی رانیہ کا ماتھا نہیں آنکھیں گیلی کر جاتے تھے۔

جانے کب ماہم واش روم گئی اور واپس آکر سامنے صوفے پر بیٹھی تو میز پر رکھے ٹشو پیپر کے ڈبے کو نظر انداز کر کے پرس سے رومال نکال کر منہ کو خشک کرنے لگی۔ تب رانیہ کو وہ بہت پرائی لگی۔ پرائے گھر کا ٹشو جو بچارہی تھی۔ وہ تو رومال استعمال ہی نہیں کرتی تھی۔

''ٹھیک ہے ماہم میری لاڈلی! تم اپنے گھر میں آباد رہو جیسے تمہیں آسانی ہو۔'' رانیہ نے دل پر پتھر دھر کر ماہم سے نظر ملائے بغیر کہا۔

''لو یو مام......! آپ بہت انڈر اسٹینڈنگ ہیں۔'' اس نے چٹ' چٹ ماں کے بوسے لیے۔ رانیہ نے جواباً اسے پیار کیا تو وہ اپنا پرس اٹھا کر چل دی۔ آج رانیہ اس کو دروازے تک رخصت کرنے نہ جا سکی اور جلدی میں ماہم کو اندازہ بھی نہ ہو سکا کہ ماما اس کو رخصت کرنے دروازے پر کیوں نہیں آئی ہیں؟

چھوٹی عمر سے کچن سنبھالنے والی ماہم جو ماں کو کچن میں داخل بھی نہ ہونے دیتی تھی، آج پوچھا نہیں

کہ ماں نے کیسے پکایا ہوگا سب کچھ......؟ روزانہ رات کو اور صبح کو دوا دینے والی کو عرصہ ہوا یہ پوچھے کہ اب دوا لیتی بھی ہیں یا نہیں......

رانیہ پتھر کا بت بنی وہیں بیٹھی تھی۔ کہ موبائل فون کی گھنٹی بجنے پر بے دلی سے فون کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ نینا کا نام دیکھ کر چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جلدی سے کپکپاتے ہاتھوں سے فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف نینا تھی۔

''ماں یار کیسی ہیں؟''

''ارے جیسی بھی ہوں اب جلدی سے آکر دیکھ لو۔ ایک ہفتے سے پاکستان آکر سسرال میں اٹکی ہوئی ہے میری بلبل......اب کیا راستے میں ہو یا گھر کے قریب؟''

دوسری طرف تھوڑی دیر کو خاموشی چھا گئی۔ جسے توڑنے کے لیے رانیہ نے ہی ہیلو......ہیلو کہا۔

''جی اماں، وہ میں ناں......دراصل آج نہیں آپاؤں گی۔ اِدھر سسرال میں بہت سارے مہمان آگئے ہیں اور عالیان بھی بہت سال بعد اپنے گھر والوں کے بیچ عید منا رہا ہے تو میں کیسے عالیان کے بغیر عید مناتی۔ چلو چھوڑو یار اب یہ بتاؤ؟ کیسی ہے میری پیاری ماں وہ چوہا احد خیال بھی رکھتا ہے یا مجھ پر ہی رعب چلاتا رہا ہے۔ اب بیوی کے سامنے نہیں چلتی اس کی۔'' وہ کھوکھلی ہنسی ہنس کر بات کو ٹال رہی تھی۔

رانیہ کو تو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا وہ تو ''بس میں آج نہیں آپاؤں گی۔'' میں اٹکی ہوئی تھی۔

''ماں یار تیرے پیروں کو آرام آیا۔ کون مالش کرتا ہے' ماہم کرتی ہوگی۔ قریب جو رہتی ہے، میں جب آؤں گی تو اتنے سالوں کی کسر نکال دوں گی۔ کھیر اب بھی ندیدی بن کر کھاتی ہوں گی ناں......؟''

''نہیں' میں نے کھیر بنانی ہی چھوڑ دی ہے اور میرے پیر تو بالکل ٹھیک ہوگئے ہیں۔'' اس نے اپنے درد کرتے پیروں کو سہلایا۔

''اور ہاں ماں، وہ جو کنگ سائز ہینڈ بیگ ہوتا تھا آپ کا جس میں پاپا کا ڈھیر سامان لیے پھرتی تھی میری ماں وہ ماہم اٹھاتی تھی پھر میں......اب کون اٹھاتا ہے۔ حیا یا احد......؟'' نینا ہنسی۔

''کوئی بھی نہیں......میں اب ہینڈ بیگ لے جاتی ہی نہیں کہیں......'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

''چل یار اماں، اب ملنے پر بات ہوگی، ابھی مہمان آگئے ہیں' او کے اللہ حافظ......'' وہ جلدی سے بولی۔

''اللہ حافظ میری جان، خوش و آباد رہو۔'' رانیہ نے فون رکھا اور بے دلی سے فون کو میز پر پٹخا۔ کچن کی طرف ایک نظر ڈالی تو خیال آیا سلاد بنانی ہے اور احد کو بھوک لگی ہوگی۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بہ مشکل اٹھی اس کے دماغ میں اپنی ماں کی بتائی کہاوت گونج رہی تھی۔

''بیٹیوں کی ماں رانی

بڑھاپے میں بھرے پانی''

تیورا کے گرتے نرم و نازک ہاتھوں کا سہارا ماہم اور نینا کا گمان گزرا۔ یقیناً سرپرائز دینا چاہتی ہوں گی یوں تو ماہم سنبھال لیتی تھی۔ گم ہوتے حواسوں سے یہی سوچتے وہ بے ہوش ہوگئی۔

آنکھ کھلی تو اپنے بیڈ پر تھی۔ احد اس کو بازوؤں میں لیے ہوئے تھا اور احمد فکرمندی سے کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کی کھلتی آنکھوں کو دیکھا تو مصنوعی خفگی بھر کر بولے۔

''تم نے تو یار، آج اوپر کا ٹکٹ کٹوا لیا تھا، وہ تو شکر ہے ہماری بہو بیگم نے بروقت آکر سنبھال لیا' احد تو دوستوں سے باہر عید مل رہا تھا، یہ تو حیا اندر آئی تو آپ فرش کو عید ملنے چلی تھیں۔ وہ تو یہ میکے سے واپس آگئی کہ عید اپنے گھر پر ہی کرے گی۔''

''لیں اماں دوائی......'' حیا ایک ہاتھ میں دوا اور دوسرے میں پانی لیے کھڑی تھی۔ رانیہ نے حیا کے چہرے کو پیار سے دیکھا' پل میں وہ ماہم سے نینا اور نینا سے رانیہ کا چہرہ بنتا چلا گیا۔

''لو رانیہ تمہارا چڑھایا قرض بھی ادا ہوگیا۔'' حیا نے پیار سے اس کے سر کے نیچے سہارے کو ہاتھ رکھا اور دوا کھلانے لگی۔



ناولٹ

آٹھواں حصہ

محبت لفظ ہے لیکن ....

"ماں باپ کے سامنے بہت سوچ سمجھ کے بولا کرو کیونکہ کبھی کبھی ان کے سامنے بولا گیا کوئی بھی برا یا اچھا کلام ہماری پوری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔"

خوب صورت جذبوں کی باریکیاں بیان کرتی حیا بخاری کی ایک دل نشیں تحریر

کیونکہ وہ یونیورسٹی کی پچھلی سائڈ سے نکلے تھے ..تو یہ راستہ انہیں کافی لمبا پڑا تھا۔ یہ راستہ جنگل کے بالکل درمیان سے ہو کر نکلتا تھا۔ بارشوں کے بعد جگہ جگہ خودرو پودوں کی وجہ سے رک جانے والے پانی کی وجہ سے کافی خراب بھی ہو رہا تھا کیونکہ اس طرف زیادہ ٹریفک نہیں ہوتی تھی۔ صرف کالج، یونیورسٹی کے بچے اور فارسٹ ڈیپارٹمنٹ کے لوگ ہی اس طرف آتے تھے۔ انہیں ڈرائیو کرتے آدھا گھنٹا ہو چلا تھا لیکن اب بھی دونوں

طرف کے درختوں کے جھنڈ ویسے ہی گھنے تھے۔ آبادی کے آثار ہی نہیں تھے۔ ضیا بھی اس وقت سے مسلسل خاموش تھا۔ لالہ نے نوٹ کیا تھا۔ وہ مضطرب سا تھا، اس کی آنکھیں اسکرین پر جمی تھیں۔ لیکن لالہ صاف محسوس کررہی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ نچلا ہونٹ مسلسل دانتوں سے کاٹتا وہ اسے بھی پریشان کررہا تھا۔ اور پھر اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ پوچھتی، اس نے کسی کو درختوں کے جھنڈ سے باہر آتے اور پھر لفٹ کے لیے ہاتھ کھڑا کرتے دیکھا تھا۔ ضیا نے اس شخص کے قریب جاتے ہی گاڑی روک دی۔

''سر...... میری بائیک خراب ہوگئی ہے۔'' اس نے درختوں کے قریب کھڑی بائیک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''پلیز شہر تک اگر مجھے لفٹ دے دیں۔'' وہ اس سے درخواست کررہا تھا۔

''شیور......!'' ضیا کے چہرے پر وہی خوب صورت دوستانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''میں بیگ لے لوں......'' وہ شکریہ ادا کرتا بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

''لالہ تم پیچھے چلی جاؤ، آج کل حالات خراب ہیں، کسی کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ اس کے پاس اگر گن ہوئی تو پیچھے سے یہ ہمیں آسانی سے کور کرسکتا ہے۔ لیکن میرے ساتھ بیٹھ کر اگر ایسی کوئی حرکت کرے گا بھی تو خود بھگتے گا۔'' ضیا نے سامنے لڑکے پہ نظر رکھتے ہوئے لالہ کو ہدایت کی۔ وہ سر ہلاتی فوراً نیچے اتر کے پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی۔ چند لمحوں بعد ہی وہ لڑکا بیگ اٹھائے فرنٹ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ ضیا نے اس کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ لالہ کی جانچتی نگاہیں ابھی تک اس لڑکے کے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ دروازے سے ہٹ کر بیٹھی تھی تقریباً بیچ میں اور اس سے پہلے کہ ضیا گاڑی آگے بڑھاتا، بالکل اچانک پچھلے دونوں دروازے ایک جھٹکے سے کھلے تھے...اور دو گن مین لالہ کے پہلوؤں میں سیٹ سنبھال گئے۔ لالہ کا دل دھک سے ہوا تھا۔

''ضیا......'' خوف کی شدت سے اس کے لب جڑ سے گئے تھے۔ وہ چاہ کر بھی ضیا کو نہ پکار سکی تھی۔ ایک نے پسٹل کی نوک اس کی کنپٹی سے لگادی تھی۔

''گاڑی آگے بڑھاؤ۔'' لب کاٹتے ضیا نے گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

''اسے بے ہوش کردو۔'' سامنے بیٹھے لڑکے نے لالہ کے دائیں طرف بیٹھے آدمی کو حکم دیا تھا۔

''نہیں، چھوڑو مجھے۔'' وہ اس کا اشارہ سمجھتے ہی چلائی تھی۔ ساتھ بیٹھے تنومند شخص نے کلوفارم سے بھیگا رومال اس کے چہرے سے لگادیا تھا، وہ چڑیا کی طرح پھڑپھڑا کے رہ گئی تھی۔ اسے صرف چند سیکنڈ لگے تھے ساکت ہونے میں۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی سب نے پستول واپس رکھ لی تھی۔

''کہاں لے کے جائیں گے اسے خان؟''
ساتھ بیٹھے لڑکے نے ضیا سے پوچھا۔

''فارم ہاؤس۔'' اس نے لب کچلتے ہوئے سخت لہجے میں جواب دیا تھا۔ وہ سر ہلا گیا تھا۔

☆☆☆

شام ڈھلنے لگی تھی اور اقرا ابھی تک کالج سے نہیں لوٹی تھی۔ زرینہ بیگم کی تو سانس پھولنے لگی تھی۔ حمزہ بھی دوبار پوچھ چکا تھا۔ انہوں نے کسی دوست کا نام لے کر اسے تو ٹال دیا تھا لیکن خود ان کا دل بیٹھا جارہا تھا۔ حمزہ آج بھی وقت پر اسے لینے کالج پہنچ گیا تھا لیکن وہاں جا کے اسے پتا چلا کہ آج فیئر ویل پارٹی تھی اور بچیاں جلد ہی واپس گھر چلی گئی تھیں۔ اس نے سوچا اقرا بھی کسی دوست کے ساتھ چلی گئی ہوگی۔ گھر آ کے اس نے یہی بات ماں کو بتاتے ہوئے جب پوچھا کہ اسے کالج سے اکیلے آنے میں پریشانی تو نہیں ہوئی تو زرینہ کو سانس رکتی محسوس ہوئی۔ انہوں نے حمزہ کو... فی الحال تو بہانہ کر کے ٹال دیا تھا لیکن اب واقعی پریشان تھیں۔ انہیں لگا تھا کہ اقرا کسی دوست کے ساتھ گئی ہو یا آغا سے ہی ملنے گئی ہوگی تو بھی شام تک گھر لوٹ آئے

گی لیکن شام کے سائے بھی گہرے ہونے لگے تھے۔ وہ ابھی تک نہیں لوٹی تھی۔ حمزہ مغرب کی نماز کے لیے نکل گیا تھا۔

''اماں کی طرف نہ گئی ہو۔'' خیال آتے ہی جیسے ڈھارس سی ملی دل کو۔ انہوں نے فوراً نمبر ملایا۔

''ہیلو......'' فون سبین نے اٹھایا تھا۔

''بھابی میں ہوں زرینہ...... اقرا آئی ہے آپ کی طرف......؟'' انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''کیا......؟ اقرا ابھی تک گھر نہیں آئی؟'' پتا نہیں کیوں زرینہ کو لگا ان کی طرح سبین کا لہجہ بھی پریشان سا تھا۔

''اقرا بھی مطلب......؟'' انہوں نے رکتے دم سے پوچھا تھا۔

''زرینہ آپا......لالہ بھی ابھی تک گھر نہیں لوٹی......'' ان کی پریشان آواز نے ایک دم ہی انہیں شانت کردیا تھا۔ تسلی سی ہوئی تھی کہ اقرا ضرور لالہ کے ہی ساتھ تھی۔ اگلے ہی پل پچھلی ساری پریشانی لہجے سے زائل تھی۔

''اور دو آزادی......لڑکی ذات کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ ارے اپنی لڑکی کی تو تربیت ہی ایسی کی ہے۔ اوپر سے اسے کھلا چھوڑ رکھا ہے۔ میری اقرا کو بھی ساتھ چمٹائے رکھتی ہے۔ سنا تھا، ایک گندی مچھلی سارے تالاب کو گندا کرتی ہے۔ زندگی میں دیکھ بھی لیا، ہائے میرا مرحوم بھائی......'' وہ بولنے پر آئیں تو رکنا ہی بھول گئیں، سبین چپ چاپ سنے گئیں۔

''بتائے دیتی ہوں، لالہ کے چکر میں میری اقرا کے ساتھ کچھ ایسا ویسا ہوا......تو چھوڑوں گی نہیں کسی کو۔'' کچھ انسان بھی کتنا زہر اگلتے ہیں ناں...... سبین کے وجود پر موت طاری ہونے لگی تھی۔ تبھی زور، زور سے گلی کا دروازہ بجا تھا۔

''لگتا ہے آگئیں دونوں ایک مرتبہ پھر آوارہ گردیاں کر کے۔'' انہوں نے تلخ لہجے میں کہا اور فون رکھنے لگیں۔

''زرینہ آپا......پلیز فون بند نہ کریں۔ لالہ ہو تو بات کروادیں میری۔'' انہوں نے التجا کی۔ دروازہ دوبارہ کھٹکھٹایا گیا۔

''ہم......'' انہوں نے منہ بناتے ہوئے فون ہولڈ پر رکھا۔ اور باہر آکر دروازہ کھولا۔ باہر صرف اقرا تھی۔ اقرا کو صحیح سلامت دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی تھی۔

''لالہ کے ساتھ تھیں تم؟'' اس سے اندر قدم رکھتے ہی انہوں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''نہیں۔'' اپنے کمرے کی طرف جاتی اقرا ان کی آواز پر رکتے ہوئے بولی تھی لیکن مڑی نہ تھی۔

''آغا کے ساتھ تھی میں۔'' بدلحاظی سے کہتی ماں کو وہیں گنگ چھوڑ کر وہ سیدھا کمرے میں چلی گئی اور اندر سے کنڈی لگادی۔ زرینہ بیگم کا سارا اطمینان ایک پل میں ہُوا ہوا تھا۔

''تو سارا دن کیا وہیں اس لوفر کے ساتھ رہی تھی۔ اور اگر وہ اس آغا کے ساتھ تھی تو لالہ......؟ ہوگئی اپنے کسی یار کے ساتھ...سبین کی بیٹی ہے۔'' پریشان ہوتے ہوئے ازلی نفرت عود کر سوچوں میں لوٹی تھی۔ فون تک آتے، آتے وہ خود کو اقرا کی پریشانی سے کچھ سنبھال چکی تھیں۔

''اقرا آگئی ہے گھر......دوستوں کی طرف تھی، لالہ نہیں ہے اس کے ساتھ۔'' انہوں نے منتظر سبین کو اطلاع دی تھی۔

''ایک آدھ گھنٹے تک آتی ہے تو ٹھیک ورنہ مجھے بھی ضرور بتانا۔ حمزہ ہے ناں، کافی تعلقات ہیں، ڈھونڈ لے گا اسے۔''

''رکھتی ہوں آپا۔'' سبین نے نم لہجے میں کہتے ہوئے کال کاٹ دی تھی۔

شام سے رات اور پھر رات سے آدھی رات ہوچلی تھی۔ لالہ گھر نہیں آئی تھی۔ اس کا فون بھی بند تھا۔ یونیورسٹی میں اس کی کوئی دوست نہیں تھی سوائے نمرہ کے۔ نمرہ کے علاوہ کسی..... کا ایڈریس ان کے

پاس نہیں تھا۔ نہ ہی فون نمبر...... نمرہ نے کہا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں اس سے ملی ضرور تھی لیکن ہنگامے کے بعد وہ بھی کافی مشکل سے وہاں سے نکلی۔ اسے لالہ کی خبر نہیں تھی۔ کچھ دوسری لڑکیوں سے نمرہ نے پتا کیا تھا۔ وہ بھی بے خبر تھیں۔ نمرہ نے معذرت کرتے ہوئے انہیں پولیس اسٹیشن جانے کا مشورہ دیا تھا۔ شاویز تو چکرا کے رہ گیا۔ اس کا جسم جیسے بے جان ہو رہا تھا۔ سین اور نانو کا رو، رو کے برا حال تھا۔ زرینہ بیگم کو بھی اطلاع کر دی گئی تھی۔ حمزہ اور اقرا کے ساتھ وہ دوڑی چلی آئی تھیں۔ مشکل کی اس گھڑی میں باریال بھی شاویز کے ساتھ تھا۔

''ہوسکتا ہے یار، کسی نے یونی کی ہنگامی صورتِ حال کا فائدہ اٹھایا ہو۔ آئی مین کسی وڈیرے نے۔'' باریال اب دوسری نہج پر سوچنے لگا تھا۔

''مطلب......؟'' شاویز نے الجھی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اور باریال اس وقت نمرہ کے گھر سے کچھ دور سڑک کنارے اسٹریٹ لائٹ کے نیچے کھڑے تھے۔

''مطلب یہ اغوا وغیرہ کا کیس ہو؟'' اس نے خیال ظاہر کیا۔

''اللہ نہ کرے یار......'' اس کا دل ڈوب سا گیا۔

''تو...... کہیں لالہ خود تو کہیں انٹرسٹڈ نہیں تھی؟'' نہ جانے کیوں اسے خود اپنے لفظوں پر شرمندگی سی ہوئی۔

''نہیں یار...... لالہ ایسی نہیں ہے۔'' شاویز سر جھٹکتے ہوئے بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

''میرے خیال میں ہمیں پولیس کے پاس چلے جانا چاہیے۔'' اس نے بے بس لہجے میں کہا تھا۔

''لڑکی کا معاملہ ہے شاویز...... یہاں کی پولیس کا حال تو تم اچھی طرح جانتے ہو...... مجرموں سے پہلے گھر والوں کی وہ پیشی لگائیں گے کہ......'' باریال کچھ سوچتے ہوئے بولا تھا۔

''میرے خیال میں کل پرسوں تک خود کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔'' اس کی بات میں وزن تھا۔ وہ سر ہلا گیا تھا۔ اور تاریخ کی یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ جہاں انصاف نہ ہو وہاں مجرم نہیں متاثرین قانون سے ڈرتے ہیں۔

☆☆☆

وہ واقعی بے حد ذہین اور دماغی طور پر مضبوط تھی۔ تبھی فارم ہاؤس تک پہنچتے، پہنچتے اس کا نشہ دم توڑنے لگا تھا۔ وہ نشے کی حالت میں بھی خود کو بار، بار جاگنے اور ذہن کو بیدار کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ گاڑی فارم ہاؤس میں داخل ہوتے ہی دوران خان اور دوسرے چند پرانے گارڈ دوڑتے چلے آئے تھے۔ وہ اتر چکا تھا۔

''ابراہیم اس لڑکی کو لے آیا تھا؟''

''جی خان...... اسے آپ کی ہدایت پر رہائشی حصے میں رکھا ہے۔'' اس کی بات پر ضیا اطمینان سے سر ہلا گیا۔

''اچھا اس لڑکی کو مہمان خانے کی طرف لے جاؤ...... کمرا تو سیٹ کروا دیا تھا ناں......؟'' اس نے ہدایت دیتے ہوئے پوچھا۔

''جی خان...... سارا انتظام کر دیا ہے۔''

''اور ہاں...... تم سب لوگ جو مری میں میرے ساتھ تھے، لالہ کے سامنے نہیں جاؤ گے۔ جب تک میں نہ کہوں، اسے پتا نہیں چلنا چاہیے کہ اسے یہاں لانے میں میرا ہاتھ ہے۔'' وہ رہائش گاہ کی طرف جانے والی پگڈنڈی پہ قدم رکھتے ہوئے بولا۔ دوران سر ہلا گیا...... تبھی ضیا کے فون پہ میسج ٹون بجی تھی۔ اس نے چلتے، چلتے ہاتھ ہلا کر دوران کو جانے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھتا میسج بھی اوپن کر دیا۔

''ضیا، لالہ ہے تمہارے ساتھ؟'' نمرہ کا میسج تھا۔ اس کے لب خود بخود بھنچ سے گئے تھے۔

''نہیں تو...... میں تو گاؤں نکل آیا ہوں آج ہنگامے کے بعد...... کیوں خیریت تو ہے ناں؟'' اس نے صاف مکرتے ہوئے ٹائپ کیا تھا۔

''ہاں، بس لالہ ابھی تک گھر نہیں پہنچی تو...... خیر پھر بات ہوگی۔ TC'' نمرہ نے جیسے جان چھڑائی تھی۔ اس نے بھی فون آف کر کے جیب میں ڈال لیا تھا۔

اندرونی دروازے میں قدم رکھتے ہی گلابی سا سراپا لیے زمزمہ اسے تیزی سے سیڑھیاں اترتی دکھائی دی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی رقم تھی۔ ضیا رک گیا تھا۔

''ضیا......'' وہ فوراً اسے پکارتی اس کی طرف آئی تھی۔

''میں نے ابھی کھڑکی سے دیکھا۔ تمہارے آدمی پچھلی طرف کسی لڑکی کو زبردستی لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔''

''لڑکی...... اور میرے آدمی......'' اس نے انجان بنتے ہوئے کندھے اچکائے۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں...... میں نے ابھی خود دیکھا۔ پچھلی طرف...... لان میں۔'' وہ سخت خوفزدہ تھی۔

''تم یہاں محفوظ تو ہو ناں......؟'' ضیا نے لمبی سانس لے کر خود کو کمپوز کیا اور اس کے قریب آ کے پوچھا۔

''ہاں...... لیکن......؟'' زمزمہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے حیرت سے بولی۔ جیسے اس کا سوال نہیں سمجھ پا رہی ہو۔

''بس تو بے فکر ہو جاؤ...... ضیا کے حکم کے بغیر اس چار دیواری کے اندر کوئی کسی کو انگلی بھی نہیں لگا سکتا۔'' وہ مسکرایا۔

''لیکن ضیا...... وہ لڑکی خود کو چھڑانے کی مسلسل کوشش کر رہی تھی۔''

''میں سخت تھکا ہوا ہوں...... جاؤ آرام کرو زمزمہ...... اور مجھے بھی آرام کرنے دو۔ ملازموں میں سے کسی کی بیٹی، بیوی ہوگی۔ یہ لوگ اپنی عورتوں سے ایسے ہی سلوک کرتے ہیں۔ میں کل دیکھ لوں گا۔'' اس نے زمزمہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ زمزمہ نے اس بار کچھ نہیں کہا...... خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ضیا کچھ دیر اسے سیڑھیاں چڑھتا دیکھتا رہا.. پھر خود بھی لب کچلتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

آدھی رات کے قریب وہ گھر لوٹا تھا۔ سبھی نفوس اس کے انتظار میں صحن میں ہی جمع تھے۔ نانو جائے نماز بچھائے، آنسو بہاتی مسلسل تسبیح کے دانے گرانے میں مصروف تھیں۔ سین پلر سے ٹیک لگائے بے جان وجود لیے زیرِ لب دعا میں...... تو حمزہ اور اقرا کی حالت بھی ان سے کم نہ تھی حمزہ کو تو خبر بھی کافی دیر سے پہنچی تھی پھر شاویز کا فون مسلسل بزی ہی ملا تھا۔ اس کی تو جان سولی پہ لٹکی تھی۔ شاویز کو دیکھتے ہی سب تیزی سے اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

''کچھ پتا چلا؟'' حمزہ نے بے قراری سے پوچھا۔

''جتنے دوستوں کا پتا تھا سب سے پوچھ لیا...... ہاسٹل بھی پتا کر آئے۔ لیکن لالہ کے بارے میں کسی کو بھی کوئی پتا نہیں......'' مایوسی سے کہتا وہ چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

''میں اسپتالوں میں چیک کرتا ہوں۔ خدانخواستہ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو اس کے ساتھ۔'' حمزہ نے کہا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔'' شاویز فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''بار، بار کہتی رہی، لڑکی ذات کو اتنی چھوٹ نہ دو۔ لیکن نہ...... میری یہاں سنتا ہی کون ہے...... زرینہ تو ہے ہی بری......'' ان کے گھر سے نکلتے ہی زرینہ نے زور سے ہتھڑ سینے پر مارتے ہوئے دہائی دی تھی۔

''امی پلیز...... کچھ تو موقع دیکھ لیا کریں......'' اقرا نے مسلسل روتی سین مامی اور نانو کی طرف دیکھتے ہوئے خفیف لہجے میں کہا۔

''او بی بی کیسا موقع؟'' زرینہ تو اور ہی... ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

''اسی موقع سے بچنے کے لیے ہی کہتی تھی...... میری بات پہ عمل کیا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا...... ہائے میرے مرحوم بھائی کی روح تک کو ننگا کر گئی بے غیرت......''

''زرینہ......'' اماں کے صبر کا پیمانہ چھلکا تو چلا اٹھیں۔

''کیا اماں......؟ اب بھی تم لوگ بچے بنو تو شاباش ہے اماں...... یوں دن دیہاڑے اچانک غائب ہو گئی لالہ...... کیا لگتا ہے آپ کو، جن اٹھا لے گیا اسے...... سیدھی بات ہے اماں...... چن لیا ہوگا سین

بھابی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کوئی ساتھی...... لات ماردی باپ کی چوکھٹ کو۔'' زرینہ کب کسی کا لحاظ رکھتی تھیں جو اس موقع پر خاموش رہتیں۔

''حد ہوتی ہے زرینہ......'' اماں کا ضعیف لہجہ کپکپا سا گیا تھا۔

''کیسی بہن ہے تو......؟ تیرے مرحوم بھائی کی بیٹی مشکل میں ہے۔ ہم سب اس قدر پریشان ہے اور تو......اب بھی مرہم رکھنے کے بجائے نمک چھڑک رہی ہے ہمارے زخموں پر۔''

''میں تو صرف سچ کہتی ہوں اماں......'' انہوں نے تنفر سے نتھنے پھلائے۔

''اور پہلے کب اچھی لگی ہوں میں آپ کو......جو آج اچھی لگوں گی۔ آپ کے لیے تو ہمیشہ بھائی، بھابی اور ان کی اولاد ہی مقدم رہی۔ آپ کا بس چلے تو لالہ کے کرتوت بھی اقرا پہ تھوپ دیں۔''

''استغفار......'' اماں کا دل دہل گیا۔ اقرا لب کترنے لگی۔

''اللہ سے ڈر زرینہ......دکھی دل کو اور نہ دکھا۔'' اماں ہاتھ جوڑے پھوٹ، پھوٹ کر رو دیں۔

''حد ہوتی ہے امی......!'' اقرا غصے سے ماں کو گھورتی نانو کو سنبھالنے لگی۔ چپ چاپ آنسو بہاتی سبین پلر سے سہارا لیے زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔

''یا اللہ میری لالہ کی حفاظت فرما......'' اماں نے روتے، روتے دعا کی تھی۔

''ہم......میری لالہ......منہ پہ کالک مل کر چلی گئی۔ لیکن ذرا جو کسی کو پروا ہو......پتا نہیں کس کے ساتھ ہوگی اس وقت بے غیرت لڑکی۔'' زرینہ مسلسل بڑبڑاتی رہیں۔

☆☆☆

ہراساں نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس نے اس جگہ کو پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ جگہ اجنبی تھی۔ چوکور کشادہ کمرے میں تین اطراف کھلی کھڑکیاں تھیں۔ جن کے سامنے لوہے کی مضبوط گرل لگی تھی۔ اور آگے دبیز پردے گرے ہوئے تھے۔ مرے، مرے وجود کو گھسیٹتی کھڑکی تک آئی تھی۔ باہر رات پھیل چکی تھی۔ اس کے کمرے سے کافی دور تک لال پکی اینٹوں کا فرش اور اس سے آگے گھنے درختوں کا سلسلہ تھا۔ پردہ چھوڑ کے وہ گرنے کے سے انداز میں وہیں ننگے فرش پر بیٹھ گئی۔ آنکھوں سے بہتے آنسو کچھ دیر میں ہی اس کے گال جلانے لگے تھے۔

''یہ کیا ہو گیا......؟ کون لوگ ہیں یہ؟'' کتنی ہی دیر تک بے جان سی آنسو بہانے کے بعد کہیں وہ کچھ سوچنے کے قابل ہوئی تھی۔

''ضیا......ضیا بھی تو میرے ساتھ تھا......'' وہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ اور اسے ذہن پر زور دینے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ ہوش اور بے ہوشی کی درمیانی کیفیت سے جنگ لڑتے ہوئے وہ مسلسل اپنے اردگرد کو محسوس کرنے، سننے کی لاشعوری کوشش کرتی رہی تھی۔ اور لاشعور بتا رہا تھا کہ ضیا ان سے ان کی زبان میں ہی بات کرتا رہا تھا......ضیا کے لہجے کی شناسائی بھی اسے محسوس ہوئی تھی۔

''کون ہے یہ لڑکا......کیا چاہتا ہے مجھ سے؟'' وہ بے بسی سے کہتی پھوٹ، پھوٹ کر رو دی تھی۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھلی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلا احساس شدید ٹھنڈک کا تھا......موت کی سی سردی کا......اس قدر شدید گرمی کے موسم میں رگ، رگ جماتی ٹھنڈک......وہ حیران سا اٹھ بیٹھا تھا۔ اگلے ہی لمحے اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا......اس نے کیا دیکھا تھا۔ وہ برف پوش چوٹی پر برہنہ بیٹھا تھا۔ بے اختیار اس نے دونوں بازو پھیلا کر خود کو ڈھانپنے کی کوشش کی تھی۔ اسی وقت عجیب... گڑگڑاہٹ سی ہوئی تھی۔ جس زمین پر وہ بیٹھا تھا ذرا سی لرزی تھی پھر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ تبھی سامنے اسے کسی کا سر دکھائی دیا تھا۔ وہ اس سے چند سال بڑا تھا۔ اور اس سردی میں اتنی اونچائی پر نہ جانے کیا کرنے آیا تھا۔

اوپر آتے ہی اسے دیکھ کر اس کی خوب صورت ذہین آنکھوں میں پہلے حیرت ابھری تھی اور پھر فکر......

''سنو، اس طرف آ جاؤ......برف کا وہ ٹکڑا پہاڑ سے الگ ہونے والا ہے۔'' اس کی بات پر ضیا نے بے اختیار سامنے نیچے دیکھا تھا، برف کے درمیان واقعی دراڑ پڑ چکی تھی۔ وہ اپنا برہنہ پن بھول کے فوراً آگے کو ہوا تھا۔ سامنے کھڑے لڑکے نے اپنی بڑی سی شال اس پر اچھال دی تھی۔ اس کا برہنہ بدن ڈھک گیا تھا۔ تبھی گڑگڑاہٹ زور سے شروع ہوئی تھی۔

''جلدی کرو......ورنہ نیچے گر جاؤ......'' سامنے والا لڑکا چلّایا تھا۔ اس نے کودنے کی کوشش کی تھی لیکن بے سود......برف کا وہ حصہ چوٹی سے جدا ہو گیا تھا۔ وہ نیچے گرتا چلا گیا۔ ٹھنڈی ہوا سے اس کا جسم چٹخنے لگا تھا۔ درد بے حساب تھا، وہ بری طرح ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

کمرے میں زیرو بلب کی ہلکی سی روشنی تھی۔ اے سی آن تھا۔ ٹھنڈک تھی پھر بھی اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔

''وہ لڑکا......'' اسے یاد آیا خواب میں آنے والا لڑکا وہی تھا جس نے کئی موقعوں پر اس کی مدد کی تھی۔

''تم ہمیشہ گرتے ہو......اور میں تمہیں سنبھال لیتا ہوں......دھیان رہے یار......کئی بار ہم اتنا گر جاتے ہیں کہ کوئی ہمیں سنبھال نہیں سکتا......تم بھی یہ بات یاد رکھنا۔ ضروری نہیں ہمیشہ تم گرو اور میں سنبھال سکوں......'' باریال ولی خان کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجے تھے۔ وہ بے آرام سا دونوں ہاتھوں سے اپنے بال جکڑ گیا تھا۔

☆☆☆

ایک رات ایک دن گزر گیا تھا کچھ پتا نہ تھا لالہ کہاں چلی گئی تھی۔ اس کا فون بھی مسلسل بند تھا۔ یونیورسٹی کے ہنگامے میں بھی ایسی کوئی خبر نہیں تھی کہ کسی کے قتل یا غائب ہونے کی اطلاع ہوتی۔ سیکیورٹی نے بروقت کارروائی کرتے ہوئے نہ صرف حالات سنبھال لیے تھے بلکہ یونیورسٹی بھی تقریباً ویران ہو چکی تھی۔ حالات کے پیشِ نظر تین دن تک تعطیلات کا بھی اعلان ہو چکا تھا، اس لیے بھی لالہ کے تمام کلاس فیلوز سے پوچھنے میں دقت تھی۔ سبین تو رو، رو کے خاموش سی ہو گئی تھیں۔ نانو بھی نڈھال سی بیڈ پکڑے بیٹھی رہ گئی تھیں۔

شاویز، باریال اور حمزہ تینوں نے ہی سارے اسپتال، ایمرجنسی سینٹرز سب چھان مارے تھے۔ اقرا نانو کو سنبھالتی تو کبھی سبین کو......زرینہ بیگم کی بڑبڑاہٹیں بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ اگلے دن بھی شام ڈھلے وہ تینوں ناکام گھر لوٹے تھے۔ ان کے مایوس چہرے دیکھ کر امید سے دھڑکتے دل بند سے ہونے لگے تھے۔ نانو کی بوڑھی آنکھیں سیلاب اُبلنے لگی تھیں۔ بالکل اسی وقت شاویز کے فون پر بیپ ہوئی تھی۔ نمرہ کی کال تھی۔ اس نے فوراً پک کی۔

''شاویز، ابھی ایک لڑکی نے مجھے بتایا کہ کل اس نے یونیورسٹی کے بعد لالہ کو ایک لڑکے کے ساتھ گاڑی میں دیکھا تھا۔ وہ شہر کے باہر والے راستے پر تھے۔'' نمرہ نے اطلاع دی تھی۔ شاویز گرنے کے سے انداز میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے آواز تقریباً سبھی نے واضح سنی تھی۔

''پڑ گئی ٹھنڈ......کہتی تھی ناں میں منہ کالا کر کے چلی گئی ہے ہم سب کا......'' زرینہ کی تلخ آواز بلند ہوئی تھی۔ سبین نے کانوں پر بے اختیار ہاتھ رکھے تھے۔

''میری لالہ ایسی نہیں ہے۔'' نفی میں سر ہلاتے وہ چلّا اٹھی تھیں۔

☆☆☆

کمرے میں ملگجی سی روشنی تھی......نڈھال وجود لیے وہ کمرے کے ایک کونے میں سکڑی بیٹھی تھی۔ میز پر رکھا کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا......اور اس کی آنکھوں کے چمکتے رنگ دھیمے پڑنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ پورے ایک دن سے گھر سے غائب تھی۔ گھر والوں پہ کیا قیامت ٹوٹی ہوگی اسے اچھی طرح خبر تھی۔ زرینہ پھپھو کو تو موقع مل گیا ہوگا۔

”اُف میرے خدا......“ اس کی پلکیں دوبارہ بھیگنے لگیں۔ آنکھوں کے پپوٹے مسلسل بے آرامی اور رونے کی وجہ سے سوج رہے تھے۔ یاقوتی ننھا دہانہ یک دم نیلا پڑنے لگا تھا۔

”میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی ضیا......“ وہ سب جان چکی تھی۔ ضیا کی سب تدبیروں کے باوجود وہ سمجھ گئی تھی، یہ سب ضیا کا ہی کیا دھرا ہے۔

کمرے کے باہر بھاری بوٹوں کی آواز پہ وہ بری طرح چونکی اور دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔ مضبوط دروازے کے سامنے آواز دم توڑ گئی اور ہلکی سی چرچراہٹ سے دروازہ کھلتا چلا گیا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اگلے ہی لمحے اسے کچھ تسلی سی ملی تھی۔ وہ خوب صورت شخصیت کے مالک بزرگ آدمی تھے۔ وہ یقیناً ضیا کے بابا تھے۔ انہیں شاید اپنے بیٹے کی حرکت کی خبر ہوگئی تھی۔ تبھی وہ وہاں چلے آئے تھے۔ انہیں دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک گونہ اطمینان چھایا تھا۔

”انکل......انکل پلیز مجھے یہاں سے باہر نکالیں، ضیا مجھے دھوکے سے یہاں لے کر آیا ہے۔“ وہ فوراً مدد کے لیے ان کی طرف بڑھی تھی۔

سہراب علی خان کے لبوں پر مسکراہٹ گہری ہوئی......اور لالہ کو اور حوصلہ ہوا تھا۔ وہ یقیناً اس کی مدد کرنے والے تھے۔

”انکل پلیز میری مدد کریں......میں بھی تو آپ کی بیٹی کی طرح ہوں......“ وہ ان کے قریب آتے ہوئے منت بھرے لہجے میں بولی تھی۔ اور اگلے ہی پل سہراب خان کا بھاری ہاتھ اس کے گال پہ نشان چھوڑ گیا تھا۔ بھوک پیاس سے نڈھال لالہ اس کے لیے تیار نہ تھی تبھی سنبھل نہ سکی تھی اور لڑکھڑا کے زمین پر جاگری تھی۔ اس کے گلابی ہونٹ کنارے سے پھٹ گئے تھے اور خون کی ننھی لکیر اس کی ٹھوڑی بھگونے لگی تھی۔ اس نے پھٹی نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا تھا۔ جسے وہ باپ کی طرح سمجھی تھی۔ اسے یہ امید تو ہرگز نہیں تھی اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر اٹھتی، انہوں نے اس کے لمبے کالے بال اپنے ہاتھ میں دبوچے تھے اور جھٹکے سے اسے سیدھا کیا تھا۔

”ارتضٰی زیدی کی بیٹی، میری بیٹی کی خاک سے بھی نہیں ملتی......“ تکلیف سے کراہتی لالہ کی پروا کیے بغیر وہ تنفر سے بولے تھے۔ اور بابا کا نام سن کر لالہ سُن سی ہوگئی تھی۔ ساری تکلیف سرد سی پڑنے لگی تھی۔

”کیا سمجھا تھا تیری ماں نے......“ انہوں نے غلیظ گالی دیتے ہوئے پھنکارتے ہوئے کہا۔ لالہ کے لب ضبط سے ایک دوسرے سے سختی سے پیوست ہوئے تھے۔

”ارتضٰی کے ساتھ میرے گھر کی چوکھٹ پار کر کے، سارے گاؤں میں ہماری عزت کا جنازہ نکال کر اس کی پناہ گاہ میں محفوظ رہے گی؟“ وہ بالکل کسی زہریلے ناگ کی طرح پھنکار رہے تھے۔ لالہ کو اُن سے خوف آنے لگا تھا۔ وہ بے اختیار ان سے اپنا آپ چھڑوانے لگی تھی لیکن اس عمر میں بھی ان کی طاقت اس سے کہیں زیادہ تھی۔

”سبین جانتی تھی، سہراب علی خان کی بہنیں، لال حویلی کی عورتیں کبھی شادی نہیں کرتیں......ان کا کسی خواب، کسی خوشی، کسی رشتے پر کوئی حق نہیں ہوتا......لیکن سبین......“ انہوں نے اس کے گال اپنے پنجے میں دبوچتے ہوئے کہا۔ درد کی تیز لہر جاگی تھی۔ اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔

”سبین نے بغاوت کی......اور وجہ تھا تمہارا باپ......“ ان کے لہجے میں نفرت تھی۔ لالہ کو ان کے صاف ستھرے، خوب صورت وجود سے ایک دم گھن آنے لگی تھی۔

”اب جب تم عبرت کی تصویر بن کر گھر جاؤ گی تو کیا حال ہوگا ارتضٰی کا، سبین کا......“ وہ قہقہہ لگا کے نہیں دیے تھے۔

”ایک، ایک پل جئیں گے......ایک، ایک پل مریں گے......نسلیں یاد رکھیں گی کہ ہماری حویلیوں سے بغاوت کرنے والی خانزادیوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔“ ان کے نتھنوں سے نکلتی گرم ہوا لالہ کا چہرہ جھلسانے لگی تھی۔

”کتنے برس، بیس سال سے بھی زیادہ اس دن کا انتظار کیا ہے میں نے......ناک کے بدلے ناک......عزت کے بدلے عزت......کہاں چھپائیں گے اس بدنامی کے داغ کو ارتضٰی اور سبین......“ وہ وجود سرتاپا نفرت تھا اور لالہ......وہ سب سمجھ رہی تھی۔ ساری کہانی کھلنے لگی تھی......وہ ساری عمر کیا سمجھتی رہی تھی......اور یہاں سانپ کے روپ میں انسان دیکھ کر اسے پل بھر میں الہام ہوا تھا......اس کی پھولوں جیسی فطرت کی ماں ان سانپ جیسے لوگوں کے ساتھ کیسے رہ سکتی تھی، اسے تو ارتضٰی ہی پناہ دے سکتے تھے......صرف اور صرف اس کے بابا......اس کا دل درد سے پھٹنے کو تھا۔

”میں ایک بدکردار ماں کی بیٹی ہوں......“ سہراب علی خان اب بھی بولے جارہے تھے لیکن لالہ کو صرف اپنے الفاظ سنائی دے رہے تھے۔

”میں نہیں چاہتی اقرا کہ تمہاری ماں کا کیا تمہارے سامنے آئے۔“ اس نے کس قدر غرور سے اقرا سے کہا تھا......لیکن اس کا کیا......وہ تو بھول ہی گئی......مکافاتِ عمل تو سب کے لیے ہوتا ہے۔

اور پھر ماں، باپ......وہ تو سگی اولاد تھی......زرینہ پھپو کی طرح اس نے بھی تو ماں کا کردار ہمیشہ چاک کیا تھا......طعنے مارے تھے۔

آج اسے اندازہ ہوا تھا......امی نے اتنا بڑا اقدم کیوں اٹھایا تھا......تبھی دروازے پر دستک ہوئی تھی اور دوران نے دروازے سے ہی آواز دی تھی۔

”خان......چھوٹے خان نے حکم دیا ہے لڑکی کو گھر چھوڑ کے آنے کا۔“ اس کی آواز مؤدب تھی۔ شیطانی مسکراہٹ ان کے لبوں کو چھوگئی۔

”انہوں نے کہا ہے ناں......میں نے تو نہیں کہا......ابھی میرا بدلہ پورا کہاں ہوا ہے۔“ انہوں نے جھٹکے سے لالہ کو چھوڑا تھا۔ وہ جہازی سائز بیڈ پر جاگری تھی۔

”تم نے ضیا کو وہ مشروب پلا دیا۔“

”جی خان......گل بی بی نے دے دیا تھا۔“ اب وہ آدھے کھلے دروازے پر کھڑا تھا۔

”گڈ......“ انہوں نے شیطانی نظریں لالہ پر جماتے ہوئے کہا......شیطان مجسم روپ بھی رکھتا ہے۔ لالہ نے آج اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ سہراب علی خان نے سائڈ ٹیبل پر رکھا ننھا کانچ سے بنا شوپیس اٹھایا اور اگلے ہی لمحے اپنی پیشانی پر دے مارا تھا۔ ہلکی سی سسکاری بھری تھی۔ اور ان کی پیشانی سے خون کی پتلی سی لکیر نکلنے لگی۔

”خان......“ دوران پریشان سا ان کی طرف بڑھا۔ لالہ بھی چیخ مار کے لاشعوری طور پر ذرا پیچھے کو کھسکی۔

”یہ آج رات بھی ہماری مہمان رہے گی......صبح منہ اندھیرے، روشنی پھیلنے سے پہلے اسے اس کے دروازے پر ڈال آنا......“ وہ زخم کی پروا کیے بغیر شیطانی مسکراہٹ سجائے بولے۔

”حکم خان......“ وہ فوراً سر جھکا گیا۔

”اور تم......“ دونوں ہاتھ بیڈ پر رکھتے ہوئے وہ اس پر جھکے تھے۔ وہ کانپ سی گئی تھی۔

”تم ضیا کا انتظار کرو......“ پھنکار کر کہتے ہوئے وہ قہقہہ لگا کے ہنسے تھے۔ لالہ کا ننھا سا دل بے جان ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

اسے عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ذہن ماؤف سا ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ چکر سے آرہے تھے......وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا اسے کیا ہو رہا تھا۔ شاید یہ مسلسل اسٹریس کی وجہ سے تھا۔ وہ لالہ کو یہاں لے تو آیا تھا ابھی تک وہ اس کے سامنے نہیں جاسکا تھا۔ اس نے بس باء جی کو اطلاع دے دی تھی۔ لالہ ایک دن گھر سے غائب رہی تھی۔ اس کے خیال میں یہ سزا کافی تھی اس کے خاندان والوں کے لیے......اسی لیے اس نے ملازموں کو بھی حکم دے دیا تھا کہ اسے واپس گھر چھوڑ آئیں رات کے اندھیرے میں لیکن یہ ایک حقیقت تھی، یہ سب کر کے وہ بے حد پریشان رہا تھا، بے حد بے سکون......حالانکہ یہ سب اس نے اپنے باء جی کے لیے کیا تھا۔ لیکن پھر بھی دل مطمئن نہ تھا......وہ خوش نہ تھا۔

ضیا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سہراب علی خان اندر آئے۔ دوران خان انہیں سہارا دیے ہوئے تھا۔ پیشانی پہ پٹی لگی تھی جس پر لگا خون کا دھبا ابھی تازہ تھا۔ وہ فوراً ان کی طرف آیا تھا۔ وجود میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔

''کیا ہوا باء جی...... آپ ٹھیک تو ہیں۔'' اس نے پوچھا تھا۔

''خان...... اس لڑکی نے حملہ کیا ہے بڑے خان پر...... گلدان سر پر دے مارا ان کے۔'' دوران خان نے فوراً کہا۔

''لالہ......!'' ضیا ضبط سے مٹھی بھینچ گیا۔

''گری ہوئی نسلوں سے یہی امید کی جاسکتی ہے (زوئے)...... بچے۔'' سہراب خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس کی ہمت بھی کیسے ہوئی آپ پر ہاتھ اٹھانے کی۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں...... خود کو سمجھتی کیا ہے؟'' غصے سے کہتا، لڑکھڑاتا وہ باہر نکل گیا تھا۔

''یاد رہے دوران خان...... صبح ہونے سے پہلے ہی لڑکی گھر پہنچ جانی چاہیے...... ضیا کو بھی یہاں لے آنا، جو مشروب اس نے پیا ہے صبح سے پہلے اسے ہوش نہیں آئے گا۔''

ضیا کے باہر جاتے ہی انہوں نے حکم دیا تھا۔ دوران خان سر جھکاتا باہر نکل گیا تھا۔ سہراب علی خان کے لبوں پر وہی شیطانی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

''تیری انتہائی شکست ہی تو اصل لطف دے گی ارتضٰی زیدی......'' انہوں نے خود کلامی کی تھی سانپ جیسی پھنکار کے ساتھ......

☆☆☆

کسی نے دروازہ پوری قوت سے کھولا تھا۔ وہ جو ماں سے کی گئی زیادتیوں پہ ندامت کے آنسو بہا رہی تھی، بری طرح چونکی تھی۔ لیکن اگلے ہی پل ضیا کو اندر آتا دیکھ کر جھٹکے سے بستر سے نیچے اتر آئی تھی۔ ضیا دروازے کو ٹھوکر سے بند کرتا کسی بپھرے شیر کی طرح اس کی طرف لپکا تھا۔

''تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی باء کو تکلیف پہنچانے کی۔'' اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔

''واہ...... تکلیف بھی تمہارے باء جی کو ہوئی...... اور میرا کیا......؟ میری تکلیف کا احساس ہے تمہیں......'' وہ اس سے خوف کھائے بنا تیز لہجے میں بولی تھی۔

''تمہاری تکلیف......؟'' ضیا نے آگے بڑھ کر اس کی نازک کلائی اپنی مضبوط گرفت میں لیتے ہوئے کہا...... وہ پھڑپھڑا کے رہ گئی۔

''ساری عمر میرے باء جی کو تکلیف کے کانٹوں پر گزارنے پر مجبور کرنے والوں کو آج اپنی تکلیف نظر آرہی ہے...... واہ......'' وہ خود کو بہ مشکل سنبھال رہا تھا۔

''اور تمہیں...... تمہیں کون سی تکلیف ہے یہاں...... ہاں۔''

''ایک لڑکی کا گھر سے ایک رات باہر گزار لینے کا مطلب تم کیا جانو ضیا......'' وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے متنفر لہجے میں بولی...... ضیا نے مزید دو قدم اس کی طرف بڑھائے۔ وہ بے اختیار پیچھے ہوئی۔ دل میں خوف سا جاگا۔

''حیرت ہے، تمہیں کسی نے بتایا نہیں شاید کہ تمہاری ماں نے گھر سے بھاگ کر ساری عمر باہر گزاری......'' اس نے جیسے گالی دی تھی۔ لالہ کا دل کٹ سا گیا تھا۔ اس نے ضیا کو دھکا دیا تھا اور اتنی ہی تیزی سے اس کے منہ پہ تھوک دیا تھا۔ ضیا دم بخود رہ گیا تھا۔ اسے لالہ سے ایسی کسی حرکت کی توقع نہ تھی۔

''پتا ہے کیا...... ساری غلطی میری ہے، میں نے یہ جانے بنا کہ تم ایک سانپ کی اولاد ہو تم پہ بھروسا کرلیا ضیا۔'' وہ نفرت سے اسے دیکھتی چلاتے ہوئے بولی تھی۔

ضیا کی آنکھوں کی سرخی ذرا سا تیز ہوئی تھی...... وہ بپھرے انداز میں اس کی طرف بڑھا تھا۔

''سانپ کیا ہوتا ہے آج میں تمہیں بتاؤں گا۔''

''ضیا......'' اسے اپنی طرف یوں جارحانہ انداز میں بڑھتے دیکھ کر لالہ کو احساس ہوا تھا، اس نے غلطی کردی تھی۔ اور آگے بڑھتے ضیا کے قدم اس کے ہلتے

ہونٹوں پر جمے تل کو دیکھ کر بس ایک پل کے لیے رکے تھے۔ اور اگلے ہی لمحے اس نے لالہ کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔ وہ کسمسا کے رہ گئی تھی۔

☆☆☆

لال حویلی کے سناٹے میں چوبدار دروازے کے کھلنے پر کسی آسیب کے پر کھلنے کی سی آہٹ پیدا ہوئی تھی۔ دل بری طرح دھڑک اٹھا تھا۔ ایک تو رات کا وقت، اوپر سے اس جگہ قدم دھرنا جہاں باء جی نے کسی کا بھی داخلہ سختی سے منع کر رکھا تھا۔ دل تھا کہ خوف سے لرزا جا رہا تھا لیکن اندر کے تجسس سے مجبور ہو کر بہرحال اس نے اندر آکے ہی دم لیا تھا۔ ضیا نے انہیں ابراہیم کے ہمراہ کچھ دنوں کے لیے گاؤں بھیجا تھا۔ باء جی خود بھی کام سے شہر گئے ہوئے تھے۔ ایسے میں وہ اس خوابیدہ جگہ کی مکمل سیر کرسکتی تھی۔ اس نے سب سے پہلے کمرے کی واحد قد آور الماری پہ لگے سارے سوئچ آن کردیے تھے۔ ہر طرف سے بند کمرا روشنی سے نہا گیا تھا۔ وہ کچھ دیر اس جنوں خیز جگہ کی ساری خوب صورتی سے نظروں کو خیرہ کرتی رہی۔ پھر دھیرے، دھیرے چلتی ایک، ایک کتاب کو چھو کر دیکھنے لگی...... وہاں ہر قسم کی کتب تھیں۔ علاقائی، غیر ملکی ادب سے، اردو ادب، عربی ادب، قرآن، حدیث سے متعلق تمام اہم کتب، شاعری کی کتابیں، جاسوسی مواد، تفریحی مواد، بچوں کی کتابیں، اسلامک اسکالرز کی اہم کتب...... فخر سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ کتنی محبت کرتے تھے اس کے باء جی اپنی کتابوں سے...... وہ بھی تو بالکل ان پر گئی تھی۔ اسے بھی تو اسی طرح کتابوں سے عشق تھا۔ اسے فخر سا محسوس ہوا، وہ اپنے باء جی کی طرح تھی۔ اور تبھی وہ ذرا آگے بڑھی تھی۔ اس کا شیفون کا دوپٹا دراز سے الجھا تھا اور اس کے تیزی سے آگے بڑھنے پہ دراز دوپٹے کے ساتھ کھسکتی کھلتی چلی گئی تھی۔ اوز گل نے حیرت سے اس کھلی دراز کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے کئی بار دیکھا تھا باء جی یہ دراز ہمیشہ لاک کرتے تھے... تو آج یہ کھلی کیسے رہ گئی تھی۔ وہ تیزی سے اسے بند کرنے کو آگے بڑھی تو دیکھا

در آئی حرف حرف میں مدحت کی روشنی

آقائے دو جہاںؐ ہیں ہدایت کی روشنی
یارب عطا ہو سب کو شفاعت کی روشنی
روشن رہے گی شمع رسالت کی روشنی
یعنی نبیؐ سے مہر و محبت کی روشنی
ساری ہی کائنات یہ ہلکی لگے مجھے
دل کو طلب ہے عشقِ رسالت کی روشنی
جی میں بسیرا آپ (ص) کی الفت نے کرلیا
در آئی حرف حرف میں مدحت کی روشنی
جا کر درِ رسولؐ سے واپس نہ آؤں میں
دل میں رہے نبیؐ کی اطاعت کی روشنی
پیارے نبیؐ (ص) پہ ختم ہدایت کا سلسلہ
ہے جاوداں ان کی نبوت کی روشنی
مجھ کو قرآن پاک ہی پڑھنا عزیز ہے
ہوتی ہے میرے اندر تلاوت کی روشنی

کلام: شگفتہ شفیق، کراچی

کہ لاک آدھا لگا ہوا تھا۔ مطلب باء جی نے تیزی سے لاک کیا تھا اور اسی لیے لاک صحیح بند نہیں ہوا تھا۔ لیکن انہوں نے یہی سمجھا تھا کہ لاک بند ہوگیا تھا۔ یہ کمرا وہ مہینوں میں کبھی کھولتے تھے۔ اور اسی لیے شاید انہیں ابھی تک اس دراز کو بند کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے دراز بند کرنے لگی کہ نظر اندر پڑی ایک فوٹو پہ ٹھہر سی گئی۔ یہ دو بچوں کی تصویر تھی۔ بارہ اور دس سال کے قریب کی عمروں کے وہ بچے بہت خوب صورت اور صحت مند تھے گہری سبز آنکھوں کو دیکھتے ہی وہ پہچان گئی تھی۔

''یہ تو باء جی ہیں......'' اس نے مسکراتے ہوئے فوٹو اٹھالی تھی اور تبھی اس کی نظر نیچے پڑی ایک بوسیدہ

ڈائری پر پڑی تھی۔ جسے دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ تقریباً تیس، چالیس سال پرانی تھی۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کے اس نے وہ ڈائری اٹھالی تھی۔ اور باء جی کی خوب صورت منقش کرسی پر بیٹھتے ہوئے ذرا سے خوفزدہ دل کے ساتھ اس نے ڈائری کا پہلا ورق پلٹا تھا۔

''میں سہراب علی خان...... آج قسم کھاتا ہوں...... آفتاب ولی خان کو کبھی معاف نہیں کروں گا...... ان کی وجہ سے میرے بابا کی جان گئی...... اور جان کے بدلے جان، عزت کے بدلے عزت...... مال کے بدلے مال...... میں اس خاندان کو، اس نسل کو ختم کردوں گا۔''

کسی ننھے بچے کی ہینڈ رائٹنگ میں لکھے لفظ اسے ساکت کر گئے تھے۔ چند لمحے یونہی ساکت بیٹھی وہ انہی لفظوں کو بار، بار دُہراتی رہی تھی۔ اور پھر اس نے تیزی سے ورق پلٹنا شروع کردیے تھے۔ اسے لگ رہا تھا وہ کوئی کہانی پڑھ رہی تھی...... بے حد طویل کہانی...... زندگی کی کہانی...... اور کہانیاں مختصر کہاں ہوتی ہیں...... اس نے بھی بیٹھے، بیٹھے ماضی کا سفر طے کیا بلکہ اب طے کرنا شروع کیا تھا۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی...... گلیوں کوچوں میں کتوں کے بھونکنے اور ٹڈوں کی گونجتی سیٹیاں سناٹے کا وجود چیرتی اور پھر وہی خاموشی طاری ہوجاتی۔ سنسان گلی میں رات کے اس پہر اس تنگ گلی کے سامنے کھڑی بڑی سی گاڑی سے چار نفوس نکلے اور گاڑی کی پچھلی سیٹ سے کسی بے جان وجود کو اٹھائے اس گلی میں داخل ہوگئے۔ ایک آدمی ان سب کے آگے تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھی اور وہ بے حد ہوشیاری سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک متوازی گیٹ کے قریب آتے ہی اس شخص نے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا تھا۔ انہوں نے وہ بے جان وجود وہیں چوکھٹ پر آرام سے ڈال دیا تھا۔

''تم سب جاؤ...... اور ہاں گاڑی اسٹارٹ رکھنا۔'' پستول تھامے شخص نے انہیں ہدایت کی...... وہ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے تیز قدموں سے واپس مڑ گئے تھے، اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جیب سے ٹیپ نکالی اور سامنے لگی بیل پر چپکا دی...... گھر میں تیز گھنٹی کی آواز گونج اٹھی تھی۔ وہ فوراً واپس مڑ گیا تھا۔ گھنٹی بجتی جارہی تھی۔

☆☆☆

حویلی کے طاقچوں میں رکھے دیے سرِشام ہی روشن کردیے جاتے تھے۔ بڑے، بڑے دالانوں کے سروں پر اتنے ہی بڑے الاؤ روشن ہوتے تو دن کا سا سماں بندھ جاتا تھا حویلی میں...... سرخ اینٹوں سے بنی یہ اونچے محرابوں والی حویلی ویسے تو لال حویلی کے نام سے مشہور تھی لیکن یہاں کے رہنے والوں کے حسنِ سلوک اور محبت کی وجہ سے امن کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

آفتاب ولی خان نہ صرف ملک کے جانے پہچانے سیاستدان بلکہ اس علاقے کے والی سمجھے جاتے تھے۔ سادہ اور نیک طبیعت کے مالک آفتاب خان ہردل عزیز شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں دیکھ کر غریبوں کے لبوں پر مسکان رقص کرنے لگتی تھی۔ اسفند یار علی خان اس کے دستِ راست تھے۔ ہر جگہ ان کے ساتھ ہوتے، اسفند یار نہ صرف یہ کہ ان کے بہترین دوست تھے بلکہ سگے چچازاد بھی تھے۔ چچا کی عیاشیوں کی وجہ سے اسفند یار گھر بار اور زمینوں کی وراثت سے ہاتھ دھو چکے تھے اور ان کی وفات کے بعد آفتاب ولی خان نے انہیں سگے بھائی کی طرح نہ صرف پناہ دی تھی بلکہ سنبھالا بھی تھا۔ وہ انہیں بالکل سگے بھائی کی طرح ہی عزیز تھے۔ اور خود اسفند یار علی خان بھی ان پر جان چھڑکتے تھے۔

یہ ایک ڈھلتی شام تھی۔ حویلی روشن ہونے لگی تھی۔ شام تک حویلی میں رہنے والی چہل پہل دم توڑ چکی تھی...... سکون سا ہر سو حصار کیے ہوئے تھا۔ جب تیز گاڑیوں کے چیختے انجنوں کے شور نے حویلی کا پُرسکون ماحول لرزا کے رکھ دیا تھا اور عصر کے وقت خوش باش مسکراتے چہرے کے ساتھ زمینوں پر جانے والے

اسفند یار علی خان چار کندھوں پر واپس آئے۔ آفتاب ولی خان پر کسی نے قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اسفند یار نے ان کے حصے کی گولیاں بھی اپنے سینے پر کھالی تھیں۔ آفتاب خان تو بال، بال بچ گئے تھے لیکن اسفند یار موقع پر ہی جان گنوا بیٹھے تھے۔ حویلی میں قیامت برپا ہوگئی تھی اور اسی دن چارپائی پر سفید لباس میں بے جان پڑے وجود کے ساتھ لگے سہراب علی خان کے سر پر آفتاب ولی خان نے دستِ شفقت رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''آج سے میرا ایک نہیں، دو بیٹے ہیں...... سہراب علی خان آج سے میرا بیٹا ہے۔'' اور وہ آنسوؤں سے دھندلاتی آنکھوں سے یہ نہیں دیکھ سکے تھے کہ گہری سبز آنکھوں میں کس قدر زہر اُمڈ آیا تھا، ان کے پہلو سے لگتے ہی اور پھر جنازہ اٹھتے ہی ماں کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے اس بچے نے زہریلے لہجے میں کہا تھا۔

''اماں...... میرے ابا کا قاتل ہے یہ...... اس نے اپنی جان بچانے کے لیے ابا کو مروا دیا۔''

''نہ بیٹا، ایسے نہیں سوچتے۔'' اماں نے روتے ہوئے اس ننھی جان کو خود میں سمیٹ لیا تھا۔

☆☆☆

نیند تو جیسے گھر کے باسیوں سے روٹھ سی گئی تھی۔ زرینہ گھر جا چکی تھیں، اقرا البتہ وہیں رک گئی تھی۔ سبین نے اسے زبردستی سلا دیا تھا لیکن خود مسلسل برآمدے میں ٹہلتی دعائیں مانگتی رہی تھیں۔ نانو بھی تسبیح کے دانے گراتی لالہ کے لوٹ آنے کی دعا میں مشغول تھیں۔ شاویز، لالہ کے کمرے میں اس کی کتابیں، نوٹس ایک، ایک کر کے دوبارہ چیک کرنے میں لگا تھا۔ اگر وہ کسی کے ساتھ انٹرسٹڈ تھی تو ضرور کہیں نہ کہیں اس آدمی کا نام نمبر لکھا ہونا چاہیے تھا۔ وہ خوش تھی تو اس کے لیے کافی تھا۔ لیکن وہ خوش تھی بھی؟ اس کی تسلی بہرحال اسے کرنی تھی، وہ اس کے کسی لڑکے کے ساتھ بھاگ جانے کا سوچ کر مطمئن نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس نے بہ مشکل کچھ کتابیں ہی چیک کی تھیں کہ ڈور بیل کی چیختی آواز نے رات کا سناٹا چیر کے رکھ دیا، آواز اس قدر تیز اور مسلسل تھی کہ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جاگری تھی۔

''شاویز......'' سبین بے اختیار اسے پکارتی گیٹ کی طرف لپکی تھیں۔ شاویز بھی تیزی سے ان کی طرف بھاگا تھا۔ گیٹ کے قریب جا کر ہی وہ ایک دم رکی تھیں۔ انہیں اپنے پیروں کی طرح اپنا دل بھی رکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ گھنٹی بجتی چلی جارہی تھی۔ جیسے گھنٹی بجانے والا ہاتھ رکھ کے اٹھانا بھول گیا تھا۔ شاویز نے بھاگ کے دروازہ کھولا تھا۔ چوکھٹ سے لگا بے جان سا وجود اندر کی طرف گرا تھا۔ چادر ڈھلک گئی تھی۔ لالہ کا ویران چہرہ ان دونوں کے سامنے تھا۔ سبین زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔

☆☆☆

جس طرح اچانک اس کا پروپوزل ریجیکٹ ہوا تھا۔ وہ واقعی اس کے لیے کافی پریشان کُن تھا۔ لیکن عین وقت پر امن کی پیشکش اور پھر اس کا خود اس پروجیکٹ میں دلچسپی لینا اسے واقعی خوشگوار حیرت میں ڈال گیا تھا۔ چند دنوں کے اندر ہی ان کی کوششوں سے وہ ایک دو اور بھی اچھے اسپانسرز لینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

لالہ کے معاملے میں جس وقت وہ شاویز کے ساتھ بزی رہا تھا۔ امن نے کنسٹرکشن کا سارا کام دیکھا تھا۔ وہ ایک دوست کی طرح اس کے شانہ بشانہ رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک مرتبہ پھر امن کی عزت مزید بڑھ گئی تھی۔

''مجھے لگتا ہے امن......! تم صرف اپنا وقت ضائع کررہی ہو۔'' امن رات گئے گھر لوٹی تو پاپا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

''ابھی تو وقت دے رہی ہوں پاپا اپنے اور باریال کے رشتے کو...... ضائع ہوتا ہے یا کامیاب، ہاں یہ وقت ہی طے کرے گا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

''میری دعا تمہارے ساتھ ہے ہمیشہ...... بس اس بار اگر ناکامی ہو تو پچھلی والی غلطی مت دُہرانا بیٹا۔''

انہوں نے اس کے گرد ہاتھ پھیلاتے ہوئے محبت سے کہا تھا۔

''تم جانتی ہو، تمہارے لیے بار یال بہت......
لیکن میرے لیے صرف تم ہو......صرف تم۔''

''بابا......'' وہ ان کے سینے میں سما گئی تھی۔ بیٹیوں کی سب سے مضبوط پناہ گاہ ماں، باپ کا سینہ ہی تو ہوتی ہے۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ چکا تھا۔ نشے کا خمار بھی...اتر چکا تھا۔ پھر وہ کتنی دیر چھت کو خالی، خالی نگاہوں سے تکتا بے سدھ لیٹا رہا تھا۔

بھلے رات وہ نشے کی حالت میں تھا لیکن ایک، ایک منظر اس کی یادداشت سے بالکل واضح چمٹ کے رہ گیا تھا۔ اس کے مضبوط شکنجوں میں پھر پھڑاتی وہ نازک سی چڑیا، اس کی گھٹی، گھٹی چیخیں، مزاحمت کرتے اس کے کمزور، نازک ملائم سے ہاتھ، بے اختیار وہ اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ سفید گلابی خوب صورت ہاتھ جنہوں نے کبھی کوئی سخت کام نہیں کیا تھا۔ کل رات کس قدر کھردرے ہوگئے تھے۔ نرم و ملائم ہاتھ اس کے ہاتھوں میں پھنس کر زخمی ہو رہے تھے۔

اس نے اپنے اوپر پڑا لا گیا کمبل اٹھا کے دور اچھال دیا تھا اور سلیپرز پہنتا باتھ روم میں آ گیا۔ سامنے لگے قد آور آئینے میں اس کا وجیہہ سراپا کس قدر شاندار تھا لیکن اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے سامنے پڑی خوب صورت کرسٹل بال اٹھا کے شیشے پہ ماردینی چاہی کہ ایک دم سراپا بدلا تھا۔ نرم و نازک، کومل سا سراپا کالی کٹورا آنکھیں، سمندر جیسی گہرائی لیے اور......

اور وہ یاقوتی لب......ننھا سا دہانہ، دھیرے سے مسکرانا پھر ایک دم جیسے درد سے نیلا پڑنے لگا تھا...... وہ یہ سب نہیں دیکھ سکتا تھا بھلے ہی وہ لالہ اور اس کی فیملی سے نفرت کرتا تھا، انہوں نے اس کے باپ کو سالوں رُلایا، اس کے چاچو، بوا سب کی موت کا باعث بنا تھا۔ پھر وہ بھی وہ اسے لالہ کو یوں تڑپتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے جھنجلاتے ہوئے وہ بال آئینے پر دے ماری تھی۔ شور سا ہوا تھا اور آئینہ چھناکے سے کرچیوں میں بکھر گیا تھا۔ وہ پریشان سا یونہی باہر آ کر بستر پر گر گیا۔ اسی وقت دروازہ کھلا تھا اور دھیرے، دھیرے قدم اٹھاتی زمزمہ اندر آئی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر زمزمہ کو دیکھا......زمزمہ کی آنکھوں میں ناراضی تھی، دکھ تھا، کرب تھا۔

''میں نے کہا تھا ناں خان...... اس لڑکی کو بچالو......لیکن......'' وہ جملہ مکمل نہ کر سکی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہوگئے تھے، صبح جس وقت لالہ کو وہاں سے لے کر گئے وہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی...... بے حس و حرکت لالہ اور نڈھال، گناہ کے بوجھ سے کپکپاتا وجود لیے ضیا......وہ بچی نہ تھی کہ کچھ سمجھ نہ پائی۔

''میں نے کچھ نہیں کیا زمزمہ......'' وہ دونوں ہاتھ بالوں میں الجھا گیا۔

''تم جانتی ہو میں ایسا کچھ نہیں کر سکتا......ضیا علی خان کو اپنا کردار کس قدر، اپنی انا کتنی عزیز ہے۔'' جھکی، جھکی پلکوں سے ندامت کا آنسو ٹپکا تھا۔ زمزمہ اس کے سامنے زمین پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔

''میں نے کہا تھا ناں خان، کچھ نشے اور حسن بہت طاقتور ہوتے ہیں۔ مدہوش کر ہی دیتے ہیں۔'' زمزمہ کا لہجہ بکھرا تھا۔ سر جھکائے بیٹھا ضیا رو رہا تھا۔ وہ مرد جسے وہ دنیا کا مضبوط ترین مرد سمجھتی تھی۔ کس طرح کمزور پڑ گیا تھا۔ برائی کی طرف کھینچ کھینچ کے لے جانے والے اس شخص نے ہمیشہ کس طرح اچھائی کی طرف خود کو مائل کیے رکھا تھا۔ لیکن اچھائی اور برائی کے دوراہے پہ چلتے، چلتے کبھی تو پھسلنا ہی تھا شاید......ٹھوکر لگنی ہی تھی......وہ مرد تھا۔ صاف راستہ چن سکتا تھا۔ صحیح راستہ چن سکتا تھا۔ لیکن اپنے باباجی کے لیے خود پر برائی کی چھاپ لگاتے، لگاتے وہ کس بری طرح برائی کی دلدل میں گرا تھا کہ سارا وجود ہی کیچڑ، کیچڑ ہو گیا تھا......زمزمہ کی آنکھیں بھی بھیگنے لگی تھیں۔

☆☆☆

وہ جیسے مٹی کا برتن تھی......
یا پھر کانچ کی گڑیا......
ایک ہی ضرب سے ٹکڑے، ٹکڑے ہوگئی تھی۔
کرچیوں کی صورت بکھری تھی۔

لالہ جب سے آئی تھی......سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی۔ اماں اسے خود سے لگائے بیٹھی تھیں۔ خود سے جدا کرنے پر راضی ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ سبین، شاویز، اقرا، حمزہ بار، بار اس سے پوچھتے، کریدنے کی کوشش کرتے اور وہ گم صم بس چپ چاپ ان سب کو دیکھے جاتی۔ اس کی ویران آنکھیں دیکھ کے سبین کا دل کٹ جاتا۔ لیکن ان کے بے حد اصرار پر بھی وہ کچھ بتانے پر راضی نہ ہوئی تھی نہ بولنے پر......اس کی چپ کسی طور ٹوٹنے پر نہیں آ رہی تھی۔

''اب بھی سب اس منحوس کو سینے سے لگا کر رکھو......ارے میں کہتی ہوں ایسی بھی کیا پٹی بندھی ہے اس کے عشق کی تم سب کی آنکھوں پر کہ اس کے وجود پر لگی غلاظت تم لوگوں کو نظر نہیں آ رہی۔'' زرینہ تو اطلاع ملتے ہی گھر پہنچیں تو اس پر ایسے حملہ آور ہوئیں کہ ابھی کچا چبا جائیں گی۔ اس وقت بھی شاویز نے لالہ کو ان سے چھڑوالیا اور اب ان سب کو یوں اس کے آگے بچھتے دیکھ کر ان کے سینے کی جلن مزید بڑھنے لگی تھی۔

''بس امی......'' ان کی زہر فشانیوں پر حمزہ ضبط کھوتے ہوئے چلایا تھا۔

''حد ہوتی ہے کسی بات کی بھی...... آپ کے مرحوم بھائی کی بیٹی ہے کم از کم اتنا ہی خیال کرلیں۔'' وہ لب کچلتے ہوئے بولا تھا۔

''ہائے، یہی تو افسوس ہے۔'' وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے دھاڑیں۔

''میرے اتنے شریف بھائی کے منہ پر کالک مل دی اس نے......ان کے کفن تک کو داغدار کر دیا اس منحوس نے......'' وہ بین کرنے لگی تھیں۔ شاویز کمرے کی دہلیز پر کھڑا بے بسی سے بت بنی بیٹھی لالہ کو دیکھتا رہا......مضبوط سی وہ لڑکی کس طرح بکھر سی گئی تھی۔ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا، وہ سب سمجھ سکتا تھا لیکن کیوں ہوا، کیا وہ خود گئی تھی یا پھر کون ایسا تھا جو اسے نقصان دے سکتا تھا۔ اس کا جواب صرف لالہ ہی دے سکتی تھی۔ اور اس کے لب تو یوں سلے تھے جیسے کبھی وہ بولی ہی نہ ہو۔

ڈور بیل کی تیز آواز پر وہ چونکا پھر تیزی سے سر جھٹکتا باہر نکل گیا۔ اس نے گیٹ کھولا، سامنے آغا کھڑا تھا۔

''اقرا کو بلادو، مجھے اقرا سے بات کرنی ہے۔'' اس نے سوچا تھا وہ کسی کام سے حمزہ کے پیچھے آیا ہوگا لیکن اس کے منہ سے اقرا کا نام سن کر اسے شدید دھچکا لگا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' شاویز کی آواز میں خود بخود غصہ اُمڈ آیا تھا، باہر آتے حمزہ نے اس کی آواز سن کر اس کی طرف پیش قدمی کی۔

''بدتمیزی......تم ایک منٹ کے لیے اقرا سے میری بات کروادو، بدتمیزی میں کر رہا ہوں یا تم...... پتا چل جائے گا......'' وہ شانے اچکاتا سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔

''تم ہوش میں تو ہو......'' اس بار ذرا آگے کو آنے والا حمزہ تھا۔

''تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی اقرا کا نام لینے کی۔'' حمزہ کی پیشانی پر سبز لکیریں تن سی گئیں۔ اندر سے زرینہ کے تیز، تیز بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

''اس بدذات کی وجہ سے اب گھر کے لڑکوں کی جان بھی خطرے میں رہے گی۔ ہائے کہاں چپ بیٹھیں گے میرے حمزہ اور شاویز...... یہ دشمنی تو نسلوں تک چلتی ہے۔ اب دیکھوں ذرا جا کر کس کے ساتھ بحث کرنے لگ گئے ہیں۔'' وہ شاید اسی طرف آ رہی تھیں۔ حمزہ خون آلود نظروں سے آغا کو گھور رہا تھا۔

''یار پلیز...... پہلے اقرا کو بلادو......پھر چاہے سارا دن مجھے دروازے پر کھڑے دیکھتے رہنا......بہت ضروری کام ہے مجھے اقرا سے۔'' باہر کی طرف آتی زرینہ، آغا کی آواز پہچان کر جھٹکے سے رکیں۔ دل کسی انہونی کے خدشے سے دھڑک اٹھا تھا۔

''کیوں......؟ کیوں بلائیں اقرا کو......کیا

کام ہے تمہیں اقرا سے۔'' شاویز، حمزہ کو پیچھے ہٹاتا خود آغا کے سامنے آیا اور قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

''کیونکہ یہ میرے شوہر ہیں شاویز بھائی۔'' ماں کے پیچھے کھڑی اقرا نے پورے اعتماد سے کہا تھا۔

''ہمارا نکاح ہوچکا ہے۔'' اس وقت ان میں سے کوئی بھی بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ آغا کے لبوں پر البتہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی۔

''جس دن لالہ آپی غائب ہوئی تھیں۔ اسی دن ہم نے بھی نکاح کیا تھا۔ میں آغا کے ساتھ ہی تھی۔ میں نے آپ لوگوں سے جھوٹ بولا تھا کہ میں دوستوں کے ساتھ تھی۔'' حمزہ کے ہاتھ اس کے پہلوؤں میں آگرے تھے۔ زرینہ یوں ساکت کھڑی تھیں جیسے کسی نے کھڑے، کھڑے ان کی روح نکال لی تھی۔

''بہت رہ لیا اقرا یہاں یا اپنے گھر جاؤ یا میرے ساتھ چلو...... ویسے بھی رقیبوں کا کیا بھروسا......'' وہ شاویز کو دیکھتے ہوئے اقرا سے مخاطب ہوا۔

''پھر تمہاری اماں جان کے ارادے تو ویسے بھی خطرناک ہیں۔''

''تم جاؤ، ہم آج شام گھر چلے جائیں گے۔'' اقرا نے وفاشعار بیوی کی طرح اسے تسلی دی۔

''چلو ٹھیک ہے، میں شام تک انتظار کروں گا۔'' وہ مڑنے لگا۔

''سنو......'' حمزہ کی آواز پر وہ رکا تھا۔

''اسے ابھی اپنے ساتھ لے جاؤ...... اقرا جاؤ چادر لے کر آؤ......'' اس نے اچانک فیصلہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ شاویز جہاں حیران ہوا تھا وہیں زرینہ کے بے جان ہوتے وجود میں حرکت ہوئی تھی ...... وہ بے اختیار آگے بڑھی تھیں۔

''ایسے کیسے حمزہ......؟'' وہ بہ مشکل بول پائی تھیں۔

''بیوی ہے وہ اس کی امی...... ایسے کیسے کا کیا مطلب......؟'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''لیکن لوگ کیا کہیں گے؟'' انہیں اپنی آواز پرائی، پرائی لگی تھی۔

''یہ تو آپ کو لالہ کے وقت بھی سوچنا چاہیے تھا ناں امی...... اب تو لوگ وہی کہیں گے جو کبھی آپ کہتی تھیں...... وقت کتنے خوب صورت انداز میں سب کچھ لوٹاتا ہے ناں امی......'' طنزیہ نظروں سے ماں کو دیکھتا وہ کاٹ دار لہجے میں بولا تھا۔ زرینہ اس بار کچھ نہ بول پائیں۔ آغا اب منتظر کھڑا تھا۔ اور زرینہ اس بار سبین کی طرح غرور سے نہیں کہہ پائی تھیں کہ......

''میری اقرا نے کچھ نہیں کیا......''

☆☆☆

''کیا کہہ رہے ہو شیرو؟'' بات اتنی بڑی تھی کہ وہ اتنی آسانی سے نہیں یقین کرسکتے تھے لیکن خبر دینے والا شیرو تھا۔ جو آج تک خبر لانے میں ہمیشہ سچا رہا تھا۔

''پکی خبر ہے خان...... اپنے بندے کو ان کے شہر والے فارم میں رکھا دیا تھا۔ اسی نے ساری معلومات دی ہیں، میں نے لڑکی اور اس کے گھر والوں کے بارے میں بھی کافی معلومات حاصل کرلی ہیں خان......'' وہ مؤدب لہجے میں بولا۔ اس کے لہجے کا اعتماد بتا رہا تھا واقعی خبر پکی تھی۔

''الیکشن کے دن ہیں خان...... خبر اتنی بڑی ہے کہ چاروں شانے چت گرے گا سہراب علی خان...... ایسی چوٹ تو ساری عمر اسے نہ پڑی ہوگی۔ بس کسی طرح اس لڑکی کے گھر والے مان جائیں۔ اتنا اچھا وکیل کریں گے کہ سہراب بچ سکے گا نہ اس کا بیٹا ضیا...... سیاست میں تو یہ خاندان ختم ہی ہوجائے گا...... اور اس کا نام ونشان بھی۔''

''یہ تو واقعی پتے کی بات ہاتھ لگی ہے۔ اب آیا ناں اونٹ پہاڑ کے نیچے۔'' وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولے۔

''سارے بدلے ایک ساتھ چکانے کا وقت...... ایک، ایک حساب دینا پڑے گا سہراب علی خان کو......'' وہ تنفر سے کہہ کر ہنسنے لگے تھے، شیرو نے ان کا ساتھ دیا تھا۔

(باقی آئندہ)

فرینڈشپ

شگفتہ بھٹی

منصور بیگ اور مائرہ کی شادی کوئی زبردستی کی شادی نہ تھی بلکہ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہوئی تھی... بہت شدید محبت...... اتنی کہ انہیں لگتا تھا وہ اگر رشتۂ ازدواج میں منسلک نہ ہوئے تو مرجائیں گے۔ دونوں کے والدین ان کی شادی پر راضی نہ تھے۔ ایک تو دونوں کے خاندان ایک ذات نہ تھے۔ دوسرا دونوں کی مالی حیثیت بھی ایک نہ تھی۔ مائرہ کے والد ایک اچھی سرکاری نوکری کررہے تھے، کچھ زمین جائداد بھی تھی جبکہ منصور



بیگ ایک چھوٹے سے دکاندار کی اولاد تھا۔ اس پر مشترکہ خاندانی نظام کا بوجھ بھی تھا۔

☆☆☆

''اٹھو مائرہ! جلدی کرو...... تیار ہو جاؤ......'' وہ آفس سے آتے ہی اسے تیار ہونے کو کہہ رہا تھا۔

''لیکن کیوں......؟'' اس نے ٹی وی کا ریموٹ اٹھا کر چینل بدلتے ہوئے کوئی خاص توجہ نہ کی۔

''بھئی کھانے کے لیے باہر جانا ہے...... کیوں کا کیا مطلب؟'' منصور بیگ نے باتھ روم کی طرف جاتے، جاتے رک کر اسے بتایا۔

''لیکن کھانا تو میں نے بنالیا تھا......'' وہ بدستور ٹی وی پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

''بنے ہوئے کھانے کو اٹھا کر فریج میں رکھ دو اور فوراً تیار ہو جاؤ......'' منصور نے عام سے انداز میں بیوی سے کہا اور منہ ہاتھ دھونے باتھ روم میں چلا گیا۔

''کیا مصیبت ہے...... بندے کا دل کہیں جانے کا ہو نہ ہو بس چلو...... عجیب مرضی کا مالک ٹائپ بندہ ملا ہے مجھے بھی...... بس جو اس کا دل کرے باقی سارے بھی وہی کریں...... جیسے اور تو کسی کی پسند ناپسند کچھ ہے ہی نہیں......'' اس نے ٹی وی کے ریموٹ کو بستر پر پٹخا اور بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپو! مما کا موڈ خراب ہو گیا ہے۔'' اسی کمرے کے ایک کونے میں اپنا اسکول بیگ سمیٹتے ہوئے رضوان نے ہولے سے اپنی بڑی بہن زہرہ کے کان میں کہا۔

''تم چپ چاپ یہاں سے چلو ہم باہر برآمدے میں چل کر تیار ہوتے ہیں۔'' زہرہ نے اس سے بھی آہستگی سے اسے جواب دیا اور اس کا اور اپنا دونوں کا اسکول بیگ سنبھالتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی...... رضی بھی اس کا بازو تھامے، تھامے اس کے ساتھ ہی باہر آ گیا تھا۔

''دیکھنا آپو! اب مما نہیں جائیں گی......'' وہ بہت ناامیدی سے منہ بسورے ہوئے تھا۔

''تم فکر نہ کرو بابا خود ہی انہیں منالیں گے...... آؤ ہم جلدی سے تیار ہوتے ہیں۔''

زہرہ کو اپنے بابا پر مکمل بھروسا تھا اس لیے وہ بےفکر تھی۔ بھائی کا ہاتھ کھینچتی ہوئی اسے برآمدے میں موجود دوسرے باتھ روم میں لے گئی...... وہیں پر اس برآمدے کو دیوار کھینچ کے آدھا کرتے ہوئے ان کا ایک چھوٹا سا کمرا بنایا گیا تھا جو پچھلے ہی برس مما اور بابا کے ایک بڑے جھگڑے کے بعد وجود میں آیا تھا ورنہ تو وہ دونوں بھی مما اور بابا کے ساتھ ہی اسی کمرے میں سوتے تھے۔ کمرا خاصا بڑا تھا۔

''ارے تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟'' باتھ روم سے واپس آ کر منصور نے جب مائرہ کو اسی حالت میں بیٹھے دیکھا تو وہ کچھ ناراضی سے بولا۔

''میرے سر میں درد ہے منصور!'' اس نے سر اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دباتے ہوئے کہا۔

''اچھا، ابھی راستے میں ڈسپرین لے لیں گے تم اٹھو تو......'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر ہی جیل اپنے بالوں میں لگا کر انہیں سنوارتے ہوئے بولا...... جس پر وہ مزید اینٹھ گئی۔

''دیکھو! میرے سر میں شدید درد ہے مجھے نہیں جانا کہیں بھی...... تم نے جانا ہے تو تم جاؤ۔'' وہ بجائے اٹھنے کے تکیہ سیدھا کرتی ہوئی لیٹ ہی گئی۔

''دیکھو! میں نے بچوں سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ آج انہیں باہر لے کر جاؤں گا اس لیے تم پلیز اٹھ جاؤ......'' منصور بیگ نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا جو اس وقت اسے مائرہ پر آ رہا تھا۔

''تو ٹھیک ہے بچوں کو لے جاؤ۔'' اس نے سپاٹ سا جواب دیا۔

''بچے صرف میرے ساتھ جا کر خوش نہیں ہوں گے۔'' وہ پھر بھی سمجھا رہا تھا۔

''تم نے تو انہیں ہی خوش کرنے کے لیے ان سے وعدہ کیا تھا ناں لہٰذا انہیں لے جاؤ اور خوش ہو جاؤ تم اور تمہارے بچے۔'' وہ ایک ایک لفظ چباتی ہوئی طنزاً سے بولی۔

''اچھا بکواس نہ کرو، نہیں جانا تو مت جاؤ...... ہر وقت نخرے ہی ختم نہیں ہوتے تمہارے۔'' اب وہ بھی

غصے میں آ گیا تھا۔

''آپو! میں نے کہا تھا ناں کہ اب ہم نہیں جائیں گے......'' برآمدے میں کھڑے رضی نے رو دینے والے انداز میں کہا۔ وہ دونوں بہن بھائی فٹافٹ تیار ہو چکے تھے اور اب برآمدے میں کھڑے تھے کہ اندر جائیں مگر منصور بیگ کی تیز آواز نے ان کے قدم وہیں پر روک دیے۔ دونوں کے خوشی سے لبریز دل غمگین ہو گئے تھے۔

''ہیں ناں آپو! اب تو ہم نہیں جائیں گے......؟'' وہ پھر بھی بہن سے پوچھے جا رہا تھا۔

''پتا نہیں رضی! تم چپ ہو کر بیٹھو......'' زہرہ نے پریشانی سے کہا۔ اس وقت وہ خود نہیں جانتی تھی کہ کیا ہوگا...... حالانکہ اس کا دل جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے اسی لیے خوف سے لرز رہا تھا اور اپنی معصوم خواہش کے ادھورا رہ جانے پر ہولے، ہولے رو بھی رہا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد اندر سے دونوں کے جھگڑے کی تیز آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔

''کیسی عورت ہو تم؟ ہر وقت تھکی اور بیزار رہتی ہو......'' منصور کے لہجے میں غصہ اور طنز دونوں شامل تھے مگر کچھ سچ بھی تھا جس پر وہ اپنے دفاع میں تلملا کر بولی۔

''بالکل بجا فرما رہے ہو۔ تھکی اور بیزار ہوں...... اپنا عیش کدہ دیکھا ہے...... جس میں آرام فرما، فرما کر میں تھک جاتی ہوں......'' اس کا اندازِ جرح زیادہ کٹیلا تھا جسے منصور بھلا کیوں برداشت کرتا۔

''کیا خرابی ہے یہاں...... اچھی بھلی تو رہ رہی ہو...... کھاتی پیتی ہو، عیش کرتی ہو اور پھر بھی غراتی ہو...... ناشکری تو تمہاری فطرت میں شامل ہے۔''

''ہاں، ہاں نعمتوں اور راحتوں سے بھرپور اس زندگی کا کیا ہی کہنا...... کاش کہ تم کبھی غور فرماسکو......'' وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی جس پر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔

''ہاں، ہاں پہلے تو جیسے بڑے محل میں رہتی آئی ہو جو مجھے طعنے دے رہی ہو۔''

''خبردار...... خبردار اگر میرے پچھلوں پر کوئی ہرزہ سرائی کی تو......'' وہ ہاتھ اٹھا کر باقاعدہ اعلانِ جنگ کر رہی تھی۔

''چلو، چلو جانتا ہوں میں بھی تمہارے پچھلوں کو۔ بڑے نواب تھے جیسے......'' اس نے اس کا اٹھا ہوا ہاتھ جھٹک کر خاصی بدتمیزی سے کہا۔

''وہ تم سے اور تمہارے پچھلوں سے تو اچھے ہیں...... اچھے نہ ہوتے تو بھلا مجھے بار، بار تلقین کرتے کہ تم جیسے شخص سے گزارہ کرتی رہوں......'' اس نے سیدھا اس کی ذات کو رگیدا جس پر وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔

''رضی! آؤ ہم اپنے کمرے میں چلیں......'' زہرہ نے چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ وہ جان چکی تھی اب اس کے پیارے سے بابا کیا کریں گے اور وہ یہ روز، روز کے جھگڑے دیکھ کر اتنا تو سمجھ چکی تھی کہ رضی جو کہ صرف آٹھ برس کا ہے اور اس کا دل بڑا نازک جبکہ دماغ بےحد معصوم اور کچا ہے اس پر والدین کے درمیان ہونے والی ایسی نازیبا گفتگو کا کیا اثر پڑ سکتا ہے...... حالانکہ وہ بھی تو ابھی صرف گیارہ برس ہی کی تو تھی۔

''آپو! رکو ناں...... ہو سکتا ہے ابھی ان کا جھگڑا ختم ہو جائے اور ہم باہر ہی چلے جائیں۔'' اسے اب بھی امید تھی۔ وہ حالات کے بہتر ہونے کی توقع رکھتا تھا...... اور پھر وہی ہوا جس کا یقین زہرہ کو ہو چکا تھا۔ منصور بیگ اور مائرہ نے خوب ایک دوسرے کو طعنے دیے، برا بھلا کہا۔ آخر میں منصور نے اردگرد کی جو چیز ہاتھ میں آئی اٹھا کر دیوار پر دے ماری اور گالیاں دیتا ہوا باہر نکل گیا جس پر مائرہ نے زور، زور سے روتے ہوئے اپنے نصیبوں کے برے ہونے کا کچھ دیر تک واویلا کیا...... پھر کچن میں جا کر اپنے لیے ایک مگ چائے کا بنایا اور جا کر پھر سے ٹی وی کا ریموٹ اٹھالیا۔

''آپو! اب مما کا غصہ کم ہو گیا ہے...... ہے ناں......؟'' اس کے ساتھ سہم کر چپکے ہوئے رضی نے ٹی وی کی آواز سن کر کہا۔

''ہاں...... شکر ہے اب وہ رو نہیں رہیں۔'' زہرہ نے طوفان کے تھم جانے کے آثار پا کر سکون کی سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

''آپو!'' وہ اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہوا مخاطب ہوا۔

''ہوں...... کیا بھوک لگی ہے؟'' وہ اس کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتی ہوئی بولی۔

''ہاں......'' اس نے معصومیت سے اقرار کیا۔

''اچھا...... میں کچن میں جا کر دیکھتی ہوں...... لاتی ہوں کچھ تمہارے لیے۔'' وہ اسے تسلی دیتی ہوئی اٹھی۔

''میں بھی آتا ہوں......'' وہ بھی زہرہ کا ہاتھ پکڑے، پکڑے اس کے ساتھ ہو گیا۔

''بریڈ پر جام لگا دوں......؟'' زہرہ نے فریج میں رکھی بریڈ دیکھ کر کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے......'' وہ ڈھیلے سے انداز میں بولا۔

''چلو دودھ میں روح افزا بھی ڈال دیتی ہوں......''

اس کا بنا ہوا منہ دیکھ کر زہرہ نے ایک مگ میں دودھ نکال لیا اور اس میں شربت ڈالنے لگی...... وہ جانتی تھی رضی کو بریڈ پر جیم لگا کر کھانا کچھ خاص پسند نہ تھا۔

''رضی! بابا ابھی کھانا لے آئیں گے...... فی الحال تم یہ لے لو۔'' اس نے چھوٹی ٹرے میں دودھ اور جیم والا سینڈوچ رکھ کر بھائی کو دیتے ہوئے ساتھ میں تسلی بھی دی۔

''ہاں! بابا ہمارے بغیر اکیلے کھانا نہیں کھائیں گے......'' رضی کو اپنے بابا کی عادت کا پتا تھا اس لیے بڑے اعتماد سے بولا۔

''پتا نہیں کیوں...... کیوں میں نے اس شخص سے شادی کر لی...... مت ماری گئی تھی میری......''

ماں کو فون پر کسی سے کہتے سن کر وہ دونوں لمحہ بھر کو برآمدے میں رکے۔

''چلو...... چلو رضی ہم اپنے کمرے میں چلیں......''

پھر اگلے ہی لمحے زہرہ بھائی کو وہاں سے لے گئی۔ وہ جانتی تھی اب رضی کئی سوال کرے گا...... ایسے سوال جن کے جواب اس کے پاس نہیں ہوں گے...... وہ اسے مطمئن نہ کر سکے گی...... اس لیے وہ اسے وہاں سے لے گئی۔

''کیا کروں...... تم ہی بتاؤ میں کیا کروں......؟''

''اور اگر تمہارا سہارا نہ ہوتو میں...... میں تو پاگل ہو جاؤں......'' ان کی مما کی سسکیوں کے درمیان ٹوٹتی ہوئی غمزدہ آواز ان کے کانوں تک اب بھی آ رہی تھی۔

☆☆☆

منصور بیگ اور مائرہ ان کے ماں، باپ کی شادی کوئی زبردستی کی شادی نہ تھی بلکہ دونوں کو ایک دوسرے سے شدید محبت ہوئی تھی...... خاندانی اونچ نیچ کے باوجود دونوں پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ مائرہ کی والدہ نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ یہ شاید زیادہ چلے گی نہیں۔

''مائرہ! جذباتی مت بنو...... یہ چار دن کی محبت کا جوش ٹھنڈا پڑے گا تو تمہیں اپنے کیے پر بہت پچھتاوا ہوگا......''

''مما! آپ فکر نہ کریں جب پچھتاوا ہوگا تو آپ کے ہاں واپس نہیں آؤں گی۔'' اس نے صاف منہ بھر کے کہہ دیا تھا۔

''لیکن تم ابھی بہت کم سن بھی ہو بیٹا...... سترہ برس کی عمر بھی بھلا گھر بسانے کی عمر ہوتی ہے؟'' اس کی مما نے ایک اور پہلو اجاگر کرتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اچھا آپ کی شادی کس عمر میں ہوئی تھی......؟''

اس نے الٹا بے شرمی سے پوچھ لیا تھا۔

''وہ زمانہ اور تھا......'' جواباً وہ بیچاری کچھ کھسیا سی گئی تھیں۔

''زمانہ...... زمانہ...... بس کریں مما! وہ زمانہ اچھا تھا، اب یہ زمانہ خراب ہے...... مجھے ایسی مثالیں نہ دیں...... بس میں نے کہہ دیا کہ منصور مجھے نہ ملا تو میں زہر کھا لوں گی......''

وہ دھمکی دیتی ہوئی چلی گئی اور یوں اس کے والدین نے اپنی بیٹی کی جان سے زیادہ اپنی عزت بچاتے ہوئے اس کی شادی منصور سے ہی کر دی...... منصور کو پا کر وہ واقعی بہت خوش تھی...... وہ اپنے ایک کمرے اور منصور کی قلیل آمدن میں بھی خود کو خوش قسمت ہی تصور کرتی تھی...... اوپر تلے دو بچے ہو جانے پر نہال اور خدا کی شکر گزار...... پھر...... پھر آہستہ، آہستہ اسے

جانے کیا ہوتا گیا...... بقول اس کے اسے شعور آنا شروع ہو گیا تھا...... وہ اپنی اس غلطی کو تسلیم کرنے لگی تھی جو بقول اس کی مما کے اس نے منصور سے شادی کر کے کی تھی...... اسے منصور کی کم آمدنی بری طرح سے کھلنے لگی تھی...... اور وہ بات، بات پر اس سے الجھنے لگی تھی...... منصور بیگ جو عادتاً غصے کا تیز اگرچہ دل کا بہت اچھا تھا...... وہ بھی زیادہ برداشت نہ کرتا اور یوں دونوں بیٹھے، بیٹھے جھگڑنے لگتے...... جیسا کہ آج ہوا تھا۔

''آپو!'' وہ سینڈوچ کھا کر اس کے ساتھ آ کر لیٹا تو بولا۔

''ہوں...... اب کیا بات ہے؟'' زہرہ نے مسکراتے ہوئے اس کے گالوں پر پیار سے بوسہ دیا۔

''یہ مما کو کیا ہو گیا ہے؟'' وہ پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔

''کیا...... کیا ہو گیا ہے مما کو......؟'' وہ جانتے ہوئے انجان بن کر بولی۔

''پہلے تو مما ایسی نہیں تھیں......'' وہ بدستور اپنی ماں کے بدلتے رویے پر پریشان تھا۔

''رضی! تم بہت بولتے ہو......'' وہ اس کا دھیان بٹانا چاہتی تھی۔

''بابا نے آخر مما کو وہ موبائل لے کر ہی کیوں دیا......'' وہ اپنے ایک ہاتھ پر دوسرے ہاتھ کا مکا بنا کر غصے سے مارتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

''موبائل فون......؟'' گیارہ سالہ زہرہ حیران ہی تو رہ گئی۔

''اور نہیں تو کیا...... جب سے وہ موبائل مما کے پاس آیا ہے مما تب سے ہی بابا کے ساتھ زیادہ جھگڑنے لگی ہیں...... اور وہ...... وہ جب دیکھو بابا کی شکایتیں لگا' لگا کر بھی روتی رہتی ہیں۔''

چھوٹا رضی تو بہت ہی غصے میں تھا۔

''دیکھو رضی! میں مما سے کہہ دوں گی تم انہیں برا کہہ رہے ہو۔'' زہرہ نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں مما کو کب برا کہہ رہا ہوں۔'' وہ کچھ ڈر سا گیا۔

''اور نہیں تو کیا...... ابھی تو کہہ رہے تھے کہ مما موبائل پر بابا کی شکایتیں لگاتی ہیں۔'' اس نے فوراً ہی اسے یاد دلایا۔

''سوری آپو......'' وہ شرمندہ ہو گیا۔

''چلو اب سو جاؤ ورنہ صبح اسکول سے دیر ہو جائے گی۔'' اس نے بھائی کو اپنے ساتھ لگا لیا اور تھپکنے لگی۔

''مما کو کیا ہو گیا ہے؟'' رضی کچھ ہی دیر میں سو گیا تو اس کا معصوم ذہن خود سے سوال کرنے لگا اور وہ سوچنے لگی۔

''ہماری مما کتنی اچھی تھیں...... ہم سے کتنا پیار کرتی تھیں...... بابا سے جھگڑا بھی کم ہی کرتی تھیں اور جب جھگڑا ہو جاتا تو وہ کچھ ہی دیر کے بعد بابا کو چائے بنا کر دیتیں اور یوں دونوں کی صلح بھی ہو جاتی تھی...... لیکن اب...... اب تو مما جھگڑا کرنے کے بعد بابا کو چائے بنا کر بھی نہیں دیتیں بلکہ خود اپنا مگ بناتی ہیں اور پھر وہ اپنے موبائل پر باتیں کر کے روتی جاتی ہیں اور چائے پیتی رہتی ہیں۔'' اسے بھی اس وقت رضی کی بات درست لگ رہی تھی کہ...... ''جب سے یہ موبائل آیا ہے، مما، بابا سے کچھ زیادہ

اجازت دیجیے

ڈاکٹر صاحب مریض کو آپریشن روم میں لے جا چکے تھے اور آپریشن کی تیاری میں مصروف تھے۔ اچانک ڈاکٹر نے مریض کو مخاطب کر کے کہا۔ ''میں آپ کو کسی غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا، یہ ایک خطرناک آپریشن ہے۔ ایسے آپریشن میں پانچ آدمیوں میں سے صرف ایک ہی صحت یاب ہوتا ہے۔ اس سے قبل کہ میں اپنا کام شروع کر دوں اگر کوئی ایسی بات ہو جو میں آپ کے لیے کر سکوں۔ بلا تکلف فرما دیجیے۔''

''میں آپ کا احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا۔'' مریض نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''میرے کپڑے اور جوتے منگوا دیجیے اور اس کے بعد مجھے اجازت دیجیے۔''

مرسلہ: تابندہ نعیم...... کوہاٹ

ہی جھگڑا کرنے لگی ہیں۔'' اس نے اپنے گالوں پر پھسلتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے دکھ سے سوچا۔

''کاش مما کی برتھ ڈے پر بابا انہیں یہ موبائل نہ لاکر دیتے...... لیکن مما کس سے اتنی باتیں کرتی ہیں......؟ اور اپنی اور بابا کی ساری باتیں کس کو بتاتی رہتی ہیں.........؟ .... نہ ہماری طرف دھیان کرتی ہیں...... نہ بابا سے صلح کرتی ہیں...... مما کو آخر کیا ہوگیا ہے......؟''

اس کے چھوٹے سے ذہن میں ڈھیروں معاملات کانٹے بن کر چبھ گئے اور کتنی ہی دیر تک اسے نیند نہ آئی۔

☆☆☆

''اوہ...... صبیح تم کتنے اچھے ہو......'' وہ مسکراتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

''کہاں اچھا ہوں...... اچھا ہوتا تو تمہارا دکھ خود نہ اٹھالیتا......'' دوسری جانب سے کسی نے بڑی نرمی سے کہا تھا۔

''مما! مجھے انگلش گرائمر نہیں آتی...... یہ جملہ تو درست کرادیں......''

رضی اپنی مما کا کندھا بار، بار ہلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں تھا جواب بھی موبائل کان سے لگائے مصروفِ گفتگو تھی۔

''یہ تمہارا ہی تو سہارا ہے جو میں اپنے غم تم سے شیئر کرلیتی ہوں......'' وہ کہہ رہی تھی۔

''میں تم سے اور کچھ نہیں چاہتی...... میرے نصیبوں میں جہاں اتنے مسائل ہیں وہاں تمہاری دوستی میرے لیے ایک نعمت ہے...... مجھے پورا بھروسا ہے کہ تم میرے مخلص دوست ہو...... خدا کا شکر ہے کہ میں نے تمہاری ریکوئسٹ کا جواب دے دیا اور یوں مجھے ایک مخلص دوست مل گیا ورنہ منصور کے پاس نہ تو وقت ہے نہ ہی احساس کہ وہ میرے درد کو سمجھ سکیں، میرے مسائل کو جانیں، میری طرف دھیان دیں۔'' مائرہ نے رضی کی انگلش کی گرامر کی کاپی ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔

''مما پلیز! بس کریں فون پر باتیں کرنا اور مجھے ہوم ورک تو کرادیں......'' رضی ذرا بدتمیزی سے بولا۔

''آؤ بھائی! میں کرادوں آپ کو ہوم ورک۔''

قریب بیٹھی زہرہ نے کاپی اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بہت پیار سے کہا۔

''ہاں آپو! یہ دیکھیں اس جملے کی انگلش ٹرانسلیشن کردیں۔'' رضی نے کاپی بہن کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

''پرویز، دانیہ کی بہت اچھی سہیلی ہے۔'' زہرہ اس کی کاپی پر یہ جملہ لکھا دیکھ کر زور، زور سے ہنسنے لگی۔

''کیا ہوا آپو!'' وہ بہن کو یوں ہنستا دیکھ کر پریشانی سے بولا۔

''پاگل! یہ جملہ تم نے غلط لکھا ہے...... پرویز، دانیہ کی سہیلی نہیں...... پرویز، دانیہ کا دوست ہے...... یوں لکھو......'' اس نے رضی کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

''لیکن آپو! دادی اماں نے تو بتایا تھا کہ لڑکے، لڑکیوں کے دوست نہیں ہوتے۔'' وہ معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

''ہاں...... وہ کہتی ہیں کہ لڑکیوں کی تو سہیلیاں ہوتی ہیں اور لڑکوں کے دوست۔'' زہرہ کو بھی اپنی دادی جان کی بات یاد آئی تو وہ بھی تذبذب کا شکار ہوگئی۔

''اس کا مطلب ہے وہ موبائل والے صبیح انکل بھی ہماری مما کے دوست نہیں ہیں جن کے ساتھ مما ہر وقت باتیں کرتی رہتی ہیں۔'' رضی نے اپنی مما کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قدرے آہستگی سے کہا تاکہ وہ سن نہ لیں...... اور اس پر خفا نہ ہوں۔

''ہاں، وہ ہماری مما کے دوست نہیں ہوسکتے......'' زہرہ نے کچھ سمجھتے اور کچھ نا سمجھتے ہوئے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

''اچھا تو آپو...... پھر صبیح انکل ہماری مما کے کیا لگتے ہیں......؟'' رضی نے بھولپن سے پوچھا۔

جہاں زہرہ نے جھٹ سے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھنے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا وہیں مائرہ کے ہاتھ سے بھی موبائل اچانک ہی گر چکا تھا...... شاید اس نے رضی کی وہ دھیمی سی آواز بھی سن لی تھی۔

''تو پھر صبیح انکل ہماری مما کے کیا لگتے ہیں؟''



عید کے رنگ خوشیوں کے سنگ

صبا آصف

''ریان تم کہہ رہے تھے کہ ایک دو دن میں بونس مل جائے گا، کیا ہوا ملا یا نہیں......؟''

''جی ماما مل گیا۔''

''تم نے بتایا بھی نہیں۔'' وہ خفا ہوئیں۔ ''ہاں بھئی اب تو ماں سے پیسہ چھپایا جائے گا' یہ دن بھی دیکھنا تھے مجھے۔''

''ماما، میں بتانے ہی والا تھا کہ آپ نے پوچھ لیا۔ ابھی تو آپ کے سامنے گھر میں داخل ہوا ہوں۔''

ریان شرمندہ سے ہوکر بولے۔

''ہم روز پوچھتے ہیں بونس کب مل رہا ہے۔ تم آج کل پر ٹال رہے تھے، ہاں بیوی بچے شاپنگ پر جانے کو تیار۔''

''آپ سے کس نے کہا؟'' زونیرہ کی رنگت زرد پڑ گئی۔

''تمہاری تیاری نے۔'' انہوں نے خفگی سے زونیرہ کے نک سک سے درست حلیے پر نظر ڈالی۔

''رانیہ اور بلال کہہ رہے تھے کہ ہم آج عید کی شاپنگ کرنے جائیں گے، اپنے ماما، بابا کے ساتھ۔''

''ماما...... وہ زونیرہ نے بچوں کو بہلانے کو کہہ دیا ہوگا۔''

''بھئی کیوں کہہ دیا؟''

''تو کیا بہلاوا بھی نہ دیں بچوں کو۔'' ریان تلخی سے بولے۔

''نہیں کیوں نہیں۔'' ماما بگڑ کر بولیں۔ ''آج بہلاوا دیا ہے کل لے کر بھی جاؤ گے۔'' ریان ایک لمحے کو ساکت ہوئے۔ (بس وہ لمحہ ہی آگہی کا تھا)

''کیا تم دونوں کو معلوم نہیں چھوٹی بہن کی شادی کے بعد پہلی عید ہے۔ دونوں میاں، بیوی اور ساس، سسر کے شاندار سے جوڑے، چھوٹی کے لیے سونے کا کوئی زیور، شوہر اور سسر کے لیے گھڑیاں، سویاں، میوہ، پھل، مٹھائی اور ہاں چھوٹی کہہ رہی تھی کہ اس کی نندوں، جیٹھ کے بچوں کے لیے چوڑیاں اور عیدی وغیرہ ہو۔''

''ماما آخر یہ چھوٹی کب بڑی ہوگی۔'' ریان جھنجلا کر بولے۔

''جب ماما کی گود سے نکلے گی۔'' زونیرہ زیرِ لب بولی۔ باوجود جھنجلاہٹ کے ریان بے ساختہ مسکرا دیے۔

''ریان میاں ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ آپ بیوہ ماں کے اکلوتے بیٹے اور پانچ یتیم بہنوں کے اکلوتے بھائی ہیں۔ آپ کے کاندھوں پر بڑی بھاری ذمے داریاں ہیں اور کوئی بھائی تو ہے نہیں کہ آدھا بوجھ اس پر ڈال دوں جو کرنا ہے آپ کو ہی کرنا ہے۔'' ماما جب شدید غصے میں ہوتیں تو آپ جناب پر اتر آتیں۔

''ماما میں نے اپنی ذمے داریاں ہمیشہ بہت اچھے سے نبھائیں اور انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی نبھاؤں گا پھر اس یاددہانی کا کیا مطلب.....؟'' وہ ذرا کی ذرا رکے۔ ''ماما اکلوتا ہونا میری سزا ہے کیا؟'' وہ بڑی دل سوزی سے پوچھ رہے تھے۔

ایک لمحے کو ماما کے دل کو کچھ ہوا۔

''ماما میں نے اکلوتے بیٹوں کو اکثر عیش و آرام کی زندگی گزارتے دیکھا ہے، سلمان ماموں کے عمران بھائی، تایا ابو کے بیٹے زبیر بھائی اور خالہ جان کے اسد کیا ٹھاٹ کی زندگی گزار رہے ہیں اماں، بہنیں صدقے واری جاتی ہیں راوی چین ہی چین لکھتا ہے، میں پندرہ برس کی عمر سے (والد کی وفات کے بعد سے) یہ بات یاد رکھے ہوئے ہوں کہ میں اکلوتا بیٹا اور اکلوتا بھائی ہوں اور پچھلے دس سال سے زونیرہ کو بھی یہ بات ذہن نشین ہو چکی ہے کہ وہ اکلوتی بہو اور بھاوج ہے۔ ماما آپ نے ہمیشہ ماں اور بہنوں کے حقوق کی بات کی۔ لیکن کبھی یہ یاد نہیں کروایا کہ بیٹے اور بھائی کے ساتھ ساتھ میں اب ایک شوہر اور باپ بھی ہوں اور میرے کاندھوں پر ایک بیوی اور تین بچوں کی ذمے داری بھی ہے، میں خود یہ بات بھولے ہوئے تھا یا جان بوجھ کر بھولنے کی کوشش میں تھا۔ صرف آپ کی تابعداری میں۔ زونیرہ نے بھی کبھی مجھے یاد نہ دلایا۔ لیکن...... میرے بچے یہ بات بھولنے کو تیار نہیں کہ میں ان کا بابا جانی ہوں اور ان کی یہ یاددہانی مجھے اچھی لگی، میں اپنی کوتاہیوں کا بھرپور ازالہ کروں گا۔''

ماما ایک ٹھنڈی آہ بھر کر انہیں بغور دیکھنے لگیں۔

''ماما ایک دن میں بچوں کے کمرے میں گیا اندر سے آتی ہوئی آواز پر میں باہر ہی رک گیا، رانیہ اپنی ماما سے فرمائش کر رہی تھی کہ میں اس عید پر بہت اچھی سی میکسی لوں گی اور دو سوٹ اور لوں گی اپنی پسند سے۔

میری سب دوستوں کے عید پر چار، چار جوڑے بنتے ہیں' کھلونے بھی آتے ہیں اور وہ لوگ گھومنے بھی جاتے ہیں ہم تو نانی جو کپڑے دیتی ہیں اور بڑی ماما (دادی) جو کپڑے لاتی ہیں وہی پہن لیتے ہیں، میں اس دفعہ اپنی پسند سے کپڑے لوں گی۔''

''ماما، رانیہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے، میرے دوست عید کی شاپنگ اپنے ماما، بابا کے ساتھ کرتے ہیں اور اپنی پسند سے کپڑے لیتے ہیں،ہم تو عید پر کہیں گھومنے بھی نہیں جاتے۔'' بلال بھی بولا'' اور محمد سعد اور ماریہ (پھوپیوں کے بچے) ہر عید پر اپنی نانی کے گھر آتے ہیں اور وہ تو عید کے بعد مری' ایوبیہ بھی گئے تھے گھومنے......بس ٹھیک ہے میں بھی بابا سے بات کروں گا وہ ہمیں اس عید پر شاپنگ بھی کروائیں اور گھمانے بھی لے کر جائیں۔'' مجھے اس کی بات پر ہنسی بھی آئی اپنے فرائض سے کوتاہی پر افسوس بھی ہوا......میں جب کمرے میں داخل ہوا تو زونیرہ کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے، زونیرہ نے رخ موڑ کر اپنے آنسو تو چھپا لیے لیکن بچوں کو چپ نہ کرواسکی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں سب کچھ سن چکا ہوں۔ پھر کمرے میں آکر جب میں زونیرہ سے پوچھا تو وہ رو پڑی اور بولی۔''ریان میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی پچھلے سال سے بچوں کا یہ مطالبہ ہے اس دفعہ تو وہ کچھ سننے کو تیار نہیں اور بچے اب بڑے ہوگئے ہیں ایان ابھی چھوٹا ہے کل وہ بھی یہی کہے گا اگر آپ اجازت دیں تو میں بچوں کے اسکول میں جاب کرلوں۔ آٹھ دس ہزار تو دے ہی دیں گے۔''

''ماما میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اجازت دے دی اب دو ماہ کی تنخواہ ہے اس کے پاس' وہ اپنے بچوں پر خرچ کرنا چاہتی ہے۔ ایک عورت کمزور ہوسکتی ہے ایک بیوی کمزور ہوسکتی ہے۔ لیکن ایک ماں کبھی کمزور نہیں پڑتی۔ ماں بہت طاقتور ہوتی ہے وہ اپنی حق تلفی برداشت کرسکتی ہے لیکن اپنے بچوں کی نہیں......میرے بچے احساسِ کمتری کا شکار ہورہے ہیں، وہ اپنا مقابلہ

اپنے دوستوں اور کزنز سے کر رہے ہیں۔ وہ بھی تہوار اپنے انداز سے منانا چاہتے ہیں۔ محبتوں اور خوشیوں سے محروم بچے نافرمان اور باغی ہو جاتے ہیں اور میں نہیں چاہتا میرے بچے کل کو نافرمان اور باغی ہوں اور اپنی دادی اور پھپو کے لیے کوئی عناد پالیں۔ میری خواہش ہے کہ ان کے دلوں میں آپ لوگوں کے لیے عزت اور محبت ہو اور میری بیوی نندوں کے آنے پر گھر کے ساتھ، ساتھ دل کے دوازے بھی وا رکھے۔ میں یہ بات اب ہمیشہ یاد رکھوں گا کہ میں ایک بیٹا اور بھائی ہونے کے ساتھ، ساتھ ایک شوہر اور ذمّے دار باپ بھی ہوں۔''

ماما دم بخود یہ سب سن رہی تھیں' وہ ایک لفظ بھی نہ بولیں، بولتیں بھی تو کیا بولتیں۔ اس دوران چوتھے نمبر کی بہن نادیہ آ گئی تھی، وہ خاموشی سے بغیر دخل دیے بھائی کی سب باتیں سن رہی تھیں۔

''مجھے بھی ارمان تھا کوئی میرا بھی خیال کرتا، اکلوتا ہونے کے ناتے میرے بھی ناز اٹھائے جاتے، ماما آپ کے اور تینوں بڑی بہنوں کے حوالے سے میں بھولے سے بھی اپنی یادوں میں کوئی جگنو نہیں پاتا. ہاں بابا جان اور نادیہ کے حوالے سے کچھ خوشیوں بھری یادیں ہیں کچھ جگنو ہیں ان کی روشنی ہے میری زندگی میں۔ میں نے سب کا خیال کیا، سب کے ناز اٹھائے۔ میرے ناز کون اٹھائے گا۔'' دکھ سے ریان کی آواز بھاری ہو گئی۔

''ہم اٹھائیں گے اپنے اکلوتے بھائی کے ناز۔'' آنسوؤں سے بھیگے چہرے کے ساتھ نادیہ آگے بڑھی اور بھائی کو بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔

''نادیہ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ارمان تو ماما کا ہے بڑی بہنوں کا ہے، تم نے ہمیشہ بہن ہونے کا حق ادا کیا چھوٹی ہوتے ہوئے بھی بڑی بہنوں کا سا خیال رکھا۔'' ماما جو کہ خاموش بیٹھی تھیں انہوں نے بھی ایک دم بڑھ کر ریان کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور روتے ہوئے بولیں۔

''میرے بچے مجھے پتا ہی نہیں چلا میں کب تم سے دور ہو گئی، بیٹیوں کو محرومیوں سے بچانے اور انہیں خوشیاں دینے کی خواہش کب جنوں بن گئی۔ خواہشیں جب حد سے بڑھ جائیں تو جنوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، میں بھی جنونی ہو گئی اس جنون میں یہ بھول گئی کہ تم میرے اکلوتے بیٹے ہو اور خوشیوں کے اتنے ہی حقدار جتنی کہ پانچوں بہنیں۔ بس یاد رہا تو اپنی محرومیاں میں اپنے اکلوتے بھائی کی ڈسی ہوئی تھی۔ ہم بھی پانچ بہنیں اور ایک بھائی تھے۔ والدین کے بے جا لاڈ پیار نے اسے اتنا خودسر بنا دیا کہ وہ ہمارے ماں، باپ کا بیٹا نہیں بلکہ باپ بن بیٹھا۔ پہلے والدین کو اس کے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا تھا اب اسے اپنے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ والدین بھی نہیں، بچپن ہی سے ہم بہنیں محرومیوں کا شکار رہیں، شادیوں کے بعد بھی بھائی نے کبھی پلٹ کر نہ پوچھا، وہ تو جو تھے سو تھے آنے والیں ان سے بھی سوا تھیں۔ ہمارے اکلوتے بھائی کی بیوی کا دماغ بھی ساتویں آسمان پر پہنچ گیا حالانکہ اپنی بہنوں میں ان کا ساتواں نمبر تھا۔ میکے کی ہر محرومی سسرال میں دور کرنا اور ہر ادھورا ارمان پورا کرنا سسرال میں فرض جانا۔ ہر دفعہ اکلوتی بھاوج ہونے کا نعرہ لگتا' ان میاں، بیوی نے ساری عمر ''حقوق ہمارے فرائض تمہارے'' کا کھیل کھیلا۔ بس بیٹا یہ سب دیکھ کر میں نے الٹا چکر چلا دیا' بچپن ہی سے تمہیں زیادہ محبت اور توجہ نہ دی، ہمیشہ یہی خدشہ رہا کہ بہت زیادہ لاڈ پیار اور آسائشیں پا کر کہیں تم بھی میرے بھائی کی طرح خود غرض نہ ہو جاؤ، تمہاری ذات کی نفی کرتی رہی، تمہاری شخصیت کو دباتی گئی' نادیہ اکثر مجھے احساس دلاتی اور کبھی، کبھی مجھے خود بھی احساس ہوتا لیکن میں سب ٹھیک دیکھ کر پھر بے حس بن جاتی بس ایک ہی خوف رہتا کہ اگر میں نے ذرا سی بھی نرمی برتی تو سب غلط ہو جائے گا۔ میں نے بیٹا بہت غلطیاں کیں زونیرہ کے جہیز بری کے زیور اور کپڑے تک اپنی بیٹیوں کے جہیز میں دے دیے جبکہ نادیہ مجھے بہت ٹوکتی تھی مگر مجھ پر

جانے کیا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ میرے اندر کے خوف نے کبھی مجھے تمہارے لیے کچھ اچھا نہ کرنے دیا۔'' ماما کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں۔

''بیٹیوں کے فرض پورے کرنے اور انہیں خوشیاں دینے میں اتنی محو ہو گئی کہ یہ بھی بھول گئی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بیٹا بھی عطا کیا ہے اور جسے میں نے بڑی منتوں' مرادوں سے حاصل کیا۔'' آنسو قطار در قطار ان کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

''نادیہ کے احساس دلانے پر اور کبھی، کبھی زونیرہ کا اداس اور خاموش چہرہ اور شکوہ کناں نظریں مجھے اندر تک جھنجوڑ دیتے۔ عید تہوار پر تمہارا خاموش رویّہ مجھے احتجاج کرتا ہوا محسوس ہوتا لیکن میں نظر انداز کرتی جاتی کہ اگر میں نے ذرا سی بھی ڈھیل دی تو معاملہ بگڑ جائے گا اور معاملہ پھر بھی بگڑ گیا تم دونوں نے آٹھ، دس سال صبر و شکر سے گزار دیے لیکن اولاد واقعی بڑی پیاری ہوتی ہے۔'' زونیرہ نے آگے بڑھ کر ساس کو سنبھالا۔

''اس گھر میں میری حق تلفی ہی نہیں ہوئی مجھے اس گھر سے بہت سی خوشیاں بھی ملیں ماما، بری کے دو تین سوٹ جو ریان کو بہت پسند تھے وہ نادیہ عید پر میرے لیے تحفے کے طور پر لے آئی میں نے بہت منع کیا ریان بھی ناراض ہوئے لیکن وہ نہ مانی اور رانی ہار والا سیٹ وہ تو نادیہ نے کبھی پہنا ہی نہیں۔ کہتی ہے بھابی وہ آپ کا ہی ہے۔'' ماما کے آنسو اور زیادہ شدت سے بہنے لگے تھے۔ نادیہ کو ہمیشہ سے ہی احساس تھا بعض مرتبہ تو وہ رو پڑتی تھی۔

صورتِ حال خاصی سنگین ہو گئی تو ریان گھبرا گئے ''توازن' اُن کے ذہن میں کلک ہوا۔

''ارے چھوڑیں ماما، نادیہ نے تو ہمیشہ ہی میرا احساس کیا۔'' ریان خود بھی ہنس پڑے (اپنی ہی کہی ہوئی باتوں پر) یہی ان کا مقصد تھا ماحول کو خوشگوار بنانا سو ریان نے شکوؤں اور کوتاہیوں کو مزاح کا رنگ دیا اور ماحول کو ہلکا پھلکا بنا دیا۔ سب ہنس رہے تھے۔

ریان کے لیے تو یہی کافی تھا کہ انہیں اپنی زیادتیوں کا احساس ہو گیا تھا۔

''ماما۔'' ریان ماں کے نزدیک ہوئے۔

''جی ماما کی جان۔'' وہ بہت سا پیار اپنے لہجے میں سمو کر بولیں۔

''ماما مجھے آپ......'' وہ جملہ مکمل نہ کر پائے۔

''ہاں، ہاں کہو بیٹا رک کیوں گئے۔'' وہ متوجہ ہوئیں' وہ سمجھ رہی تھیں کہ وہ کوئی بڑی فرمائش کرے گا کہ گھر میرے نام کر دیں، زمینوں کی آمدنی میں سے کچھ مانگے گا دکانوں والا مکان اپنے نام کروانے کی بات کرے گا' وہ اب سب کچھ کرنے کو تیار تھیں بچپن سے اس کی حق تلفی ہو رہی تھی صد شکر کہ تلافی کے لیے وقت تھا' وقت گزرا نہیں تھا۔ بیس برس کی عمر سے ذمّے داریاں نبھا رہا تھا۔ دس سال سے زونیرہ بھی اس کے ہم قدم تھی اس نے اپنے لیے تو کبھی کچھ نہیں مانگا تھا ہمیشہ دیے ہی گیا روپیہ، پیسہ، محبت، احترام، شفقت اب اس کی باری تھی کہ اسے لوٹایا جائے وہ ہر وہ کچھ کرنے کو تیار تھیں جو اس کے بہترین ہو۔

''ہاں بولو بیٹا۔'' انہوں نے حوصلہ دیا۔

''ماما مجھے معاف کر دیں' میں نے آپ سے جو یہ سب کہا میں یہ سب کہنا نہیں چاہتا تھا، آپ کی ایک نہیں نے میرا دل چیر کر رکھ دیا تھا اور میں وہ سب کہہ گیا جو میں کہنا نہیں چاہتا تھا، کہنا چاہنا تو درکنار کہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔'' وہ بولا بھی تو کیا مانگا بھی تو کیا...... معافی...... واقعی وہ ہیرا تھا وہی جوہری نہ تھیں کہ اسے پرکھ نہ سکیں۔ ان کی آنکھیں خوشی سے بھر آئیں۔

''کس بات کی معافی......؟'' وہ نم لہجے میں بولیں فرطِ محبت سے انہوں نے ریان کا منہ چوم لیا تھا۔ اتنا بڑا دل' ایسی اعلیٰ ظرفی، وہ دل سے قائل ہوئیں۔

''معاف تو تم دونوں مجھے کر دو۔'' انہوں نے دونوں ہاتھ ریان اور زونیرہ کے سامنے جوڑ دیے۔

''ماما۔'' ریان تڑپ ہی گئے ماں کے بندھے

ہاتھ کھول کر چوم کے آنکھوں سے لگا لیے......

''نہیں، ماما نہیں میں نے تو صرف معافی مانگی ہے آپ کی شرمندگی نہیں۔''

''کس بات کی معافی بیٹا، میں تم سے ناراض نہیں ہوں خوش ہوں کہ تم نے مجھے میرے اندر کے خوف سے نجات دلائی اور اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دہی سے بھی بچالیا، تم دونوں معاف کردو گے تو اللہ بھی مجھے معاف کردے گا۔''

''بس ماما آگے ایک لفظ بھی نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ مسکرائیں۔

''آج سے تمہاری ساری تنخواہ تمہارے اور تمہارے بیوی بچوں کے لیے ہوگی، نہ زونیرہ کو نوکری کرنے کی ضرورت ہے اور نہ تمہیں پارٹ ٹائم جاب کرنے کی، اپنی زندگی کو انجوائے کرو، گھر کا خرچ میں مکان اور دکانوں کے کرایے سے پورا کروں گی، بہنوں کا دینا دلانا زمین کی آمدن سے ہوجائے گا بڑی ذمے داریاں الحمدللہ جیسے شادیاں وغیرہ تو نمٹ گئیں۔''

''ماما اب ہمارا دینا دلانا ختم کریں، بہت دے لیا سب بہنوں کو پلاٹ تک تو مل گئے بس اب صرف چھوٹی کی عیدی بھجوایا کریں عید کی دعوت بھی اب بس چھوٹی کی ہی کیا کریں اب بھائی جان کے لیے پلاٹ لینا ہے تاکہ وہ اس پر اچھا سا گھر بنوا سکیں۔''

''انشاء اللہ تعالیٰ!'' ماما بڑے جذب سے بولیں۔ ''واقعی نادیہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو میں بھی یہ سوچ رہی تھی کہ تم لوگوں کو عیدیاں مطلب جوڑے وغیرہ بند کردوں لیکن تھوڑا بہت دینا دلانا تو چلے گا اور عید بقر عید کی دعوت بھی ضرور ہوگی۔''

''ضرور ماما ضرور بلکہ تھوڑا بہت کیوں ماما، بہنوں کی عیدیاں اسی طرح جائیں گی۔'' ریان بولے۔

''جیتے رہو میرے بچے لیکن اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں اب ہر چیز میں تبدیلی آئے گی، عید تہوار کے موقع پر آنے جانے میں بھی، زونیرہ برسوں سے عید بقر عید کی دعوتوں میں اپنے گھر نہیں جا پاتی، چاند رات سے لے کر عید کے تینوں دن سب وقفے، وقفے سے پائی جاتیں ہیں اب اس سب کا بھی ازالہ ہوگا میری بیٹیاں آئیں گی لیکن طریقے سے اب چاند رات اور عیدیں زونیرہ اور اس کے بچے بھی منائیں گے۔ ان کا بھی حق ہے خوشیوں پر۔''

''بالکل ماما اب ہم عید کی دعوت بھی تیسرے دن رکھا کریں گے ہم نے آپ کی بہت سی عیدیں خراب کیں، آئندہ اچھی سی عیدیں منانا آپ کا حق ہے اب ہم بہنیں آپ لوگوں کی دعوت کیا کریں گے ہر عید پر کیوں ٹھیک ہے ناں ماما۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔'' ماما مسکرائیں۔

''بلکہ بقر عید پر بھی۔'' ریان خوشدلی سے بولے۔

''بالکل بھائی، بقر عید پر تو بھابی زیادہ تھکتی تھیں۔ بھابی اب ہر بقر عید پر باربی کیو اور ایک پکنک میری طرف سے ہوا کرے گی۔''

''شکر میرے مولا میری اولاد نے کسی حد تک تلافی کردی۔ زونیرہ بیٹی پانچ بج رہے ہیں جلدی کرو، عید کی شاپنگ کے لیے بھی تو جانا ہے اب عید میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں، بچے کہاں ہیں انہیں تیار کرو۔''

''ماما آج نہیں کل جائیں گے، آج تو نادیہ آئی ہوئی ہے ناں۔'' ماما حیرت و مسرت سے گنگ ہوگئیں۔ صد شکر کے ازالے کے لیے وقت تھا ماما نے بہت محبت سے زونیرہ کا منہ چوما اور گلے سے لگا کر بولیں۔

''میری اصل بیٹی تو تم ہی ہو انشاء اللہ تعالیٰ پانچوں سے بڑھ کر محبت دوں گی، ہر دکھ کا ازالہ کروں گی جو تم نے اس گھر میں میری ناانصافیوں کے ہاتھوں اٹھائے، تم نے زبان سے شکوہ نہ کیا تو کیا ان حق تلفیوں پر تمہیں کوئی دکھ نہ تھا۔ انشاء اللہ میں خود تمہارے لیے عید کی خریداری کروں گی۔''

''لو بھئی پہلے پانچ بیٹیوں کو نوازا جاتا تھا اب چھٹی بیٹی بھی شامل ہوگئی۔ میں تو کچھ زیادہ ہی اکلوتا

ہوگیا۔'' ریان مصنوعی خفگی سے بولے سب ہنسے اور ماما کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔

☆☆☆

آج چاند رات متوقع تھی۔ جو پچھلے برسوں کی نسبت زیادہ خوشیاں لا رہی تھی۔ زونیرہ نے بہت سے کام دن میں ہی نبٹا لیے تھے، بچوں اور ریان کے تین دن کے کپڑے استری کر کے ہینگ کردیے تھے عید کا بہت سا کام بھی کافی حد تک نبٹا لیا تھا اپنی بھی پوری تیاری تھی، بچے بہت خوش تھے تین کے بجائے چار، چار سوٹ بنے تھے دو دفعہ ماما، بابا کے ساتھ تو شاپنگ پر گئے خوب گھومے پھرے ان کے لیے یہ سب بہت نیا اور خوش کن تھا۔ پہلی عید کے بعد سے آج سالوں بعد زونیرہ کو بھی چاند نظر آنے کا انتظار تھا۔ امی، بابا کے پاس جو جانا تھا کتنا خوش کن لمحہ ہوگا جب وہ امی، بابا کو اچانک سے جا کر حیران کردے گی۔

ماما بہت چپ، چپ سی تھیں۔

''ماما، بابا چاند نظر آگیا ٹی وی پر بتا رہے ہیں۔'' بلال اور رانیہ خوشی، خوشی ماں کے پاس آئے۔ ماما کو چاند کی مبارک باد دی۔

''بیٹا اپنی امی، ابا کو عید کا سلام کرآؤ......'' انہوں نے بہت پیار سے کہا۔

''جی ماما ابھی تھوڑی دیر میں جاؤں گی۔'' وہ دھیما سا مسکرائی۔ بچے بے چین تھے کہ نانی کے گھر کب جائیں گے جلدی تو زونیرہ کو بھی تھی مگر اسے چاند رات کا معمول یاد تھا کچھ ہی دیر بعد بیل بجی اور پانچوں بہنیں مع اپنے شوہروں اور بچوں کے گھر میں داخل ہوئیں ڈھیروں ڈھیر مٹھائی اور پھلوں اور تحائف سے لدی پھندی ''چاند مبارک......'' سب نے یک زبان ہوکر مبارک باد دی۔ گھر چاند مبارک کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ سب نے ماما کو سلام کیا ان کا چہرہ خوشی سے جگمگا اٹھا ان کی خوشی دیدنی تھی انہوں نے نہال ہوکر بیٹیوں اور نواسے، نواسیوں کو پیار کیا اور دامادوں کے سر پر ہاتھ رکھا اور دعائیں دیں۔

''ہم سب امید سے ہیں۔'' پانچوں بہنیں کورس

جواھر پارے

☆ دس دعوے کرنے سے ایک عملی قدم اٹھانا بہتر ہے۔

☆ نیکی کر کے بھول جانا، نیکی کو دُگنا کردیتا ہے۔

☆ عقل مندوں کے لیے مشکلات محض عارضی رکاوٹیں ہوتی ہیں۔

☆ ظلم کی رات کتنی ہی طویل ہو انصاف کی صبح ضرور ہوتی ہے۔

☆ مستقبل کی فکر میں گھلنے کے بجائے حال کو بہتر بنانے کی کوشش کرو تو مستقبل خود بخود سنور جائے گا۔

از: ارم کمال، فیصل آباد

قسمت

تدبیر اور تقدیر دونوں ہی انسان کے لیے ضروری ہیں۔

ایک شعر ہے۔

تقدیر کا شکوہ بے معنی جینا ہی تجھے منظور نہیں
آپ اپنا مقدر بن نہ سکے اتنا تو کوئی مجبور نہیں

یہ بھی صحیح ہے کہ

وقت سے پہلے اور تقدیر سے زیادہ کسی کو کچھ نہیں ملتا تو ہوتا یوں ہے کہ تقدیر ہماری زندگی میں بڑے خوب صورت رنگ بھرتی ہے مگر ہم جیسے لوگ اپنی بے لگام خواہشوں اور آوارہ خوابوں کی بدرنگی سے ساری تصویر مسخ کر کے رکھ دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ رنگ کچے ہیں۔

اصل اور پکا رنگ تو وہی ہے جو کاتبِ تقدیر نے ہمارے لیے زندگی کی تصویر میں بھر دیا ہے اور یہی ہے۔ تقدیر یا قسمت جو بھی کہیں......

از: فریدہ فضل ڈالاس، یو ایس اے

میں بولیں۔ ''کہ بھائی اور بھابی ہمیں معاف کردیں گے سب سے پہلے بڑی آپا آگے بڑھیں اور بھائی کو گلے لگالیا اور بولیں۔
''خطائیں ہماری بھی کچھ کم نہیں، ہم بھی بہت خود غرض ہوگئے تھیں اور ایسا اکثر ہوتا ہے کہ اگر ایک ... بےغرض ہوجائے تو دوسرا خود بخود خود غرض ہوجاتا ہے۔'' اس طرح سب بہنوں نے باری، باری بھائی، بھاوج کو گلے لگایا۔
''چلو دیر آید درست آید......'' ریان بولے۔
آپا نے اپنے تحائف بانٹے۔ پھر اور بہنوں نے بھی ان کی تقلید کی۔ اپنے، اپنے تحائف بانٹے۔
''منجھلی آپا آپ نے تو اگلی پچھلی ساری کسر نکال دی۔'' ریان نے خوش دلی سے کہا تو انہوں نے بھائی، بھاوج کو بڑھ کر گلے سے لگالیا۔ زنیرہ نے بھی نندوں کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ آج پانچوں بہنیں مہمان بن کر صوفوں پر نہ بیٹھی تھیں بلکہ بھاوج کا ہاتھ بٹارہی تھیں۔
''تم لوگوں نے تو آج آنا نہیں تھا پھر پروگرام کیسے بن گیا تھا۔'' ماما نے بڑی آپا سے چپکے سے پوچھا۔
''ماما، ریان اور زنیرہ دونوں نے آنے کو کہا تھا اور زنیرہ نے تو باقاعدہ دھمکی دی تھی کہ اگر آپ لوگ نہ آئیں تو وہ بھی اپنے گھر نہیں جائے گی۔''
''گریٹ......'' ماما نہال ہی تو ہوگئیں اور سامنے سے آتی زنیرہ کو بڑھ کر گلے سے لگالیا۔
''بیٹی میرے گھر کی رونقیں قائم رکھنے کا شکریہ۔'' زنیرہ دھیمے سے مسکرائی۔
''ماما، خوشیاں سب کے لیے......ریان اور زنیرہ اب آپ لوگ بھی جائیں خوشیاں اپنے لیے بھی۔ اور ہاں آرام سے آنا میں ماما کو گھر لے جاؤں گی واپسی میں تم لوگ لے لینا۔''
''بالکل بڑی آپا اور ہاں آج تو آپ نے بھی بڑا پن دکھادیا، شکریہ۔'' ریان شریر ہوئے۔

☆☆☆

زنیرہ جب اپنی امی کے یہاں پہنچی تو دونوں بھائیوں اور بڑی باجی کی فیملی کو اپنا منتظر پایا بڑا شاندار استقبال ہوا، آوازیں سن کر امی، بابا باہر آیا ہی چاہتے تھے کہ زنیرہ، ریان اور بچے سلام کرنے اور چاند مبارک کہنے امی، بابا کے کمرے میں آئے۔ انہیں اچانک دیکھ کر اور ان کے چاند مبارک کہنے پر امی، بابا پر تو شادیِ مرگ طاری ہوگئی کچھ دیر تو امی حیرت اور مسرت سے کچھ بول ہی نہیں پائیں پھر زنیرہ کو لپٹا کر خوب روئیں۔
''زنیرہ آج تمہیں کیسے خیال آگیا کہ اماں، بابا کو سلام کر آؤ اور اپنی صورت دکھا آؤ۔ چھ سال سے انتظار کررہی ہوں ہر عید، بقر عید پر سب کے درمیان تمہیں نہ پاکر مجھے ساری خوشیاں ادھوری سی لگتی تھیں۔ گھر سے رخصت کیا تھا دل سے تو نہیں، میں جانتی ہوں بیاہی بیٹیوں کے سو مسئلے ہوتے ہیں لیکن ہمیشہ نہ سہی کبھی کبھار آکے تو ماں، باپ کو خوشی دے سکتی ہیں ناں، ماں، باپ کے لیے وہ لمحات کتنے خوشیوں سے بھرے ہوتے ہیں جب بیاہی بیٹیاں خوش وخرم میکے آتی ہیں۔ تمہاری مصروفیات تو عید بقر عید پر بھی ختم نہیں ہوتیں۔ دعوت میں تھوڑی دیر کو ہی آجایا کرتیں ماں، باپ تو تھوڑے ہی میں خوش ہوجاتے ہیں۔'' ریان مجرم بنے کھڑے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ان کی حقیقت سے چشم پوشی نے کتنے دل دکھی کیے ہوئے تھے۔ بڑے بھیا نے زنیرہ کو ماں سے الگ کیا۔
''امی اب آپ خوش ہوں اور زنیرہ کو بھی خوش ہونے دیں۔ ہمارے لیے خوشی کا مقام ہے کہ زنیرہ نے آپ کی تربیت کی لاج رکھی اور ہم سرخرو ٹھہرے۔'' بڑے بھیا کی آنکھوں میں نمی در آئی انہیں اپنی یہ راضی بہ رضا رہنے والی بہن بہت عزیز تھی اور دوری کے باوجود دل سے بہت قریب تھی۔
تھوڑی دیر بیٹھ کر ریان نے چلنے کا اشارہ کیا بچے نانا، نانی کے گھر آکر بہت خوش تھے لیکن انہیں چاند رات کی رونقیں بھی تو دیکھنا تھیں اور زنیرہ تھی کہ اس کا

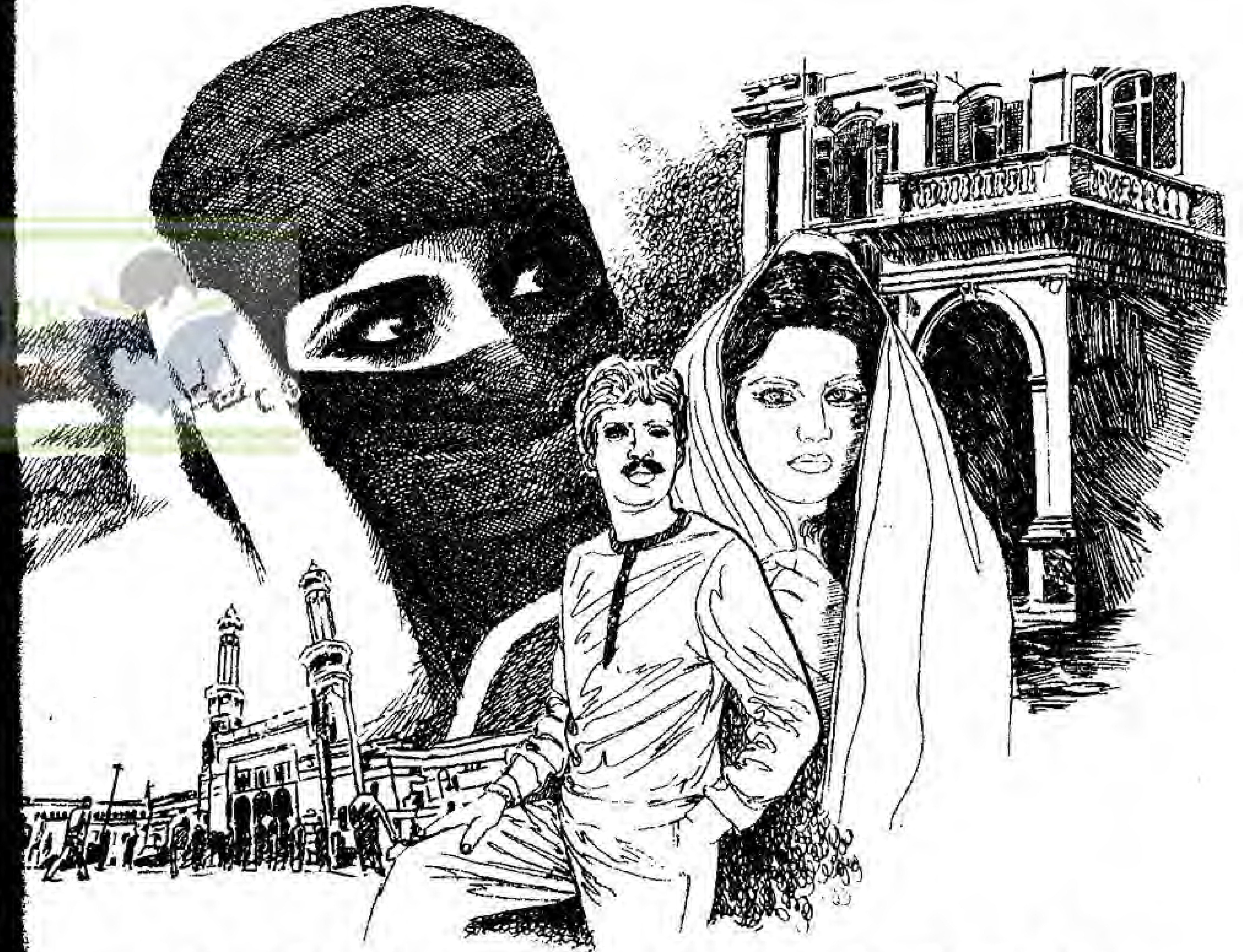
دل ماں کے پاس سے اٹھنے کو نہ چاہ رہا تھا اور نہ امی اسے چھوڑنے کو تیار تھیں طے یہ ہوا کہ بچہ پارٹی چاند رات کی رونقیں دیکھنے چلے جائیں، زنیرہ نے اصرار کر کے بھاوجوں کو بھی ساتھ بھیج دیا، رات گئے سب واپس آئے تو زنیرہ اور ریان بھی گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ بڑی آپا کے گھر سے ماما کو بھی لیا۔ یوں ایک خوشگوار چاند رات بیتی۔
عید کا دن چاند رات سے بھی زیادہ خوب صورت تھا۔ آج یہ سارا اہتمام وہ بہت خوشی سے کررہی تھی، اس کے بچے خوش تھے، شوہر خوش تھا برسوں بعد امی، بابا کو خوشی دے کر آئی تھی سو وہ بھی خوش تھی، جلدی، جلدی گھر کو مزید سنوارا بچوں کو تیار کیا، شوہر کو عیدگاہ جانے کی تیاری میں مدد دی جب شوہر اور بیٹے عیدگاہ سے آئے تو وہ بھی تیار تھی، ماما کا دیا ہوا خوب صورت جوڑا اور لاکٹ سیٹ پہن کر ہاتھوں پر مہندی کا رنگ بہت خوب صورت آیا تھا، ماما کو جا کر سلام کیا انہوں نے نہال ہوکر دعائیں دیں، دس ساڑھے دس بجے تک نندیں بھی آگئیں ٹیبل پہلے ہی سیٹ تھی۔
زنیرہ کے بلانے پر ماما کمرے میں آئیں تو حیران ہی رہ گئیں۔ دہی بڑے، چنا چاٹ، رس ملائی، گرم، گرم کچوریاں، بھنا قیمہ، چنے کا سالن، کٹے آلو، شیر خورمہ کھیر، کیا نہیں تھا ٹیبل پر......
''اچھا تو کیا ناشتا کیا جارہا ہے تم لوگوں کو اپنے گھر میں چین نہیں ہے۔'' ماما لاڈ سے بولیں۔
''ماما یہ آپ کی بہو زنیرہ ہے ناں، اسے چین نہیں ہے اس نے رات ہی فون کردیا تھا کہ صبح ناشتا یہیں کرنا ہے۔'' نندوئی سب خوش ہوکر کھا رہے تھے بچے اپنی پسندیدہ چیزیں دیکھ کر بہت خوش تھے۔
اس عید پر بچوں کی تو مانو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ سب خوش تھے ماما بھی خوش تھیں بلکہ بہت ہی خوش تھیں۔ اس سوچ کے ساتھ کہ بہو، بیٹے اور پوتے، پوتی کے ساتھ ناانصافی بھی نہیں ہورہی اور سب کچھ ٹھیک بھی ہے، ان کے دل کا خوف کسی حد تک کم ہوا تھا لیکن ختم نہیں ہوا تھا۔
نندیں ڈیڑھ دو گھنٹا بیٹھ کر چلی گئیں اس دوران دوسرے مہمان بھی آتے رہے، خاطر تواضع بھی چلتی رہی۔
زنیرہ کی امی نے ماما کو خاص طور پر عید کی رات کی دعوت دی تھی اور آنے کی بہت تاکید کی تھی، سب لوگ تیار ہوکر وہاں پہنچے تو ان کا کل سے بھی زیادہ شاندار استقبال ہوا دعوت بہت شاندار رہی زنیرہ کے امی اور بابا، ماما سے بہت اخلاق سے پیش آئے۔
اس عید نے زنیرہ کو تھکایا نہیں تھا بلکہ ملنے والی خوشیوں نے تازہ دم کردیا تھا۔
ماما یہ سب دیکھ کر خوش تو ہورہی تھیں مگر دل میں خدشہ بھی تھا کہ کہیں پھر سے یہ خوشیاں روٹھ نہ جائیں۔
یہ عید زنیرہ اور بچوں کے لیے بہت یادگار تھی۔
وہ اب سرشاری کیفیت میں کل منجھلی آپا (نازیہ) کے گھر ہونے والی دعوت کے متعلق سوچ رہی تھی عید کے چوتھے دن بڑی آپا کے ہاں دعوت تھی۔ اگلے ہفتے شازیہ آپی اور نادیہ کی طرف سے پکنک تھی سمندر کنارے، عید کے تیسرے دن چھوٹی کے سسرال والوں اور سب بہنوں کی دعوت تھی۔ خاص طور پر ماما کی طرف سے وہ بھی ہوٹل میں اس دعوت کی ایک خاص بات تو یہ تھی کہ یہ چھوٹی کی شادی کے بعد کی پہلی عید کی دعوت تھی۔ دوسری خاص بات یہ تھی کہ اس میں زنیرہ کے گھر والوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ زنیرہ.... بےحد خوش بھی خوشیاں اس کے اور اس کے بچوں اور شوہر کے گرد رقصاں تھیں۔ ریان بیوی اور بچوں کو خوش دیکھ کر بہت خوش تھے، اپنوں کی محبتوں، خلوص اور عنایتوں کے رنگ ان کے ساتھ، ساتھ تھے، چہار جانب خوشیاں ہی خوشیاں تھیں عید کے رنگ خوشیوں کے ساتھ ان کے سنگ تھے۔

منی ناول



صُفہ

دُردانہ نوشین خان



یکا یک بادل اُمڈ آئے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا سا چھا گیا۔ وسیع و عریض حویلی کے باغیچے میں گھنے درخت جیسے دھمال ڈالنے لگے۔ تیز ٹھنڈی ہوا کے پیچھے تڑ، تڑ کرتی چھدری موٹی بوندیں ایسے اتریں جیسے خاکستری چادر پر بڑے، بڑے تارے ڈالے جارہے ہوں۔ ساون کی بارش تھی پیاسی مٹی اور سوکھے سبزے کی سیرابی مہک بن کر پھیلی۔ برسات نے جلترنگ بجا دیے۔ بارش کھل کے برسی۔ روکھے موسم کا پھیکا پیراہن طوطیا

رنگ میں رنگا......فضا نے بھیگی اوڑھنی اوڑھی۔ کوئل پپیہا سُر دینے لگے۔ تیتر سبحان تری قدرت کی ثنا الاپنے لگے۔

حویلی کے بائیں برآمدے کی چلمنیں باری، باری ڈوری میں باندھتی شبانہ (ملازمہ) بظاہر وہاں ناموجود صفہ بخاری سے بولے جاتی تھی۔

''بڑی تیز بارش آگئی جی......آسمان سے زمین تک پانی کی چادر تنی ہو جیسے... دیکھیں تو چڑیاں کیسے ڈبکیاں لگا رہی ہیں، اللہ کی شان ہے اس نے چٹکی بھر کے پرندے کو بھی عقل دی ہے......دیکھیے تو بخاری باجی دوپہر تک کتنی گرمی تھی۔ اب ایسی ٹھنڈی ٹھار ہوا ہے کہ جھومنے کو جی کرتا ہے...... بی بی وہ کون سا درود شریف ہے بارش والا...... میں گناہ گار بھی پڑھ لوں۔''

اندر کہیں سے درود شریف کی آواز سنائی دی...... جسے دُہراتی شبانہ اِدھر اُدھر چھوٹی موٹی چیزیں سنبھالتی...... کچھ دیر بعد پھر برآمدے کے مرکز میں آگئی......آٹھ دس ستونوں کا کافی لمبا برآمدہ تھا...... اب پھر شبانہ کی آواز گونجنے لگی۔

''واہ مولا جی...... صدقے ترے...... پل میں رنگ جما دیا، ہوا ایسی ہے جیسے برف کے پہاڑوں سے اتر کر آرہی ہو...... اس موسم میں بھی کہیں ژالہ باری ہوئی ہوگی...... یہ پکوان کی خوشبو ......سندری پکوڑے تل رہی ہے...... بخاری بی بی ......میں بھی تھوڑا سا بیسن گھول لوں......آپ بھی چکھیے گا......''

چست، محنتی، ایمان دار، سادہ سی پینتیس، اڑتیس سالہ شبانہ یونہی جواب کا انتظار کیے بغیر کام کیے جاتی اور بولے جاتی۔ اِدھر اُدھر چلتی پھرتی ایک کے بعد ایک مصروفیت نکالے رکھتی......خود کو کام میں لگائے رکھتی۔ صفہ بخاری تو کم بولتیں...... حویلی کے بائیں صحن میں ایک طرف سرونٹ کوارٹر تھا۔ اس کے آگے بھی ایک باغیچہ تھا۔ کوارٹر میں شبانہ، اس کی بھابی سندری اور بارہ سالہ بھتیجا اذان اور سات سالہ موذن رہتے تھے۔ لالہ (بھائی) مسقط میں مزدوری کرنے گیا ہوا تھا۔ سندری بھی محنت کش عورت تھی......سلائی کڑھائی اجرت پہ کرتی تھی۔

برآمدے میں کھلنے والا اندرونی جالی کا دروازہ دھیرے سے کھلا۔ سفید ڈھیلا لمبا کرتہ، پاؤں چھپاتے پائنچوں والی شلوار، سر اور سینے پر یہ بڑا چوڑا سا سفید اسکارف لیے گندمی رنگت، گہری اور خاموش انوکھی چمک والی آنکھیں، یہ بیالیس سالہ صفہ بخاری تھیں۔ نہایت سکوت سے برآمدے میں رکھے بڑے موڑھے میں بیٹھ گئیں۔

بارش کی بوندیں شبانہ کے سلونے چہرے پر ناک میں پڑی چاندی کی لونگ جیسی چمکتی تھیں۔ جب یلغار کرتی بوندیں اودھم مچاتیں تو زمین پر ٹھہرے پانی میں رقص برپا ہو جاتا۔ بلبلے ناچنے لگتے۔ بارش صرف سائنسی عمل نہیں ہے یا یہ جغرافیائی ردِعمل نہیں ہے، یہ درختوں کا دھوون نہیں ہے۔ اس میں ایک عمیق بے آواز جادو ہے جو زندگی کے لمحات کو سرمست کرتا ہے۔ انسان خوشی سے مچل اٹھتا ہے جذبوں کی وارفتگی بادلوں کے سنگ اڑنے لگتی ہے۔ نوعمر لڑکیاں، لڑکے گیلے پاؤں کے چپو چلاتے ہتھیلیوں میں پانی کی طشتریاں بھرتے کھیلتے بھاگتے ہیں۔ صرف لڑکیوں، لڑکوں پر ہی کیا سرشاری کی لہر ہر کسی کو چھوتی ہے۔ انسان، حیوان، پرندے، تتلیاں، حشرات، کیڑے مکوڑے، مینڈک...... حتیٰ کہ بیر بہوٹیاں ......سچ ہے کیا، کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں......

اب بارش رک گئی تھی۔ الگنی پر پھدکتی گیلے پروں والی چڑیاں......درختوں میں پرندوں کے بھرپور چہچہے......کہیں دور آوازیں دیتے کھیلتے بچے...... اور شبانہ جو گیلے بالوں کا مختصر جوڑا سمیٹے کڑاہی میں تیل گرم کرتی باورچی خانے کی کھلی کھڑکی سے دکھائی دے رہی تھی۔ یہ سارا منظر مصورِ اکبر کی صناعی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا ایسے کروڑوں سحر آفریں مناظر کھینچ دینا...... یا پل بھر ان میں سے سحر کھینچ لینا......مصورِ حقیقی کے برش کا ایک اسٹروک ہے۔ کوتاہ اندیش انسان مناظر کو حیات

بنا لینے پر تل جاتا ہے سچ تو یہ ہے کہ رنگ و بو کی جزوقتی خوش نمائی میں کوئی سچائی نہیں ہوتی ......رم جھم کا یہ کالا جادو گلی میں گزرتے انجان لڑکے کے دل میں منڈیر سے جھانکتی، گیلے بالوں والی اتار دیتا ہے۔ یہ منظر سہولت کار ہے، یہ اعتبار دے کر لاتعلق بن جاتا ہے۔ منظر کے اندر سے نکل کر منظر دیکھنا آسان نہیں...... منظر کے اندر تو سامری ہے، چمتکار ہے۔ خوابوں میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ اجنبی، پرائے سب باہم رُلے ملے ہوتے ہیں۔ اجنبیت نہیں ہوتی، منظر، منظر ٹوٹے جڑے ہوتے ہیں، دراصل بالکل یہی ہماری زندگی میں ہو رہا ہوتا ہے۔ ہمارے اردگرد منظر، نام، کردار کسی کی کوئی اصلیت orginality نہیں ہے۔

صفہ بخاری برآمدے کے موڑھے پر تراوٹ کے ایک بھی قطرے سے گریزاں خشک بھوسے کی طرح بیٹھی تھیں۔ سوچنا، سوچتے چلے جانا، استغراق، معلوم نہیں عبادت ہے یا نہیں......مگر صفہ بخاری کی عادت بن چکی تھی۔ تفکر والی سوچ وقت کا زیاں تو نہیں ہوسکتی۔ خالق کو اپنی تحقیقات کا سرسری دیکھا جانا پسند نہیں ہے لیکن مراقبہ، غور و فکر، شریعت کے بعد آتے تھے البتہ جب احکام نہ اترے تو پہلے غور تھا۔ غور جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سورج چاند ستاروں پر کرتے تھے غور جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار حرا میں کرتے تھے۔ پھر احکام اور شریعت مکمل ہوگئی۔ جتنے اولیاء اللہ گزرے سب نے حصولِ علم حقیقتِ حق کو پانے کی خاطر دور دراز کے سفر کیے۔ علم کی تکمیل کے بعد مجاہدے اور مراقبے کیے......اللہ کو رسولؐ اللہ کے ذریعے سے جاننے کے عمل کے بغیر مجاہدہ، ورزش اور مراقبہ مخبوط الحواس کی خاموشی ہے۔ لیکن صفہ بخاری کا مراقبہ اصولی تربیت ہونے کے سبب بامعنی تھا۔

پھاٹک پر گاڑی رکی ہوگی، ہارن بھی بجا ہوگا، پھاٹک کھلنے بند ہونے کی آواز بھی آئی ہوگی۔ پھاٹک دور ہونے کے سبب خبر نہ ہوئی...... یہاں تک کہ نخبہ خاور اعوان کی ہیل کی ٹک، ٹک اور موبائل پر مسلسل بولتے چلے آنے کی آواز سر تک آن پہنچی......مگر صفہ بخاری کی ایک جگہ مرکوز نگاہ کے استغراق میں تعطل نہ ڈال سکی۔ استغراق تب ٹوٹا جب نخبہ خاور نے اپنے شانے سے لٹکتا ہینڈ بیگ اتار کر برآمدے میں پڑے رنگین پٹی والے پلنگ پر ڈالا اور ہیلو کہا۔ جانتی تھی کہ اس کی دیرینہ سہیلی کا استغراق تصنع نہیں، اس میں بناوٹ کا شائبہ تک نہیں ہوتا بلکہ یہی اس کا اصلی روپ ہے۔ صفہ نے اسے دیکھا تو اٹھ کر سلام لیا۔

''تمہاری شبانہ کی زندہ دلی خوب ہے۔ زندگی اسی کو کہتے ہیں۔'' نخبہ خاور سرونٹ کوارٹر کے لان میں آم کے پیڑ میں پڑے رسی کے جھولے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

صفہ بخاری تسبیح کو کلائی میں لپیٹ کر گھٹنے موڑے ہوئے ٹانگوں کو اپنے بازوؤں کے دائرے میں لے کر بیٹھے، بیٹھے دھیرے، دھیرے آگے پیچھے ہلنے لگی۔

''خیر ہے ناں......'' نخبہ نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا۔

''ہاں خیر......'' مسکراہٹ کا ہلکا سا زاویہ ابھرا۔

''صفہ......اوو......اللہ کی پیاری بندی......اپنا حال دیکھ......کبھی آئینہ بھی دیکھتی ہو؟'' پھر شبانہ کو بلا کر ایک پیکٹ دیتے ہوئے کہا۔ ''مہندی ہے بہت مشہور برانڈ کی ہے......بی بی کے بالوں میں لگا دینا۔''

''جی......؟ جی۔'' شبانہ نے پیکٹ پکڑنے کی اطاعت کی۔

صفہ بخاری جیسے بیٹھی تھیں بیٹھی رہیں...... صفہ کے سامنے نخبہ کھڑی تھی۔ جدید تراش کے اسٹائلش فراک اور ہاف آستین ٹخنوں سے اونچی ٹائٹس، ہیل والا قیمتی جوتا اس کے اجلے گورے پاؤں کے حسن کو چار چاند لگا رہا تھا۔ پاؤں کے ناخنوں پر سلیقے سے لگی ہلکی جامنی نیل پالش ......طرح، طرح کی خوشبوؤں میں مہکتی سہیلی اس کے سامنے موڑھے پر بیٹھ گئی۔

''صفہ......تم نے ایسا حال کیوں کر لیا......؟ میں جب بھی سوچتی ہوں......سمجھ نہیں آتی کیوں درویشی اپنالی

..... اچھی بھلی ہوتی تھیں جب ہم کالج میں پڑھتے تھے..... سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے کیا بن گئی ہو..... بس یہ مدرسے ایسا ہی کر دیتے ہیں..... جانتی ہوں تمہیں فنانشل پرابلم نہیں ہے، کمانے کی خاطر باہر نکلنے کی ضرورت نہیں..... مگر پھر بھی باہر نکلو..... کہیں آؤ جاؤ.....'' صفہ کے خالی ہاتھ (کیونکہ نخبہ کے ہاتھ کی انگلیاں انگوٹھیوں سے چمک رہی تھیں) کو اپنے ہاتھ میں لے کر محبت سے کہا۔

''باہر تو تب نکلوں جب اندر طے کرلوں.....''
اور ایک مصلوب آواز آئی۔

نخبہ خاور حیران ہو کر تکنے لگی۔

''ہاں نخبہ اندر بہت بڑی دنیا ہے۔ ہم عجیب لوگ ہیں اندر کی خبر گیری کرتے نہیں، باہر پھول بوٹے لگاتے رہتے ہیں..... کیسا لگتا ہے وہ مکان جو اندر سے گندا میلا کوڑا کرکٹ سے بھرا ہوا مگر جس کے باہر پھول پودے رنگ و روغن گل بوٹے ہوں..... اس میں داخل ہوتے ہی آسیبی وحشت ہوتی ہے..... منافقت کی بُو آتی ہے۔ ہم اپنے اندر کی آسیبی تاریکی سے خائف ہیں..... اکیلے قدم رکھتے ڈرتے ہیں۔ اپنے ڈر سے بچنے کے لیے ہجوم تلاشتے ہیں.....''

اتنے میں شبانہ لیمن جوس کے دو گلاس لے آئی تھی..... نخبہ نے ایک خود لے کر دوسرا اسے دے دیا۔ صفہ اب گلاس پکڑے بولے جا رہی تھی۔

''یہ ایک اور اچنبھا ہے کہ بھرے میلے میں جینے والے کا آغاز و انجام اکیلا پن ہے..... دروازے کھڑکیاں بند کر کے آپس کا دائرہ باندھے دب کر بیٹھنے والے..... تارِ عنکبوت کے جھولے میں بیٹھے ہیں..... ''آپس'' کچھ نہیں ہوتا۔''

''تم نے والدین کی جدائی کو دل میں بٹھا لیا..... تم سب کچھ ٹھیک کہہ رہی ہو مگر..... ہم زندہ متحرک انسان ہیں، مہاتما بدھ ہر کوئی نہیں ہوتا لاکھوں سال میں کوئی ہوتا ہے..... اچھا چھوڑو..... میں تمہیں صوفی کانفرنس میں اپنے ساتھ لے جانے آئی ہوں۔ وہ تو تمہارے خیال کی دنیا ہے..... چلو گی ناں.....؟''

''اس کا مقصد.....؟''

''نفرت، تقسیم، جنگ و جدل سے بچنے کا راستہ..... امن سے محبت، انسان سے محبت..... تقریروں کے بھی یہی ٹاپکس ہوتے ہیں..... صوفی شعراء کا کلام پیش کیا جاتا ہے جیسے خواجہ غلام فرید..... مادھو لعل حسین، بابا بلھے شاہ..... سخی شہباز قلندر، شاہ لطیف جانے کتنے نام ہیں، سب محبت کا درس دینے والے.....''

''ہاں.....''

''میں نے اپنا مقالہ تیار کرلیا ہے۔''

''مقالہ تو خوب ہوگا تمہارا.....'' بے تصنع تبصرہ کیا گیا۔

''چلو گی.....؟''

وہ پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کریدنے لگی..... کچھ دیر بعد سر اٹھایا اور اسے دیکھا۔

''اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے..... کتنی گہری بات کہہ دی علامہ نے..... صوفی آراستہ پیراستہ سیمیناروں سے نہیں نکلتا..... علمیت بھری تقاریر سے نہیں بنتا..... یہ کٹھالی سے ڈھل کے نکلتا ہے..... سل بٹے پر رگڑ کھا کر خوشبو دیتا ہے جیسے رات بھر آنچ پا کر شب دیگ ذائقہ نکالتی ہے..... سوچو..... ان گنت مفکر ہیں..... کسی ایک کی بات ذہن میں کیوں جا اترتی ہے..... سنو تو ہزاروں نعت خواں ہیں..... کسی ایک یا صرف چند کی آواز اندر کی دنیا کیوں ہلا دیتی ہے..... یہ سچ سچ پکنے والا میٹھا ہے۔'' وہ کہیں اور کھوئی بڑی گہرائی کی باتیں کہہ رہی تھیں۔

''یاد رکھو..... پاکیزہ خلوت نفس پر کاری ضرب لگاتی ہے۔ رزقِ حلال کراماتی قوت ہے نفس بذات خود ایک ناکارہ، سست، عیش پرست ملغوبہ ہے..... اس پر سردیوں کے ٹھنڈے پانی کا وضو ہی صرف بار نہیں ہوتا..... وہ تو سمجھ آنے والی بات ہے اس پر مجبوری میں بھی کم کھانا بار ہے..... یہ تو مکر مار کر پڑا رہتا ہے موقع ملے تو دندناتا ہوا تباہی مچا دے.....''

اب کوئی پوچھے حسینہ پری وش نخبہ سے کہ جسے دیکھ کر کتنے ہی آہیں بھریں..... ٹی وی چینل پر نخبہ کے ٹپس'' پروگرام کرنے والی، ایسی فنافی الذات سہیلی سے بھلا کیا لینے آتی تھی..... نخبہ کا شوہر بیوروکریٹ، جتنا دولت مند اتنا حسن پرست بھی، سسر ٹیکسٹائل ملز کا مالک۔ شوہر سے داد و تحسین کے لیے بھی نخبہ کو حسن کی حفاظت کا کریز رہتا۔ کبھی ہیر کلر مکمل بدل دیتی کبھی ہیر اسٹائل، اسکن ٹریٹمنٹ بھی کروا ڈالتی۔ اگرچہ مانند گلاب دلنشین لگتی تھی۔ اتنی ساری پتھریلی دنیا داریوں میں کہیں کوئی جگنو صفہ کے نام کا جگمگاتا اور بلاتا تھا۔

دونوں کے درمیان اسی طرح کی ادھوری بے سروپا ملاقاتیں ہوتیں..... صفہ بخاری نے حلقۂ احباب نامی کوئی شے باقی رکھی نہ تھی۔ مگر شبانہ جانتی تھی کہ صرف ... اسی بیگم صاحبہ باجی (نخبہ خاور) کو آنے کی اجازت ہے۔

☆☆☆

اشراق کا مصلیٰ لپیٹ کر صفہ بخاری چارپائی پر کمر سیدھی کرنے کو لیٹی تھیں کہ ہینڈل گھومنے کی آواز نے کمرے کے دروازے کی طرف متوجہ کیا۔ کس کر جوڑا بنائے صحت مند چہرے والی شبانہ نے اندر جھانکا۔

''بخاری بی بی ..... کوئی دعا منگوانے والی آئی ہیں۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

ایک تھکن آلود مسکراہٹ، اخلاقی استقبال اور ندامت و شگفتگی..... ''انہیں کیا پتا میرے اوپر کتنا میل ہے..... یہ بھولیاں اپنا آپ مجھ سے اجلوانے آتی ہیں۔ میری روح کا اوڑھن ادھ سلا پڑا اور سوئی زنگ آلود ہے۔'' وہ خاموشی میں جانے کیا کہہ گئی تھیں۔

''وہ بہت دور سے آئی ہیں..... کہتی ہیں نواب پور سے آئی ہیں۔'' شبانہ نے متوجہ کیا۔ صفہ اٹھتے ہوئے رکیں۔

''مجھے کیسے جانتی ہیں؟'' صفہ نے شبانہ سے پوچھا۔

''خوشبو آپ اپنا پتا دیتی ہے، بخاری باجی.....''

شبانہ نے آگے بڑھ کر چپل سرکائے۔

''لوگ لاعلمی میں آجاتے ہیں شبانہ.....'' وہ ایک آہ سرد بھر کر آگے بڑھیں۔

سر پر کالے حاشیے والا سفید سوتی دوپٹا جمائے وہ گول کمرے میں داخل ہوئیں تو تینوں عورتیں احتراماً کھڑی ہوگئیں..... ''لو بھئی صفہ..... اس طرح آغاز ہوتا ہے پیری مریدی کا..... اس کا بھی نشہ لگ جائے تو چھوٹتا نہیں..... نفس کا غبارہ پھول جاتا ہے۔'' عورتوں پر نگاہ ڈالی تو مصائب کی پٹی چلنے لگی..... اولاد نہ ہونا، اولادِ نرینہ، رزق، روزی کی تنگی، ظالم ساس، ظالم بہو، پرانے امراض، مقدمہ، قبضہ، وغیرہ، وغیرہ، چہرے بدلتے ہیں مصیبتیں وہی پرانی ہوتی ہیں۔ ہر نسل اپنے تئیں تازہ ولولہ لے کر پرانا راستہ ناپتی ہے، پرانا سبق نئی زبان سے دُہراتی ہے، نیا بیل نیا کولھو پرانا چکر..... اس زیست میں تو جذبے بھی گنتی کے چار پانچ ہیں..... آواز اور شکل کی قبیل بھی کوئی زیادہ متنوع نہیں ہے..... مگر ہر کسی کو لگتی اپنی کہانی جدا ہے..... بندہ گھن چکر بنا ہوا ہے..... بندہ بیچارہ بھی کیا نظر آنے والی سطح سے بالا ہو کر جائزہ لے، بالا ہونے کے لیے کم سے کم وزن کی ضرورت ہوتی ہے مگر بندہ تو وہ ہے کہ ہر صبح خود پر مزید وزن بڑھا لیتا ہے۔ چاہے غذا کا، بد اعمالی کا..... آنے والیوں نے عاجزی سے سلام کیا۔

''آپ کے ہاں ایک بوڑھی ملازمہ ہوتی تھی اماں بتولاں..... اس کی ایک بہن تھی رسولاں۔ میری آپا نغماں رسولاں خالہ کی ہمسائی تھی۔ آپ کی دعا سے اللہ نے اسے بیٹا دیا۔''

''میں جی بتولاں کی بیٹی ہوں اور رسولاں میری خالہ تھی۔'' شبانہ نے مسکرا کر بتایا۔ وہ سب شبانہ کو بھی عقیدت بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔

''میں نغماں کی بہن نجماں ہوں۔'' وہی بڑی عمر والی عورت بولی۔ ''آپا نغماں کو اس کی ساس بہت کوستی، منحوس کہتی..... بیٹیاں تھیں اس کی، بیٹا نہ تھا..... ہمارا باپ، بھائی بھی نہ تھا..... آپا بہت روتی، اماں بھی روتی..... اکیلی غریب ماں رونے کے سوا کیا کرسکتی تھی۔ ویسے بیٹا دینا تو کسی کے بس میں نہیں ہوتا.....

ایک دن وہ اسی حویلی میں اماں کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ باورچی خانے کے فرش پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اماں اور بتولاں خالہ وہی تھیں...... اسے سمجھاتی، کبھی چپ کراتی، آپ تب کالج، اسکول پڑھتی تھیں...... آپ باورچی خانے میں کسی کام سے آئیں...... انہیں دیکھا اماں وضاحت کرنے لگیں۔ ''بیٹیاں ہیں تین' بیٹا نہیں ہوتا تو ساس' خاوند روز لڑتے ہیں بس بیچاری پریشان رہتی ہے بہت......'' آپ ایسی دبلی پتلی لڑکی سی آپ نے نغماں کے کندھے پر ہاتھ رکھا......اور کہا۔

''اللہ بیٹا دے گا...... اس کا ماتھا بتا رہا ہے...... اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔''

''آپ کی بات پر اماں، خالہ، آپا سب حیران ہو کے ایک دوسرے کا منہ دیکھے گئیں۔ اور آپا نغماں کا کہنا تھا کہ بس میرے اندر یقین اتر گیا۔ دل قابو میں آ گیا۔ سکون سا مل گیا...... آپ کم عمر لڑکی تھیں، بےفکری کی عمر تھی مگر نغماں آپا کا کہنا ہے تب بھی آپ کی آنکھوں میں خاص روشنی تھی...... بس اسی سال آپا کی گود میں بیٹا آ گیا۔ آپا اتنی خوش اتنی نہال...... آپا کی زندگی بچ گئی...... بیٹیاں رُلنے سے بچ گئیں۔ آپ نے بچا دی ان کی زندگی......''

''اوہوں...... نہیں۔'' صفہ بخاری کے جلالی انکار نے اس نجماں نامی عورت کا بولنا بند کر دیا۔ شبانہ جلدی سے پانی کا گلاس بھر لائی۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ شبانہ نے گلاس آگے بڑھایا صفہ بخاری نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''اس کی زندگی اللہ نے بچائی......'' تحکم سے کہا۔ ''اسے بیٹا اللہ نے دیا...... کلمہ پڑھو...... تجدیدِ ایمان کرو......'' کمرا کلمۂ طیبہ کے ورد سے گونج اٹھا۔ عورتوں کے سر جھک گئے، وہ ایک دوسرے کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ کئی پل ایسے گزرے پھر تیسری عورت جو نوجوان لڑکی تھی اور پڑھی لکھی نظر آتی تھی نے سکوت توڑنے کی ہمت کی۔

''بخاری بی بی...... لاریب اللہ دیتا ہے اور کون دے سکتا ہے...... مگر اللہ اپنے نیک بندوں کی دعائیں بھی تو قبول فرماتا ہے ناں جی۔''

''بی بی یہ میری بیٹی عائزہ ہے...... نجماں ہمت کر کے بولی۔ ''ہر شریف انسان غریب ہو یا امیر کو اپنی عزت ہر چیز سے زیادہ پیاری ہوتی ہے، روپیہ پیسہ صحت بیماری سب بعد کی باتیں ہیں...... عزت کا غم دنیا کے سامنے رونے بھی نہیں دیتا......'' ان کا قصہ مختصر یہ تھا کہ عائزہ کے پیچھے کوئی بدنام زمانہ بدمعاش پڑا ہوا تھا۔ عائزہ کی الٹی سیدھی تصویریں کہیں سے بنوا کر دھمکیاں دیتا تھا...... ماں بیٹی جدید ٹیکنالوجی سے آگاہ نہ تھیں۔ ڈر کے مارے گھر کے مردوں سے چھپاتیں اور اس کا منہ بند کرنے کو سونا پیسہ دینے کو آمادہ تھیں۔

''امی رات دن دعائیں مانگ رہی ہیں، وظیفے پڑھ رہی ہیں۔'' عائزہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''کسی نے کہا سفلی علم سے بندہ مروا دو۔''

درمیان والی خاتون جواب تک چپ تھی وہ بولی۔ صفہ بخاری کا رنگ متغیر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ نجماں آپا نے اسے کہنی مار کر چپ کرایا۔

''نہیں بخاری بی بی۔'' عائزہ شرمساری بولی۔ ''ہمیں پتا ہے سفلی کالا علم گناہ ہوتا ہے ہم اس طرف نہیں گئے۔'' عورتیں بھی بیچاری بہت سیدھی ہوتی ہیں، جس کام سے اللہ توبہ کر رہی ہوتی ہیں اس کو کرنے پر بھی نیم تیار ہو جاتی ہیں، گھبراہٹ حاوی ہو تو اصل' نقل کی پرکھ، پہچان مٹ جاتی ہے، جو چمکارے وہ ہمدرد لگتا ہے، جو جھوٹے خواب دکھائے اسے ناخدا بنا لیتی ہیں، دھوکا کھا کر دھوکا دینے والے کا پرچار تو کرتی ہیں سبق حاصل نہیں کرتیں۔

صفہ سامنے بیٹھی عائزہ میں بیتے دنوں کی صفہ کو دیکھ رہی تھی۔ بس ایک قدم پھسلتا ہے اور گرنے سے خود کو روکنا مشکل تر ہو جاتا ہے۔

''عائزہ...... ایک بات تو یہ سمجھ لو...... سفلی علم کے گناہ ہونے پر شک کی کیفیت میں ہونا بھی شرک ہے۔ یہ قطعیت سے گناہ اور کفر ہے۔''

''جی بخاری بی بی......''

''اور آپ......'' وہ نجماں نامی عورت سے مخاطب ہوئی۔ ''ایک بدراہ کے تنگ کرنے کو کالے پیلے علم کی طرف کیوں لے جانے کا سوچ رہی ہیں۔ نجماں بی بی...... آپ کا اصل ڈر وہ بدراہ نہیں، معاشرہ بھی نہیں...... آپ کا اصل ڈر آپ کا گھر والا...... عائزہ کا باپ ہے، حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ صاحبِ خانہ رعیت دار ہے اور اس کے گھر والے اس کی رعیت ہیں۔ رعیت کی پریشانی دور کرنا، اس کا فرض ہے۔ بیٹیوں کی پرورش، تربیت، حفاظت باپ کی ذمے داری ہے یونہی تو وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دو جڑی انگلیوں کے مساوی قریب نہیں ہو جاتا ناں...... عائزہ سے اگر کوئی غلطی نہیں ہوئی تو آپ کو بالکل ڈرنے گھبرانے کی ضرورت نہیں...... بےقصور... باحیا، نیک عورت کی اللہ حفاظت کرتا ہے...... عائزہ سے کوئی نہ کوئی غلطی ہو گئی ہے تو بھی اللہ، توبہ کرنے والوں اور توجہ کرنے والوں کو پناہ دیتا ہے۔ تسلی سے صورت حال باپ کے سامنے رکھو...... میرے پاس کیا لینے آئی ہو؟ کیا نواب پور سے آئی ہو؟''

''جی بخاری بی بی...... ہم نواب پور رہتی ہیں...... آپ سے دعا...... بی بی سائنریں! میری بیٹی کی حفاظت کا تعویذ دے دیں...... دعا تو میں بھی مانگتی رہتی ہوں مگر میں گناہ گار سو جھوٹ فریب والی، میری دعا کی وہ حیثیت کہاں...... آپ دعا کر دیں جی۔''

''نیک پاک صالحات کی دعا افضل ہوتی ہے بی بی۔'' کالج کی پڑھی عائزہ نے اپنی ماں کی بات کو مزید مناسب الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

''تم نے یہ تو سنا ہوگا ماں کی دعا......'' صفہ بولی۔

''جنت کی ہوا......'' شبانہ نے بات پوری کی...... نجماں نے رقت کے مارے ہاتھ جوڑ دیے۔ لفظ اس کی زبان پر ٹوٹنے لگے اور آنسو بہنے لگے۔ وہ کسی طرح مایوس نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اسے خالی ہاتھ لوٹایا جا رہا ہے۔ اِدھر صفہ بخاری کا بس چلتا تو امید لے کر آنے والوں کو کبھی ناامید نہ کرے...... صفہ بخاری تو خود ایک بھاری بوجھ تلے دبتی چلی جا رہی تھی۔

بہت پہلے کی بات تھی، محلّہ بھر کے عید کے کپڑے سینے والی درزن نکو پروین عید کے دن ڈھلے کپڑوں میں ہوتی تھی۔ عورتیں کہتیں نکو پروین اپنا بھی ایک نیا جوڑا سی کر پہن لیتیں۔ نکو پروین کہتی ایک جوڑا خریدا تو تھا مگر ہر بار جب اسے سلائی مشین کے پاس لاتی کوئی نہ کوئی محلّہ دارن اپنے کپڑے لیے آ جاتی اور منت کرتی کہ اسے سی دوں...... کسی کی بچیوں کی عید خراب کر کے میں اپنی عید نہیں سجا سکتی تھی...... سوچتی ان سے گھڑی لے لو...... حامی بھر لو...... ان کی عید خراب نہ کرو...... چنانچہ صفہ بخاری کسی کی عید خراب نہیں کر سکتی تھی سوچا مشین زنگ آلود سہی...... حامی بھر لو...... پھر مشین جانے تو جانے، صفہ بخاری نے شبانہ کو اشارہ کیا، وہ اندر سے ایک صندوقچی اٹھا کر لے آئی۔

اس صندوقچی کی بھی ایک کہانی تھی۔

جب صفہ بخاری یتیم و مسکین ہو گئی، تن تنہا ہو گئی تو اس نے ایک فیصلہ لیا اور اپنے سارے زیور اللہ کی راہ میں بانٹ دیے۔ ایک چھلے کو ترستی مفلس غریب بیٹیاں اپنا نصیب سجا گئیں...... پھر صفہ نے زیورات سے خالی صندوقچی کو دیکھا۔ صندوقچی بہت خوب صورت تھی۔ ساگوان کی لکڑی پر سنہری تاروں سے اسمائے حسنہ اللہ عزوجل اور دوسری طرف اسمائے النبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کندہ تھے۔ صفہ اسے دیکھتی اور سوچتی رہی اس کا کیا کروں...... قرآن مجید اس میں سما نہیں سکتا تھا کہ اس میں خانے اور درازیں تھیں صفہ نے الوہی تصور سے سوچا سدرۃ المنتہیٰ پر لکھنے والا قلم جس کے چلنے کی آواز آتی ہے، وہ طاقتوں والا ہمیشہ رواں رہنے والا قلم کیا ہوگا؟ صفہ بخاری کی پردادی جی نے جب پہلی بار فاؤنٹین پین دیکھا تھا تو حیرت کا سجدہ ادا کر کے سر اٹھایا اور کہا۔ ''سبحان اللہ سیاہی نہیں ڈبوتا تو لکھتا کیسے ہے۔'' بندے کی عقل تو بہت محدود ہے کل کی حیرت

آج کا علم ہے، کل کا غیب کل کو معلوم ہو سکتا ہے۔ قلم تو سماوی ایجاد ہے، قلم رسم ربی، سنتِ الٰہی ہے، ہاتھ کا قلم پر قادر ہونا عنایت خداوندی ہے۔ امید اور روشنی بانٹنے والے قلم کی حرکت تمام متحرک اشیا سے معتبر ہے۔

صفہ بخاری نے صندوقچی میں قلم رکھ دیا کہ یہ آفاقی فیصلوں کے اٹل ہونے کی یاد دلائے گا۔ جہاں قلم ہوتا ہے وہاں قرطاس بھی ہوتا ہے۔ حروف سے قرطاس کی زیبائی ہے۔ حرف کی توانائی (انرجی) سے بشر ابھی پوری طرح آگاہ نہیں حرف ''کُن'' نے کائنات مرتب کردی۔ وہ بھی حرف تھے کہ جسے خالق نے رات پر رکھا تو تاریک ہوگئی دن پر رکھا، روشن ہوگیا...... آسمانوں پر رکھا تو بے ستون ٹھہرے ارض پر رکھا تو تغیر میں ثبات پا گئی۔ وہ بھی حروف جو جبرئیل علیہ السلام کی جبیں مبارک پر لکھے ہیں اور وہ حرف کہ جن کے لفظوں سے انبیا کرام نے حمد و ثنا، استدعا، التجا، مدعا اور دعا مانگی...... صفہ نے کامدار صندوقچی کھولی...... کاغذ کی پرچی پر اسما حسنہ لکھے اور لکھا جو لکھا اور عائزہ کو دے دیا...... اور اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

''اللہ پر پکا یقین باندھو...... ایسا یقین جو ہوا میں اچھالے جانے والا بچہ اپنے اچھالنے والے باپ پر رکھتا ہے۔ یقین اس کو ہنساتا ہے، رُلاتا نہیں ہے۔''

وہ سر جھکائے، نظر جھکائے مؤدب کھڑی رہی۔

صندوقچی بند ہوئی...... وہ تشکر کے جانے کون، کون سے پیمانے بھرتی چلی گئیں۔ اب باقی تو اسے اپنی جان پر لینا تھا...... اپنا بھرم بچانے کو گڑگڑانا تھا...... گول کمرا خالی ہوگیا...... صفہ اپنے جہیز کی صندوقچی گود میں رکھے ماضی کے نقشِ پا پر چلتی بہت پیچھے چلی گئی۔

☆☆☆

مہندی کی تقریب میں جانے کے لیے تیار اماں جان اور خالہ میرو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے آوازیں دے رہی تھیں۔

''اب آ بھی جاؤ صفہ...... کب تک تیار ہوتی رہو گی بیٹی۔''

''لپ اسٹک کا یہ شیڈ نہیں جچ رہا...... اسے اتار کر یہ والا لگاتی ہوں...... اماں جان کو تو جلدی پڑی رہتی ہے، بلائے جا رہی ہیں...... ڈھنگ سے تیار نہیں ہونے دیتیں...... پارلر جانے سے روک دیا۔ اب خود سے تیاری میں کچھ وقت تو لگے گا......'' اکیس سالہ صفہ بخاری سنگار میز کے سامنے کھڑی تھی۔ اپنی تیاری سے مطمئن ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ اپنی دکھاوٹ پر کوئی سمجھوتا کرنے کو آمادہ نہ تھی...... اس کی رنگت گندمی، آنکھیں بڑی، بڑی اور سیاہ بھویں سیاہ گھنی تھیں باقی ناک نقشہ درست تھا۔ بیوٹی پارلر والی نے ایک بار سمجھایا تھا کہ ہر لڑکی کے چہرے پر کچھ نہ کچھ ضرور خوب صورت ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ لڑکی اپنے اس پوائنٹ سے آگاہ ہو۔ جو نقش اچھا ہو اسے مزید اجاگر کیا جائے اور جو خامی ہو اسے مدھم کر دیا جائے۔ اس لیے وہ اپنی آنکھوں کو کاجل لائنر مسکارا لگا کر قلو پطرہ بنا دیتی...... بھنوؤں کو متناسب موٹائی دے کر پنسل لگاتی تو نین کٹاری بن جاتے مگر اسے معلوم تھا کہ بخاری روڈ کی علیشاہ، چاچی زبیدہ کی بیٹی وردہ اور سہیلیوں میں نخبہ اعوان کسی تقریب میں ہوں تو منتخب حسینائیں ہیں اور اندر ہی اندر مقابلے کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اس کا جی چاہتا وہ ہر لحاظ سے خوب صورت تسلیم کی جائے۔ اور یہ صرف اس کی بات نہیں تھی سراہے جانے کی نسائی فطرت تھی۔

تعلق کے گھنے جنگل میں بچھو سراتے تھے

مہندی کی تقریب میں خوب رونق تھی۔ چمکتے دمکتے پنڈال، آراستہ و پیراستہ اسٹیج، یہ ایک مخلوط محفل تھی۔ ایسے مواقع پر نوجوان لڑکے غیر معمولی چستی کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں، بنی ٹھنی لڑکیاں بھی جوابی ہتھیاروں سے لیس ہوتی ہیں، لڑکوں کے گروپ میں ایک لمبا گورا صحت مند لڑکا صفہ کو بار، بار دیکھ رہا تھا۔ صفہ کو اس کی نظروں کی تپش کا ادراک ہو گیا تھا۔ لڑکیوں کے گروہ میں سرخ و سیاہ کامدار سوٹ میں جادوگر

آنکھوں والی یہ لڑکی بھی خاصی پُرکشش لگ رہی تھی۔ آج تو وردہ نے اس کی خاصی تعریف کی تھی۔ (خاندان کی تقریب میں علیشاہ اور نخبہ نہیں ہوتی تھیں) تعریف کی جگمگاتی شمع سے اس کا دل روشنی سے لبریز ہو رہا تھا۔ اب یہ ہینڈسم لڑکا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا جس نے کھلے بٹنوں کی چیک دار ریڈ اینڈ وائٹ شرٹ کے نیچے عجیب و غریب اشکال والی بلیک ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ ڈانس کرنے والوں کے گرد تالیاں بجانے والے حلقے میں وہ صفہ کے بالکل قریب پیچھے آٹھہرا تھا۔

''اے ے...... نام کیا ہے تیرا؟'' اس نے سرگوشی کی۔

صفہ نے پلٹ کر دیکھا اتنے قریب پا کر وہ سرخ پڑ گئی۔ جلدی سے جگہ بدل لی۔ کچھ دیر بعد پھر دیکھا وہ لکھنے کا اشارہ کر کے پوچھ رہا تھا ٹیلی فون نمبر کیا ہے...... صفہ کو ہنسی آ گئی بس جوں، جوں تکلف کا کلف اترتا رہا...... واپسی تک وہ صفہ کے گھر کا ٹیلی فون نمبر جان چکا تھا اور یہ بھی کہ فون کس وقت کرنا مناسب ہوگا...... اس کا نام واصف تھا۔

''واصف اور صفہ...... ہمارے تو نام بھی ملتے جلتے ہیں......'' اس کی نثار ہوتی مسکراہٹ نے کہا تھا۔

صفہ کی ابھی تک کی زندگی میں کسی مرد کا نام و نشان نہ تھا۔ محبت تو بس سچائی ہوتی تھی۔ (اس کے لیے) محبت میں بھلا کیا فریب ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر اب واصف کے نام کا تارہ جھلملاتا۔ وہ تتلی کی طرح اڑتی اور چاند کی طرح دمکتی رہتی جب ابا صاحب چلے جاتے، اماں جان ملازمین کے ساتھ مصروف ہو جاتیں وہ گول کمرے کے کارنر میں رکھا ٹیلی فون کا چونگا سنبھال لیتی۔ واصف تو ہر وقت ہی فون پر مل جاتا تھا۔ واصف کی آواز ایک جیتی جاگتی تمازت جو لہر در لہر جسم میں سرایت کرتی جاتی...... چند دنوں کے بعد ہی ایسا لگنے لگا جیسے وہ اسے بہت جانتی ہے۔ کس بات پر خوش ہوتا ہے، ناراضی کیسے اس کے لہجے سے چھلکتی ہے۔ ''اور جاننا کیا ہوتا ہے۔'' اس نے کبھی غور نہ کیا کہ واصف کے بارے میں معلومات کا ذریعہ تو وہ خود ہے۔ اس صورتِ حال میں source (ذریعہ) جھوٹا ہو تو کشتی کسی وقت بھی ڈوب سکتی ہے۔ مگر رئیس والدین کی اکلوتی لاڈلی بیٹی کو مستقبل کی فکر کیونکر ہوتی۔ مستقبل اس کی مٹھی میں تھا اور بس ویسا ہی ہونا تھا جیسا اس کو پسند ہوتا وہ بھلا کیوں فکر کرے۔

محبت ہمیشہ مزید کا مطالبہ کرتی ہے۔ جہنم بھی کبھی قناعت نہیں کرے گی، پکارے گی ھل من مزید...... محبوب کبھی خط لکھنے یا فون کرنے تک اکتفا نہیں کرتے...... پہلا قدم تو آنکھوں کے ایجاب کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد عمر اور صورت، شکل کی جانکاری ہوتی ہے پھر میٹھی۔ میٹھی باتیں ہوتی ہیں...... اس کے بعد ملاقات...... بہت ضروری ہے۔ آگے چل کر ملاقات بھی ایک بار تک محدود نہیں رہتی...... اور ملاقات اسرار بھی باقی نہیں رکھتی، اسے پردے مٹانے ہوتے ہیں، حجاب ختم کرنے ہوتے ہیں۔ انتہا میں اترنا ہوتا ہے۔ واصف اب ملنا چاہتا تھا۔ اس کے پیغامات، اس کا ہجر، اس کی محبت سب کچھ اب ملاقات کے تقاضے کے گرد گھومتے تھے۔ یہاں پر آ کر سادہ، شریف، عام لڑکی کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگتے ہیں۔ زمینی حقائق قدم پکڑتے ہیں مگر تخیل کی اڑان زمین پر پاؤں ٹکنے نہیں دیتی۔ تب بھی یہی حویلی تھی، یہی پھاٹک تھا، یہی روشیں اور یہی رستے تھے مگر کچھ بھی اب جیسا لگتا نہ تھا۔ اڑی، اڑی پھرنے والی صفہ کا دھانی آنچل سنبھلتا نہ تھا، ایک تو نائلون کا دوپٹا اوپر سے بانکی توریں...... اماں جان کہتی تھیں کہ چوڑی کلائی کے موافق پوری ہو تو چھنکار نہیں کرتی پر جس کا من ناچتا ہو اس کی چوڑیاں کیسے نہ چھنکیں...... نخبہ اعوان ایڈمیشن فارم لے کر آئی تھی۔ ایم اے کے داخلے چل رہے تھے۔

''تم کیوں ایڈمیشن نہیں لے رہیں؟'' وہ بدستور مسکراتی رہی۔

''ایڈمیشن کی ڈیٹ آگے بڑھ گئی ہے، فارم لے لو......'' پھر بھی کہا۔

''ابا صاحب کہتے ہیں لڑکوں کے ساتھ پڑھنا پڑتا ہے۔''

''بالکل نہیں مانتے انکل......؟''

''اصرار کروں تو مان بھی لیں گے......'' صفہ نے بے فکری سے چیونگم چباتے ہوئے کہا۔

''تو کرو ناں اصرار...... کس چیز کا انتظار کر رہی ہو......''

''ہے ایک چیز......''

''شادی ہونے والی ہے کیا......؟'' نخبہ کی آنکھوں میں سوال ابھرا۔

''ہو بھی سکتی ہے۔''

''بتاؤ ناں......''

''کیا بتاؤں......؟''

''کس کا انتظار ہے؟ کون ہے وہ؟''

''بس ایسے ہی......''

''کیا بس ایسے ہی...... جنات تو نہیں آ گئے تجھ پر۔'' نخبہ چڑ گئی۔

''پرامس کرو کسی کو بتاؤ گی نہیں......''

''میں کس کو بتاؤں گی بھلا......''

''وعدہ کرو۔''

''وعدہ ہے یار۔''

''مجھے واصف کا انتظار ہے۔''

''واصف کون ہے؟''

ٹوٹا پھوٹا تعارف صفہ نے بتا دیا۔

''ارے...... تین ماہ سے فون پر باتیں کر رہی ہے، مجھے بتایا تک نہیں...... کیا کرتا ہے مسٹر واصف؟''

''بزنس ہے۔''

''اس کی تصویر دکھا......'' صفہ کتابوں میں رکھی ایک تصویر اٹھا لائی۔

''اس کی آنکھیں تیز لگتی ہیں۔'' تصویر دیکھ کر نخبہ بولی۔

''قیافہ شناس کب سے ہو گئی ہو۔''

''بس مجھے لگا...... کبھی ملی ہو؟''

''نہیں......''

''ایک بار مل کے دیکھ لو۔''

''وہ بھی یہی کہتا ہے۔''

''وہ بھی یہی کہتا ہے...... تو واقعی تیز ہے۔''

''تم مشورہ دے رہی ہو تو تم تیز نہیں......'' دونوں ہنسنے لگیں۔

''ملنا ولنا مجھ سے نہیں ہوتا...... بس رشتہ بھیج دے۔''

''وہ کہاں ملنے کو کہتا ہے؟''

''کہیں بھی...... ویسے اپنی کوٹھی پر ہوتا ہے...... وہاں چوکیدار اور مزدور بھی ہوتے ہیں۔''

''یعنی گھر والے نہیں ہوتے؟''

''ابھی زیرِ تعمیر ہے۔''

''یہ زیرِ تعمیر کوٹھی والی بات ٹھیک نہیں...... کہیں ریستوران میں کافی پی لینا۔''

''تمہیں پتا ہے، ہمارا یہ ماحول نہیں ہے۔''

''پھر کیا کرو گی آخر......؟''

''پتا نہیں......''

''چلتا کرو...... اور ایم اے کا داخلہ بھرو۔''

''جب کوئی دل میں سما جائے تو چلتا کرنا آسان نہیں ہوتا۔''

''دل میں سما گیا یعنی......'' وہ اسے گدگدانے لگی۔

''اچھا...... سیریسلی بتا...... اس کی محبت پر بھروسا ہے؟''

''آف کورس......!''

''کتنا......؟''

''جتنا کوئی پیمانہ بھر سکتا ہو۔''

''اگر اتنا بھروسا ہے تو مل لو ایک بار...... کچھ نہیں ہوتا۔''

صفہ چپ ہو گئی، ادھیڑ بن میں لگ گئی۔

نخبہ کا یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا۔ چھٹی جماعت سے شروع ہونے والی یہ دوستی دوری کا شکار ہو گئی۔ صفہ جھنگ کے نواحات میں بخاری حویلی میں رہ گئی...... نخبہ اسلام آباد چلی گئی، اس کے بابا وہیں افسر تھے۔ واصف اپنی زیرِ تعمیر کوٹھی کی تصاویر صفہ کو بھیجتا اور کہتا کہ شادی کے بعد ہم یہاں رہیں گے۔ وہ اس سے آرائش و تزئین کے مشورے طلب کرتا...... وہ کہتا کہ ہمارے گھر کا کونہ، کونہ تمہاری رائے اور مرضی سے سجے گا۔ صفہ کو

خوابوں کے اس محل سے نادیدہ انس ہوتا چلا گیا اور بالآخر جرائت و جسارت کا وہ دن بھی آ گیا جب صفہ نے ایک بار زیرِ تعمیر کوٹھی میں جانے اور واصف سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

جب وہ اماں جان سے ''نخبہ کے گھر جانے کا جھوٹ بول کر اجازت لے رہی تھی تو اندر سے خوف سے لرز رہی تھی۔ باطنی ردِ عمل جاری تھا مگر اماں جان نے اسے معمول کی بات لیا۔

''کب تک آؤ گی؟'' بس اتنا پوچھا۔

''ایک گھنٹے تک آ جاؤں گی۔''

''شبانہ کو لے جاؤ ساتھ......'' وہ لکڑی کے دیوان پر بیٹھی کروشیا کی بیل بُن رہی تھیں۔

''شبانہ بچی نہیں ہے، اتنی بڑی کو لیے پھروں...... مجھے بابو رکشا لا دے گا۔''

اماں جان نے سر اٹھا کر اسے غور سے دیکھا، بسنت بہار کا کھلتا بسنتی رنگ جس پر سرسبز پتوں کی کڑھائی تھی، آنکھوں میں کاجل بولتا تھا۔

''چادر کہاں ہے تمہاری......؟''

صفہ نے استری شدہ چادر کھولی، کھول کر اوڑھی اور اماں جان کو دیکھ کر مسکرائی۔

''ابا صاحب کہاں ہیں؟''

''فجر سویرے اراضی پر چلے گئے، منشی میاں آیا تھا۔''

''اچھا...... چلتی ہوں۔''

وہ کچھ قدم چلی ہی تھی کہ اماں جان کی آواز آئی......

''صفہ، نخبہ کا داخلہ جو ہو گیا تھا تو ابھی گئی نہیں......'' صفہ کا رنگ اُڑ گیا...... پشت موڑے جواب دیا۔

''اتوار کو جائے گی۔'' ایک جھوٹ کو سنبھالنے کے لیے درجنوں جھوٹ درکار ہوتے ہیں۔ واصف کے دیے ہوئے پتے پر زیرِ تعمیر کوٹھی کے سامنے اتری۔ دیدہ زیب جدید ترین آؤٹ لک تھی۔ کوٹھی کے باہر... جیومیٹریکل اشکال میں تراشے باغیچوں میں ہرے گھاس کی اٹھان پر تازہ، تازہ پانی لگا ہوا تھا۔ نئی عمارت کے عدم تکمیل میں بھی شوکت تھی۔ باہر تعمیراتی خام سامان کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ وہ رکشے سے اتر کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ واصف اوپر کہیں سے اسے دیکھ رہا تھا اور لطف لے رہا تھا۔ پھر اس نے اوپر سے سیٹی بجا کر متوجہ کیا۔ صفہ سیٹی کی آواز پر ڈر ہی تو گئی...... اوپر دیکھا تو وہ ہاتھ ہلا رہا تھا۔ کسی نامکمل کھڑکی سے لٹکا ہوا پھر وہ ہنستا ہوا ذرا سی دیر میں نیچے پہنچ گیا۔

صفہ ایک معتبر معزز گھرانے کی پروردہ تھی۔ اس طرح کسی غیر مرد سے چھپ کر ملنا ان کے ماحول کے حساب سے ناقابلِ تصور بلکہ ناقابلِ معافی خطا تھی۔ مگر واصف پر اندھا بھروسا اور ایسا اعتماد جیسا انسان کا خود پر ہوتا ہے، اسے یہاں تک لے آیا تھا۔ وہ آرام سے چادر اتار کر تہ لگا کر ہینڈ بیگ میں ڈالتی...... (جیسے کسی سہیلی کو ملنے آئی ہو......) صرف دوپٹا پہنے کوٹھی کی بھول بھلیوں میں اس کے ساتھ چلتی اس کمرے تک آ گئی جہاں پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں مکمل اور لاک تک لگے ہوئے تھے اندر دو چھوٹے صوفے، ایک میز اور ایک سنگل بیڈ رکھا تھا۔ غالباً دورانِ تعمیر رہائش کے لیے اسے سیٹ کر دیا گیا تھا۔ راہداریوں میں مکان کے متعلق باتیں کرتے اور چلتے ہوئے صفہ کو کسی اجنبیت کا احساس نہ ہوا مگر واصف کے اس بیڈ روم نما کمرے میں داخل ہونے پر وہ ضرور ہچکچائی۔

''اکثر یہاں stay کرنا پڑتا ہے کچھ گزارہ بنا رکھا ہے، آؤ بیٹھو...... اس کے سوا تو بیٹھنے کی کوئی اور جگہ نہیں......'' واصف اس کی ہچکچاہٹ بھانپ کر بولا۔

''اِدھر باہر ہی کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔''

''باہر تو میں تمہیں نہیں بٹھا سکتا سویٹ ہارٹ میرے انکل وغیرہ آ نکلتے ہیں۔ اور لیبر بھی تو ہے۔''

تیار شدہ دلائل نے اسے اندر آنے پر مجبور کر دیا۔

''اُف یہ آنکھیں...... کتنی قاتل آنکھیں ہیں، لگتا ہے آج میں نہیں بچوں گا۔'' وہ اسے محبت سے ایک ٹک دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔

بہرحال یہ جملہ اپنی طرف سے تعریف سہی مگر خاصا

بیہودہ تھا۔ وہ تو مسلسل کبھی اشعار کبھی گیت کبھی مکالمے میں اس کے حسن کی تعریفیں کر رہا تھا۔ پھر اس نے وہیں رکھے ریفریجریٹر میں سے دو بوتلیں نکالیں اور دروازہ بند کرنے بڑھا۔ ایک دم صفہ کی چھٹی حس بیدار ہوگئی۔

''ان بوتلوں میں کیا ہے؟ وہ ہرگز کچھ نہیں پیے گی۔ یہ دروازہ کیوں لاک کر رہا ہے؟'' یہی سوچ کر وہ لپک کر دروازے پر آگئی۔

''دروازہ نہیں بند کرنا۔''

''بھئی ایسے ہی، کوئی دیکھ نہ لے۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''کوئی نہیں دیکھتا...... نہیں بند کرنا پلیز......''

صفہ نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہاتھ جھٹک کر صفہ نے ہینڈل گھمایا تو وہ ایک دم سے اسے اپنی جانب کھینچنے لگا۔ ساری شائستگی ہوا میں اُڑ چکی تھی۔ جیسے اسے چھونے، پکڑنے، تمام حدیں پار کرنے کی چھوٹ مل گئی تھی اس کے قریب تر ہو کر وہ بول رہا تھا، کیا بول رہا تھا صفہ کو اب قطعی پروا نہیں تھی۔ وہ پوری قوت سے اسے دھکا دے کر چیخی۔

''دور ہو کے بیٹھو......'' لفظوں کی پناہ گاہ ٹوٹ چکی تھی۔ صفہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ اس کی ناپسندیدگی، اس کی ناراضی کو نظر انداز کر کے ایسی نازیبا حرکتیں کیوں کر رہا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اس طرح وہ اس کے دل سے نکل جائے گا، اسے کھو دے گا مگر واصف کے ہاں کھونا اور پانا دیگر معنوں میں تھا۔ وہ اسے موقع کہتا تھا جو قسمت سے ملا تھا۔

''قسمت سے موقع ملا ہے...... ترس گیا تھا میں...... تم آتی ہی نہیں تھی، نیند نہیں آتی تھی ساری، ساری رات...... یہاں اس بستر پر اکیلا پڑا کروٹیں بدلتا رہتا تھا۔ آج آئی ہو تو پلیز اس طرح ظالمانہ سلوک تو نہ کرو...... میرے پاس آ کر بیٹھو میں تمہیں جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''دیکھا ہوا ہے...... میں اب یہاں ہرگز نہیں بیٹھوں گی...... باہر آ جاؤ......'' وہ دروازہ کھولنے کو تھی کہ واصف پھر ایک بار اسے بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔

''تم سمجھتی کیوں نہیں...... آرام سے آ کے بیٹھ جاؤ...... تماشا نہ کرو......''

''مجھے ہاتھ مت لگاؤ......'' وہ چیخ کر بولی۔

''چیخو مت......'' واصف نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ وحشت میں صفہ نے دھکم پیل کرتے ہوئے دروازہ کھولا اس کا دوپٹا اتر کر واصف کے ہاتھوں میں آ گیا مگر وہ ننگے سر دروازے سے نکل کر دوڑ پڑی...... وہ باؤلے پن سے اس کے پیچھے لپکا، ایک بار پھر اسے گرفت میں لے کر جہاں داؤ لگا اسے اپنے وحشیانہ پن کا نشانہ بناتے ہوئے کھینچنے لگا۔ جانے کہاں سے اتنی طاقت صفہ میں آئی کہ اس نے زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کیا۔ بالوں کی لٹیں چہرے پر پھیل گئی تھیں اور وہ اب راہداری میں دوڑ رہی تھی۔

اُف خداوندا...... کہاں گئی چاہت، کہاں گیا چاہنے والا...... وہ تو کوئی خونخوار درندہ تھا۔ جو پیچھے آ رہا تھا...... کسی وحشت ناک فلم کے منظر کی طرح بغیر دوپٹے، کھلی لٹیں، دیوانہ وار دوڑتی لڑکی اور اس کے پیچھے کھلے گریبان والا فحش بکتا مرد...... گویا کوئی بہت ڈراؤنا خواب...... کہ جس سے جان چھڑانے کے لیے نیند میں ہاتھ پاؤں پٹخنے سے آنکھ کھل جائے مگر یہ خواب نہیں تھا۔

''یہاں سے نکلوں کس طرح...... آج نکل جاؤں اللہ...... آج بچا لے مجھے......'' صفہ کے ہر موئے بدن، روئیں روئیں سے یہی دعا نکل رہی تھی۔ وہ بھاگتی دوڑتی ابتر حال سڑک پر آ گئی...... جیسے وہ اس کی حدود سے باہر پہنچی، پیچھا کرنے کی چاپ رک گئی۔ وہ اندر رک گیا۔ یہ سڑک تھی کھلی آمد و رفت کی جگہ تھی۔ صفہ کے سر پر دوپٹا نہ تھا۔ زمین پھٹتی نہ تھی کہ وہ اس میں گڑ جائے کیسا عزت دار وضع دار گھرانا...... اور عزت کا جنازہ نکال دینے والی بیٹی...... کہیں سے چادر مل جائے، یاد آیا چادر ہینڈ بیگ میں تھی جو شانے پر لٹکا ہوا تھا اور وہ آخر میں باہر نکلتے ہوئے وہیں گرا تھا۔ وہ زیادہ دور نہیں تھا۔ بغیر دروازے والے انٹرنس کی

چوکھٹ کے پاس گرا تھا۔ مگر کہیں وہ اُدھر قریب ہی نہ چھپا ہو...... اس ڈر کے باوجود وہ ایک سیکنڈ بھی مزید باہر اس طرح بے پردہ نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ وہ سامنے آنے والی کار، وہ بھاگ کر اندر گئی چوکھٹ کے بائیں طرف بیگ پڑا ہوا تھا۔ سرعت سے اٹھایا اِدھر اُدھر دیکھے بغیر باہر نکلی...... اینٹوں کی اوٹ میں ہو کر چادر نکالی...... جلدی سے سر پر اوڑھ کر چہرہ چھپا لیا...... ایسا لگا کہ بچ گئی ہو...... دنیا میں چادر سے بڑی کوئی نعمت نہ ہو...... پانی بھی نہیں...... سانس بھی نہیں۔

وہ سڑک پر آ گئی...... اب خیال آیا کہ دوپٹا اس بدمعاش کے ہاتھوں میں رہ گیا...... وہ اسے گھر والوں کو کسی کو دکھا کر کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ دوپٹا گم ہونے کی من گھڑت کہانیاں سوچتی وہ ٹیکسی میں بیٹھی اور...... گھر آ گیا۔ بخاری حویلی کا پھاٹک سامنے تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آج وہ اتنے بڑے سانحے سے بچ گئی ہے۔ بدحواس سی اندر داخل ہوئی...... روش پر چلتی آنگن میں آ نکلی حالانکہ چاہتی تو انٹرنس سے اندرونِ خانہ داخل ہو جاتی مگر ابھی اس کا شعور کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ سرونٹ کوارٹر کے لان میں شبانہ اور اماں بتولاں بیٹھی سرسوں کا ساگ کاٹ رہی تھی۔ ابھی ابھی فرش دھو کر آنے والی شبانہ نے پائنچے چڑھائے ہوئے تھے۔ پرانا سا پھولدار سوٹ اور دوپٹا اتار کر کہیں رکھا ہوا تھا...... لمبا سا دھنیا لیے لہراتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

''اتی لمبی ٹہنی تے دو پتے...... اتی لمبی ٹہنی تے دو پتے۔'' اس کی ماں نے ممتا بھری ڈپٹ دی۔

''چپ کر جا، پگلی نہ ہو تو...... تمیز کر...... چھوٹی بخاری بی بی دیکھ رہی ہے...... دوپٹا کدھر ہے ترا...... دوپٹے کا اتا پتا نئیں، نری کوئی جھلی ہے۔''

صفہ کے قلب میں تیر پیوست ہوا...... وہ جو خود اپنا دوپٹا کھو آئی ہے اسے دیکھ کر یہ بیچاریاں سر ڈھانپ رہی ہیں۔ ''میں اس گیلی آستینوں والی نیم خواندہ لڑکی سے بہت کمتر ہوں۔ یہ پاکباز ہے، معصوم ہے، اسے کسی مرد نے اس طرح نہیں ہاتھ لگایا......'' وہ آنسو چھپانے کے لیے تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے تک گئی۔ اندر داخل ہو کے دروازہ بند کر کے فرش پر بیٹھ رہی، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آنسوؤں کا ایک طوفان تھا جو بہہ نکلنے کو بے تاب تھا...... ایسے تو کسی مرنے والے کو رویا جاتا ہے...... ہاں موت ہوئی تھی، ایک نہیں کئی اموات ہوئی تھیں...... محبت کی موت بلکہ محبت کا وحشیانہ قتل، اعتماد کی موت.... اعتبار کی موت، یقین کی موت.... انا کی موت، معصومیت کی موت، خود ستائشی کی موت، خود پسندی کی موت، موروثی نجابت کے تفاخر کی موت، احساسِ جوانی کی موت، اماں، ابا کی نظروں میں لاڈلی گڑیا کی موت، اتنی موتیں...... اتنے جنازے، روتی، دفناتی تھک کر چور ہوگئی۔

ہاں بچ نکلنے کا شکر تھا مگر ندامت نے زبان گنگ کر دی تھی۔ شکر ایک ٹھنڈی مرہم کی طرح نیلے زخموں پر ٹھنڈک کا پھاہا تھا۔ اس کیفیت سے نکلی تو کپڑے نکالے اور نہانے چلی گی۔ ہر اس جگہ کو مل، مل کر دھویا جہاں واصف نے ہاتھ لگایا تھا۔ اور غسل کے دوران گرم، گرم آنسو چہرے پر گرتے رہے۔ کیا تھا اس کا اندھا اعتماد...... اسے تو لگتا تھا وہ دونوں الگ کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ کر مستقبل کی باتیں کریں گے...... اگر انہوں نے مستقبل میں ایک ہونا ہی تھا تو وہ کیوں اپنا ضمیر، ایمان، وجود ناپاک کرتے...... مگر واصف نے ایک خودغرض، بدمعاش، موقع پرست، بداعمال، گمراہ، گھٹیا مرد کی طرح سوچ رکھا تھا کیونکہ وہ ایسا ہی تھا۔

جل کر خاکستر ہوگئی محبت، اس کی راکھ سے نیا وجود جنم لے رہا تھا۔ رات اس نے آنکھوں میں کاٹی، اپنے رب کے حضور سجدۂ شکر میں پڑی رہی پھر اٹھ کر نئے سرے سے غسل کیا، سفید براق جوڑا نکال کر پہنا پھر تہجد پڑھی اور پھر فجر پڑھ کر اماں کے پاس آ گئی۔ اس نے سفید سوٹ پر سفید دوپٹا سر پر لے رکھا تھا۔ اماں جان نے دیکھا تو حیران سی رہ گئیں، جانتی تھیں اسے سفید رنگ پہننے سے چڑ ہے اچھا بھلا نیا سفید سوٹ گفٹ آیا تھا وہ نہ پہنتی کہ کالی نظر آؤں گی۔ آج

اس نے یہ کیسے پہن لیا۔ منہ سے یہی نکلا۔

''کیا ہوا بیٹا، خیر تو ہے؟''

''ہاں...... کیوں......؟''

''یہ سوٹ تم نے آج کیسے پہن لیا......؟'' اماں جان اسے دیکھ کر بولیں۔

''اماں جان...... میں آپ سے اجازت مانگنے آئی ہوں۔''

''خیر ہے بیٹی......'' وہ فکر مند ہوگئیں۔

''اماں جان...... میں دینی مدرسے میں داخلہ لینا چاہتی ہوں۔''

''دینی مدرسہ......؟ کیا مطلب؟''

''جی ہاں، جہاں دین اسلام کی تعلیم دی جاتی ہے۔''

''تم پڑھی لکھی ہو......نماز، روزہ جانتی ہو، تمہارے والدین نے تمہیں اچھی تربیت دی ہے۔''

''نہیں اماں جان...... میں کچھ نہیں جانتی۔''

''بیٹھو......تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے بیٹا، تم مجھے فکر مند کر رہی ہو۔''

''ہمارا رہن، سہن، اپنی اصل سے بھٹک چکا ہے۔ دین کی تعلیم حاصل کرنا آج کل ہمیں بے مقصد، عجیب، کمتر، اور اب......'' وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔

''اب تمہاری شادی کا وقت ہے۔''

''اماں جان...... اگر میں نخبہ کے ساتھ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتی تب بھی مجھے دو تین سال لگ جانے تھے ناں...... وہاں میں نے مردوں کے ساتھ پڑھنا تھا......اماں جان، میرا جی چاہتا ہے میں کسی مصفا ماحول میں نکل جاؤں...... آپ ابا صاحب سے اجازت دلوا دیں۔''

''اِدھر آ کے بیٹھو......'' اماں جان بڑے ہمانچے پر بیٹھ رہیں، وہ ان کے پاس بیٹھی تو اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''آج کل کے مدرسوں کے ماحول سے وسوسہ ہوتا ہے۔ وہاں اگرچہ سب ایسے نہیں ہوں گے مگر...... وہاں مسلمانوں کو تقسیم کر دیا جاتا ہے۔'' وہ اپنے خدشات زبان تک لے آئیں۔

''وہاں کے ہاسٹل میں بھی خرابیاں سنتی رہتی ہوں...... گھر بیٹھی عورت ہوں مگر جانتی بہت کچھ ہوں......''

صفہ نے توجہ سے سنا...... پھر اماں جان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے متانت سے کہا۔

''آپ ٹھیک سوچتی ہیں...... میں بھی یہی سوچتی ہوں مگر میں جاننا چاہتی ہوں کہ اسلام کی حقیقی تعلیم کیا اب واقعی کہیں نہیں رہی؟ ایسا نہیں ہو سکتا، میں تحقیق کر کے ادارے کا انتخاب کروں گی...... میں اپنا باطن اجلا کرنا چاہتی ہوں، اپنے لیے راہنما ہستی کی تلاش ہے...... میں پڑھنے کے بعد معلم نہیں بنوں گی......اتنا بلند مقام میرا ہو ہی نہیں سکتا...... میں سوچتی ہوں بندہ اپنے اندر کا جنگل کاٹ لے بہت ہے...... یہ تو روز کی جنگ ہے اماں......''

''میں صدقے جاؤں...... تم اتنی سمجھداری کی باتیں کرنے لگی ہو......تم تو ایک رات میں سیانی ہوگئی ہو......کوئی خواب دیکھا ہے کیا؟'' اماں نے رازداری سے پوچھا۔

''دیکھا تو نہیں...... اب دیکھ رہی ہوں...... میں ہاتھ بڑھاؤں گی تو میرا اللہ مجھے تھامے گا ناں...... اماں جان۔''

اماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، حسرت و رشک سے کہا۔

''صفہ......تم ہم بوڑھوں سے آگے نکل گئی ہو۔''

''پیاری اماں، ابا صاحب مان جائیں گے ناں......؟ ویسے میرا خیال ہے انہیں اچھا لگے گا۔'' صفہ نے آگے بڑھ کر اماں کو گلے لگا لیا۔ اماں نے اس کی بلائیں لیں۔

''ہاں وہ تو انکار نہیں کریں گے، تمہاری تو کوئی بات نہیں ٹالتے۔''

صفہ نے کمرے میں آ کر واصف کے خط اور تصاویر نکالیں، آتش دان سرد تھا موسم نہیں تھا۔ اس نے آتش دان میں خط اور تصاویر رکھ کر ماچس کی تیلی لگا دی۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس بسنتی سوٹ کو آگ لگا دے جو پہن کر گئی تھی مگر دھواں زیادہ اٹھتا مبادا کوئی دیکھ لیتا۔

صفہ کی اسلامی تعلیم حاصل کرنے کی خبر سے وہ گھر بھر میں ایک دم معتبر ہوگئی تھی۔ ابا صاحب فخر محسوس کر رہے تھے۔ ملازمین مرعوب تھے، اس سہ پہر اماں بتولاں اور شبانہ کو باورچی خانے سے الگ کر کے اس نے چائے خود بنائی۔ اماں کو پکوڑیاں اور ابا صاحب کو کباب پسند تھے، صفہ نے دونوں چیزیں تیار کیں، ساتھ پودینے کی چٹنی رکھی۔ چنیوٹی کام دار لکڑی کی ٹرے میں برتن سجا کر وہ موتیا کے پھولوں سے لدے باغیچے میں آئی جہاں اماں جان اور ابا صاحب بیٹھے تھے۔

''چھوٹی بی بی نے خود سب کچھ بنایا ہے۔'' شبانہ چہکی......

اماں جان خوش اور حیران تھیں صفہ تو باورچی خانے میں گھستی نہ تھی۔ گرمیوں میں گرمی، سردیوں میں سردی کا بہانہ، ملازمین کی عادی تھی۔ ابا صاحب نے ٹرے پر نظر ڈالی۔

''کل جا رہی ہو بیٹا......اس لیے آج ثواب کما رہی ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگی۔

''ابا صاحب، عالمہ کا کورس چھ سال کا ہوتا ہے۔''

''صفہ کے ابا......کیا ہم چھ سال تک بیٹی کی شادی نہیں کریں گے؟'' اماں جان نے شاکی نظروں سے میاں کو دیکھنے لگیں۔

''صفہ کی ماں، ہم نصیب لکھنے، روکنے والے نہیں، خوش نصیب ہوگا وہ جو اس پاکیزہ خیال بچی سے شادی کرے گا۔ کون لڑکی آج مدرسے کی تعلیم کا انتخاب کرتی ہے، یہ عام لڑکی نہیں ہے خوش بخت......''

صفہ کی جھکی پلکوں میں آنسو آئے جاتے تھے۔

''میں خود جاؤں گا...... ہاسٹل وغیرہ دیکھ کر آؤں گا......اللہ اس کے شوق کو قبول فرمائے......'' اماں جان چپ ہوگئیں۔

میرے ہم سفر

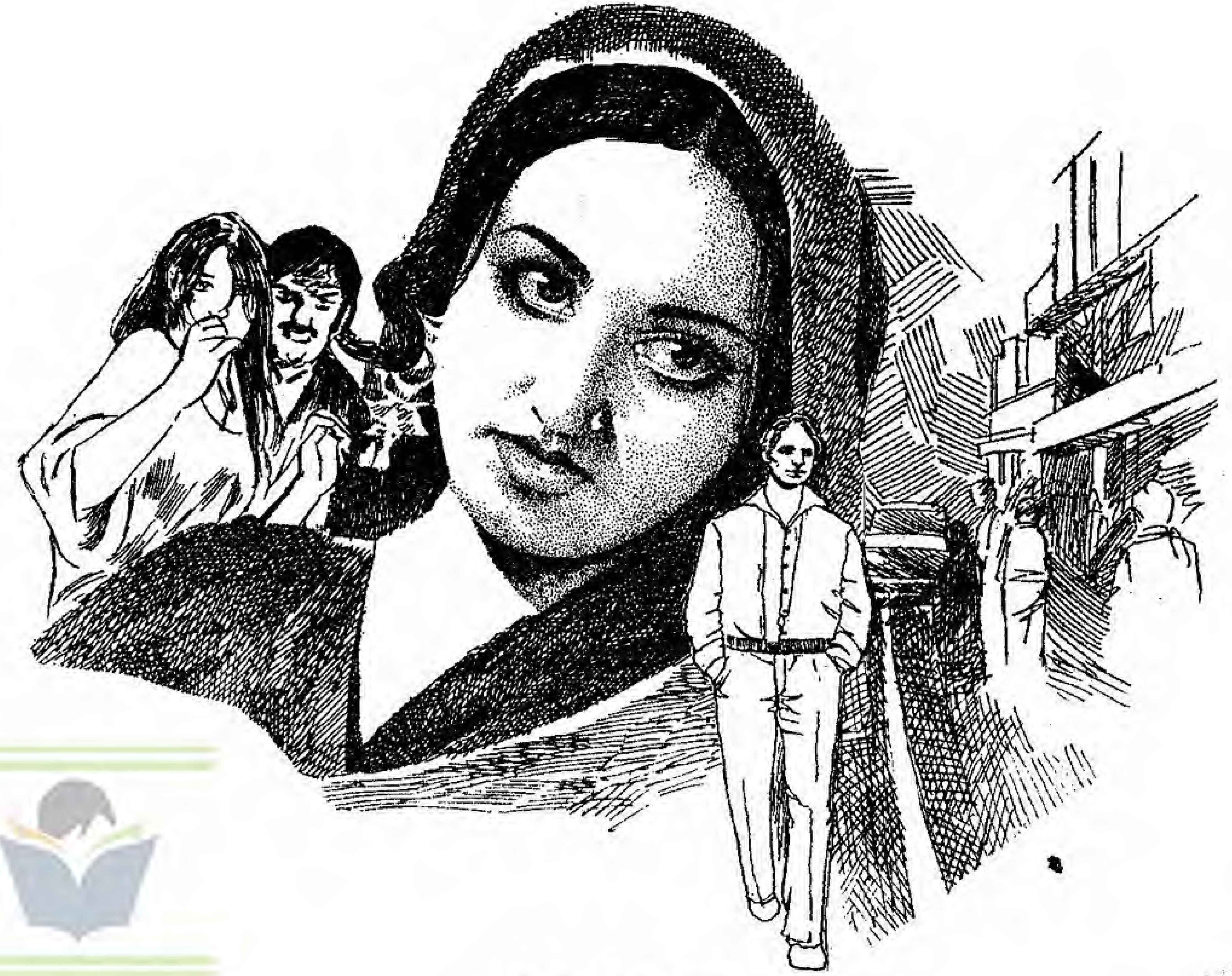
میرے ہم سفر تم جاتے، جاتے
کیا کچھ اپنے سنگ لے گئے
راتوں کی میری نیندیں
بہارِ زندگی کے سبھی رنگ لے گئے
ہو کر بھی میرے ساتھ، میرے ساتھ نہیں ہو
تصویر بن کے کمرے کی دیوار پر سجے ہو
ویران ہے یہ کمرا، ویران میری آنکھیں
کمرے میں کوئی آئے، دل چاہتا ہے وہ تم ہو
تم تھے تو تھی سہاگن اب بیوہ ہوں تمہاری
یہ تلخ سی حقیقت میرا دل نہ مانتا ہے
اک یاد بن گئے ہو، اک خواب بن گئے ہو
اب کب ملیں دوبارہ اللہ ہی جانتا ہے
اللہ سے التجا ہے ہر پل یہی دعا ہے
کریں آپ کی شفاعت پیارے نبی محمدؐ

کاوش: ہما علی، اسلام آباد

''اماں میری جانی اماں......آپ فکر نہ کریں...... میں روز ٹیلی فون کروں گی، روز کا احوال دوں گی...... آپ کے پاس میرو خالہ آ رہی ہیں آپ اداس نہ ہونا۔'' میرو خالہ صفہ کی بڑی خالہ تھیں...... بیوہ تھیں اور بیٹا اسکالر شپ پر لندن جا رہا تھا۔ بہو نے بھی اس کے ساتھ چلے جانا تھا۔ اماں جان نے مشورہ دیا تھا کہ جب تک ان کے کاغذات بنتے ہیں وہ تنہا رہنے کے بجائے ان کے ساتھ آ کر رہیں، میرا خالہ کے پاس بھی روپے پیسے کی کمی نہ تھی، پہلے سے طے کر لیا کہ اپنا خرچہ خود ادا کریں گی۔ ابا صاحب ناراض ہوئے مگر کسی کی انا کو ٹھیس نہ پہنچنے کے خیال سے چپ کر گئے، میرو خالہ کے ہمراہ ان کی قدیمی ملازمہ بھی تھی۔ یوں اماں جان کے اکلاپے کا بھی حل نکل آیا اور صفہ کو تسلی ہوگئی۔

امید کی ڈوری تھامے صفہ نے مستقبل کی طرف قدم بڑھا دیے۔

(باقی آئندہ)



خشکی کا مگرمچھ

شمیم فضل خالق

''کتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں آمنہ...... تمہیں سنائی نہیں دے رہا کیا......؟'' جواد قدرے تیز آواز میں بولا تو دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی آمنہ اندر آئی۔

''وہ...... میں برتن دھو رہی تھی...... اس لیے۔''

''خدارا آمنہ یہ جتا، جتا کر کام کرنا چھوڑ دو......'' جواد بیزاری سے کہنے لگا۔ ''اپنے گھر کا کام تم نہیں کروگی تو کون کرے گا...... میں سارا دن آفس میں سر کھپاتا ہوں۔ کبھی جتایا ہے میں نے......''

''میں جتا نہیں رہی تھی، بتا رہی تھی۔'' وہ معصومیت سے بولی تو جواد کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

''اچھا بیٹھو تم یہاں میرے پاس......'' اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے جواد نے اسے اپنے سے قریب کرلیا۔

''میں جب گھر آتا ہوں آمنہ دل چاہتا ہے کہ بس تمہیں دیکھتا رہوں...... تمہیں اس کا احساس ہونا چاہیے......'' وہ اس کے لمبے گھنے بالوں میں منہ چھپاتے ہوئے مخمور لہجے میں بولا۔ ''کام تو ہوتے رہتے ہیں۔''

''جی......'' وہ اس کے اس انداز پر شرم سے سرخ ہوئی جارہی تھی۔

''ہاں بھئی، ہماری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں یہی دن تو ہوتے ہیں انجوائے کے...... ورنہ بعد میں تو انسان غمِ دوراں کا ہو کر رہ جاتا ہے...... بس تم وعدہ کرو مجھ سے کہ آئندہ میرے گھر آنے سے قبل تم سارے کام بھی ختم کروگی اور صاف ستھری ہو کر میرا انتظار کروگی۔'' جواد نے اس کے کپڑوں سے اٹھتی لہسن، پیاز کی مہک کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا تو آمنہ نے اثبات میں سر ہلادیا۔

آمنہ گاؤں کے مخصوص...... ماحول کی پروردہ تھی...... جواد اس کا خالہ زاد ضرور تھا لیکن اس کی خالہ دوسرے گاؤں میں رہتی تھیں سو اس کی جواد سے ملاقات کچھ زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ شاید بچپن میں کبھی دیکھا ہو۔ جواد کراچی میں کسی کمپنی میں کام کررہا تھا۔ نوکری بڑی تگ و دو کے بعد ملی تھی۔ چھٹی کم ہی ملتی سو وہ گاؤں بہت کم آیا کرتا تھا لیکن جب خالہ نے آمنہ کو جواد کے لیے پسند کیا تو رشتہ مانگنے سے قبل انہوں نے جواد کو کہہ دیا کہ وہ آکر آمنہ کو ایک نظر دیکھ لے اگر وہ آمنہ کو پسند کرے گا تو ہی وہ اس کا رشتہ مانگنے جائیں گی...... جواد ایمرجنسی میں ایک دن کے لیے گاؤں آیا تھا اور جب اس نے آمنہ کو دیکھا تو حیران رہ گیا...... آمنہ جیسی حسین لڑکی تو اسے جیسے شہر میں کہیں نظر ہی نہیں آئی تھی، لانبا قد، گلابی رنگت، بڑی، بڑی آنکھیں اور لانبے گھنے بال...... اس نے فوراً سے پیشتر ماں کو اپنی رضامندی دے دی۔

جواد کا رشتہ آنا آمنہ کے گھر والوں کے لیے ایک اعزاز تھا۔ خاندان میں بہت سے گھرانے جواد کو داماد بنانے کے خواہش مند تھے۔ جواد ایک بڑے شہر میں ملازمت کرتا تھا، پڑھا لکھا تھا خوبرو تھا، اس لیے ہر کوئی اس کوشش میں تھا کہ اسی کے گھر جواد کا پیام آئے لیکن قرعۂ فال آمنہ کے نکل آیا۔ آمنہ کے گھر والے تو خوشی سے پھولے نہ سمائے اور جھٹ پٹ ہاں کردی...... جواد کی شادی کی تاریخ دو ماہ بعد کی ٹھہری...... اتنی جلدی شادی بھی کسی لڑکی کی نہیں ہوئی تھی گاؤں میں...... سالوں گزر جاتے منگنی کو لیکن شادی کے لیے رقم ہی جمع نہ ہو پاتی...... آمنہ کی یہ بھی خوش قسمتی ٹھہری، دوسرے وہ بیاہ کر خالہ کے گھر آئی تو جواد نے مژدہ سنایا کہ اسے صرف ایک ہفتے کی چھٹی ملی ہے اور جب وہ واپس کراچی جائے گا تو وہ بھی اس کے ساتھ ہی جائے گی۔ آمنہ کبھی بھولے سے بھی کسی شہر نہیں گئی تھی۔ ایک طرف جہاں اس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے وہاں شہر میں رہنے کے خیال سے ڈر بھی رہی تھی۔ لیکن یہ سوچ کر کہ وہ شہر میں جواد کے ساتھ اکیلی رہے گی اور...... جانے کیا، کیا اسے یاد آجاتا کہ وہ سرخ پڑجاتی...... لیکن ایک تکلیف دہ سفر کے بعد وہ اس ڈربے نما گھر میں گھسی تو اس کا سارا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اسے بری طرح رونا آگیا۔

کہاں وہ گاؤں کے بڑے، بڑے مکانات، بھلے سے وہ کچے مکانات تھے لیکن تھے تو وہ کھلے وسیع و عریض...... اور کہاں یہ مرغیوں کا ڈربا نما فلیٹ اسے اپنے گاؤں والے گھر میں اپنا مرغی کا ڈربا یاد آگیا...... کتنی مماثلت تھی اس گھر میں اور مرغیوں کے ڈربے میں...... ایک کمرے کا چھوٹا سا مکان جس میں ایک واش روم اور ایک چھوٹا سا کچن تھا...... جواد سامان کمرے میں رکھ کر آیا تو وہ اسی پوزیشن میں کھڑی سوچوں میں گم تھی۔

''اپنا گھر پسند نہیں آیا کیا......؟'' جواد نے محبت سے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ...... بہت چھوٹا نہیں ہے؟'' وہ قدرے محتاط لہجے میں بولی تو جواد بے اختیار ہنس پڑا۔

''کراچی میں اتنا سا مکان ملنا بھی بہت مشکل بات ہے، میری جان یہ تو تم خوش نصیب ہو جو ہمیں یہ مکان مل گیا...... ورنہ میں ابھی تک تین بندوں کے ساتھ ایک کمرے میں ہی رہ رہا تھا...... اب یہ پورا گھر

ہمارا ہے نہ کسی کی شراکت۔نہ کسی کی دھونس...... چلو......اب مل کر اپنا گھر سیٹ کرتے ہیں۔'' جواد نے بہلا پھسلا کر اسے اپنے ساتھ کام میں مصروف کر لیا......گھر بھی چھوٹا تھا، وہ گھر میں اکیلی بھی تھی سو روز بروز زیادہ سے زیادہ خاموش رہنے لگی تھی، ایک دن جواد کو احساس ہوا تو کہنے لگا۔

''آمنہ یہ جو پڑوس میں خاتون رہتی ہیں وہ تم سے عمر میں تھوڑی ہی بڑی ہوں گی۔مگر تم ان کے ساتھ دوستی کر سکتی ہو، اس طرح تمہارا اکیلا پن دور ہو جائے گا...... میں انہیں اکثر گھر کے باہر آتا جاتا دیکھتا ہوں......'' آمنہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''بلکہ ایسا کرو کسی دن کچھ اچھا پکا کر ان کے گھر لے جانا......اس طرح تم دونوں کی بات چیت ہو جایا کرے گی، ان کا ایک چھوٹا بچہ بھی ہے۔''

''جی......اچھا......'' اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ اگلے دن اس نے مٹر پلاؤ بنایا...... پلیٹ میں ڈال کر اوپر دوسری پلیٹ رکھ دی اور کچھ گھبرائی سی اپنے ساتھ والے گھر کے دروازے پر کھڑی ہو گئی دروازہ کئی بار کھٹکھٹانا چاہا لیکن ایک عجیب سی جھجک آڑے آ گئی......کراچی کے ماڈرن لوگ ہیں، جانے کسی کا اس طرح منہ اٹھا کر آنا پسند بھی کرتے ہیں کہ نہیں اور اسی...سوچ کے زیر اثر وہ گیٹ سے ہی واپس گھر جانا چاہتی تھی کہ اچانک دروازہ زور سے کھلا اور اندر سے ایک مرد برآمد ہوا کچھ دیر تو وہ حیرت سے اسے دیکھتا رہا اس کا تو مارے ڈر کے رنگ فق ہو گیا...... پاؤں لرزنے لگے......اگلے ہی پل وہ آدمی جلدی سے بولا۔

''آیئے، آیئے، اندر تشریف لایئے۔'' پھر اس نے وہیں سے آواز دے کر اپنی بیوی کو پکارا۔

''نسرین......تمہاری مہمان آئی ہیں۔'' اب تو اندر جانے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا...... وہ سہمی سی گھبرائی، گھبرائی اندر گھس گئی...... کمرے سے ایک سانولی سی بوٹے قد کی ہنس مکھ سی لڑکی باہر آئی اور تپاک سے اس سے ملتے ہوئے بولی۔

''تم اس ساتھ والے گھر سے آئی ہوناں......''

''ہاں......'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پلیٹ اس کی طرف بڑھا دی۔

''ارے ......اس تکلف کی کیا ضرورت تھی......'' نسرین جلدی سے بولی۔''ویسے اصولاً تو مجھے تمہاری طرف پہلے آنا چاہیے تھا لیکن کیا کروں...... ذرا جو فرصت ملتی ہو...... بچے نے الگ پاگل کر کے رکھ دیا ہے...... بڑی مشکل سے سلایا ہے ابھی اسے۔''

''ارے مہمان کو بٹھاؤ، خاطر تواضع کرو ......یہ کیا اپنی کتھا سنانی شروع کر دی۔'' اس کا میاں ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔خوش مزاجی سے بولا۔اونچے لمبے قد کا سانولا سا مرد نسرین سے میچ نہیں کر رہا تھا......آمنہ کہاں غیر مردوں سے بات چیت کی عادی تھی...... مارے خوف کے وہ ساری کی ساری پسینے میں نہا گئی اس کا دل چاہا کہ ابھی کے ابھی یہاں سے بھاگ جائے......لیکن نسرین نے بڑی محبت سے اسے اپنے پاس بٹھایا اور اس سے باتیں شروع کر دیں لیکن آمنہ کا سارا دھیان اس کے میاں کی طرف تھا جو پاس کھڑا اسے گھور رہا تھا......خدایا...... یہ اندر کیوں نہیں چلا جاتا......یا گھر سے باہر کیوں نہیں چلا جاتا......جب اس نے محسوس کیا کہ وہ ٹلنے والا نہیں تو وہ معذرت کے انداز میں بولی۔

''میں گھر میں بہت کام چھوڑ کے آئی ہوں...... میں پھر کبھی آؤں گی......اور آپ بھی ضرور آئیں......''

نسرین نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ تیر کی طرح ان کے گھر سے نکلی اور گھر آ کر بھی کتنی دیر خوف سے کانپتی رہی......رات کو جواد کو ساری بات بتا کر وہ شکوے کے سے انداز میں بولی۔''آپ نے ہی مجھے یہ مشورہ دیا تھا......ورنہ میں تو کبھی نہ جاتی۔''

''ارے......'' وہ ہنس کر بولا۔''تو کیا ہوا......اگر تم چلی گئیں تو......''

''وہ بدتمیز مرد......ذرا جو اسے احساس ہو کہ کوئی عورت اس سے پردہ بھی کر سکتی ہے......توبہ، توبہ۔''

اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے تو جواد قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''ارے پگلی...... یہاں گاؤں جیسے دستور نہیں چلتے......'' وہ اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر تھپتھپاتے ہوئے بولا۔''اب دیکھو......نسرین یہاں آئے گی ناں تو مجھ سے بھی کوئی پردہ وردہ نہیں کرے گی......تم یہ سب مائنڈ مت کرو......اور جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق خود کو ان باتوں کا عادی بناؤ......''

''میں عادی نہیں ہو سکوں گی جواد......'' وہ بےبسی ....سے بولی۔

''مجھے غیر مردوں سے خوف آتا ہے۔''

''ٹھیک ہو جاؤ گی وقت کے ساتھ، ساتھ۔'' جواد اسے اپنے ساتھ لگا کر محبت سے بولا۔

جیسے، جیسے وقت گزرتا گیا آمنہ اور نسرین کی دوستی مضبوط تر ہوتی گئی۔آمنہ اس کے گھر جانے میں احتیاط کرتی لیکن نسرین تو وقت بے وقت آ جاتی...... جواد گھر پر ہوتا تو بھی وہ بڑی بے تکلفی سے اس سے بات چیت کرتی...... ہر بات میں اسے بھائی جان کہہ کر اسے اپنی گفتگو میں شریک کر لیتی اور اس کے جانے کے بعد جواد آمنہ کو سمجھاتے ہوئے کہتا۔

''دیکھا تم نے...... یہاں سب لوگ اسی بے تکلفی سے ملتے ہیں......مرد، عورت کی یہاں کوئی تفریق نہیں ہوتی......وہ مجھے بھائی سمجھتی ہے اور میں اسے بھابی، بس تم بھی اسی طرح رویّہ رکھو اس کے شوہر کے ساتھ۔''

لیکن آمنہ اسے یہ نہ بتا سکی کہ نسرین کے میاں کی نظروں میں اس کے لیے بھابی والا تقدس ہرگز نہیں ہوتا......اس کی بےباک نظریں اس کے جسم کا ایکسرے کر رہی ہوتی ہیں......لیکن بہر حال جہاں اس نے نسرین کے گھر آنا جانا کم کر دیا وہاں وہ اس وقت نسرین کے گھر جاتی جب اس کا میاں مراد گھر پر نہ ہوتا۔

اس دن آمنہ اور جواد ناشتا کرنے بیٹھے تو نسرین حلوا اور پوریاں لے کر آ گئی...... اور کرسی کھینچ کر ان کے پاس ہی بیٹھتے ہوئے بولی۔

''شکر ہے تم لوگوں نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا تھا......آج میں نے پوریاں بنانے کا تجربہ کیا ہے...... میں اپنا بھی حصہ لائی ہوں مراد کو آفس جلدی جانا تھا...... میں نے سوچا تم لوگوں کے ساتھ ہی مل کر ناشتا کر لوں گی۔''

''جی بھابی......نیکی اور پوچھ، پوچھ......'' جواد خوش دلی سے بولا۔آمنہ دوڑ کر اندر سے کپ اٹھا لائی...... ناشتے کے دوران تینوں ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہے...... پھر جواد آفس چلا گیا......اتنے میں سبزی والا آوازیں دینے لگا تو نسرین اٹھتے ہوئے بولی۔

''چلتی ہوں آمنہ...... منو بھی اپنی نیند پوری کر چکا ہوگا اور سبزی بھی لینی ہے۔'' پھر وہ جاتے، جاتے رک کر بولی۔

''تم سبزی نہیں لو گی......؟''

''نہیں، وہ جواد لے آتے ہیں۔'' آمنہ نے جواب دیا۔

''لو اور سنو......'' نسرین جلدی سے بولی۔''تم نے تو آمنہ...... ساری ذمّے داریاں اپنے میاں پر ڈال رکھی ہیں......خدارا......گاؤں کے اس ماحول سے اب باہر نکل آؤ...... مجھے دیکھو میں گھر کے سارے کام خود نپٹاتی ہوں......مراد کو صرف اپنے آفس کا کام کرنا ہوتا ہے۔''

''لیکن میں نے کبھی سبزی نہیں خریدی...... مجھے کوئی تجربہ ہی نہیں ہے۔'' آمنہ معصومیت سے بولی۔

''بھئی...... ہر کام کرنے سے آتا ہے...... چلو میرے ساتھ...... میں تمہیں سبزی خرید کر دیتی ہوں...... چلو، جلدی کرو......'' نسرین نے آمنہ کو زبردستی ساتھ لیا...... سبزی والا ان کے گھر کے سامنے ریڑھی لگائے کھڑا تھا۔

''تم کیا خریدو گی؟'' اپنی سبزی خرید کر نسرین نے آمنہ سے پوچھا۔

''بھنڈی...... بھنڈی لے لوں گی۔''

''آدھا کلو بھنڈی تول دو......ساتھ آدھا، آدھا کلو پیاز، ٹماٹر دے دینا...... سبز مرچ اوپر ڈال دینا۔''

وہ سبزی لے کر گھر آئی تو بڑی خوش تھی......اس نے

جلدی سے جواد کو فون ملایا۔

''جواد...... میں نے سبزی خود خریدی ہے...... ریڑھے والے سے۔''

''ارے کیا سچ......!'' جواد بھی خوش ہو گیا۔ ''یہ تو تم نے بہت اچھا کیا...... جانتی ہو، میں آفس سے نکل کر پہلے سبزی لینے جاتا...... پھر گھر آتا...... چلو اب میرے وقت کی خاصی بچت ہو گئی ہے، میں سیدھا گھر آؤں گا...... اور سبزی لینا تمہاری روز کی ڈیوٹی ہو گئی ہے۔'' وہ بشاشت سے بولا تو اس نے مسکرا کر فون بند کر دیا...... وہ بڑی خوش تھی اور نسرین کی ممنون بھی...... اب وہ خود سے سبزی لینے لگی تھی۔ سبزی لیتے ہوئے اسے عجیب سا مالکانہ احساس ہوتا...... سبزی کے ساتھ وہ کبھی کھیرا، سبز دھنیا اور پودینہ خرید لیتی اور جب اس کی سلاد چٹنی بنا کر جواد کے آگے روٹی کے ساتھ رکھتی تو جواد کھل اٹھتا۔

''ارے آمنہ، تم تو بڑی سگھڑ ہو گئی ہو، اب تم ہی بتاؤ، مردوں کا ان چیزوں کی طرف دھیان کہاں جاتا ہے، یہ تو بس تم عورتوں کا ہی شعبہ ہے۔'' جواد کی تعریف پر اس کی باچھیں کھل جاتیں وہ بات بے بات ہنستی رہتی اور دل ہی دل میں سوچتی کہ جواد سچ کہتا ہے شہر اور گاؤں کی زندگی میں بڑا فرق ہے۔ اور شہر بھی کراچی جیسا...... جو پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔

اس دن نسرین قیمے آلو کا سالن بنا کر لے آئی اور اس نے توری کی سبزی بنائی تھی...... بڑے پیار سے اس نے نسرین سے پوچھا۔

''تیرے برتن میں توری کی بھجیا ڈال دیتی ہوں...... بڑی لذیذ بنی ہیں۔''

''نہیں......'' نسرین نے منہ بنایا...... ''تیرے بھائی کوئی سبزی خالی خولی نہیں کھاتے جب تک سبزی میں گوشت یا قیمہ نہ ہو۔''

''اچھا......'' آمنہ نے بے دلی سے برتن خالی کر کے اسے لوٹا دیا۔

''آمنہ......'' جبھی نسرین نے اس سے کچھ کہنا چاہا۔ ''چل تو ہماری طرح روز، روز سبزی میں گوشت قیمہ نہ ڈالا کر، پر کبھی کبھار تو گوشت کا بھی استعمال کیا کرو...... صحت کے لیے اچھا رہتا ہے۔''

''وہ...... ہمیں زیادہ اچھا نہیں لگتا ناں اس لیے......'' وہ جھجک کر بولی۔

''چل چھوڑ...... کیوں اچھا نہیں لگتا...... میں تو جو بھی گوشت، قیمے والا سالن لاتی ہوں تم دونوں بہت شوق سے کھاتے ہو جواد بھائی کی زبان تو تعریف کرتے نہیں تھکتی...... یہ کہو کہ جواد بھائی کنجوس مکھی چوس ہیں...... پیسے خرچ نہیں کرتے اس لیے تو نہ گھر میں پھل، فروٹ لاتے ہیں، نہ گوشت، قیمہ...... ایک تمہارے مراد بھائی ہیں، ایسے لدے پھندے گھر آتے ہیں کہ میرے لیے تو ان چیزوں کی جگہ نکالنی مشکل پڑ جاتی ہے...... اچھا...... میں چلتی ہوں...... منو کو اکیلا چھوڑا ہے گھر میں...... قیمے، آلو کا سالن کھا کے بتا کیسا بنا ہے۔'' وہ خالی برتن لے کر چلی گئی لیکن آمنہ پیڑھی پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی...... یہ سچ تھا کہ وہ کراچی آ کر ہر اچھی چیز کے لیے ترس گئی تھی چاہے وہ پہننے اوڑھنے کی چیز ہو یا کھانے پینے کی...... جواد نے پہلے دن ہی جتا دیا تھا کہ اس کی تنخواہ کم ہے اوپر سے شادی کے بعد خرچے بھی بڑھ گئے ہیں۔ گھر کا کرایہ دینا پڑتا ہے اور اوپر سے بجلی، گیس اور پانی کا بل دینا پڑتا ہے بس وہ اپنے خرچے کم کریں گے تو ہی گزارہ چلے گا......

وہ بڑی قناعت پسند لڑکی تھی اور پھر اس کی تربیت ہی ایسی ہوئی تھی کہ خاوند کی کہی ہر بات پتھر پر لکیر کے مانند ہوتی تھی...... سو کبھی نہ کھانے کی فرمائش کی نہ کپڑے لتے کی...... حالانکہ دل تو اس کا بھی چاہتا تھا کہ اچھا کھائے پیے گھومے پھرے...... اچھا پہنے اوڑھے...... بلکہ نسرین کے ساتھ جب سے دوستی ہوئی تھی اس کی یہ خواہشات بڑھ گئی تھیں...... کیونکہ نسرین کھلا خرچ کرتی...... نہ کھانے پینے میں ڈنڈی مارتی نہ نہ ہی سستا کپڑا پہنتی اور اسے بھی ترغیب دیتی کہ وہ اچھا کھائے پیے اور پہنے اوڑھے...... ایسی باتیں تو وہ دبے

لفظوں میں ہر وقت کرتی تھی لیکن آج تو کھلم کھلا جواد کو کنجوس کا خطاب دے دیا تھا۔

''کیا بات ہے آج بھوک نہیں ہے کیا؟'' جب وہ نوالوں سے کھیل رہی تھی تو جواد نے حیرت سے اس سے پوچھا۔

''ہاں...... بس...... چائے پی لی تھی...... اس لیے بھوک نہیں ہے۔'' وہ بے دلی سے بولتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی...... لیکن وقت کے ساتھ، ساتھ اسے احساس ہوتا گیا جیسے وہ بڑی محروم زندگی گزار رہی ہے جبکہ نسرین بڑے ٹھسے سے رہتی ہے بالکل بیگمات جیسی زندگی ہے نسرین کی...... حالانکہ اس کا خاوند اور جواد دونوں ایک جیسے ہی ادنیٰ درجے کے ملازم تھے...... جواد سے کچھ کہنے کی ہمت نہ تھی۔ گاؤں میں اسے یہی سکھایا گیا تھا کہ خاوند مجازی خدا ہوتا ہے اس کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے...... لیکن ان منفی سوچوں نے اسے مرجھا کر رکھ دیا تھا وہ سارا دن اپنا اور نسرین کا موازنہ کرتی رہتی اور کڑھتی رہتی...... جواد اس بات پر خوش تھا کہ نسرین کی صورت میں اسے کسی کا ساتھ ملا ہے اس کا اکیلا پن دور ہو گیا ہے۔ ویسے بھی وہ تو نسرین کے گھر کم ہی جایا کرتی لیکن نسرین ہر وقت اس کے گھر پائی جاتی...... نسرین اس سے گلے شکوے کرتی کہ وہ اس کے گھر نہیں آتی لیکن وہ ہر وقت کام کاج کا بہانہ بنا لیتی حالانکہ اصل بات یہ تھی کہ اسے مراد کی ٹٹولتی ہوئی گندی نظروں سے خوف آتا تھا...... یہ ایسی بات تھی جسے نہ وہ جواد سے شیئر کر سکتی تھی نہ ہی نسرین سے کچھ کہہ سکتی تھی۔

اس دن اس نے پہلی بار تو نہیں لیکن کافی دنوں بعد چکن کا سالن بنایا تھا جواد اس کی فرمائش پر چکن لایا تھا...... اس نے بڑے شوق اور محبت سے چکن کڑھائی بنائی...... جواد آفس گیا ہوا تھا...... وہ وقت ایسا تھا کہ سارے مرد ہی کام پر گئے ہوئے تھے عورتیں گھروں میں کام کاج نپٹا رہی تھیں...... ہانڈی تیار ہو گئی تو اس نے سوچا پہلے جا کر نسرین کو دے آئے...... منو کی بھی کل طبیعت بہتر نہیں تھی...... اس کی طبیعت بھی پوچھ لوں گی...... ویسے بھی جب سے نسرین نے اسے خالی سبزیاں پکانے کا طعنہ دیا تھا اسے بہت برا لگا تھا اور آج چکن کی ہانڈی بنانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ چکن کا سالن نسرین کے گھر جا کر دے آئے اور اسے حیرت زدہ کر دے...... اس نے ڈونگے میں اچھی، اچھی بوٹیاں ڈالیں اور اس پر ڈھکن رکھ کر اس کے گھر چل دی...... چھوٹی سی بات تھی لیکن وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی...... دروازے پر دستک دے کر اس نے اپنے دائیں طرف نظر دوڑائی تو اسے یہاں سے وہاں تک کوئی بندہ بشر نظر نہیں آیا...... کتنی ویرانی ہے یہاں...... اچھا ہے کہ وہ اپنے گھر کا دروازہ بند رکھتی ہے اسے گاؤں کے راستوں کی چہل پہل یاد آ گئی...... اس نے ایک بار پھر دروازہ بجایا تو کسی نے پٹ سے دروازہ کھول دیا...... وہ نسرین نہیں تھی...... اس کا شوہر مراد تھا...... مراد کو دیکھ کر اس کی روح فنا ہو گئی...... اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ مراد اس وقت گھر پر ہو گا...... قدرے ہچکچا کر اس نے ڈونگا آگے کرتے ہوئے کہا۔

''میں...... یہ سالن دینے آئی تھی۔'' مراد نے ڈونگا نہیں لیا...... بلکہ اسے راستہ دیتے ہوئے بولا۔

''آؤ بھابی...... اندر آ جاؤ...... نسرین اندر ہے...... دراصل وہ منو بہت بیمار ہے اس لیے میں بھی آفس نہیں گیا۔''

''منو بیمار ہے......؟'' وہ منو کی بیماری کا سن کر پریشان ہو گئی۔ منو اسے بہت عزیز تھا وہ اکثر اسے اپنے گھر لے جاتی اور اس سے کھیلتی رہتی...... منو کی بیماری کی خبر نے اسے سوچنے نہیں دیا اور وہ بے اختیار اندر گھس گئی۔ مراد داخلی دروازے کی کنڈی چڑھا کر اس کے پیچھے، پیچھے آ گیا...... گھر کے اندر سناٹا اور خاموشی تھی، وہ نسرین کو پکارتی ہوئی کمرے میں گھس گئی۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا...... وہ حیرانی سی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی سالن کا ڈونگا اس نے میز پر رکھ دیا تھا کہ

اچانک کھٹکے کی آواز پر اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ مراد تھا جس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا وہ عجیب سی خباثت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”یہ، یہ آپ نے دروازہ کیوں بند کرلیا......اور نسرین کہاں ہے؟“ وہ وحشت بھری آواز سے چلا کر بولی۔

”نسرین منو کو ڈاکٹر کے پاس لے گئی ہے...... اور میں اسی موقع کی تلاش میں تھا۔“ وہ مکروہ سی ہنسی ہنس کر بولا۔

”جب سے تمہیں دیکھا ہے دل قابو میں ہی نہیں...... دن رات تمہیں حاصل کرنے کی ترکیبیں سوچتا ہوں...... دیکھو ناں ایک تمہارا وہ خاوند ہے...... کسی کام کا نہیں ہے اور خدا نے اسے تمہاری جیسی بیوی دی ہے...... سراپا بہار...... اور ایک میں ہوں...... جواد سے لاکھ درجہ بہتر ہوں لیکن کیا بیوی ملی ہے...... کالی کلوٹی...... جیسے بھتنی ہو...... آخر میرا دل بھی ہے...... میں بھی جذبات رکھتا ہوں۔“ وہ شیطانی انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

”آج تمہیں میرے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا سکتا...... جب سے تمہیں دیکھا ہے انگاروں پر لوٹتا ہوں...... حسرت سے تمہارے گھر کی دیوار کو دیکھتا ہوں...... اور آج تو تم اتنی آسانی سے میرے دام میں آگئی ہو۔“

”خدا..خدا کے لیے......“ وہ اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر کپکپاتے لہجے میں پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ”مجھ پر رحم کرو، مم...... میں نے تمہارا...... وہ آپ کا کیا بگاڑا ہے......“ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی آواز نہیں نکل پا رہی تھی کاش، کاش وہ ابھی کے ابھی مر جائے...... وہ پیچھے ہٹتے، ہٹتے دیوار سے جا لگی...... اور وہ شیطان آگے بڑھ رہا تھا۔ اس دوران زبردست قسم کی گڑ گڑاہٹ ہوئی...... ہر چیز زور، زور سے ہلنے لگی، وہ ٹھٹک کر رک گیا...... ہراساں سا باہر دیکھا...... جلدی سے کمرے کا دروازہ کھولا اور پھر داخلی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا...... اس کی طرف سے اس کا دھیان ہٹ گیا تھا اور اسی کا فائدہ اٹھا کر آمنہ نے جلدی سے اپنا دوپٹا اٹھایا اور تیر کے مانند پہلے کمرے سے اور پھر نسرین کے گھر سے باہر نکلی اور اپنے گھر کے گیٹ میں گھستی چلی گئی...... در و دیوار ابھی تک ہل رہے تھے، لوگ کلمے کا ورد کرتے گھروں سے باہر آرہے تھے زبردست قسم کا زلزلہ تھا...... آمنہ کا جسم پسینے میں شرابور تھا...... اس کی کپکپاہٹ ابھی تک جاری تھی...... وہ اپنے گھر کو کسی جھولے کی طرح ہلتا ہوا دیکھ رہی تھی...... باہر سے آنے والی چیخ و پکار سن رہی تھی لیکن اسے ذرا بھی ڈر نہیں لگ رہا تھا کہ اسی زلزلے نے تو اسے ایک شیطان سے بچایا تھا۔

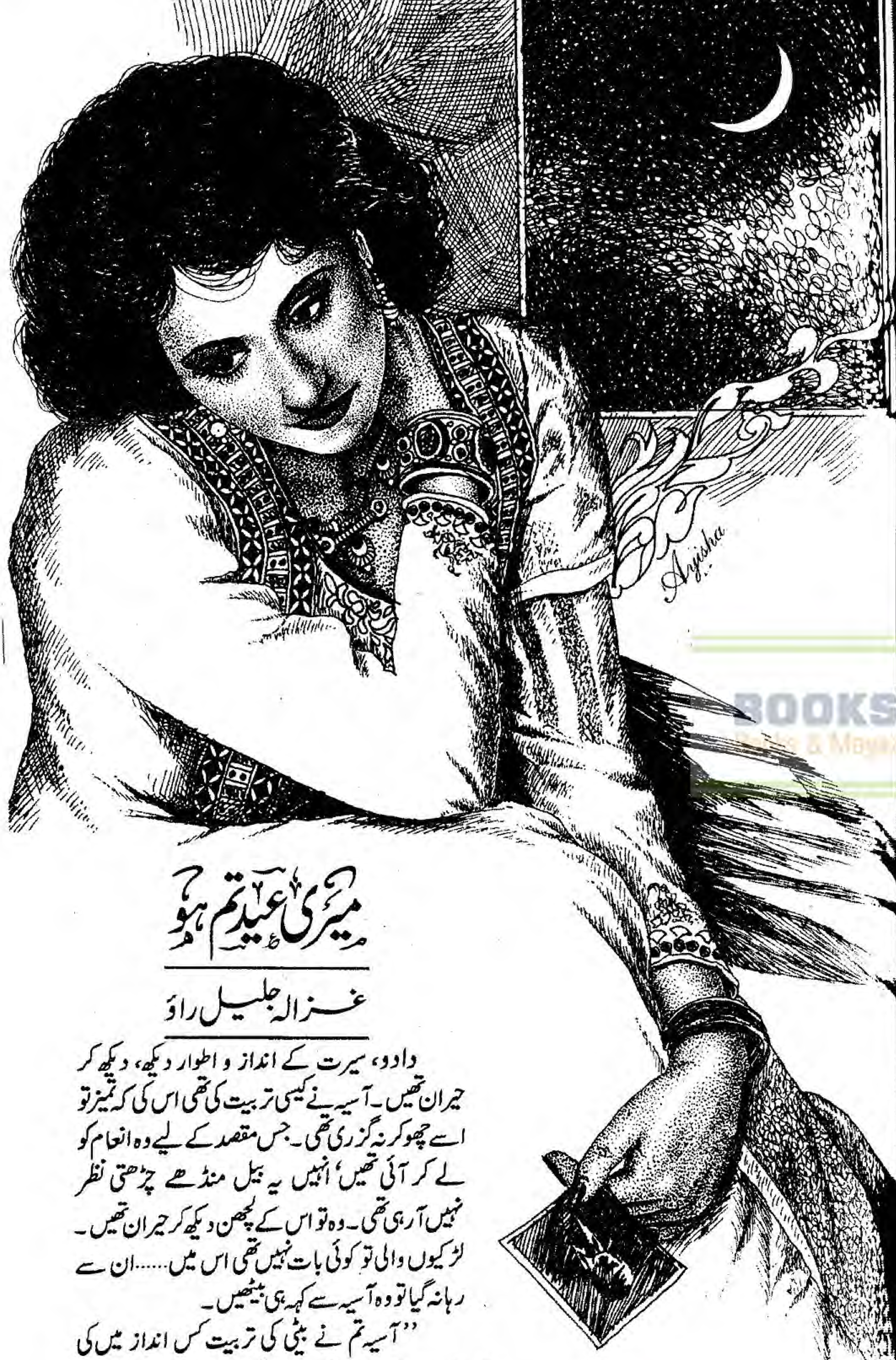
”اے میرے رب...... تو کتنا مہربان ہے تو نے مجھ پر کتنا بڑا کرم کیا ہے......“ وہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی...... اتنے میں موبائل کی گھنٹی زور سے بج اٹھی...... کال کرنے والا جواد تھا...... جوں ہی اس نے کال ریسیو کی...... جواد بے قراری سے بولا۔

”آمنہ، کیسی ہو تم...... تم ٹھیک تو ہو ناں...... زبردست قسم کا زلزلہ تھا...... میں تمہارے لیے فکر مند تھا......“

”مجھے میرے خدا نے بچالیا جواد......“ وہ سکون اور بڑے اطمینان سے بولی۔

”بہت تباہی ہوئی ہے آمنہ...... شکر ہے میں بھی ٹھیک ہوں...... بس میں تھوڑی دیر میں آرہا ہوں...... تم ایسا کرو نسرین بھابی کے گھر چلی جاؤ...... اکیلی گھر میں گھبرا رہی ہوگی۔“

”نہیں، میں اپنے گھر میں ٹھیک ہوں جواد......“ اس نے اسی اطمینان سے جواب دیا...... مسجد سے اعلانات ہو رہے تھے...... لوگوں کے گھر مسمار ہوگئے تھے گلی میں چیخ و پکار ہو رہی تھی...... شور و غوغا تھا...... اور تب اس نے سنا مسجد سے اعلان ہو رہا تھا کہ ”مراد صاحب کے گھر کی دیوار گر پڑی ہے اور وہ اس میں دب گئے ہیں۔ مہربانی کر کے محلے والے ان کو ملبے سے نکالنے میں مدد کریں......“ وہ خالی، خالی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔



میری عید تم ہو

غزالہ جلیل راؤ

دادو، سیرت کے انداز و اطوار دیکھ، دیکھ کر حیران تھیں۔ آسیہ نے کیسی تربیت کی تھی اس کی کہ تمیز تو اسے چھو کر نہ گزری تھی۔ جس مقصد کے لیے وہ انعام کو لے کر آئی تھیں، انہیں یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ تو اس کے لچھن دیکھ کر حیران تھیں۔ لڑکیوں والی تو کوئی بات نہیں تھی اس میں...... ان سے رہا نہ گیا تو وہ آسیہ سے کہہ ہی بیٹھیں۔

”آسیہ تم نے بیٹی کی تربیت کس انداز میں کی

ہے...... ہمارے خاندان کا یہ ماحول نہیں...... مانا کہ اللہ نے بہت خوب صورت بنایا ہے اسے لیکن صورت کے ساتھ لوگ سیرت بھی دیکھتے ہیں۔ ذرا کوئی بات کرو تو فوراً جواب منہ پر دے مارتی ہے۔ اتنی منہ پھٹ لحاظ تو چھو کر نہیں گزرا...... بیٹیاں تو ویسے بھی پرایا دھن ہوتی ہیں، ماں، باپ والے چاؤ چونچلے کوئی نہیں اٹھاتا۔ اس طرح تو تمہاری تربیت پر حرف ہی آئے گا۔'' دادو نے ان سے شکایت کرتے ہوئے کہا تو وہ شرمندہ سی چند لمحوں کے لیے تو کچھ بول بھی نہ سکیں۔

''کیا کروں اماں بی...... میں نے تو سیرت کی تربیت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی مگر مجال ہے جو اس نے اثر لیا ہو......'' آسیہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

''نہیں، تم غلط کہہ رہی ہو، اگر تم نے بچپن سے ہی اس پر روک ٹوک کی ہوتی، اچھا برا سمجھایا ہوتا تو آج اس کے یہ رنگ نہ ہوتے، تم نے بہت آسانی سے اپنا سارا قصور اس بچی کے سر پر رکھ دیا...... بیٹیاں تو ماں کا پرتو ہوتی ہیں۔'' انہوں نے جو کہنا تھا ڈھکے چھپے لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ آسیہ ایک طویل گہری سانس کھینچ کر رہ گئیں۔

''مجھے آئے ہفتہ ہوگیا...... میں نے سیرت کو ایک روزہ رکھتے دیکھا نہ ہی کوئی عبادت کرتے۔ بلکہ بودے سے جواب آتے ہیں کہ...... وہ کمزور ہے، روزہ نہیں رکھ سکتی، اس سے بھوک برداشت نہیں ہوتی، اس کے امتحان ہونے والے ہیں، وہ دن رات پڑھنے میں لگی رہتی ہے۔ روزہ رکھ کر وہ پڑھائی نہیں کرسکتی اور تو اور کچن کے کاموں سے بھی بالکل ہی ناواقف۔'' انہوں نے بہت دھیمے لہجے میں بہو کو احساس دلایا...... آسیہ کے چہرے پر تاسف اتر آیا۔

''بہت افسوس کی بات ہے آسیہ...... ہم الحمدللہ مسلمان ہیں لیکن اپنے بچوں کی تربیت ہم مغرب کے اصولوں پر کررہے ہیں، دنیاوی فائدے کی تمہیں فکر ہے لیکن آخرت کا کوئی احساس نہیں۔ یہ ایک مہینہ پورے سال کا دل ہوتا ہے اور لوگ اس مہینے میں سب کام چھوڑ کر اپنے خدا کی عبادت میں مشغول ہوجاتے ہیں۔''

''میں کہتی تو ہوں اماں بی لیکن اس سے رکھا ہی نہیں جاتا......'' آسیہ کے لہجے میں بیچارگی تھی۔

''اور نماز کے لیے اس کی مصروفیات میں ...... وقت نہیں ہے اس کے پاس...... ہے ناں...... دس منٹ لگتے ہیں نماز کی ادائیگی میں...... سہیلیوں سے فون پر گپیں لگانے، ٹی وی ڈرامے دیکھنے کے لیے گھنٹوں کا وقت ہوتا ہے۔ مگر نماز اور قرآن پاک کے لیے نہیں......'' دادو بھی لگتا تھا آج اگلے پچھلے سارے حساب کھول کر بیٹھ گئی تھیں۔

آسیہ کو فرار کی کوئی راہ نظر نہیں آرہی تھی۔

''کامران کو دیکھ لو، وہ روزے بھی رکھتا ہے اور عبات بھی کرتا ہے اور بڑے چھوٹے سے بات کرنے کا سلیقہ بھی ہے۔'' انہوں نے پوتے کی طرف اشارہ کیا۔ ''جبکہ لڑکے اس معاملے میں بے حد...... بے پروا ہوتے ہیں اور لڑکیاں محتاط...... ایک، ایک قدم پھونک، پھونک کر رکھتی ہیں، اسے ذرا سی نصیحت کردو تو ہر کوئی اسے مولوی لگتا ہے۔'' وہ کہنا تو بہت کچھ چاہ رہی تھیں مگر ان کے خیال میں آج کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ ساس کی لمبی گفتگو سے آسیہ تنگ پڑ گئی تھیں اور وہ راہِ فرار کی تلاش میں تھیں کہ بھلا ہو کامران کا جو اُن کے لیے فرشتہ ثابت ہوا۔

''ممی، پاپا کا فون ہے، آپ کو بلا رہے ہیں۔''

''اچھا......'' آسیہ جیسے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اٹھ کر لاؤنج کی طرف بھاگیں۔ شوہر کا فون سننے کے بعد ساس کو آکر بتایا کہ احسان کے کچھ دوست افطاری پر آرہے ہیں ان کے لیے بھی افطاری کا انتظام کرنا ہے۔

''کچھ کام مجھے دے دو، میں عصر کی نماز پڑھنے کے بعد بیٹھی، بیٹھی کرلوں گی اور تم اپنے ساتھ سیرت کو بھی لگا لو......''

''جی اچھا اماں بی......'' وہ ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس کے کمرے میں چلی آئیں...... وہ سیل فون کان سے لگائے دوست سے باتیں کررہی تھی۔

''سیرت فون بند کرو...... اور اٹھ کر میرے ساتھ کچن میں آؤ......'' اس نے ایک دم سے ماں کے بدلے ہوئے تیور اور لہجے کو محسوس کیا۔

''آج کیا ہوگیا ہے انہیں......'' وہ بڑبڑائی۔

''سنا نہیں تم نے فون بند کر کے آؤ میرے ساتھ۔'' انہوں نے برہمی سے کہا اور پھر نزدیک آکر سیل اس کے کان سے ہٹا کر بند کردیا...... ''چلو اٹھو فوراً......'' انہوں نے انتہا کے سخت لہجے میں کہا...... وہ ماں کے رویّے پر حیران تھی سو اس وقت وہ خاموشی سے ان کے ساتھ ہولی۔

''آسیہ......'' اماں بی نے بہو کو پکارا۔

''جی اماں بی......'' وہ چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے ان کی طرف بڑھیں جبکہ سیرت کچن میں چلی گئی۔

''دیکھو بیٹی، اپنے لہجے کو نرم اور انداز میں لچک رکھو...... یوں ایک دم سے اس پر سختی کروگی تو وہ مزید بگڑ جائے گی اور ضد میں آکر اور زیادہ بدتمیزی کرنے لگے گی۔ پیار سب سے بڑا اور کامیاب ہتھیار ہے، اس کا سہارا لو۔'' انہوں نے بہو کو سمجھایا۔

''جی اماں بی......'' وہ کہتی ہوئی کچن میں آگئیں۔

وہ کچن میں آکر اسے مختلف کاموں کے لیے ہدایات دینے لگیں۔

''مجھ سے نہیں ہوتے ممی یہ سب کام......'' اس نے سب سن کر ٹھنکتے ہوئے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے جاؤ تم بیٹھ جاؤ......''

''ممی یہ دادو کب جائیں گی؟'' اس کے لہجے سے بیزاری عیاں تھی۔

''کیوں......؟'' آسیہ نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''میں تنگ آگئی ہوں ان کی نصیحتوں سے...... ہر وقت روک ٹوک، روزہ کیوں نہیں رکھتی ہو، نماز کیوں نہیں پڑھتیں، قرآن پاک کیوں نہیں پڑھتیں۔ تسبیح کیوں نہیں کرتیں، کچن میں ہاتھ کیوں نہیں بٹاتیں وغیرہ، وغیرہ......''

''سیرت بیٹا بری بات، بڑوں کے بارے میں ایسے بات نہیں کرتے اور اب تم بچی نہیں ہو کہ ہر بات تمہیں سمجھائی جائے، اللہ کا خوف رکھو دل میں، لوٹ کر ایک دن اسی کے پاس جاتا ہے اور وہ تمہارے بھلے کے لیے ہی کہتی ہیں۔''

''ہاں بس سب کو میری ہی بھلائی نظر آتی ہے...... کامران کم تھا میرے کان کھانے کے لیے کہ دادو اور انعام بھی آگئے...... سارے ملا مولوی میرے لیے ہی اس گھر میں اکٹھے ہوگئے ہیں۔ ایک سے بچو تو دوسرا پکڑ لیتا ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی وعظ شروع کردیتا ہے۔ آخر کہاں جاؤں میں......'' اس نے ناگواری سے کہا۔

آسیہ نے اسے سخت نظروں سے گھورا تو وہ دانتوں سے لبوں کو کاٹنے لگی۔

''فضول باتیں نہ کیا کرو...... اور وہ بھی انعام کے سامنے...... کتنی بار سمجھایا ہے تمہیں...... کیسا سلجھا ہوا با اخلاق مذہبی لڑکا ہے، آج کے دور میں ایسے دین دار لڑکے نہیں ملتے...... بہت اچھا رشتہ ہے تمہارے لیے...... تمہاری دادو خاص کر اس مقصد کے لیے اسے لے کر آئی ہیں، ورنہ ایسے لڑکوں کے لیے رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔'' اسے پہلے بھی سمجھاتی رہی تھیں لیکن وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔

''تو آپ کے خیال میں مجھے انعام کی کنیز بن جانا چاہیے۔ اس کی غلام، اس کے ایک اشارے کی منتظر اور جیسے آپ سب لوگ مجھے ملانی بنانا چاہتے ہیں تو نہیں بن سکتی میں، نہیں ہوتا یہ ڈراما مجھ سے...... میرا ظاہر، باطن ایک ہے...... پھر یہ منافقت کیوں......؟ یہ دکھاوے نہیں ہوتے مجھ سے۔''

''پھر تم غلط بولی ہو بیٹا، میرا یہ مطلب نہیں تھا

کہ تم منافقت کرو..... تم آہستہ، آہستہ شروع کرو، یہ دن تو ویسے بھی عبادت کے دن ہیں تم...... قرآن پاک کی تلاوت کرو، آخر کو تمہاری آمین ہوئی تھی اب بالکل چھوڑ دیا تم نے۔ آہستہ، آہستہ عادت ہو جائے گی اور پھر باقاعدگی سے فرض کی ادائیگی کرنے لگو گی ایک بار کوشش تو کرو..... مذہب تو ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اسے اختیار کرنے یا نہ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمیں اطاعتِ اللہ و رسول کرنی ہے۔''

''تو یہ سب آپ کو بچپن میں ہی سکھانا چاہیے تھا۔ کامران کو تو صحبت بھی اچھی مل گئی ہے وہ اس لائن پر چل پڑا لیکن مجھے کبھی کسی نے ہدایت ہی نہیں دی۔ اب بڑے ہو کر اس کی عادت نہیں تو اس میں میرا کیا قصور.....''وہ کہہ تو ٹھیک رہی تھی ایک دم سے کیسے نماز کی عادی ہو جاتی۔ ''اس کی عادت نہیں تو اس میں میرا کیا قصور...... اور مما سب سے بڑی مشکل یہ کہ انعام بھائی بھی دادو کی فوٹو اسٹیٹ ہیں...... اگر ان کا بس چلے تو ایک دن میں ہی مجھے عالمہ بنا دیں......''

اس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور اس کی یہ عادت اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ اب تو آسیہ خود بھی اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ جاتیں۔ صاف گوئی منہ پھٹ ہونے کی حد تک اپنا رکھی تھی۔ سادہ سا لہجہ مگر الفاظ کی کڑواہٹ حلق تک کڑوا کر دیتی...... شروع میں تو وہ خوش ہوتی تھیں کہ ان کی بیٹی کا کوئی ثانی نہیں اگلے کو لاجواب کر دیتی ہے۔ لیکن اب تو یہی عادت ان کے لیے شرمندگی کا باعث بنتی جا رہی تھی۔ انہی کی تربیت کا رونا رویا جا رہا تھا۔ سیرت کے والد کمال صاحب اپنے بھتیجے انعام کے حق میں فیصلہ سنا چکے تھے اور آسیہ بیگم گھبرائی ہوئی تھیں کہ ان کی دیورانی صاحبہ تیز مزاج اور سخت طبیعت کی مالک تھیں۔ وہ سیرت کو ایک پل برداشت نہ کرتیں۔ اور اگر ساس اور شوہر کے آگے مجبور بھی ہو جاتیں تو ان کے درمیان پانی پت کی جنگ ہی چھڑی رہتی۔

''قینچی کی طرح زبان چلتی ہے تمہاری سیرت کبھی کوئی بات دل میں بھی رکھ لیا کرو......'' وہ اسے ٹوک رہی تھیں۔ ''جیسے آج میرے سامنے زبان چلاتی ہو کل ساس کو بھی پٹر، پٹر جواب دو گی۔ ادھار رکھنا تو سیکھا ہی نہیں تم نے۔''

''یہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ مجھے سننے کی عادت نہیں بلکہ سنانے کی ہے۔ اور آپ بھول گئیں کہ بچپن میں آپ ہی مجھے سکھاتی تھیں کہ جو کوئی بھی کچھ کہے تمہیں فوری اس کا جواب دینا ہے۔ یہ آپ نے ہی بتایا تھا پھر اب ایک دم سے یہ عادت کیوں بری لگنے لگی۔'' وہ سیب اٹھا کر کھاتے ہوئے اطمینان سے بولی۔ آسیہ بیگم سچائی برداشت نہ کر سکیں اور خوفزدہ سی ہو کر کچن سے نکل کر آئیں۔

''یہ ممی بھی عجیب ہیں پہلے خود بولنا سکھایا اور اب زبان بندی کا حکم دے رہی ہیں۔'' وہ سیب کھاتی کچن سے نکلی تو سامنے سے آتے انعام سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔

انعام نے بڑی اسے گہری نظروں سے دیکھا اور ایک طرف سے نکلتا چلا گیا۔

''ان صاحب نے بھی عین وقت پر ہی سامنے آنا تھا، اب افطار کے بعد دادی پوتا ایک لمبا لیکچر دیں گے اور مجھے ملانی بنا کر ہی چھوڑیں گے۔'' وہ سوچتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

ایک، ایک کر کے دن یونہی گزرتے گئے آخری عشرے میں دادو، انعام اور کامران نے بڑے خشوع خضوع سے عبادت کی، وہ متاثر ضرور ہوئی لیکن اپنی ازلی کاہلی اور نیند کی کچی ہونے کی وجہ سے ان کا ساتھ نہ دے سکی۔ ہاں اس نے عید کی تیاری بڑے زور شور سے کی۔ دادو اسے روکتی ٹوکتیں تو اس نے ان کے سامنے آنا ہی کم کر دیا۔ اور انعام بھی کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا...... ان ہی مصروفیات میں عید کا دن بھی آ گیا۔

شیفون کے فیروزی کڑھائی کے سوٹ میں وہ دوپٹا سلیقے سے اوڑھے بھر بھر چوڑیاں پہنے دل میں اتر جانے کی حد تک اچھی لگ رہی تھی۔ سنجیدہ سا انعام بھی اس کی خوب صورتی سے نظریں چرائے بغیر نہ رہ سکا...... سیرت کو بھی اس کی نگاہوں کی تپش کا احساس ہو گیا۔ وہ مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھ گئی۔

''میری عیدی انعام بھائی؟'' اس نے مہندی سے رنگی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی، وہ بے تکلف اس سے عیدی کا مطالبہ کر رہی تھی۔

''عیدی تو ان کو ملتی ہے جو روزے رکھتے ہیں، رمضان المبارک کے مہینے کی عبادت کرتے ہیں...... یہ نہیں کہ روزے کا احترام بھی نہ کریں اور عید روزے دار سے بھی زیادہ اچھی منائیں...... تم اس عید اور عیدی کی حق دار نہیں ہو۔'' وہ سخت لہجے میں کہتا آف موڈ کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ اور وہ بے اختیار ہونٹ کاٹتے ہوئے آنسوؤں کو پی گئی...... انعام کا انداز اسے ہرٹ کر گیا تھا۔ اسے اپنی انسلٹ محسوس ہوئی۔ پھر وہ لاشعوری طور پر اس کی طرف سے معذرت کی منتظر رہی لیکن وہ جیسے بھول گیا تھا سب...... مگر اس روز دادو کے کمرے کی طرف جاتے' اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے۔ انعام کی آواز اسے ہوش میں لے آئی۔

''دادو، سیرت اور میرا کوئی جوڑ نہیں...... میں زمین ہوں تو وہ آسمان...... اس کی طبیعت میں لاابالی پن کے ساتھ خودسری اور بدلحاظی بھی ہے۔ وہ میرے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ میں نے اپنی شریکِ حیات کے بارے میں کبھی ایسا نہیں سوچا کہ وہ ایسی ہو...... یہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں دین دار بیوی پسند کرتا ہوں۔ محض دکھاوے کی نماز، روزہ، عبادت کو اسلام اختیار کرنا نہیں کہتے...... یہ سب تو دل سے ہوتا ہے۔ آپ سیرت کا خیال دل سے نکال دیں، مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔''

وہ کس بے دردی اور سفا کی سے اپنا فیصلہ سنا گیا

تھا جو انعام کی شخصیت کے حصار میں مقید ہو گئی تھی لیکن اب جیسے آسمان سے فرش پر پہنچ گئی۔ اس کا سارا وجود چور، چور ہو گیا تھا۔

پھر وہ کتنے دن بستر پر پڑی رہیں، ٹھکرائے جانے کا دکھ اپنی جگہ اور بہت سے پچھتاوے تھے ممی نے جس طرح اس کی تربیت کی تھی اس سے نجات پانا ممکن نہیں تھا۔

وہ اکثر سوچتی انعام اگر اسے صرف ایک بار محبت سے سمجھاتا تو شاید وہ سمجھ جاتی لیکن وہ تو اسے ٹھکرا کر چلا گیا تھا۔ نادانستہ اسے اپنی شخصیت سے متاثر کرنے والے انعام کو خبر بھی نہ تھی کہ وہ اس کے دل میں نرم جذبہ پیدا کر گیا ہے۔ انعام تو چلا گیا تھا۔ دادو نہیں گئی تھیں اتنا تو اسے اندازہ کہ دادو بھی دکھی ہیں اور وہ انہیں دیکھتی تو شرمندگی کا احساس گہرا ہو جاتا۔ اور ممی، بابا گو کہ ان تک انعام کا انکار نہیں پہنچا تھا مگر اس کا اندازہ تو تھا کہ وہ ناخوش گیا ہے، وہ ان کو افسردہ دیکھتی تو اندر تک ایک کاٹ سی اتر جاتی۔

اب اس نے باقاعدگی سے قرآن پاک کی تلاوت مع ترجمہ سنی جہاں وہ الجھتی دادو اسے درست کر دیتیں، قرآنِ پاک تو پڑھ ہی چکی تھی بس دہرایا نہ تھا۔ یہی لمحات تھے جب وہ اللہ کے قریب ہوتی چلی گئی۔ اور اسے جیسے صبر و سکون اور اطمینان ملتا گیا۔ یوں بہت آہستگی سے وہ دادو کی ہدایات پر عمل کرتی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں سے غفلت کا پردہ ہٹتا چلا گیا تو ذرّے، ذرّے میں بندگی کے اسرار نظر آنے لگے۔

ٹھکرائے جانے کے احساس نے اسے یہ یقین دلا دیا تھا کہ زندگی میں ملنے والی ہر چیز نعمتِ خداوندی ہے۔ وہ دے سکتا ہے تو لے بھی سکتا ہے۔ دونوں ہی آزمائشیں انسان کی زندگی کا حصہ ہیں مگر کبھی، کبھی دل اس طرح بھر آتا کہ وہ کسی کا کندھا چاہتا ہے لیکن ایسے میں دادو اسے نماز قرآن کی طرف متوجہ کر لیتیں تو وہ سب کچھ بھلا کر مگن سی ہو جاتی۔

آسیہ بیگم اپنی تربیت پر نادم تھیں مگر اب وقت ان کے ہاتھ میں نہیں تھا جو بویا تھا وہ کاٹ چکی تھیں۔ وہ ساس کو روکتی نہ سیرت کو...... دن پر لگا کر اڑتے چلے گئے، وہ غیر متوقع طور پر انعام کی پسند میں ڈھلتی چلی گئی۔ کبھی غور کرتی تو ایک آہ دل سے نکل جاتی...... ایسا کب چاہا تھا اس نے۔ ایک بار دادو نے انعام کا ذکر کیا تو اس نے سختی سے دادو اور گھر والوں کو منع کر دیا کہ دوبارہ وہ یہ سلسلہ شروع نہ کر سکیں۔ بی ایس کے ایگزام کے بعد وہ گھر داری میں لگ گئی اور صحیح معنوں میں اِک اچھی انسان بن گئی تھی۔ دینی تعلیم نے اسے سنوار دیا تھا۔ اسے اپنی گزری زندگی پر شرمندگی محسوس ہونے لگتی۔ دھیرے، دھیرے اس کے دل سے انعام کے لیے ناراضی بھی نکل گئی۔ اس بات کا اسے اب احساس ہوا تھا کہ انعام نے اس کے لیے انکار کیوں کیا تھا۔

''میں واقعی انعام کے لائق نہیں تھی۔'' وہ خود کو یقین دلاتی۔

''مگر اب تو اس کی پسند کے سانچے میں ڈھل گئی ہو۔'' ایک دم سے اس کے اندر سے آواز ابھرتی۔ تو وہ چونک جاتی اور پھر اس خیال کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے خود کو اپنے کام اور عبادت میں مصروف کر لیتی۔

آسیہ پہلے تو بہت خوش ہوئیں کہ وہ صرف نام کی ہی ''سیرت'' نہیں رہی تھی بلکہ اس کے ہر عمل سے سیرت کا پتا چلتا۔ لیکن دھیرے، دھیرے اس کے ارادوں میں مضبوطی کے احساس نے آسیہ بیگم کو فضول کے اندیشوں میں دھکیل دیا کہ اب ایسے لڑکیوں کی کون ڈیمانڈ کرتا تھا۔ وہ دنیا سے کٹ کر ہی رہ گئی تھی...... انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہیں...... سو انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

☆☆☆

اگلے سال رمضان المبارک کا آخری عشرہ چل رہا تھا۔ جب انعام اپنی فیملی کے ساتھ ایک بار پھر اس کے سامنے تھا۔ (اب اس ماہ مبارک میں دادو پھر اس

کے ساتھ تھیں سال بھر میں اس میں بہت تبدیلیاں آ چکی تھیں۔) اس وقت وہ مغرب کی نماز کی ادائیگی کے بعد تسبیح کر رہی تھی کہ اس ستم گر کو دیکھا تو آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔ اس نرم گرم پانی کو اس نے اندر ہی اتار لیا۔ وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے دیکھ کر اسے لگتا وہ اپنا بھرم قائم نہ رکھ سکے گی۔ لیکن انعام اس کا یا پلٹ پر بہت حیران تھا۔ تب اس سے رہا نہ گیا تو اس نے دادو سے پوچھ ہی لیا۔

''دادو کیا یہ اپنی سیرت ہے؟''

''ہاں، کیوں تمہیں کوئی اور نظر آ رہی ہے؟''

''ہاں کیونکہ بہت بدل گئی ہے یہ آپ کی صحبت کا اثر ہے کہ وہ کیا سے کیا بن گئی۔''

''اسے ایسا ہی بننا چاہیے تھا۔'' دادو کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ وہ چونک گیا۔ اور جب اس نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ نادم سا ہو گیا۔

اور پھر اسے پتا ہی نہیں چلا کب اور کیسے پھپھو، بی بی اور چچا کی فیملی پوری تیاری کے ساتھ آن دھمکی تھی...... اور وہ اس وقت ورطۂ حیرت میں ڈوب گئی جب دادو نے اسے بتایا کہ انعام اس کے ساتھ کا خواہش مند ہے، کتنی دیر تک وہ دادو کا چہرہ دیکھتی رہی اور پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے بولی۔

''مجھ سے......''

''ہاں......''

''لیکن وہ تو مجھے ریجیکٹ کر چکے تھے۔''

''اس نے تمہیں ریجیکٹ نہیں کیا تھا بلکہ تمہاری عادات پسند نہیں تھیں۔ لیکن اب تم سرتاپا بدل چکی ہو اور وہ تمہارے ساتھ کی آرزو رکھتا ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ وہ بھی تمہیں چاہتا ہے۔ اور بعض جذبے اتنے منہ زور ہوتے ہیں کہ ہم ان پر اختیار نہیں رکھتے۔''

دادو نے محبت سے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

وہ افطاری سے فارغ ہو کر کمرے میں آ کر بیٹھی ہی تھی کہ دستک دے کر وہ اندر چلا آیا۔ وہ اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جی کوئی کام ہے آپ کو......؟''

''ہاں، تمہارے ساتھ کچھ شاپنگ کرنی تھی۔ سنا ہے کہ اب تمہیں عیدیں منانے کا شوق نہیں رہا حالانکہ اب تم اس بات کی حقدار ہو کہ عید جوش و خروش سے مناؤ۔'' بڑی پیاری سی مسکراہٹ لبوں پر لیے وہ اس کے قریب آ رکا تھا۔ سیرت کا سر جھکے جا رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر بول نہ سکی۔

''میں تمہارا تہِ دل سے ممنون ہوں کہ تم نے میرا ساتھ قبول کر لیا ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ اس بار تم اکڑ جاؤ گی اور اب کئی سال کا بن باس کاٹنا پڑے گا۔ وہ تو میں خود ہی ہمت بندھاتا رہتا تھا ورنہ دادو نے تو لعن طعن کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔'' جذبوں سے چور لہجہ اس کے الفاظ کی سچائی کے گواہ تھے اور اس نئے انکشاف پر وہ حیرت سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''اب اس طرح تو مت دیکھو بڑی مشکل سے یہ دل قابو کیا ہے۔'' اس کے لہجے کی...... بے ساختگی پر وہ بری طرح جھینپ گئی۔

''چلو تمہیں شاپنگ کر لاؤں، چوڑیاں اور مہندی بہت سوٹ کرتی ہے تمہیں...... اور...... اور......'' اور جانے وہ کیا، کیا کہہ رہا تھا۔

''پلیز بس کریں......'' اس نے حلاوت بھرے لہجے میں کہا، وہ پزل ہو گئی تھی۔ اس کی بے ساختگی پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ذرا دیر بعد چاند نظر آنے کا شور اٹھا تو وہ جا کر دادو کے پاس چھپ گئی۔

مگر اس کی یہ کوشش بیکار ہی رہی۔ انعام گھر کے بزرگوں سے اجازت لے کر اسے اپنے ساتھ لے ہی گیا تھا۔

عید اور منگنی کے ڈریس کے لیے اسے سیرت کی پسند درکار تھی۔

اور اس عید کا ابھرتا چاند دونوں کے دلوں کی خبر ایک دوسرے کو دے رہا تھا۔ انعام اور اس کا ساتھ اس عید کا بہت حسین انعام ملا تھا اسے۔



امرت

شیریں حیدر

قسط 19

تخلیقِ کائنات سے لے کراب تک . . . کئی ادوار بدلے مگر عورت کی کہانی ہر دور میں لگ بھگ وہی رہی ہے ۔اللہ تعالیٰ نے ہمیں رشتوں کی ڈور میں باندھا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی تخلیق کے مقصد کو اور بھی خوب صورت بنائیں مگر اس کے پیدا کردہ دل میں جذبے بھی اسی کے پیدا کردہ تھے۔ محبت ،نفرت، رشک، حسد، رنج، غصہ اور خوشی . . . اب ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم کس جذبے کو خود پر حاوی کرلیتے ہیں ، یہ ہماری خصلت بن جاتا ہے اور ہماری کل شخصیت کا خلاصہ . . . یہی ہمارے کردار کی تعمیر کرتا ہے اور ہم اسی کا تاثر دوسروں پر عمر بھر کے لیے چھوڑتے ہیں ۔ ہماری عادات صرف ہم پر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ کسی کی زندگی کا سفر کس طرح سہل یا کٹھن ہوتا ہے اس کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اُن کی زندگی کے اہم کردار ہوتے ہیں اور جن کا ہونا یا نہ ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ پیدائش سے لے کر اپنی موت تک رشتوں کی ڈور سے بندھے ہوئے کردار زندگی کو ہنس کر گزارتے ہیں یا رو کر، مشقت سے سانس لیتے ہیں یا خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے ہوئے اس کا سارا دارومدار ان سے وابستہ رشتوں پر ہوتا ہے ۔ وقت بدل جاتے ہیں مگر کہانی وہی رہتی ہے اور اپنی باری سے اس میں مختلف کردار شامل ہوتے رہتے ہیں۔

زندگی کے انہی پیچ وخم اور نشیب وفراز سے نبرد آزما ہوتی ایک چشم کشا تحریر ......

''تم فکر نہ کرو ساجدہ...... زین یہاں بھی......'' میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ ''میں کوشش کروں گی کہ آئندہ ایسا کوئی موقع نہ آئے کہ تم تنہا رہو اور......''

''جی ٹھیک ہے......'' اس کی تسلی ہوگئی تھی۔ ''میں کھانا لگا دوں اب؟''

''ہوں، لگا دو ساجدہ، اتنی بھوک تو نہیں ہے مگر ایک ڈیوٹی تو ہے ناں جو پوری کرنی ہے۔''

''اپنے لیے نہ سہی، حبیب صاحب کے لیے ہی آپ کھانا اچھی طرح کھایا کریں، آپ کی خوراک اچھی ہوگی تو اُن کی صحت بھی اچھی ہوگی انشاء اللہ۔''

''یہ تم حبیب کو حبیب صاحب کیوں کہتی ہو ساجدہ؟''

''تو اور کیا کہوں باجی، ہمیشہ سے صاحب لوگوں کے بچوں کو صاحب کہنے کی جو عادت ہے۔''

''اسے صرف حبیب کہا کرو یا حبیب بابا کہہ لیا کرو۔''

''بابا تو جی بوڑھے آدمی کو کہتے ہیں......'' وہ ہنسی۔ ''میں 'صرف حبیب' ہی کہہ لیا کروں گی یا چھوٹے صاحب۔''

''تم اسے حبیب کہا کرو 'صرف حبیب' نہیں۔'' میں بھی اس کی ہنسی میں شامل ہوگئی۔

☆☆☆

''واہ امو جان! بہت مبارک ہو آپ کو۔'' میں خوشی سے چیخی۔ ''اتنی پیاری خبر سنائی ہے آپ نے سویرے سویرے! جی چاہ رہا ہے کہ اُڑ کر گاؤں آ جاؤں ابھی۔'' میں نے جوشِ جذبات سے کہا۔ ''فاطمہ کیسی ہے اور بچی کی صحت کیسی ہے؟''

''فاطمہ لاہور میں ہے اور کبیر بھی۔ بچی وہیں پیدا ہوئی ہے، میں آج ہی لاہور جاؤں گی، شامیر کا انتظار ہے، اس نے کال کی تھی کہ وہ آج آئے گا ورنہ میں کل ہی چلی جاتی جب فاطمہ اسپتال گئی تھی۔''

''اوہ، اچھا۔'' میں نے کہا۔ ''چلیں میں پروگرام بناتی ہوں کہ لاہور آ جاؤں، آپ لوگوں سے بھی مل لوں گی اور شامیر سے بھی۔''

''کیسے آؤ گی؟'' امو جان نے پوچھا۔ ''میں یہاں سے گاڑی اور ڈرائیور بھجوا دوں؟''

''ارے نہیں امو جان...... میں کوچ سے آ جاؤں گی، ورنہ چاچو سے گاڑی اور ڈرائیور لے لوں گی۔''

''کوچ میں تو حبیب کے ساتھ آنا اتنا آسان نہ ہوگا، جمال سے گاڑی لو گی تو زیبا سو، سو باتیں بنائے گی۔''

''آپ ان کی باتوں کے خوف سے نکل کیوں نہیں آتیں امو جان؟'' میں نے ان سے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں، اب وہ کوئی بات نہیں کریں گی، اگر کریں گی بھی تو کون سا میں اور آپ سن رہے ہوں گے۔'' کہہ کر میں نے فون بند کیا اور ساجدہ کو بتایا کہ کبیر بھائی اور فاطمہ کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تھی۔

''بہت مبارک ہو باجی۔'' ساجدہ نے مبارک باد دی۔ ''یہ تو بہت اچھا ہوا ہے، ماشاء اللہ اپنے حبیب کا جوڑا بن گیا ہے۔''

''وہ یہاں حبیب کے ساتھ تھوڑا ہی رہے گی ساجدہ۔'' میں کچھ نہ سمجھی تھی جب تک کہ اس نے وضاحت نہ کی تھی۔

''ابھی نہیں جی...... جب حبیب جوان ہوگا، بیاہ کرے گا اس ننھی گڑیا سے۔''

''ساجدہ......'' میں نے اسے سرزنش کے انداز سے کہا۔ ''ایسی باتیں نہیں کرتے۔''

''وہ تو جی میں نے مذاق سے......''

''مذاق سے نہ سنجیدگی سے، میں ایسی کوئی بات آئندہ نہ سنوں۔'' جب سے میرا اس سے واسطہ پڑا تھا، میں نے پہلی بار اس کے ساتھ اس انداز سے بات کی تھی۔

''سوری باجی۔'' اس نے شرمندگی سے کہا۔

''اچھا میں اپنا سامان پیک کر لوں۔'' میں نے وہاں سے اٹھنا بہتر سمجھا۔ ''میں کل لاہور جا رہی ہوں، اگر تمہیں لگے کہ تم یہاں دو دن کے لیے تنہا نہیں رہ سکو گی تو اُدھر چلی جاؤ، مقبول چاچا کے پاس......''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے باجی، آپ بے فکر ہو کر گھر لاک کر کے جائیں، بچے بھی دو دن گھر پر ہوں گے، میں یہیں اپنے کوارٹر میں آرام سے رہ لوں گی۔'' اس نے فوراً کہا۔

☆☆☆

کیسے ہو سکتا تھا کہ میں لاہور جانے کا کہتی اور چاچو مجھے کوچ پر جانے دیتے...... سویرے، سویرے گاڑی ڈرائیور سمیت پہنچ چکی تھی۔

میں گھر کو لاک کر کے ساجدہ کو ضروری ہدایات دے کر روانہ ہوئی۔ حبیب کی کار سیٹ میں نے پچھلی سیٹ میں اپنے ساتھ لگا لی تھی اور وہ کار سیٹ میں لیٹا مزے سے سو رہا تھا، میں اسے دیکھ رہی تھی، وہ نیند میں مسکرا رہا تھا۔ کائنات میں ایسی مسکراہٹ سے بڑھ کر خوب صورت اور کیا منظر ہو سکتا ہے؟ میں بھی راستے میں اونگھ گئی، موٹروے کا سفر ایسا ہی ہوتا ہے مگر کوشش یہ بھی تھی کہ مجھے اتنی گہری نیند نہ آ جائے کہ میں غافل ہو جاؤں۔ ڈرائیور پر نظر رکھنا لازم ہوتی ہے کہ کہیں وہ حدِ رفتار سے تیز گاڑی نہ چلائے یا اسے نیند نہ آ جائے۔

''کہیں رک کر چائے وغیرہ لے لیں الیاس چاچا۔'' میں نے اسے کہا۔

''جی بی بی، جب ضرورت سمجھوں گا تو رک جاؤں گا، آپ بے فکر ہو کر سو جائیں بے شک۔''

میں نے لاکھ کوشش کی مگر جاگنا ممکن نہ رہا تھا، سفر میں، میں یونہی سکون سے سو جاتی تھی۔

☆☆☆

''بچہ ہمارے حوالے کر دو بی بی۔'' اس نقاب پوش نے اپنے ہاتھ مکروہ عزم کے ساتھ حبیب کی طرف بڑھائے۔

''دیکھو......'' میں نے بہ مشکل تھوک نگلا۔ ''تمہیں جو زیور یا رقم چاہیے وہ لے لو، اس معصوم بچے کو چھوڑ دو۔'' میں نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''ہاہاہاہ......'' وہ اتنا منہ پھاڑ کر ہنسا کہ اس کے حلق کا کوا تک نظر آ رہا تھا۔ اس کے باقی حواریوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ حیرت یہ ہے کہ ان میں سے صرف اس نے اپنا چہرہ جلد کے رنگ کے ایک ایسے ماسک سے چھپا رکھا تھا جس سے اس کے چہرے کے نقوش نہ پہچانے جا رہے تھے۔ ''لو بھئی سنو...... اس کے پاس اس بچے کی قیمت کے برابر کی رقم اور زیورات بھی ہیں اور وہ ہمیں پیشکش کر رہی ہے کہ ہم وہ لے کر بچے کو چھوڑ دیں۔''

''مجھے بھی بچے کو لے جانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' ایک نے دانتوں کی نمائش کی۔

''کس چیز سے دلچسپی ہے تمہیں؟'' باس نے سوال کیا۔

''تمہیں پتا ہے باس...... میں جوان ہو گیا ہوں، بچوں وچوں سے دلچسپی ختم ہوگئی ہے...... بڑوں سے ہوگئی ہے۔''

''بہت بڑے خبیث ہو تم۔'' باس نے اسے جھڑکا۔ ''تم نشے میں اپنی اصلیت بھی بھول جاتے ہو اور وہ کام بھی جسے کرنا سب سے اہم ہے۔''

''کیا خیال ہے باس؟'' ایک اور نے آنکھ مار کر سوال کیا۔ ''بچے کو چھوڑ دیتے ہیں، وہ بھی کہہ رہی ہے۔''

میں ایک لمحے کو باقیوں کے چہرے دیکھ کر اُن کے تاثرات کا اندازہ کرنے میں اتنی غافل ہوئی کہ اس نے

حبیب کو میری گود سے اچک لیا۔ اس کے زور، زور سے رونے کی آواز میرے وجود کو کاٹنے لگی تھی، میں نے چیخنے کی کوشش کی مگر چیخیں میرے حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئیں۔

''چھوٹے صاحب جاگ گئے ہیں بی بی۔'' الیاس چاچا کی آواز نے مجھے نیند کی گہرائی سے کھینچ لیا، میرا وجود پسینہ، پسینہ ہو رہا تھا۔

''اے سی بند ہو گیا ہے کیا چاچا؟'' میں نے حبیب کو اپنے ساتھ لگایا، اسے تھپکا اور وہ ذرا سا بہلا تو میں نے اپنی چادر پھیلا کر اسے اپنے وجود سے بھینچ لیا۔ پیٹ بھر کر وہ پھر سو گیا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ کیوں اس کے بارے میں، میں اکثر ایسے خواب دیکھتی تھی کہ کوئی اسے مجھ سے چھین لے گا۔ زیرِ لب قرآنی آیات کا ورد کر کے میں اس پر پھونکنے لگی۔

''اے سی تو آن ہے، کہیں تو تیز کر دوں؟''

''نہیں ٹھیک ہے رہنے دیں، حبیب کے لیے سردی ہو جائے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''چائے پئیں گی آپ بی بی؟'' الیاس چاچا نے سوال کیا۔

''آپ گاڑی روک کر کچھ دیر آرام کر لیں، کچھ کھا لیں اور چائے بھی پی لیں...... میں فریش جوس لے لوں گی۔'' مجھے گرمی محسوس ہو رہی تھی۔

''ٹھیک ہے بی بی۔'' انہوں نے گاڑی کا رخ موٹر وے پر قیام وطعام کی طرف موڑا۔

☆☆☆

''تم ابھی سے اتنی موٹی ہو گئی ہو تمنا......'' میں اس سے لپٹ کر بولی۔

''پھپھو کا بس چلے تو مجھے اور بھی ٹھونسا ٹھونسا کر کھلائیں...... ہر وقت کچھ نہ کچھ کھلاتی رہتی ہیں۔'' اس نے جواباً اپنا دفاع کیا۔ ''اور تو اور یثاق بھی کہتا ہے کہ اسے میں بہت موٹی لگتی ہوں مگر پھپھو کو کون سمجھائے......''

''اپنا وزن قابو میں رکھو ورنہ یثاق کی اماں لگنا شروع ہو جاؤ گی...... وہ پہلے سے بھی اسمارٹ ہو گیا ہے۔'' میں نے اسے ڈرایا۔

''ہاں، ہاں...... بہن ہو ناں اُس کی اسی لیے وہ تمہیں اسمارٹ لگتا ہے۔''

''شامیر کو دیکھا تم نے...... مجھے تو پہلے سے بہت کمزور لگا ہے۔''

''زندگی اتنی آسان تو نہیں ہے فوج میں میری پیاری۔'' تمنا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم سناؤ...... کیسی گزر رہی ہے، اب تو تم اپنی نیند سوتی ہو اور اپنی مرضی سے سانس لیتی ہو۔''

''میں بہت سکون میں ہوں تمنا، سونے کا مجھے کبھی بہت زیادہ شوق نہیں رہا ہے مگر ہاں، میں اپنی مرضی سے سانس لیتی ہوں اب۔''

''یوسف کی کوئی خبر؟'' اس نے سوال کیا۔ ''بہت اچھا بچہ ہے، سچ اس کے بارے میں سن کر بہت دکھ ہوتا ہے۔''

''بہت زیادہ پریشانی ہے تمنا، میرے لیے تو وہ اسی طرح ہے جیسے شامیر بھائی اور کبیر بھائی، میرا بہت خیال رکھتا تھا وہ۔''

''سب کو ہی پریشانی ہے امرت، جمال چاچو اس سارے خاندان کے لاڈلے ہیں اور سب کا خیال بھی کرتے ہیں، ان کے گھر کا دکھ سب کا دکھ ہے۔ پہلے زائنہ کی یوں حادثاتی موت اور پھر اب یوسف کا معاملہ......''

''جانتی ہوں مگر چاچو کا حوصلہ بھی داد دینے کے قابل ہے۔''

''تم سناؤ...... زین کیوں تمہارے ساتھ شفٹ نہیں ہوا؟''

''تم سو جاؤ اب جا کر، رات کافی ہو گئی ہے۔'' میں نے آنکھیں موند کر کہا۔

''میں یہیں سو رہی ہوں، یثاق اور شامیر ہمارے کمرے میں سو رہے ہیں۔''

''بد دعائیں دے رہا ہو گا یثاق مجھے کہ میں نے آ کر تم دونوں میں جدائی ڈال دی ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''ارے نہیں...... وہ تو خود اتنا خوش تھا کہ شامیر اتنے عرصے کے بعد یہاں ہے اور ان دونوں کو اکٹھے ہونے کا موقع ملا ہے۔''

''ہوں......'' حبیب کسمسایا تھا۔ ''سو جاؤ پھر تم، میں حبیب کو فیڈ کروا لوں۔'' میں نے بسورتے ہوئے اپنے بیٹے کو گود میں لیا۔

''کتنا خوب صورت منظر ہے یہ امرت، لگتا ہے کہ کائنات کی ساری خوب صورتی اس منظر کی خوب صورتی کے پیچھے ماند پڑ گئی ہے۔'' میری طرف دیکھ کر اس نے شاعرانہ انداز میں کہا۔

''بہت آمد ہو رہی ہے تمہیں!'' میں اسے گھورتا ہوا دیکھ کر لجا گئی۔

''میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں تمہارے اس روپ کو اپنے کیمرے میں مقید کر لوں۔'' اس کا لہجہ کھویا، کھویا تھا۔ ''عورت کی تکمیل کا منظر، ماں کی ممتا کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور آنکھوں میں رکا ہوا دریا...... پتا دیتا ہے کہ اپنے بچے کو فخر سے گود میں اٹھائے ہوئے یہ ماں کسی اندرونی کرب میں ہے...... تمہیں کیا غم ہے امرت؟'' میرا دل اس کے الفاظ پر دھڑکا۔ میں اسے یہ ہی تو معلوم نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔

''بہت بڑی شاعرہ اور فلاسفر ہو گئی ہو تم......'' میں ہنسی۔

''تم اتنا جو مسکرا رہے ہو...... کیا غم ہے جس کو چھپا رہے ہو؟'' اس نے گنگنا کر سوال کیا۔

''مجھے کوئی غم نہیں ہے تمنا...... میری جان۔''

''مجھے تمہارے اندر اور باہر کے سب موسموں کی خبر ہے امرت پیاری۔'' اس نے اپنے لہجے کو مضبوط رکھ کر کہا۔ ''کیا یہ غم اس بات کا ہے کہ زین بھائی کسی وجہ سے تمہارے ساتھ تمہارے نئے فلیٹ میں شفٹ نہیں ہوئے؟'' اس نے سوال کیا۔

''یقین کرو تمنا...... اس کا میرے ساتھ شفٹ نہ ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے جو مجھے غم میں مبتلا کر دے...... مجھے تو اس کا ساتھ زیادہ کرب میں رکھتا تھا، میری زندگی اس کے وجود کے بغیر زیادہ سکون میں ہے۔ میں اپنی زندگی کو حبیب کے ساتھ اور زین کے بغیر مکمل پاتی ہوں، اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔''

''میں جانتی ہوں کہ اُن کا سلوک تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہے، تم ان کے ساتھ خوش نہیں ہو ویسے ان کا چہرہ دیکھ کر لگتا نہیں کہ کوئی انسان اتنا مکروہ روپ بھی رکھ سکتا ہے، کیا وہ تم پر ہاتھ اٹھاتے ہیں امرت؟''

''اب نہیں......'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''کاش ان پیاری، پیاری صورتوں کے پیچھے چھپے گھناؤنے چہرے ہم پہلے دیکھ پاتے، کم از کم ابو جان ان کو پہچان جاتے......''

''تم پچھتا رہی ہو تو اُن سے چھٹکارا پا لو امرت، تمہارے لیے ضروری نہیں کہ تم اس گھر میں مجبوری کی زندگی گزارو جہاں تم خوش نہیں ہو۔ ابو جان زندہ ہوتے تو تمہیں ایک دن بھی خود پر ایسی تکلیف نہ جھیلنے دیتے، وہ تم سے اپنی سب اولادوں سے بڑھ کر پیار کرتے تھے امرت، جانتی ہوں تم ان کے اسی پیار کی لاج نباہ رہی ہو مگر اب وہ نہیں رہے تو تمہیں ان کے طے کیے گئے رشتے کا طوق گلے میں ڈالے رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

"ہوں......" میں نے گہری سانس لی۔ "میں نے بھی یہی سوچا ہے تمنا۔" میں نے مختصراً کہا۔ "اب سو جاؤ تم۔" وہ مجھ سے لپٹ کر سو گئی۔ اس کے وجود سے سکون کا احساس ہو رہا تھا اور اس کی سانسوں کے ہموار پنے سے مجھے احساس ہوا کہ وہ کتنی مطمئن تھی۔

☆☆☆

"بہت مبارک ہو دونوں پھپوؤں کو۔" شہر بانو پھپو کی تحریم مجھ سے اور تمنا سے اکٹھے لپٹ گئی۔

"تمہیں بھی مبارک ہو پھپو اور خالہ...... اور اپنی منگنی کی بھی۔" میں نے پیار سے اس سے لپٹ کر کہا۔

"تھینک یو...... شکر ہے کہ تمہیں یاد آ گیا مبارک باد دینا۔" اس نے گلہ کیا۔

"اس سے پہلے ملاقات ہی کب ہوئی ہے؟" میں ہنسی۔

"ایک چیز فون بھی ہوتی ہے اور وہ فاصلے سے بات کرنے کے لیے ہی استعمال ہوتی ہے......" اس نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"سوری تحریم...... واقعی مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے، اصل میں اوپر تلے اتنی پریشانیاں......"

"جانتی ہوں یار۔" اس نے میرے ہاتھ تھام لیے۔ "تمنا ہے ناں سب چیزوں سے اپ ڈیٹ کرنے کے لیے۔ تمہیں بہت مبارک ہو حبیب کی اور بہت دکھ ہوا زائنہ کی موت کا اور یوسف کے ساتھ ہونے والے حادثے کا بھی۔ ہم زائنہ کی وفات پر آئے تھے تو تم اسپتال میں تھیں اس لیے ملاقات نہ ہو سکی۔ جمال ماموں بیچارے ایک کے بعد ایک مسائل میں پھنسے ہوئے ہیں۔"

"بس دعا کیا کرو...... اللہ یوسف کی طرف سے پریشانی رفع کرے۔" میں نے کہا۔ "چاچو آج سویرے کی فلائیٹ سے ہی ساؤتھ افریقہ گئے ہیں، وہ وہاں جا کر اہم لوگوں سے اور سرکاری محکموں سے رابطہ کر کے اپنی سی کوشش کریں گے۔"

"ان ملکوں میں تو ایسے قوانین بہت سخت ہیں امرت۔"

"ہوں، جانتی ہوں مگر اللہ کی مدد شامل حال رہے تو...... یوسف کی کم عمری ایک اہم پہلو ہے اور اس کے علاوہ اس کا فیملی بیک گراؤنڈ بھی ہے کہ اسے... پیسہ کمانے کے لیے ایسی ویسی غلط کارروائیوں میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے...... بہت سی دعائیں ہیں اس کے لیے۔"

"پھپو کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہیں ماما...... کینیڈا گئی ہوئی ہیں، وہیں سے کامل بھائی کے پاس امریکا جائیں گی۔" اس نے سرسری لہجے میں کہا۔

"کینیڈا میں تو تمہاری سسرال ہے ناں؟" میں نے شرارت سے کہا۔

"ہاں...... وہیں گئی ہیں پھر کامل بھائی کو قائل کرنا ہے کہ وہ بھی کوئی لڑکی پسند کر لیں تا کہ ان کی شادی بھی میرے ساتھ ہی کر دی جائے۔" میرا دل رکا اور پھر ہلکی سی رفتار سے چلا۔ "جانتی ہو ایک تم لوگوں کی کلاس فیلو تھی شفاف؟"

"ہاں تھی...... وہیں ہوتی ہے امریکا میں۔" تمنا نے کہا۔

"کامل بھائی تھوڑا سا اس کے ساتھ سیریس ہوئے تھے، کچھ عرصہ اس سے ملتے بھی رہے، ماما سے کہا کہ وہ اسے جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں کہ نہیں۔" وہ بتا رہی تھی اور میں چاہ رہی تھی

کہ موضوع تبدیل ہو جائے۔ شفاف کے بارے میں اس کی بھابی سیما نے بتایا تھا...... تو گویا وہ قصہ اس کے اور کامل کے بیچ تعلق کا تھا۔

"تم بتاؤ تمہاری شادی کب ہو رہی ہے؟" میں نے بات بدلی۔

"اب سے بہتر دن کے بعد، میں سمجھی کہ تمہیں خبر ہو گی۔"

"اچھا...... پھر تو بہت قریب ہے۔"

"کب کوئی، ابھی تو اتنے دن باقی ہیں۔" اس نے بے ساختہ کہا تو ہم سب کا مشترکہ قہقہہ گونجا۔

"تم آؤ گی ناں شادی پر؟" اس نے سوال کیا۔

"تم بلاؤ گی تو ضرور آؤں گی۔"

"میں بھی کہ......" وہ رک گئی۔ "تمہیں بلاوے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی امرت؟"

"او کے بھئی، تاریخ بتا دینا، بلاوے کے بغیر بھی آ جاؤں گی۔"

"یہ ہوئی ناں بات۔" اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

☆☆☆

"تمنا تم ڈاکٹر سے باقاعدگی سے چیک اپ کروا رہی ہوناں؟" میں نے اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں......"

"دوبارہ ویسا دورہ تو نہیں پڑا تمہیں؟"

"ارے نہیں بالکل بھی نہیں...... ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ شدید ٹینشن کے باعث ایسا ہوا تھا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "جانتی ہو کہ تم سے کتنا پیار ہے مجھے پیاری، تم سے متعلق اتنی بڑی بات سن کر برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا مجھ میں۔"

"جانتی ہوں...... مجھے بھی تم سے اتنی ہی محبت ہے تمنا، لگتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی تکلیف پر یونہی تڑپ اٹھتی ہیں۔"

"اللہ اب تمہیں کسی بھی قسم کی تکلیف سے بچائے۔"

"سب کچھ ٹھیک ہے ناں تمہارے بچے کے ساتھ؟"

"ہاں سب ٹھیک ہے اللہ کے فضل سے۔" اس نے میرا ہاتھ تھاما۔ "تم میرے لیے دعا کیا کرو۔"

"کیا دعا کروں؟" میں ہنسی۔ "بیٹے کی یا بیٹی کی؟"

"جو بھی ہو بس صحت مند ہو اور تمہاری طرح ذہین ہو۔"

"مکھن مت لگاؤ......" میں نے اس کو چپت لگائی۔

"حقیقت کہہ رہی ہوں۔"

"نام کیا سوچے ہیں تم لوگوں نے؟"

"ارے ہاں نام سے یاد آیا، کبیر بھائی اور فاطمہ نے اموجان سے کہا ہے کہ ان کی بیٹی کا نام وہ تجویز کریں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے، انہوں نے ان کو عزت دی ہے۔"

"مگر اموجان کہتی ہیں کہ ان کے ذہن میں کوئی ایسا نام آ ہی نہیں رہا، انہوں نے کہا ہے کہ میں اور تم چند نام تجویز کریں تو ان میں سے وہ کوئی نام منتخب کر لیں گی۔"

"ہم دونوں کون سا بہت سے نام جانتی ہیں، اموجان تو خود اتنے ڈائجسٹ وغیرہ پڑھتی رہتی ہیں اور ان میں

کئی نئے، نئے نام ہوتے ہیں۔''

''یہی تو میں نے کہا تھا مگر وہ کہنے لگیں کہ آج کل کی کہانیوں میں عجیب، عجیب سے نام ہوتے ہیں، جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا اور صرف اس لیے کہ وہ سننے میں اچھے لگتے ہیں۔''

''تمہیں بھلا کون سا نام اچھا لگتا ہے؟''

''مجھے تو تمہارا نام اچھا لگتا ہے......''اس نے ہنس کر کہا۔

''اور مجھے تمہارا......''میں نے بھی اسی جیسا جواب دیا۔

''چلو میں اموجان سے کہتی ہوں کہ اس کا نام امرت تمنا رکھ دیں۔''

''نہیں تمنائے امرت ٹھیک رہے گا۔''ہم دونوں کی ہنسی سے حبیب جاگ گیا اور ہماری ہنسی کو لگام لگ گئی۔

☆☆☆

''پتا بھی نہیں چلا اور چار دن گزر بھی گئے۔''اس رات نیند ہم دونوں کی آنکھوں سے دور تھی۔

''دو دن کے لیے آئی تھی اور چار دن لگا کر واپس جا رہی ہوں۔''

''ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کہ دل ابھی بھرا نہیں۔''وہ گنگنائی۔

''میثاق سے پوچھو جو مجھے بددعائیں دے رہا ہوگا کہ اس کی بیوی کو چھین لیا ہے میں نے۔''میں نے ہنس کر کہا۔''پہلے دن تو شامیر کا بہانہ ہوگیا مگر وہ تو اگلے روز چلا گیا تھا، وہ بیچارہ تمہاری جدائی میں تین راتوں سے آہیں بھر رہا ہوگا۔''

''وہ تو دل کی گہرائیوں سے خوش ہوگا۔''

''کیوں؟''میرے دل میں ایک اندیشے نے سر اٹھایا۔

''بھئی اتنی موٹی اور کروٹ، کروٹ پر کراہتی ہوئی بیوی کے پاس کس کا سونے کو دل چاہتا ہے۔''اس نے مزاح سے کہا۔

''تم نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا......''

''تم سمجھیں کہ میرے اور اس کے بیچ بھی کچھ تمہارے اور زین بھائی جیسا اختلاف چل رہا ہے؟''

''اللہ نہ کرے تمنا......''میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔

''تم اُن سے اپنی جان کیوں نہیں چھڑا لیتیں امرت، جب ان کا ذکر تک تمہیں اس تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے؟''

''یہی سوچا ہے۔''

''کیا تم ان سے علیحدگی کے لیے تیار ہو؟''

''کیا تم کوئی ایسی بات سننے کے لیے تیار ہو تمنا جو میں اموجان سے کہنا چاہتی ہوں مگر ہمت نہیں پاتی، تم سے کہوں تو تم انہیں بتادو، کبیر بھائی کو بتادو اور شامیر کو بھی۔''

''ہاں ہاں، کہو، ایسی کون سی بات ہے جو تم کہتے ہوئے یوں جھجک رہی ہو؟''

''پہلے بتاؤ کہ تم اس کا اثر اپنے دماغ پر تو نہیں لوگی؟''میں نے ضمانت چاہی کہ اسے کہیں دوبارہ دورہ نہ پڑ جائے۔

''ارے نہیں امرت، بہت مضبوط ہوں میں، تم جانتی نہیں ہو مجھے۔''

''تمنا......''میں نے تھوک نگلا۔''تم ابھی جو بات کر رہی تھیں ناں......''میں نے سر جھکا کر اپنی بات شروع کی، دو ایک بار اس کی ہوں کی آواز آئی مگر جب میں نے اپنی بات پوری کرنے کے بعد سر اٹھا کر دیکھا تو میری

چیخوں نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ چند لمحوں میں گھر کے سبھی لوگ کمرے میں موجود تھے اور انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیا ہوا تھا کہ یوں تمنا کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اور اس کا سارا جسم جھٹکے لے رہا تھا۔ حبیب نے گلا پھاڑ کر رونا شروع کر دیا، کبیر بھائی اور میثاق نے مل کر تمنا کو اٹھایا اور اسے لے کر باہر کو بھاگے۔

''اسے کو کیا ہوا ہے......لگتا ہے کہ کوئی خوفناک خواب دیکھ لیا ہے؟''مہر پھپو پوچھ رہی تھیں اور میرے پاس اس کا جواب یہی تھا کہ جاگتی آنکھوں سے اس نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا۔ مگر میں وہ خواب انہیں سنا نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

''سب کچھ ٹھیک رہا ناں ساجدہ؟''میں نے پوچھا، مجھے واپس دیکھ کر اس کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔

''جی سب ٹھیک رہا......وہ آئی تھیں آپ کی ساس۔''اس نے آپ کی ساس پر زور دے کر کہا۔

''اکیلی آئی تھیں؟''میں نے پوچھا۔''انہیں تو علم تھا کہ میں لاہور گئی ہوں پھر کیوں آئیں؟''

''پتا نہیں جی، آئی ہوں گی جاسوسی کرنے......دیکھنے کے لیے کہ یہاں کیا چل رہا ہے۔''

''ساجدہ۔''میں نے اسے تنبیہ کی۔''ممکن ہے کہ وہ سمجھی ہوں کہ گھر کھلا ہوگا اور انہوں نے تو ابھی تک میرا گھر دیکھا بھی نہیں۔''

''نہیں جی، انہیں علم تھا کہ گھر بند ہے......کیونکہ وہ گھر کے قریب بھی نہیں آئیں، گاڑی میں بیٹھے، بیٹھے ہی ساری تفتیش کر لی انہوں نے، کہہ رہی تھیں کہ یوں ہی آئی تھیں، مارکیٹ سے واپسی پر، حسنہ باجی بھی ساتھ تھیں، وہ کچھ پوچھ رہی تھیں۔''وہ رکی۔

''کیا پوچھ رہی تھیں؟''میں نے سرسری انداز میں پوچھ کر کندھے سے بیگ اتار کر اسے پکڑایا۔''ڈرائیور کو چائے بنا کر دینا ساجدہ اور پھر مجھے بتانا۔''

''پوچھ رہی تھیں کہ کیا بڑے صاحب روز یہاں آتے ہیں، جب آتے ہیں تو کتنی دیر رکتے ہیں، کیا کرتے ہیں، میں کہاں ہوتی ہوں جب وہ آتے ہیں تو اور کیا ارسل صاحب بھی یہاں آتے ہیں؟''اس نے جلدی، جلدی بتایا۔''سارے سوال گاڑی میں بیٹھے، بیٹھے ہی پوچھ لیے جی انہوں نے۔''

''گاڑی میں ڈرائیور بھی تھا؟''میرا سر بھک سے اڑ گیا......ان کے ایسے گھٹیا سوالات کو سن کر اور پہلا خیال یہی آیا کہ کیا وہ ساری باتیں اس نئے ڈرائیور کے سامنے ہی کر رہی تھیں۔

''نہیں جی، حسنہ باجی گاڑی چلا رہی تھیں۔''

''اچھا تم ڈرائیور کو جلدی سے چائے بنا دو۔''میں نے اسے ٹالا۔

''میں پہلے آپ کو میز اور صوفہ صاف کر دوں جی، کل آندھی چلی تھی تو بہت مٹی ہو رہی ہے، بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں ہے۔''

''مٹی کچھ نہیں کہتی مجھے ساجدہ......جو کہا ہے تم وہ کرو۔''میں نے اسے کہا مگر اس نے لمحوں میں میز اور ایک صوفہ صاف کر دیا تھا، میں حبیب کو گود میں لیے، لیے اس پر بیٹھ گئی۔

''آپ چائے لیں گی باجی؟''اس نے جاتے، جاتے پوچھا۔

''پہلے ڈرائیور چاچا کو چائے دے لو۔ پھر مجھے کافی بنا دینا، میں بہت تھک گئی ہوں۔''میں نے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔''اور ہاں جب وہ چائے سے فارغ ہو جائیں تو مجھے بتانا۔''سوچ رہی تھی کہ انہیں کچھ ٹپ دے دوں گی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ اس سفر نے مجھے اتنا نہیں تھکایا تھا جتنا ساجدہ کی بتائی ہوئی باتوں نے چند لمحوں میں مجھے یوں نڈھال کر دیا تھا۔ میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اگر انسان کے گھٹیا پن کو ناپنے کا کوئی پیمانہ ہوتا تو...... ماما اس پیمانے پر کتنا پورا اترتیں؟ انہیں یوسف کی جدائی اور اس کے قید میں ہونے اور ممکنہ پھانسی کی سزا ہونے کی پریشانی کے باوصف یہ جاننے کی پڑی تھی کہ میں کیا کرتی پھر رہی تھی۔ بہتر ہے کہ اب میں خود ہی انہیں بتا دوں کہ میرا ان کے بیٹے سے کوئی واسطہ نہ تھا اور نہ ہی وہ میرے بارے میں یوں فضول اور بے تکی باتیں کرنے کا حق رکھتی تھیں۔

''مجھے کمرے میں کافی دے دینا ساجدہ......'' اس کے کافی لانے کی آواز سے میں چونکی تھی، حبیب دودھ پیتے، پیتے سو گیا تھا۔ ''میں حبیب کو کمرے میں لٹاتی ہوں۔''

''آپ اِدھر ہی بیٹھ کر کافی پئیں، میں دس منٹ میں کمرا صاف کر دوں، ورنہ گرد سے کہیں حبیب بابا بیمار نہ ہو جائیں۔'' اس نے میز پر میرے سامنے ٹرے رکھی، نفاست سے ایک پلیٹ میں رکھے ہوئے مختلف قسموں کے بسکٹ اور بھاپ اڑاتی ہوئی گرما گرم کافی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اسے جواب دے کر کافی کا گھونٹ بھرا، دماغ کو سکون کا احساس ہوا۔

☆☆☆

''تمنا اب ٹھیک ہے ناں امو جان؟'' میں نے کال کر کے ان سے تمنا کی خیریت دریافت کی۔

ڈاکٹر نے اسے رات کو سکون آور دوا دے دی تھی اور وہ سو گئی تھی۔ میں آنے سے پہلے اس سے مل کر معذرت کر کے آئی تھی کہ میں نے اس پر اس کی برداشت سے بڑھ کر بوجھ ڈال دیا تھا۔ اس پر اس نے ناراضی سے مجھے دیکھا تھا، آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں، میرا ہاتھ اس نے مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

''کیوں تم یہ سب جھیلتی رہیں امرت؟'' وہ سسکی تھی۔ ''تم نے کرب اور تکلیف کے سارے سفر تنہا کاٹ دیے، کسی کو بھی اس قابل نہ جانا کہ وہ تمہارے غم کا بوجھ بٹاتا۔''

''تم دیکھ لو اپنی حالت تمنا...... تم سے تو سن کر بھی برداشت نہیں ہوتا۔''

''یہی تو......'' اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ ''جو بات سن کر برداشت نہیں ہوتی، تم وہ سب کچھ تنہا خود پر جھیلتی رہیں۔'' میرے ہاتھ پر اس نے بوسہ دیا۔ ''آفرین ہے تم پر امرت، ابو جان کی خواہش پر قائم ہونے والے اس رشتے کی لاج نبھاتے، نبھاتے تم جان سے گزر گئیں مگر حرف نہیں آنے دیا اپنے باپ کے وعدے پر۔'' میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھا۔ ''اتنا ظلم برداشت کرنا بھی ظلم ہے میری جان۔''

''بس جو برداشت کرنا تھا...... وہ کر لیا، اب میرے لیے ایک نئی صبح ہے اور میری زندگی میں سکون ہے۔''

''اللہ تمہیں ہمیشہ خوش اور سکون میں رکھے۔'' اس نے دل سے دعا دی۔

''چلتی ہوں، اب اپنا خیال رکھنا۔'' میں نے اس سے لپٹ کر پیار کیا اور روانہ ہوئی تھی، راستہ بھر اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔

''ہاں، وہ اب بہتر ہے پہلے سے بیٹا۔'' امو جان نے بتایا۔ ''تم سناؤ سفر خیریت سے گزرا، حبیب ٹھیک ہے؟''

''جی امو جان۔''

''کبیر کی بیٹی کا نام ہاجرہ بانو رکھا ہے ہم نے۔'' امو جان نے بتایا تو میرے سینے میں سانس رک گئی، میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ''تمہیں اچھا نہیں لگا بیٹا؟''

''اچھا نام ہے امو جان۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تو یہ نام یوں بھی اپنی ماں کی یاد دلاتا رہے گا۔''

''پتا ہے، اس کا نام سن کر تمنا نے بھی ہو بہو یہی الفاظ کہے تھے۔'' امو جان نے بتایا۔

''آپ اسے اصلیت کیوں نہیں بتا دیتیں امو جان؟''

''امرت بیٹا، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں نے اصلیت تم لوگوں کے باپ سے بھی چھپائی تھی، میری نظر میں تم میں اور تمنا میں کوئی فرق نہیں ہے، ہاجرہ اور میں دونوں ہی تم دونوں کی ایک جیسی مائیں ہیں۔''

''ایسی باتوں سے حقیقت بدل تو نہیں جاتی امو جان۔''

''تم یوں بات کرتی ہو تو میرا دل کٹتا ہے، مجھے لگتا ہے کہ میری محبت میں کوئی کمی یا کھوٹ تھا جو تمہیں میں اپنی ماں نہیں لگتی۔''

''ایسا نہیں ہے امو جان......'' میں ہکلائی۔ ''کیا یہ تمنا کے ساتھ ناانصافی نہیں ہے کہ اسے اپنی اصلی ماں کے بارے میں بھی علم نہیں ہے؟''

''تمنا تو یوں بھی تایا اور تائی کو ماں اور باپ کہتی ہے، اسے کیا فرق پڑتا ہے کہ اسے میں نے جنم دیا تھا یا ہاجرہ نے اور اس کے بعد میں اس موضوع پر تم سے کوئی بات نہیں سننا چاہتی، اگر ایسا ہوا تو مجھے لگے گا کہ میری محبت میں کوئی کھوٹ تھا یا میں کوشش کر کے بھی تمہیں ماں کا پیار نہیں دے سکی۔''

''ایسا نہیں ہے امو جان۔'' میں سسکی۔

''آئندہ میں اس کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہوں گی۔''

''میں اسے بانو کہہ کر بلا سکتی ہوں؟'' میں نے موضوع بدلا۔

''ہم سب اسے بانو ہی کہیں گے...... اسی لیے اس کے نام کے ساتھ بانو لگایا ہے۔'' امو جان نے بتایا۔

''ویسے اس کے لیے ہاجرہ نام، تمنا نے تجویز کیا ہے۔'' امو جان کے انکشاف پر میں حیرت زدہ رہ گئی، وہ بچپن سے ہاجرہ اپنی ماں کا نام سمجھتی تھی اور وہی نام اس نے کبیر بھائی کی بیٹی کے لیے تجویز کیا تھا اور مجھے اسی بات پر افسوس ہوا تھا کہ ہاجرہ نام رکھنے سے میں ہر وقت اس نام کی پکار سنوں گی تو مجھے اپنی اصلیت یاد آتی رہے گی، دونوں بہنوں کی سوچ میں ایسا فرق پہلی بار دیکھنے میں آیا تھا۔

''ہاجرہ بانو۔'' فون بند کر کے میں نے پکارا۔

''کس سے باتیں کر رہی ہیں باجی، کس کو بلا رہی ہیں؟''

''وہ...... وہ، کبیر بھائی کی بیٹی کا نام ہاجرہ بانو رکھا ہے امو جان نے۔'' مجھے خود ہی اپنی بے وقوفی پر ہنسی آ گئی۔

''بہت پیارا نام ہے جی۔'' اس کی بھی باچھیں کھل گئیں۔

☆☆☆

''کیا؟'' میں نے مندی آنکھوں سے سوال کیا۔ ''کیا کہہ رہی ہو ساجدہ؟''

''وہ جی گاؤں سے......'' اس نے دُہرایا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹا کر بتایا تھا کہ امو جان اور کبیر بھائی آئے تھے، صبح کے آٹھ بجے تھے اور وہ لوگ تو لاہور میں تھے، اس وقت آنے کا مطلب کہ وہ لاہور سے رات کو دو اڑھائی بجے چلے ہوں گے۔

''اچھا انہیں بٹھاؤ اور ناشتے کا بندوبست کرو، میں ہاتھ منہ دھو کر آتی ہوں۔'' جلدی سے میں نے پیروں میں چپل اڑسی اور غسل خانے کی طرف بھاگی، ہاتھ منہ دھو کر بال سمیٹے اور رات کے پہنے ہوئے کپڑے تبدیل کیے۔

''اللہ خیر کرے۔'' باہر نکلتے ہوئے میں نے حبیب کو گہری نیند میں سوتے ہوئے دیکھا اور دروازہ نیم وا رہنے دیا.. تاکہ اگر وہ جاگے تو مجھے آواز آ جائے۔

باہر نکلی تو امو جان اور کبیر بھائی اٹھ کھڑے ہوئے، میں دونوں سے ملی، حیرت میرے چہرے پر میک اپ کی

برتن قلعی کرالو

بات کچھ یوں ہے کہ یہ سانحہ اس وقت پیش آیا جب میں تقریباً چھ سال کی تھی مگر آج تک ذہن سے نہیں اترا۔ اس دور میں ہمارے گاؤں میں تقریباً سب لوگ پیتل یا تانبے کے برتن استعمال کرتے تھے۔ ہمارے گھر میں امی کی شادی اور کچھ بعد میں خریدے گئے برتنوں کے ڈھیر ہوا کرتے تھے جو تہواروں اور شادی بیاہ پر نکلا کرتے پھر عین صحن کے وسط میں رکھ کر ریت سے مانجھے جاتے، برتن اس قدر چمک جاتے کہ ان میں منہ دیکھ لو۔ بڑے، بڑے پیتل کے گلاس اور کٹورے جن میں تقریباً ایک کلو دودھ یا لسی کسی کو دینی ہوتی تو آجاتی تھی اور پینے والا اتنا بڑا گلاس دیکھ کر خوش ہوجاتا تھا کہ خالہ نے میری اتنی عزت افزائی کی ورنہ آج کل تو کوئی کسی کو اسٹیل کے گلاس میں پانی دے، دے تو بندہ ناراض ہوجاتا ہے کہ شیشے کے گلاس میں پانی کیوں نہیں دیا۔ خیر بات ہورہی تھی برتنوں کی...... صبح دس بجے کا وقت ہوگا کہ ایک آدمی نے ہماری گلی میں آکر آواز لگائی۔

برتن قلعی کرالو، پرانے نئے بنالو......

میں اپنے مکان کی چھت پر دھوپ تاپ رہی تھی، میری امی جان، (اللہ جنت نصیب کرے) نے مجھے آواز دی کہ جلدی آؤ کہیں قلعی والا دور نہ نکل جائے۔ میں بھاگتے ہوئے آئی اور گلی سے قلعی والے کو آواز دی کہ ہم نے برتن قلعی کروانے ہیں واپس آؤ، وہ جلدی سے ہمارے دروازے تک آگیا۔ اپنی بوری جس میں چند برتن جو کہ لوگوں نے قلعی کے لیے دیے تھے رکھ کر آکر بیٹھ گیا۔ میری امی جان نے سیڑھی لگائی اور پرچھتی سے سارے برتن اتار دیے۔ تقریباً ایک بوری کے قریب برتن ہوگئے، پراتیں، تھالیاں، گلاس، کٹورے، دیگچے، دیگچیاں، لوٹے، نہ جانے کیا، کیا سامان جو آج بھی یاد آتا ہے۔ ہمارے گھر میں امی کی شادی کی گاگر جس میں تقریباً دس سیر، دودھ آتا تھا اور وہ ہم بچوں کے بڑے کام کی چیز تھی جب گھر میں کسی کی شادی ہوتی تو بڑی عورتیں ہمیں ڈھولک نہیں بجانے دیتی تھیں ہم سب بچے اکھٹے ہوکر گاگر درمیان میں رکھ لیتے تھے۔ ایک بچہ بڑا سا جوتا اس پر مارتا تھا ایک لڑکا پتھر مارتا تھا۔ باقی سب بچے گانا گاتے تھے۔ امی جان نے سوچا اس بیچاری کا رنگ جوتے کھا، کھا کر اتر گیا ہے وہ گاگر بھی قلعی والے کو دے دی۔

ہمارے محلے میں ایک لڑکی کی نئی، نئی شادی ہوئی تھی کوئی بوری کے برابر برتن اس کی ساس نے کہا کہ یہ برتن قلعی کروا کر استعمال میں لاتے ہیں اس کے علاوہ اور لوگوں نے بھی کافی برتن اس کو دے دیے۔ ہمارے محلے والوں کو اس نے کہا کہ جامع مسجد کے باہر بیٹھ کر قلعی کروں گا وہاں جگہ زیادہ ہے، تم لوگ عصر کے وقت اپنے، اپنے برتن لے جانا، دوسرے محلے والوں کو کہا کہ میں مسجد کشمیریاں کے صحن میں بیٹھ کر برتن قلعی کروں گا، عصر کے وقت اپنے برتن لے جانا۔ جب عصر کا وقت ہوا تو بیچارے محلے والے جامع مسجد گئے تاکہ اپنے برتن وہاں سے اٹھائیں مگر نہ تو وہ قلعی والا نظر آیا نہ برتن، دوسرے محلے والے ہمارے محلے کی مسجد کشمیریاں میں آئے مگر مسجد کے دروازے پر بڑا سا تالا لگا ہوا تھا کیونکہ وہاں صحن میں بچے کھیلتے تھے اس لیے ہر نماز کے بعد مولوی صاحب دروازے کو تالا لگا دیتے تھے۔ چاروں طرف شور مچ گیا لوگ بھاگ دوڑ کر آنے لگے۔ اللہ جانے اس کے ساتھ اور کتنے آدمی ہوں گے جو بوریاں بھر، بھر کر بھاگ گئے جب وہ آدمی ہمارے گاؤں میں آیا تھا تو اس نے جان بوجھ کر ایک ٹانگ لنگڑی کی ہوئی تھی مگر دوسرے گاؤں والوں نے بتایا کہ وہ آدمی اچھا بھلا تھا لنگڑا نہیں تھا کاندھے پر برتنوں سے بھری بوری تھی مگر وہ بچ نہیں رہا تھا اور سیدھا شہر کی طرف جارہا تھا ہمارے گاؤں کے کچھ لوگ شہر گئے وہاں اسے کافی تلاش کیا مگر نہ جانے اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ آج اتنے سال گزر گئے کئی نشیب و فراز زندگی میں آئے کئی دکھ دیکھے مگر...... یہ واقعہ آج تک میرے ذہن سے نہیں نکلا خاص کر مجھے وہ گاگر نہیں بھولتی کیونکہ اس کے ساتھ میرا بچپن جڑا ہوا تھا۔ ذرا سوچیے کیسے، کیسے دھوکے ہوتے ہیں دنیا میں......

تحریر: فرخندہ جعفری، گجرات

طرح لپی ہوئی تھی۔ ساجدہ میز پر ناشتے کے برتن لگا رہی تھی۔

''حبیب سو رہا ہے کیا؟'' اموجان نے بات کا آغاز کیا۔

''جی اموجان، آپ سنائیں، خیریت تو ہے ناں، اتنی سویرے...... رات کا سفر کیوں کیا آپ نے؟''

''ہم کل گاؤں آئے تھے، گاؤں سے صبح فجر کے بعد نکلے ہیں۔''

''خیریت ہے ناں اموجان...... کبیر بھائی؟''

''الٹا سوال ہم سے کر رہی ہو تم؟'' اموجان کے لہجے سے ناراضی جھلک رہی تھی۔

''کیوں، کیا ہوا، میں سمجھی نہیں۔'' میں نے بات کو کچھ، کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔

''ساجدہ میرے لیے پراٹھا نہ بنانا، خالی روٹی بنانا۔'' اموجان نے ساجدہ کو کہا۔ وہ میز پر برتن لگا کر چلی گئی مگر کچن بھی کون سا دور تھا۔ ''تم سے اکیلے میں کس وقت اور کہاں بات ہوسکتی ہے؟'' اموجان نے ہولے سے پوچھا۔

''میں دیکھتی ہوں اموجان۔'' میں وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ انہیں کیا بات کرنا تھی، میری آنکھوں میں جلن ہونے لگی تھی، ضبط کا یارانہ رہا تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے ساجدہ کو دوپہر کے کھانے کے لیے سودے کی ایک طویل لسٹ بنا کر دی کہ وہ ٹیکسی لے کر جائے اور بڑی مارکیٹ سے سارا سامان لے آئے۔

☆☆☆

''تم نے ہمیں اس قابل بھی نہیں جانا امرت کہ ہمیں اتنی بڑی قیامت خود پر ٹوٹنے کی خبر ہی کر دیتیں۔'' اموجان بے چینی سے ساجدہ کے جانے کا انتظار کر رہی تھیں، اس کے نکلتے ہی غصے سے شروع ہوگئیں۔

''کیا بتاتی اموجان...... اور پھر یقین کریں کہ مجھے یہ اتنی بڑی قیامت لگی بھی نہیں، مجھے تو نجات مل گئی ہے

اپنی زندگی میں ناپسندیدہ لوگوں سے، مجھے جن رشتوں کو نبھانے کی کوشش میں ہلکان ہونا پڑ رہا تھا وہ میرے ساتھ اپنے تعلق کو خود ہی ختم کر گئے۔'' میں نے تحمل سے جواب دیا۔

''اس سے کہیں بہتر تھا کہ تم شروع میں ہی اس سے خلع لے لیتیں، کم از کم ہمیں کسی کو یہ تو نہ بتانا پڑتا کہ اس نے تمہیں طلاق دی ہے......'' وہ کہتے ہوئے سسکیں۔

''تعلق ہی ٹوٹا ہے ناں اموجان، وہ مجھے چھوڑے یا میں اسے! اور ہم نے بتانا کس کو ہے، کیا صفائیاں دینا ہیں ہمیں کسی کو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''تم اس بات کو نظر انداز کردو...... اموجان یونہی جذبات میں ایسا کہہ گئی ہیں۔'' کبیر بھائی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا، میرا دل پگھلنے لگا۔ میں اب تک کتنی بہادری سے سب کچھ سہہ رہی تھی اور اب اپنے پیاروں کی طرف سے ہمدردی کے دو بولوں نے میرے اندر کرب کے احساس کو جگا دیا تھا۔ مجھے اب اندازہ ہوا تھا کہ میرے ساتھ کتنا برا ہوا تھا، اتنا برا کہ میں خاندان میں سو لوگوں کے سوالوں کے جوابات دیتے، دیتے تھک جاتی۔ کوئی مجھ سے نہ بھی پوچھتا مگر اموجان سے تو سب کرید، کرید کر ضرور پوچھتے۔

''باتھ روم کس طرف ہے امرت؟'' کبیر بھائی نے پوچھا، میں نے انہیں دوسرے بیڈروم کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر چلے گئے اور میں اموجان کے پاس بیٹھ گئی، ان کا ہاتھ تھاما۔

''میں نے اپنی سی پوری کوشش کی اس تعلق کو قائم رکھنے کی اموجان...... آپ جانتی ہیں، اس حد تک جانے کا میں نے بھی بارہا سوچا مگر ہر بار یہ سوچ کر رہ جاتی کہ ایسی عورتوں کی اس معاشرے میں کوئی عزت نہیں ہوتی، میں اب بھی نہ اس تعلق کو توڑتی، حبیب کی خاطر ساری عمر نباہ لیتی مگر اسی نے ساری حدیں پار کرلیں...... رجوع کا موقع

بھی تھا اور وقت بھی مگر جب اس نے اس تعلق کو یوں ایک ہی بار میں توڑ دیا تو میرے دل کے سنگھاسن سے وہ اترا نہیں بلکہ گر گیا۔ اس نے مجھے طلاق کے الفاظ کہے تو میری بے چینیوں کو قرار آ گیا تھا امو جان...... آپ یقین کریں امو جان، میں گزارہ کر لیتی جو اُس میں ذرا سی بھی انسانیت ہوتی تو......''

''یہی تو تکلیف ہے میری جان کہ تم یہ سب برداشت کرنے میں اپنی جان سے گزر گئیں، اپنے وجود کو کینسر جیسا روگ لگا لیا، اس گھر کے سارے لوگ ہی کینسر ہیں جو تمہیں چمٹے ہوئے تھے، اچھا ہوا کہ جان چھوٹی مگر میں اس بات سے تکلیف محسوس کرتی ہوں کہ مرنے والے کے وعدے کی لاج نبھاتے ہوئے تم نے اپنی مرضی اور انا کو بھینٹ چڑھا دیا۔''

''کوئی یہ تو نہیں کہے گا ناں امو جان کہ ایسے ماں باپ کی بیٹی اپنے چچا کے گھر بھی نبھا نہ کر سکی، سب کو معلوم ہو گا کہ اس نے پوری سی کوشش کی تھی۔''

''کبیر ٹھیک کہہ رہا تھا بیٹا، میرے منہ سے یونہی ایک بات نکل گئی۔ ہمیں کسی کے سوالوں کی پروا ہے نہ قیافوں کی۔'' انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''آپ میرے لیے دعا کیا کریں امو جان، آگے کی زندگی کے مراحل بڑے مشکل ہیں جو مجھے تنہا کاٹنا ہیں۔''

''کیوں...... ہم مر گئے ہیں کیا؟'' وہ پھر غصے میں آ گئیں۔ ''مہر تو کہہ رہی تھی کہ ہمیں فوراً تمہیں گاؤں لے آنا چاہیے، کیوں جمال کے دیے ہوئے اس فلیٹ میں رہو تم۔ وہ اتنا ہی بے اختیار ہے اپنے گھر والوں کو سنبھالنے میں تو اس نے رشتہ لیا ہی کیوں تھا تمہارا؟''

''مہر پھپو کو تو نہیں معلوم امو جان مگر آپ تو جانتی ہیں ناں کہ یہ رشتہ ابو جان نے خود دیا تھا چاچو کو۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''اور یہاں میں اپنی خوشی اور اپنے حق سے رہ رہی ہوں، یہ گھر میرے نام پر ہے اور میں کسی کی محتاج نہیں ہوں، چاچو نے میرے اور حبیب کے نام پر اور بھی بہت کچھ کر دیا ہے امو جان۔''

''انہوں نے خود یونہی نہیں دیا تھا رشتہ...... تمہارے دادا یعنی ان دونوں کے مرے ہوئے باپ کی خواہش تھی کہ اُن کے شہری بیٹے کا گاؤں سے کسی حوالے سے رابطہ رہے اور انہوں نے ہی تمہارے ابو جان سے اس کی درخواست کی تھی جو انہوں نے جمال کو بتائی تھی۔'' امو جان نے فوراً کہا۔ ''اور رہی بات اس کے تمہارے اور حبیب کے نام پر جائدادیں لگانے کی تو وہ بھی اس کے ضمیر کا بوجھ ہے جو اسے اتارنا ہے، شہر میں کاروبار شروع کرنے کے لیے اسے تمہارے دادا جان نے مشترکہ زمینوں میں سے زمینیں بیچ کر رقم دی تھی۔ اس کے کاروبار پر اس خاندان کے ہر بیٹے اور بیٹی کا بھی حق ہے، سب کی رقم لگی ہوئی ہے اس میں۔''

''جو بھی ہے......'' میں نے کہا، حبیب کے رونے کی آواز آئی تھی۔ ''میں آتی ہوں تھوڑی دیر میں امو جان۔'' میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ کمرے میں جا کر حبیب کو اٹھایا، اس کا ڈائپر وغیرہ تبدیل کیا اور منہ ہاتھ دھلا کر اسے لاؤنج میں لے آئی۔

''آ گیا ہمارا شیر۔'' کبیر بھائی نے اٹھ کر اسے میرے ہاتھوں سے لیا۔ وہ منہ بسورنے لگا تو کبیر بھائی نے اسے امو جان کے حوالے کر دیا۔ ''آپ دونوں بیٹھیں، میں ذرا دیر کو آرام کر لوں، نیند پوری نہیں ہوئی اس لیے سر میں ہلکا سا درد ہے۔''

''آپ کو دوا دوں کوئی کبیر بھائی؟'' میں نے تشویش سے کہا۔

''ارے نہیں گل بیٹا، نیند پوری کروں گا تو آرام آ جائے گا۔''

''دوائیں کھانے کا تو یہ ہمیشہ سے چور ہے، جانتی تو ہو تم۔'' امو جان نے کہا۔ ''ٹھیک ہے بیٹا، جاؤ تم آرام

کرو...... وہاں لاہور میں بھی دو بچوں کے ساتھ کہاں نیندیں پوری ہوتی ہیں اس کی، ہر وقت اس کی آنکھیں لال رہتی ہیں۔'' کبیر بھائی چلے گئے۔

''تو آپ کمیل کو اپنے پاس رکھتی ناں۔''

''وہ فاطمہ سے بہت اٹیچڈ ہے اور خاص طور پر بچی کی پیدائش کے بعد تو اور بھی چڑچڑا ہو گیا ہے، ماں کی گود میں اسے برداشت ہی نہیں کرتا۔''

''ابھی تو وہ اتنا چھوٹا سا ہے......''

''بچوں کو اپنی ماں کی گود کی بہت پہچان ہوتی ہے اور اس میں شراکت ان سے کسی بھی عمر میں برداشت کرنا پہلا صدمہ ہوتا ہے...... آہستہ، آہستہ عادی ہو جائے گا۔'' میں ان کی بات کے مطلب کو سمجھ سکتی تھی، مجھ سے زیادہ اس وقت اس کے معانی شاید ہی کوئی اور سمجھتا۔ ماں کیسا رشتہ ہے، عمر بھر آپ جسے ماں سمجھتے رہے ہوں، سالوں بعد علم ہو کہ آپ غلط سمجھ رہے تھے...... مجھے اپنی زندگی ایک دھوکا لگنا شروع ہو گئی تھی۔

''آپ اس وقت چاچو کے کاروبار کی بات کر رہی تھیں امو جان کہ اس میں رقم دادا جان نے کچھ آبائی زمینیں بیچ کر لگائی تھی اور اس کاروبار پر سب کا حق ہے...... مگر آپ کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ چاچو نے اس کا سارا حساب کتاب سیدھا رکھا ہوا ہے، سب کچھ تحریری طور پر بھی موجود ہے اور تایا جان کو اور کبیر بھائی کو بھی بتا رکھا ہے۔ سب بھائیوں اور بہنوں کو سالانہ منافع میں سے باقاعدگی سے حصہ دیا جاتا ہے۔ آپ چاہیں تو کبیر بھائی سے بھی چیک کر لیں، مجھے چاچو نے یہ سب کچھ خود بتایا ہے اور یہ جو کچھ انہوں نے میرے اور حبیب کے نام پر کیا ہے وہ ان کے اپنے حصے میں سے ہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ میں غلط سوچتی ہوں کیونکہ مجھے ان سب باتوں کا علم نہیں تھا۔ مالی معاملات میں نہ تم لوگوں کے ابو جان نے خود مجھے کچھ بتایا اور نہ ان کی زندگی میں، میں نے کوئی مداخلت کی تھی، اب کبیر کے ساتھ بھی ایسی کوئی بات نہیں ہوتی ہے۔''

''اچھا بتائیں کہ دوپہر کو کیا کھائیں گی آپ؟'' میں نے بات کا رخ بدلا۔

''جیسے ہم بہت خوشی کے موقع پر آئے ہیں جو فرمائشیں کر کے کھائیں گے۔'' انہوں نے طنز سے کہا۔

''بھئی، کبیر بھائی تو پہلی بار میرے گھر آئے ہیں، میرے اپنے گھر پر... میرے لیے اس سے بڑھ کر کیا خوشی کا موقع ہو گا؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''آپ کو علم ہی ہے کہ وہ کتنا کہیں جاتے ہیں۔''

''اسے گاؤں اور زمینوں کے معاملات ہی کہاں نکلنے دیتے ہیں، لاہور سے ان دنوں میں کئی بار اسے جانا پڑا۔ کٹائی کے دنوں میں ہر روز کوئی نہ کوئی مسئلہ پڑا ہوتا ہے۔''

''آپ بتائیں کہ تمنا نے کس وقت آپ کو یہ سب بتایا؟'' میں نے ان کے پاس بیٹھ کر حبیب کو اپنی گود میں لیا۔

''تمہارے آنے کے بعد مہر کو تو تشویش ہو رہی تھی کہ جانے اسے کس بات پر یوں دورہ پڑا ہے...... اسے اس کے پہلے دورے کا بھی علم تھا۔ ڈاکٹر کے کہنے پر کہ اسے جب انتہائی ٹینشن اور ذہنی دباؤ ہوتا ہے تو برداشت نہیں کر پاتی اور دورہ پڑ جاتا ہے، یہ بھی مرگی کی ہی ایک قسم ہے۔ مہر کو ڈاکٹر کے کہنے پر تسلی اس لیے بھی نہیں ہوئی کہ چلو پہلی بار تو اس نے تمہاری بیماری کا سنا تو اسے ذہنی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا تو اب کیا بات ہوئی تھی، اب تو ہاجرہ کی پیدائش خوشی کا موقع ہے۔''

''ہوں۔'' میں نے ہنکارا بھرا۔

''اسی لیے اس نے مہر کے سامنے ہی بتایا... جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا، تب جا کر مہر کو یقین آیا ہے۔''

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں، اس کے یہ دورے ختم ہو جائیں گے؟" میں نے سوال کیا، مجھے اس بات کی فکر نہ تھی کہ مہر پھپو کیا سوچتی ہیں اور اُن کا کیا ردِعمل ہوگا۔ "اس حالت میں وہ دورے ختم کرنے کی دوا لے سکتی ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے دوا بہت احتیاط سے دی ہے اور کہا ہے کہ کوشش کریں کہ اسے صدمے والی کوئی بات نہ بتائیں، ممکن ہے کہ وہ دوا کے بغیر بھی گزارہ کر لے۔" امو جان نے وضاحت کی۔

"اللہ کرے......" میں نے دل سے کہا۔ تمنا کی تکلیف نے مجھے تڑپا دیا تھا اور کئی طرح کے واہمے ستانے لگے تھے۔ اسے بتانے سے پہلے میں خوفزدہ بھی تھی مگر میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا، اس کے سوا میں کسی سے یوں آرام سے اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکتی تھی۔

"مہر تو کہہ رہی تھی کہ وہ سب لوگ جانتے تھے کہ زین کتنا آزاد خیال اور آوارہ مزاج لڑکا تھا...... جب تمہارا رشتہ دیا تو وہ سب حیرت زدہ رہ گئے تھے کہ تمہارے ابو جان نے کامل جیسے ہیرے کو ٹھکرا کر کیسے اس بدفطرت لڑکے کا انتخاب کیا تھا۔" امو جان بول رہی تھیں مگر مجھے اس سے کچھ غرض نہ تھی۔

"یہ سب لوگ اگر زین کی آوارگیوں کو جانتے تھے تو اس وقت کیوں خاموش رہے تھے؟" جانے کس خیال میں تھی کہ میری سوچ میرے منہ سے پھسل گئی تھی۔

"کیونکہ ایک طرف ایک بھائی تھا...... اس کی بیٹی کو بچانے کے لیے اگر کوئی تمہارے ابو جان کو زین کے کردار کے بارے میں سچ بتاتا تو جمال کو کتنا برا لگتا، سب کی کوئی نہ کوئی مصلحت تھی جو خاموش رہے۔" امو جان نے جواب دیا۔

"اگر اس وقت خاموش رہے تھے تو اب بھی خاموش رہیں پھر، ان کی مصلحتوں نے مجھے بھینٹ چڑھا دیا، اب بولے ہیں اور جانتی ہوں امو جان...... اب بھی کئی لوگ ایسے ہوں گے جو مجھے ہی غلط سمجھیں گے۔"

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔" انہوں نے غصے سے کہا۔

"میں کھانے کا کچھ دیکھ لوں۔" اس سے پہلے کہ میرا ضبط ختم ہو جاتا، میں نے وہاں سے اٹھ جانا بہتر سمجھا۔

☆☆☆

"آج تو نہیں آسکوں گی سارہ......" میں نے اس کے کہنے پر معذرت کی۔ "امو جان اور کبیر بھائی آئے ہوئے ہیں۔"

"میں آجاؤں، تم سے کوئی اہم مشورہ کرنا تھا۔" اس نے لجاجت سے کہا۔

"مجھ سے کیا مشورہ کرنا ہے، مجھ جیسی بے وقوف کون ہوگی جسے تم عقلمند سمجھتی ہو۔"

"اچھا جان نہ چھڑاؤ، مجھے بتاؤ کہ میں آجاؤں؟"

"آج نہیں آؤ، کل کا تمہیں بتاؤں گی۔" میں نے اسے ٹالا، میں نہیں چاہتی تھی کہ اس کے سامنے امو جان کوئی ایسی بات کر دیں۔ مگر سوچ میں پڑ گئی کہ جانے اسے کون سی اہم بات کرنا تھی۔ میں جب بھی اسے مدد کے لیے پکارتی تھی تو وہ فوراً لبیک کہتی تھی، میرے ساتھ مجبوریوں کے ایسے بندھن تھے کہ جب وہ ملنے کا کہتی تو میں سو، سو بہانے بناتی تھی۔ "ویسے کیا فون پر تم مجھ سے وہ بات نہیں کہہ سکتیں؟"

"کہہ تو سکتی ہوں مگر چاہتی ہوں کہ تمہارے سامنے بیٹھ کر مشورہ کروں، مجھے تمہارے چہرے کو دیکھ کر بات کرنا اچھا لگتا ہے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"اچھا اب باتیں نہ بناؤ، کوئی اشارہ دو کہ کس بارے میں بات ہے؟"

"مل کر ہی بتاؤں گی۔" اس نے تجسس برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "تم بتاؤ پنکی کے لیے چاچو کو ہاں کہہ دی ہے کہ نہیں؟"

"چاچو کل واپس آئیں گے، اس کے بعد۔" میں نے غیر واضح انداز میں بات کی تا کہ امو جان کو اندازہ نہ ہو۔

"ٹھیک ہے پھر ملتے ہیں تو بات کرتے ہیں، مجھے لگ رہا ہے کہ تم اپنی امو جان کے سامنے کھل کر بات نہیں کر پا رہی ہو۔"

"ہاں، ہاں ٹھیک ہے......" میں نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

"سارہ ہوگی یقیناً؟" امو جان نے استفسار کیا۔ "کیا حال ہے اس کا، بڑی اچھی بچی ہے، کیسی چل رہی ہے اس کی شادی؟"

"اس کی شادی ختم ہوگئی ہے امو جان اور......"

"کیا اس کی دوسری شادی بھی ختم ہوگئی ہے؟" ان کی حیرت دیدنی تھی۔ "ایک تو آج کل لڑکیوں نے شادی بیاہ کو مذاق بنا کر رکھ دیا ہے۔"

"یہ آپ کہہ رہی ہیں امو جان، آپ کی بیٹی کے بارے میں بھی لوگ اگر اسی طرح سوچیں اور بات کریں گے تو آپ کو سن کر دکھ ہوگا ناں؟" میں نے ان کی تصحیح کی۔ "کب تک ہم شادی کی ناکامی کا سارا مدعا لڑکیوں پر ڈالتے رہیں گے، آپ پوچھ تو لیتیں، ہوسکتا ہے کہ آپ کو علم ہوتا... اس کا کوئی قصور نہیں تھا سوائے قسمت کی خرابی کے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو، ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں ایسا ہی سوچا جاتا ہے۔"

"آپ کبیر بھائی کو جگائیں، میں کھانا میز پر لگوا رہی ہوں۔" میں ان سے کہہ کر باورچی خانے کی سمت مڑ گئی۔

☆☆☆

کبیر بھائی کے پاس تو سو کاموں کے حیلے تھے سو ان کو روکنا تو ناممکنات میں سے ایک تھا، لے دے کے امو جان کی ہی منتیں کر سکتی تھی مگر ان کے پاس جواز تھا کہ فاطمہ ایک دو روز میں واپس گھر آنے والی تھی اور انہیں اس کے انتظامات کرنا تھے۔ اس کے آتے ہی مہمانداری کا رش ہو جاتا اور پھر پوتی کی پیدائش کی مٹھائی بھی بانٹنا تھی انہیں۔

"تو اب آپ یہاں سے لاہور جائیں گی؟" نکلتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"نہیں، میں گاؤں رکوں گی، کبیر کل یا پرسوں جائے گا اور پھر اسے ساتھ لے کر آئے گا، ہوسکتا ہے کہ تمنا بھی ساتھ آجائے۔"

"تمنا کیوں آئے گی، اس حالت میں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اسے بھی تو بچے کی پیدائش کے لیے میکے آنا ہوگا ناں۔" امو جان نے کہا۔ "فاطمہ کے دونوں بچے میکے میں ہوئے ہیں تو کیا تمنا کا بچہ سسرال میں ہوگا؟"

"مہر پھپو نے کہا ہے کیا کہ تمنا آپ کے پاس جائے گی؟"

"وہ کہے یا نہ کہے نگران کے گھر کا یہی رواج ہے؟"

"رواج کون بناتا ہے امو جان، ہم لوگ ہی بناتے ہیں ناں، رانی کا بیٹا تو بڑی پھپو کے ہاں ہی ہوا تھا ناں اس کے میکے میں تو نہیں! اور حبیب بھی اپنے ددھیال میں۔"

''حبیب کی دفعہ تو تمہاری اپنی جان کے لالے پڑے تھے، میں چاہ کر بھی تمہیں گاؤں نہ لے جا پاتی۔''
''شہروں میں لوگ دیہات سے علاج کے لیے آتے ہیں اور آپ شہر سے گاؤں لے جانے کا سوچ رہی ہیں۔''
''وہ تو ہے مگر مہر جانے کیا سوچے گی کہ میں نے ایک بار بھی نہیں کہا، کل کلاں کو تمنا کو کوئی بات نہ سننی پڑ جائے۔'' ان کے لہجے میں تفکر تھا۔
''وہ کچھ نہیں سوچیں گی اموجان، وہ شہر میں رہتی ہیں اور فاطمہ کو دونوں بچوں کی پیدائش کے لیے اس لیے شہر جانا پڑا کہ گاؤں کی ڈسپنسری میں آپریشن کی سہولت موجود نہیں ہے۔ پھر تمنا کی حالت ایسی نہیں ہے کہ آپ اسے ڈلیوری کے لیے گاؤں لے آئیں۔''
''میں اسے فون کر کے کہہ کر تو دیکھوں گی، آگے جو اس کا فیصلہ ہوگا۔''
''مجھے یقین ہے اموجان کہ یثاق بھی اسے گاؤں نہیں بھیجے گا۔''
''اگر یثاق کی ماں کہے گی تب بھی نہیں؟'' اموجان نے سوال کیا۔
''ہاں، تب بھی نہیں۔'' یثاق کو جانتے ہوئے میں نے دعویٰ کیا۔
''تم اس خاندان کے لڑکوں کو نہیں جانتیں، ان کی ماؤں نے اُن کی مہار اپنے ہاتھوں میں رکھی ہوتی ہے، زین کے ساتھ رہ کر تمہیں اندازہ نہیں ہوا؟''
''آپ کو ایسا لگتا ہے اموجان پر ماما کی کوئی اولاد ان کے کہے میں نہیں ہے، کیا زین اور کیا باقی۔ زین کی حرکتوں پر تو وہ چاچو کے ڈر سے پردے ڈالتی رہی ہیں، رہی بات زین کی مہار کی تو وہ بھی کسی اور کے ہاتھ میں ہے جس کا جادو اس کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔''
''تمہاری عمر سے زیادہ میرا تجربہ ہے بیٹا۔'' انہوں نے دعویٰ کیا۔
''میں اسے کبھی چیلنج نہیں کرتی اموجان مگر میں نے ان چند سالوں میں جن مشکل حالات کا سامنا کیا ہے اور جو تلخیاں برداشت کی ہیں، انہوں نے مجھے اپنی عمر سے جانے کتنا بڑا کر دیا ہے۔''
''اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔'' انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر پیار کیا۔ حبیب کو اٹھا کو اپنے ساتھ لگایا اور کبیر بھائی بھی مل کر روانہ ہوئے۔ ''یہ کچھ رقم ساجدہ کو دے دینا، اپنے اور بچوں کے کپڑے بنا لے۔'' انہوں نے چند نوٹ میرے ہاتھ میں تھمائے۔
''آپ خود دے دیں اسے اموجان، وہ خوش ہو جائے، میں بلاتی ہوں۔'' میں نے نوٹ انہیں واپس کر کے ساجدہ کو پکارا۔

☆☆☆

اگلے روز سارہ کی اپنی کوئی مصروفیت تھی، کال کیا تو اس نے کہا کہ وہ شام تک آئے گی، اگر میں فارغ ہوئی تو... چاچو کا پیغام آیا تھا، انہوں نے اپنی پرواز کا وقت بتایا تھا اور کہا تھا کہ وہ اگلے روز دوپہر کا کھانا میرے پاس کھائیں گے۔ دن فارغ تھا، آدھا دن میں نے کسلمندی سے بستر میں پڑے رہ کر اور باقی کا دن ٹی وی دیکھتے ہوئے گزارا۔ حبیب کے چھوٹے موٹے کام اب کام محسوس نہ ہوتے تھے، وہ معمول بن گئے تھے، اسی طرح جس طرح ہم چلتے پھرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، سانس لیتے ہیں اور ان میں سے ہمیں کوئی بھی کام بوجھ نہیں لگتا اور نہ ہی محسوس ہوتا ہے کہ ہم کچھ کر رہے ہیں۔
ساجدہ سے کہہ کر اس کے بچوں کو کتابوں کاپیوں سمیت بلوایا اور ان کی پڑھائی کی پروگریس چیک کی، لاہور کے ٹرپ کے بعد اور اموجان اور کبیر بھائی کے ساتھ دو مصروف دن گزار کر اب فرصت ہی فرصت لگ رہی تھی۔

سوچا کہ کوئی نہ کوئی کتاب پڑھ لینی چاہیے، گھر پر رکھی سب کتابیں میری کئی بار کی پڑھی ہوئی تھیں۔
''ساجدہ بچوں کو واپس کوارٹر میں چھوڑ آؤ اور میرے کپڑے استری کر دو، میں ذرا مارکیٹ تک ہو آؤں۔'' یکا یک پروگرام بنا کر میں نے ساجدہ سے کہا۔
''میں آپ کے ساتھ جاؤں گی باجی۔''
''نہیں، بچے گھر پر تنہا ہوں گے......''
''انہیں کوارٹر میں باہر سے تالا لگا کر چلی جاتی ہوں، آپ اکیلی کیسے جائیں گی؟'' اس نے کہا۔
''اگر میرے جانے کی کوئی انتہائی مجبوری ہوتی تو بھی میں تمہیں اس بات کی اجازت نہ دیتی کہ بچوں کو یوں کوارٹر میں لاک کر کے جایا جائے اور نہ ہی کبھی ایسا کرنا۔ کسی بھی وقت کوئی ایسا حادثہ ہو سکتا ہے کہ انہیں باہر نکلنا پڑے اور وہ اندر بند ہوں۔ میں تو یونہی سوچ رہی تھی کہ ذرا گاڑی چلانے کی پریکٹس بھی ہو جائے گی۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''ورنہ اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں اکیلی نہیں جا سکتی تو میں نہیں جاتی۔''
''ایسا تو میں نے نہیں کہا، پہلی بار خود اکیلے چلا کر گاڑی لے کر جائیں گی، یونہی ذرا سوچا کہ بچے کے ساتھ اور پھر کبھی آپ یوں تنہا جاتی بھی تو نہیں ہیں جی۔ میرے بیٹے کو ساتھ لے جائیں۔'' اس نے حل پیش کیا۔
''اچھا کیا اسے گاڑی چلانا آتی ہے یا اس کے پاس میری حفاظت کے لیے کوئی اسلحہ موجود ہوگا؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔
''کچھ بھی نہیں جی مگر سوچا کہ ایک سے دو بھلے......'' وہ منمنائی۔
''اچھا چلو...... بھیج دو اسے، اگر اس سے تمہاری تسلی ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور شکریہ یوں سوچنے کا اور میری اتنی فکر کرنے کا، تم بہت اچھی ہو ساجدہ۔''
''آپ جیسا اچھا کون ہوگا باجی، آپ خود اتنی اچھی اور پیاری ہیں، ہم تو آپ کے احسان مند ہیں، پاؤں دھو دھو کر بھی پئیں تو کم ہے، ملازموں کو انسان سمجھتی ہیں اور ان کے دکھ درد میں ساتھ دیتی ہیں۔''
''چلو اب جلدی سے تیار کرو میرے باڈی گارڈ کو۔'' میرے یوں کہنے پر وہ ہنستی ہوئی کوارٹر کی طرف بھاگی۔

☆☆☆

''یہ تو بہت برا ہوا چاچو۔'' میں آنسوؤں سے رو پڑی۔ چاچو نے بتایا تھا کہ اس کی پھانسی کی سزا قید کی سزا میں تبدیل ہو گئی تھی۔
''اس سے بہت برا بھی ہو سکتا تھا، تم سوچ بھی نہیں سکتیں بیٹا کہ اس مرحلے تک لانے کے لیے بھی میں نے کس طرح اپنا اثر... رسوخ اور دولت استعمال کی ہے، غیر ملک میں مقدمے لڑنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ پانی کی طرح پیسہ بہایا ہے اور یہ بھی شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا کہ وہاں بھی دولت کا سکہ انصاف خریدنے کے لیے چلتا ہے۔''
''آپ کو رشوت دینا پڑی کسی کو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''کوئی آدمی تھا جس نے مجھ سے رابطہ کیا کہ وہ میرے بیٹے کے لیے سزا کم سے کم کروا سکتا ہے اگر میں اسے اتنی رقم بطور کمیشن دوں تو۔'' چاچو نے بتایا۔
''رشوت ہی ہوئی ناں چاچو، یقیناً اس میں سے بڑا حصہ جج کو ملا ہوگا جس نے سزا میں نرمی کی ہے۔''
''تم اسے رشوت کہہ لو، جانتا ہوں کہ اس ملک میں رہتے ہوئے بھی ہم کاروباری آدمی، کمیشن کے نام پر

جانے کس، کس کو اور کن طریقوں سے رشوت دیتے ہیں، یہاں اسے جائز سمجھ لیا گیا ہے اور اس کے بغیر کام نہیں ہوتا، کوئی فائل حرکت نہیں کرتی۔“

”جائز سمجھ لیے جانے یا کمیشن کہہ دینے سے تو رشوت کا نام نہیں بدل جاتا چاچو۔“

”مگر جب جان کے لالے پڑے ہوں بیٹا تو مردار کو بھی جائز قرار دے دیا جاتا ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”تم تو خود ایک ماں ہو، میں باپ ہو کر بھی یہ بات نہ سن سکا کہ میرا بیٹا سزائے موت کا مستحق ٹھہرایا گیا تھا۔ اولاد کی ذرا سی تکلیف انسان کو تڑپا دیتی ہے، کجا یہ کہ اسے یوں دور دیس میں پھانسی پر لٹکا دیا جاتا، اس جرم کی سزا میں جو کہ اس نے کیا بھی نہیں، انجانے میں سازش کا شکار ہو کر شریکِ جرم ہوا اور اسے شریکِ جرم کرنے والے منظر سے غائب ہیں۔“

”سزا تو پھر انہیں ہونی چاہیے ناں چاچو۔“ میں ان کی بات سن کر لرز گئی۔ ایک لمحے کو بھی نہ سوچ سکی کہ جو یوسف کی جگہ حبیب ہوتا تو میرا ردِعمل کیا ہوتا۔ وہ تو کبھی پیٹ میں درد سے بلکتا تو، تو میرے دل پر آرے چلنے لگتے تھے، اس کی تکلیف مجھے اپنی تکلیف سے زیادہ تڑپاتی تھی۔ اللہ نہ کرے کہ مجھے ایسا تصور بھی کرنا پڑے۔ میں چاچو کی بے بسی کی کیفیت کو سمجھ رہی تھی، ان کی مجبوری کو بھی جانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ اپنی اولاد کو بچانے کی خاطر ماں، باپ ہر حیلہ اور حربہ آزماتے ہیں، اپنی جان پر بھی کھیل جاتے ہیں یہ تو پھر ایمان کا معاملہ تھا۔

”جو لوگ ایسے کاموں میں ملوث ہیں، انہیں تو بڑوں، بڑوں کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے بیٹا، میں نے اپنی سی پوری کاوش کی ہے مگر وہ فراڈیا زمان ابھی تک مفرور ہے مگر اللہ کا نظام ایسا ہے کہ وہ اپنے کیے کی سزا اس دنیا میں بھی پائے گا اور آخرت میں بھی۔“

”یوسف کی سزا میں اس سے زیادہ نرمی نہیں ہوسکتی تھی چاچو؟“ میں نے سوال کیا۔ ”یہ تو آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی بات ہوئی ناں۔“

”ابھی تو اس کو بھی غنیمت سمجھ رہا ہوں بیٹا، آگے جو اللہ کو منظور ہوگا، کم از کم وہ پھانسی سے بچ گیا ہے، میں اپنی کوشش کرتا رہوں گا اور پھر جب ممکن ہوا اسے جا کر مل تو آیا کروں گا ناں۔“ وہ سسکے۔ ”اسے اس حال میں دیکھنا بھی میرے لیے کوئی چھوٹی آزمائش نہیں ہے، اسے بہت مارا گیا تھا اس بات کا اقبال کروانے کے لیے کہ وہ اس سے پہلے بھی اسمگلنگ میں ملوث رہا ہے اور یہ کہ وہ خود بھی نشہ کرتا ہے اور عادی مجرم ہے۔“

”کیا...... کیا وہ خود نشہ کرتا ہے؟“ مجھے یہ سن کر دکھ ہوا کیونکہ اس سے پہلے زین کے بارے میں نہ صرف میں خود جانتی تھی بلکہ چاچو کو بھی بتا چکی تھی۔

”جان بوجھ کر نہیں مگر انجانے میں......“ انہوں نے انکشاف کیا۔ ”اس کے خون کے نمونوں سے ظاہر ہوا کہ وہ نشہ آور ادویات کا استعمال کرتا رہا ہے...... میرا خیال ہے کہ اسے اور اس جیسے باقی نوجوانوں کو کسی نہ کسی طرح یہ دوا دی جاتی ہے اور اپنے اندھے اعتقاد کے باعث وہ اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ اس حادثے نے بھی اس کی آنکھیں نہیں کھولیں، وہ سب اب بھی شیخ زمان کو بے قصور اور ایماندار سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے خلاف کسی نے سازش کی ہے۔“

”اوہ، تو ان کی اچھی طرح برین واشنگ کی گئی ہے۔“

”ہاں بیٹا...... وہ اسے کسی ولی تو کیا نعوذ باللہ کسی پیغمبر کی طرح نیک سمجھتے ہیں۔“

”اس کے ساتھ کے باقی لڑکوں کا کیا ہوا؟“

”سب کے والدین ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، جس کی جتنی سکت ہے، بدقسمتی سے ایک تو اس کارروائی کے

دوران پولیس کی گولی کا شکار ہو گیا، گولی اس کی ٹانگ پر لگی مگر اسپتال پہنچنے تک اس کا سارا خون بہہ گیا اور وہ راستے میں ہی دم توڑ گیا۔“

”اوہو...... کل کتنے لڑکے تھے چاچو؟“

”کل پندرہ کا گروپ تھا، چار نے جیل میں ہی مل کر خودکشی کی کوشش کی، کسی ایک کے پاس کسی طرح ایک بلیڈ رہ گیا تھا، اس سے چاروں نے رات گئے اپنی کلائی کی نسیں کاٹ لیں، ان کو بھی جب تک اسپتال پہنچایا جاتا اس میں سے تین موت سے ہمکنار ہو چکے تھے، چوتھے کی جان تو بچالی گئی مگر اس کا ایک ہاتھ جسم سے جدا کرنا پڑا کیونکہ اس کی پوری نسیں اور رگیں کٹ چکی تھیں۔“

”ہاہ۔“ میری سانس رک گئی۔ ”یہ تو بہت برا ہوا۔“ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ”انہوں نے اپنے والدین کا بھی نہیں سوچا۔“

”مایوسی کی انتہا پر پہنچ کر انسان ہر روز سسک، سسک کر جینے کے بجائے شاید مرنے کو ہی ترجیح دیتا ہے...... انہیں کوئی امید نہیں ہوگی کہ کوئی انہیں بچا سکتا ہے، موت کا انتظار کرنے کے بجائے انہوں نے اسے فوری گلے لگانے کو ترجیح دی۔“

”جانے ان کا راہنما کس نوعیت کا پیر ہے کہ انہیں امید تک کا سبق نہیں سکھا سکا اور یہ نہیں بتا سکا کہ زندگی اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے......“

”اس کا بس چلے تو ان سب کو ختم کروا دیتا کہیں، اس سے پہلے کہ اس کا نام کسی طرح منظرِ عام پر آئے مگر میں اسے بے نقاب کیے بغیر نہیں رہوں گا۔“ چاچو نے عزم سے کہا۔

”میری درخواست ہے چاچو کہ آپ صرف یوسف کی فکر کریں، اپنی کوششیں اس کے لیے صرف کریں، اپنے

لیے ایسا محاذ نہ کھولیں......اس جیسے مجرموں کے ہاتھ بہت لمبے ہوں گے۔''

''ہوں۔'' چاچو نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

''اس کی سزا کتنے عرصے کی ہے چاچو؟''

''چودہ سال بیٹا۔'' میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ اس قدر پیسہ بہانے کے بعد بھی اس کی سزا مہینوں کے بجائے اتنے سال کی ہوگی۔

''اللہ رحم کرے......'' میں نے دل سے کہا۔

''چاچو...... میں نے اموجان کو بتا دیا ہے کہ میرے اور زین کے بیچ اب کوئی تعلق نہیں ہے......آپ بھی ماما کو بتا دیں، وہ میری عدم موجودگی میں یہاں آئی تھیں اور ساجدہ سے یونہی الٹے سیدھے سوالات پوچھتی رہیں، انہیں بتا دیں کہ اب انہیں میرے بارے میں کسی طرح کچھ بھی جاننے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔''

''میں عائشہ بھابی کا سامنا کس طرح کروں گا؟'' وہ بے بسی سے بولے۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں، کوئی آپ سے پوچھ گچھ نہیں کرے گا۔''

''آپ نے پنکی کے بارے میں کہا تھا ناں چاچو، میں اسے رکھنے کو تیار ہوں۔''

''سچ بیٹا...... میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔''

''میں آپ کی بیٹی ہوں چاچو اور آپ کی خواہش مقدم ہے میرے لیے۔''

''تم نے یقیناً عائشہ بھابی سے مشورہ کیا ہوگا، مجھے ان سے اسی بات کی امید تھی۔''

''ہرگز نہیں چاچو، ان سے کہتی تو شاید یہ فیصلہ نہ ہوتا، وہ ماما کی طرف سے بہت بدگمان ہیں۔''

''ہونا بھی چاہیے......''

''میں اب زیبا چچی کو ماما نہ کہوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟'' میں نے ان سے سوال کیا، انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''کبیر کی بیٹی کیسی ہے؟''

''بہت پیاری ہے چاچو، صحت بھی اچھی ہے، ہاجرہ بانو۔''

''ہاجرہ بانو؟'' چاچو نے میرا چہرہ دیکھا، جس پر مسکراہٹ کا راج تھا...... ''تمہاری ماں کا نام۔''

☆☆☆

''اتنی مصروف تو شاید برطانیہ کی ملکہ بھی نہیں ہے جتنی تم ہوگئی ہو۔'' کافی شاپ میں کافی آرڈر کرنے کے بعد اس نے کہا۔

''اچھا...... ملکۂ برطانیہ کو ایسی کیا مصروفیت ہونے لگی میرے جیسی؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''سچ کہتی ہو پیاری۔'' وہ ہنسی، اس کی ہنسی میں انوکھی کھنک تھی، میں سمجھی تھی وہ اپنے ساتھ ہونے والے حادثے سے اپ سیٹ ہوگی اور مجھے کوشش کرکے اسے مسکرانے پر مجبور کرنا ہوگا، اسے سمجھانا ہوگا کہ زندگی میں جو کچھ ہمارے نصیب کا نہیں ہوتا اسے ہم اپنے ساتھ باندھ کر نہیں رکھ سکتے...... ''وہ تو ہر روز سویرے، سویرے ایک بھاری بھرکم شاہانہ لباس پہن کر، سر پر تاج سجا کر بیٹھ کر سارا دن مکھیاں مارتی ہوں گی۔'' سارہ نے ملکۂ برطانیہ کا جو نقشہ کھینچا تھا اس پر ہم دونوں ہی زور سے ہنسیں، لوگ مڑ، مڑ کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔

''تم سناؤ، بہت خوش لگ رہی ہو؟'' میں نے اس کی مسکراہٹ کو کھوجا۔

''خوش رہنا سیکھ لیا ہے میں نے میری جان۔''

''تم کہہ رہی ہو تو ایسا ہی ہوگا مگر مجھے تو لگتا ہے کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔''

''کچھ بھی نہیں ہے جس کی پردہ داری ہے، تم سے چھپانا ہوتا تو تین دن سے میرے پیٹ میں مروڑ نہ اٹھ رہے ہوتے۔''

''چلو پھر بتاؤ کہ کیا مشورہ کرنا تھا؟''

''تم بتاؤ......اپنی نئی بھتیجی کے بارے میں، تمنا اور فاطمہ کے بارے میں، چاچو آگئے ہیں واپس، کیا بنا یوسف کا؟''

''میری بھتیجی، ہاجرہ بانو......'' میں نے مختصراً اس کے سارے سوالوں کے جوابات دیے، جانتی تھی کہ اس کی پٹاری میں میرے لیے کچھ ایسا ہے کہ اسے وہ میرے تجسس کے غبارے میں پوری ہوا بھر کے پھاڑنا چاہتی ہے۔ ''تمہیں میں نے بھی کچھ بتانا تھا۔''

''کیا؟'' اس نے میرے قریب ہوکر پوچھا۔

''تم جانتی ہو ناں کہ جس فلیٹ میں، میں رہ رہی ہوں، چاچو نے وہ میرے نام پر خریدا ہے اور اس میں، میں اور حبیب رہ رہے ہیں، زین وہاں منتقل نہیں ہوا......''

''جانتی ہوں......'' اس کے کہنے میں بھی استفسار تھا۔

''اور ہوگا بھی نہیں۔'' اپنی دانست میں، میں نے دھماکا کیا تھا مگر وہ مسکرا اٹھی۔ ''تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟''

''اب حیرت نہیں ہوتی، زندگی میں اتنا کچھ ہوچکا ہے اور جو کچھ مجھ پر بیتا ہے اس سے میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کے نقصان کے بطن سے کوئی فائدہ جنم لینے والا ہوتا ہے۔''

''تم پوچھو گی نہیں کہ زین میرے ساتھ کیوں نہیں رہے گا؟'' میں نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

''اگرچہ مجھے جواب کا کچھ، کچھ اندازہ ہے مگر تم کہتی ہو تو پوچھ لیتی ہوں۔'' اس نے تجاہلِ عارفانہ سے کہا۔ ''چلو تم بتاؤ...... میں تم سے بتانے کا حق نہیں چھیننا چاہتی۔''

''کیا اندازہ ہے تمہیں؟'' میں نے چیلنج کے انداز میں کہا۔ ''دیکھ لیتے ہیں تمہارے دعوے کو بھی۔''

''تم اس سے خلع لے رہی ہو...... یا لے چکی ہو۔'' اس نے دونوں ابرو اٹھا کر بات کہی اور اس کی تائید چاہنے کے انداز میں میری طرف دیکھنے لگی۔

''ہوں......'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟'' لحوں میں، میں نے سوچ لیا کہ جو کچھ وہ سمجھ رہی ہے اسے سمجھنے دوں، اپنا مان رہ جائے گا۔

''چاچو نے تمہاری سائڈ لی ہوگی یقیناً......اور یہ پہلا کام ہے جو تم نے مجھ سے مشورہ کیے بغیر کیا اتنے عرصے میں، مگر مجھے خوشی ہے کہ بہت اچھا کیا۔''

''ہاں...... چاچو کو سمجھ میں آگیا تھا کہ ہم دونوں کے بیچ حالات بہتری کے قابل نہیں رہے تو انہوں نے......''

''چلو، خس کم جہاں پاک۔'' اس نے میرا کندھا تھپکا۔ ''جس طرح میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، کسی بہتری کے لیے ہی ہوا ہے، اسی طرح مجھے یقین ہے کہ تمہارے لیے بھی اس کے بعد بہت بہتری ہوگی۔ دکھ تو بہت ہو رہا ہے کہ میری اتنی پیاری دوست کے ساتھ اتنا برا ہوا، اتنا کچھ برداشت کرنے کے بعد بھی۔''

''تمہیں کیسے اندازہ ہوا اس کا؟''

''تمہارے چہرے پر سکون دیکھ کر، جب سے تم اپنے فلیٹ میں گئی ہو، تمہارے ساتھ فون پر بھی بات ہوتی ہے تو مجھے لگتا ہے کہ تم مطمئن ہو اور آج دیکھ کر بھی یقین آگیا ہے کہ تم اپنے اس فیصلے پر خوش ہو۔''

''خوشی تو مجھے آج تمہارے روم، روم سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے......؟'' میں نے استفسار کیا۔

"ہاں امرت...... خوشی میرے دروازے پر دستک دے رہی ہے، تم سے یہی مشورہ کرنا تھا کہ کیا میں دروازے کھول دوں؟" اس نے مسکرا کر کہا۔ "تمہیں علم ہے کہ میرے پاس تمہارے علاوہ اور کوئی ہے ہی نہیں جس سے مشورہ کروں۔"

"اب کون ہے جو دستک دے رہا ہے؟" مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی بے وقوف ہوسکتی ہے کہ تیسری بار شادی کا جوا کھیلنے کو تیار بیٹھی تھی۔ "اور تم اتنی جلدی سب کچھ بھول گئیں سارہ، ابھی تو پہلا زخم ہرا ہے۔"

"میرا پہلا شوہر امرت...... میری بیٹیوں کا باپ۔" اس نے انکشاف کیا۔

"اب حالات میں کیا تبدیلی آگئی ہے جو وہ......" میں نے غصے سے بات بھی پوری نہ کی، وہ بے وقوف بنی چلی تھی اور مجھ سے حمایت کی توقع کررہی تھی۔

"اب میں اس کے لیے حلال ہوگئی ہوں، اسے بھی وقت نے وہ سبق سکھائے ہیں جو دنیا کی کسی کتاب میں درج نہیں ہیں۔"

"اب وہ تمہیں اپنے گھر میں آباد کرے گا جسے اس نے بیٹیاں پیدا کرنے کے جرم میں اپنی زندگی سے نکال دیا تھا اور اب اسے نکالے گا جو اسے کوئی زندہ اولاد نہ دے سکی تھی؟" میرا لہجہ تلخ ہوگیا۔

"نہیں، نہ وہ اس کے گھر سے نکلے گی نہ اس کی زندگی سے......" اس نے رسان سے کہا۔ "یہ میری شرط ہے میں کسی کی خوشیوں کی لحد پر اپنی خوشیوں کا مینار نہیں تعمیر کرنا چاہتی...... وہ ہم دونوں کو علیحدہ، علیحدہ گھروں میں رکھ سکتا ہے اور میرے لیے صرف یہ بات اہم ہے امرت کہ میری بیٹیوں کو اپنا باپ مل جائے گا، عمر کے جس حصے میں وہ ہیں اس حصے میں میرے لیے ان کے بارے میں فکریں بہت زیادہ ہیں، میں ان کی زندگی میں آنے والی اس خوشی کو ان سے نہیں چھین سکتی کہ انہیں ان کا باپ مل جائے۔"

"ہوں۔" میں نے گہری سانس لی۔ "چلو اچھا ہے اگر اس کو عقل آگئی ہے تو......"

"تو تمہارا خیال ہے کہ یہ ٹھیک ہے؟"

"میرے خیال کی کوئی اہمیت ہے؟"

"کیوں نہیں...... میں نے ان سے سوچنے اور مشورہ کرنے کا وقت لیا ہے۔"

"اگر میں کہوں کہ میں اس کے حق میں نہیں ہوں تو؟" میں نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

"تو میں انکار کردوں گی امرت۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

"ارے نہیں سارہ، میری جان، میں مذاق کررہی ہوں، اگر تمہارا دل مطمئن ہے اور دماغ کہتا ہے کہ اس پر اعتبار کرلو تو کرلو۔"

"کرلوں؟" اس نے آنکھیں میچ کر پوچھا۔

"بالکل کرلو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "جتنا جلد ہو کرلو اور اپنی زندگی میں خوشیوں کو آنے دو، میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں، بچیوں کو بھی خوشی ہوگی اور تمہارے لیے اللہ بہت بہتر کرے۔"

"اللہ تمہارے لیے بھی بہت بہتر کرے امرت، تمہاری زندگی میں بھی کوئی ایسا آجائے کہ تمہارے سارے غم اپنی انگلیوں سے سمیٹ لے، تمہیں ایسی خوشی دے جس سے تم اب تک محروم رہی ہو۔" وہ آنکھیں بند کیے جذبے سے مجھے دعائیں دے رہی تھی اور میری کھلی آنکھوں کے سامنے کوئی چھم سے تصور بن کر اترا تھا مگر میں تو اسے سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

(جاری ہے)



تم وفا ہو

عائشہ خان

"اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی یہ دنیا کس قدر خوب صورت ہے ناں وفا آپا......؟" اسد نے ٹوکری میں سے موٹی سی سرخ اسٹرابیری اٹھا کر منہ میں ڈالی تھی۔

"ہاں مگر اسی قدر ناپائدار بھی...... ہر منظر ختم ہوجانے والا...... ہر چیز بدل جانے والی......" وفا کے لہجے میں عجیب سی یاسیت تھی۔

"اور انسان بھی کیسا نادان ہے پھر بھی ان سے دل لگاتا ہے۔"

''کیا بات ہے آج آپ کچھ اداس ہیں...... خیریت......؟''

''اداس......!نہیں تو......''

وفا نے آخری اسٹرابیری دھو کر ٹوکری میں رکھی اور ٹوکری کے نیچے پلیٹ رکھتے ہوئے اسے ایک طرف رکھ دیا۔

''کہیں آپ فہد بھائی کے نہ آنے پر تو اداس نہیں ہیں۔''

''میرا فہد سے کیا تعلق......؟''

''کیوں تعلق نہیں...... ہمارے اکیو اِک تایا ابا کے اکیو اِک لائق فائق پتر ہیں فہد بھائی...... خاندان کی شان ہیں وہ...... آپ کو پتا ہے، رات تایا ابا کی حویلی میں بہت بڑی دعوت تھی۔ فہد بھائی کے افسر دوست آئے ہوئے تھے تو تایا ابا نے بھی اپنے یار بیلیوں کو بلا لیا تھا۔ اس لیے فہد بھائی مصروف ہوں گے۔ دیکھنا صبح سب سے پہلے ابا سے ملنے آئیں گے۔ تایا ابا ہوتے رہیں ناراض، ابا سے ملنا نہیں چھوڑتے فہد بھائی...... بہت محبت کرتے ہیں ابا سے ہاں......''

''محبت......'' وہ چونکی۔

محبت تو وہ اس سے بھی کرتا تھا۔ اسے وہ لمحہ پوری جزئیات کے ساتھ آج بھی یاد تھا جب اسے پہلی مرتبہ اس محبت کا ادراک ہوا تھا۔

تایا، ابا سے ابا کی ناراضی کے بعد وہ پہلی مرتبہ شہر سے گاؤں آیا تھا۔ اور تایا ابا کی ناراضی کی پروا کیے بنا ابا سے ملنے چلا آیا تھا۔

''کیسی ہو وفا......؟''

''میں بالکل ٹھیک ٹھاک......'' چائے کی ٹرے ابا کے اور اس کے درمیان رکھتے ہوئے اس نے کہا تھا اور کمرے سے نکل آئی تھی۔

''تم وفا ہو یہ یاد رکھنا۔'' کچھ دیر بعد جاتے سمے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے اس نے گھمبیر لہجے اور بوجھل آواز میں کہا تھا۔

اس نے بہ مشکل پلکیں اٹھائی تھیں...... سیاہ گھنی پلکیں جن پر کسی نے منوں بوجھ دھر دیا تھا۔

وہ اسے کیا باور کروا رہا تھا...... اس سے کیا چاہ رہا تھا...... ان دونوں کے درمیان کبھی کوئی اظہار ہوا تھا نہ اقرار...... نہ کوئی وعدہ تھا نہ دعویٰ...... لیکن اس چھوٹے سے جملے نے جیسے یہ چاروں کام ایک ساتھ کیے تھے...... ایک لمحے سے بھی کم وقفے میں اس نے نگاہیں جھکا لی تھیں۔

لیکن اس کے اظہار پر اقرار کی مہر ثبت کر دی تھی۔ محبت اس لمحے وحی کی طرح اس کے دل پر نازل ہوئی تھی۔

''کیا سوچنے لگیں آپا......؟''

اس کے کھوئے، کھوئے انداز پر اسد نے حیرانی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں......'' وفا نے دھیرے سے کہا اور دھلے ہوئے برتن اٹھا، اٹھا کر خواہ مخواہ دوبارہ دھونے لگی پھر یہ نہ کہہ سکی کہ محبت تو ابا بھی بہت کرتے تھے فہد سے...... لیکن انہوں نے پھر بھی کہہ دیا تھا۔

''فہد پتر...... برا مت ماننا...... اور نہ ہی یہ سمجھنا کہ تیرے چاچے کی محبت میں کمی آ گئی ہے...... چاچے کو اب بھی تجھ سے بڑا پیار ہے پتر لیکن مجبور ہوں اس لیے منع کر رہا ہوں کہ دوبارہ اس دہلیز پر مت آنا۔'' دروازے کی چوکھٹ کے درمیان کھڑے ابا نے کہا تھا اور سائڈ سے نظر آتے اس کے چہرے کو وفا نے دھواں، دھواں ہوتے دیکھا تھا اور اس کا اپنا چہرہ بھی تو اس وقت دھوئیں کے ایسے ہی بادلوں کی لپیٹ میں تھا۔ راستے جو پہلے ہی تاریک تھے کچھ اور تاریک ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

''لیکن چاچا.. اس مجبوری کا پتا تو چلے جس نے آپ کو گھر آئے مہمان کو اندر داخل ہونے سے روکنے پر مجبور کر دیا۔''

''کچھ باتیں دل میں رہیں تو بہتر ہوتا ہے پتر...... لبوں پر آ جائیں تو سر کو جھکا دیتی ہیں۔''

''یہ سر کبھی نہیں جھکے گا چاچا...... یہ فہد کا آپ سے وعدہ ہے...... چلتا ہوں لیکن دوبارہ آؤں گا، اس وقت جب آپ کی ہر مجبوری دور کر دوں گا۔'' سنجیدگی سے

کہتا، ان کے ہاتھ پر بوسہ دیتا وہ واپس پلٹ گیا تھا۔

ملک سیف اللہ بوجھل ہوتے دل کے ساتھ اس وقت تک اسے دیکھتے رہے تھے جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گیا تھا۔ تھکے، تھکے سے انداز میں جب وہ واپس پلٹے تو سر جھکائے چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی وفا اندر جا رہی تھی۔

ان کا دل کچھ اور بوجھل ہوا تھا...... تھکن کچھ اور بڑھی تھی...... لیکن کچھ بھی تو اُن کے بس میں نہیں تھا۔

☆☆☆

بات تو معمولی سی تھی لیکن جانے کیسے اتنی بڑی بن گئی کہ خون کے رشتوں کو جدا کر گئی۔

ہوا صرف یہ تھا کہ تایا ابا نے ابا سے کہا تھا کہ وہ اپنی سالی کو منع کریں کہ وہ برادری سے باہر بیٹے کا رشتہ طے نہ کرے...... ابا نے رسان سے کہا کہ رشتہ تو تقریباً طے ہو ہی چکا ہے۔

''پر تم منع کر سکتے ہو سالی ہے تمہاری سلمیٰ......''

''بھاء جی میں کیسے منع کر سکتا ہوں...... لڑکے کی مرضی ہے وہاں...... بہن، بھائی، ماں، باپ سب راضی ہیں۔''

''تو تم منع نہیں کرو گے؟''

''بھاء جی آپ......''

''ہاں یا نہ......''

''سمجھنے کی کوشش کریں بھاء جی......''

''اب تم مجھے سمجھاؤ گے......'' انہوں نے تیز نظروں سے انہیں گھورا۔

''ایسی بات نہیں ہے بھاء جی......''

''بات جو بھی ہے میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں...... اب تم بھی میری بات اچھی طرح سمجھ لو...... یا تو سالی کو منع کرو وہاں رشتہ کرنے سے...... یا پھر اس سے تعلق ختم کر لو اور یہ بھی نہیں کر سکتے تو مجھ سے تو تعلق ختم کر ہی سکتے ہو...... اس میں تو کوئی مشکل نہیں ہے ناں......'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

ملک سیف اللہ نے حیرانی سے بڑے بھائی کو دیکھا، روکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ نہیں رکے تھے۔

اور بس اسی بات کو انہوں نے انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ انا انہیں خون کے رشتوں سے پیاری ہو گئی تھی' اتنی پیاری کہ چار سال گزر گئے تھے ان کا دل چھوٹے بھائی سے ملنے کے لیے نہیں تڑپا تھا جسے وہ بھائی نہیں بیٹا کہتے تھے۔

☆☆☆

''اللہ تعالیٰ نے قطع رحمی کو کس قدر ناپسند فرمایا ہے کیا یہ بات بھاء جی نہیں جانتے ہوں گے ملک جی......''

''ہاہ......'' ملک سیف اللہ نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

''انسان جو جانتا ہے اس کو مانتا بھی تو دنیا جنت نہ بن جاتی۔''

''بھاء جی تو ہمیشہ سے پتھر دل ہیں...... آپ کیوں اس بات کو اتنا دل پر لے رہے ہیں۔'' شوہر کے چہرے سے ہویدا اندرونی شکست و ریخت کو سمجھتے ہوئے صالحہ نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

رموزِ کاروبار

اتفاق سے قبروں کے کتبے تیار کرنے والا یہ شخص ایک ڈاکٹر کے محلے میں رہتا تھا اور وہیں اس کا ورکشاپ تھا۔ ایک دن ڈاکٹر نے ازراہِ تضحیک اس سے کہا۔ ''آپ تو ہمیشہ یہی دعا کرتے رہتے ہوں گے کہ جلدی سے کوئی شخص مرے اور آپ کو لوحِ مزار کا آرڈر ملے۔''

''مجھے دعا کی زحمت کی ضرورت نہیں۔'' کتبے لکھنے والے نے جواب دیا۔'' مجھے جس وقت یہ علم ہو جاتا ہے کہ فلاں شخص آپ کے زیرِ علاج ہے، میں اس کا لوح مزار بنانا شروع کر دیتا ہوں اور مجھے آج تک کبھی مایوسی نہیں ہوئی۔''

کاوش: شاہینہ رفیق، سیالکوٹ

فالتو چربی کہاں جاتی ہے؟

حیرت انگیز معلومات

پوری دنیا پر وزن گھٹانے والی خوراکیں کھانے اور وزن گھٹانے کا بھوت سوار ہے جو کہ ایک مثبت چیز ہے تاہم بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ جب ان کا وزن کم ہوتا ہے تو وہ فالتو چربی کہاں جاتی ہے جس کی وجہ سے آپ کا وزن بڑھا ہوا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اگر آپ نے اپنے وزن میں پانچ کلو کی کمی کی ہے تو یہ پانچ کلوگرام گوشت آخر کہاں گیا؟

دلچسپی کی بات ہے کہ اس جواب کو جاننے کے لیے لگ بھگ ڈیڑھ سو ڈاکٹروں، ماہرینِ غذائیات اور پرسنل ٹرینرز سے سوال کیا گیا تو ان میں سے اکثریت اس کا جواب نہیں جانتی تھی۔

زیادہ تر یہ غلط فہمی تھی کہ چربی توانائی میں بدل جاتی ہے تاہم یہ جواب درست نہیں تھا۔ کچھ کا کہنا تھا کہ یہ چربی پٹھوں میں بدل جاتی ہے اور یہ بھی ناممکن ہے جبکہ دیگر کا ماننا تھا کہ چربی پاخانے کے راستے خارج ہوجاتی ہے اور یہ سب سے مضحکہ خیز جواب تھا۔ ان ڈیڑھ سو افراد میں سے صرف تین نے ہی درست جواب دیا جس کا مطلب ہے کہ صحت سے متعلقہ یہ اٹھانوے فیصد افراد اس کے صحیح جواب سے ناواقف تھے حالانکہ ان کا تعلق صحت کے شعبے سے تھا۔

چنانچہ اگر چربی توانائی بھی نہیں بنتی، پٹھے بھی نہیں اور بول و براز کے راستے بھی خارج نہیں ہوتی تو یہ جاتی کہاں ہے؟

اس کا درست جواب یہ ہے کہ چربی کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ آپ کاربن ڈائی آکسائیڈ کو اپنی سانسوں کے ذریعے خارج کرتے ہیں جبکہ پانی، پیشاب اور پسینے کی صورت میں جسم سے نکل جاتا ہے۔

جب آپ اپنے وزن میں دس پاؤنڈ کی کمی کرتے ہیں یعنی دس پاؤنڈ چربی زائل کرتے ہیں تو اس میں سے 4.8 فیصد کو پھیپھڑے سانس کے ذریعے باہر نکالتے ہیں جبکہ باقی 1.6 چربی پانی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم جتنا بھی وزن گھٹاتے ہیں وہ زیادہ تر سانس کے ذریعے گھٹاتے ہیں۔

ہمارے اس جواب پر زیادہ تر لوگوں کو حیرانی ہوئی لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہم جو کچھ بھی کھاتے ہیں وہ پھیپھڑوں کے ذریعے ہی ہمارے جسم سے خارج ہوتا ہے، ہم جو بھی کاربوہائیڈریٹ کھاتے ہیں اور جو بھی چکنائی ہضم کرتے ہیں وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی میں تبدیل ہوکر ہمارے جسم سے خارج ہوجاتی ہے۔

پروٹین کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے ماسوائے یہ کہ اس کا تھوڑا سا حصہ یوریا اور دیگر ٹھوس اشیاء میں بدل جاتا ہے اور ہمارے پیشاب کے راستے خارج ہوجاتا ہے۔

انتخاب: فضہ بتول، بہارہ کہو

''پتا نہیں کیوں مجھے پوری امید تھی کہ اس خوشی کے موقع پر اور پھر ملک فیض کے سمجھانے پر بھاء جی ساری رنجشیں بھلا دیں گے مگر......'' انہوں نے بے حد مایوسی اور آزردگی سے کہا تھا۔ چائے کی ٹرے تھامے کمرے کی جانب بڑھتی وفا کو باپ کے اس لہجے نے شدید دھچکا پہنچایا تھا۔

چار سال سے بڑے بھائی کو منانے کی ہر کوشش میں ناکام ہونے کے باوجود وہ اسے ہمیشہ امید اور آس کا دامن تھامے نظر آئے تھے پھر اب ایسا کیا ہوا تھا جس نے انہیں اس قدر مایوس کردیا تھا...... کسی انہونی کے احساس نے وفا کے دل و دماغ کو یوں اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا کہ اسے اپنے اعصاب چٹختے محسوس ہوئے تھے۔

''ملک فیض کا تو بڑا لحاظ کرتے ہیں بھاء جی...... ان کے سمجھانے پر انہیں کیا جواب دیا انہوں نے؟''

''جواب؟'' ملک سیف اللہ ہنسے تھے۔ ٹوٹے کانچ جیسی ہنسی...... ''انہوں نے کہا میں نہیں جانتا سیف اللہ کون ہے...... میرا بھائی تو چار سال پہلے مرگیا تھا، اس لیے آپ میرے بھائی کی بات نہ کریں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔''

''اتنی بڑی بات......؟'' بے اختیار صالحہ کے منہ سے نکلا۔

''آگے بھی سن لو کیا کہا تھا انہوں نے......'' کہتے ہوئے ملک سیف اللہ نے لب بھینچے تھے۔

صالحہ نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

''ملک فیض جی...... سیف اللہ کو میرا پیغام پہنچا دیں کہ میرے بیٹے کی امید میں نہ بٹھائے رکھے اپنی بیٹی کو...... برادری میں آخری لڑکی بھی ہوئی سیف اللہ کی بیٹی تو بھی میں اس کے ساتھ اپنے بیٹے کی شادی نہیں کروں گا۔''

تو یہ تھی وہ بات جس نے ابا کو فہد کو دہلیز پر ہی روکنے پر مجبور کردیا تھا۔

نچلا لب دانتوں تلے دباتی لرزتے ہاتھوں کی گرفت کو ٹرے پر مضبوط کرتی وہ واپس پلٹی اور ٹرے

چارپائی پر بیٹھے اسد کو لا تھمائی۔

''اسد میں دودھ ابال رہی ہوں، تم یہ چائے تو اماں، ابا کو دے آؤ۔'' اسد نے خاموشی سے ٹرے تھام لی اور وہ بہنے کے لیے تیار آنکھوں کو اس سے چھپاتی تیزی سے کچن میں چلی آئی تھی۔

☆☆☆

''میں نے تم سے وفا نبھانے کا وعدہ لیا تھا ناں......'' سرخ آنکھوں سے اسے گھورتا وہ کہہ رہا تھا۔

''ہاں لیا تھا...... لیکن جو رشتے پہلے ہیں ان سے وفا بھی پہلے نبھائی جائے گی...... جو بیٹی والدین سے وفا نہ نبھا سکے وہ کسی اور رشتے سے کیا وفا نبھائے گی۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''تایا ابا غیر لوگوں سے ابا کو پیغام بھجوا رہے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنی بیٹی کو ان کے بیٹے کے انتظار میں بٹھا رکھا ہے تو یہ خیال دل سے نکال دیں، ان کی بیٹی اگر برادری کی آخری لڑکی بھی ہوئی ناں تو وہ اس سے اپنے بیٹے کو ہرگز نہیں بیاہیں گے...... ایسے میں ایک باپ کیا کرے...... کیا بیٹی کو بٹھائے رکھے؟''

وفا نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا۔

''یہ ابا نے کہا ہے......؟'' فہد کو جیسے یقین نہ آیا۔

''انہوں نے صرف کہا نہیں باقاعدہ پیغام بھجوایا ہے۔'' وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر بنا کچھ کہے ایک جھٹکے سے واپس مڑ گیا۔

☆☆☆

''ابا......! چاچا، وفا کی شادی طے کررہے ہیں۔''

''تو یہ تو اچھی بات ہے...... دیر سے ہی سہی پر اسے خیال تو آیا......'' انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''ابا...... اگر وفا کی شادی ہوگئی تو آپ پھر میرا مرا ہوا ہی منہ دیکھیں گے۔''

''تم مجھے دھمکا رہے ہو......؟''

''نہیں...... میں آپ کو حقیقت بتا رہا ہوں......''

''اور وہ جو بڑی، بڑی باتیں کرتے تھے خودکشی

اسلام میں حرام ہے۔ خودکشی بزدل کرتے ہیں اور پتانہیں کیا، کیا......'' انہوں نے اس کی ایک اسپیچ کا حوالہ دیا تھا۔

''میں خودکشی کی نہیں، ملک سے باہر جانے کی بات کر رہا ہوں جہاں سے مر کر ہی واپس آؤں گا......مر تو خیر آپ لوگوں سے جدا ہوتے ہی جاؤں گا......لیکن آپ کو اس سے کیا......آپ مزے سے جی لیں گے جیسے چاچا کے بغیر جی رہے ہیں...لیکن ابا ان چار سالوں میں آپ اپنی انا کے حصار سے نکل کر ایک بار بھی چاچا کو دیکھ لیتے ناں......تو کبھی یوں نہ رہ پاتے۔''

''کیوں......کیا ہوا ہے سیف اللہ کو......؟'' بلا ارادہ ان کے منہ سے نکلا تھا۔

انا اور ضد میں دل میں دبائی ہوئی بھائی کی محبت نے بے اختیار سر ابھارا تھا۔

''آپ نے دیکھا نہیں، آپ سے ناراضی کے بعد سے کس قدر سنجیدہ بلکہ رنجیدہ رہنے لگے ہیں وہ......کمزور بھی بے حد ہو گئے ہیں، آپ کو پتا ہے اسد کیا کہہ رہا تھا۔'' وہ ایک لمحے کو چپ ہوا۔

انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''وہ بتا رہا تھا کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جب ابا، تایا، ابا کو یاد نہ کرتے ہوں اور کوئی شام ایسی نہیں ہوتی جب کھانا کھاتے ہوئے ان کی آنکھیں بھیگ نہ جاتی ہوں۔ آپ کو یاد ہے ناں آپ اور چاچا رات کا کھانا ہمیشہ اکٹھے کھایا کرتے تھے۔''

وہ گمبھیر لہجے میں کہہ رہا تھا اور وہ گم صم سے اس کی جانب دیکھتے جیسے کسی گہری سوچ میں تھے۔

''چلیں یہ ساری باتیں چھوڑ دیں ابا......صرف اللہ کا فرمان دیکھیں......صبح قاری صاحب بیان میں بتا رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ سورۂ رعد میں فرماتا ہے۔ ''جو توڑتے ہیں ان رشتوں کو جن کو ملانے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد مچاتے ہیں ان پر اللہ کی لعنت ہے اور ان کے لیے برا گھر ہے۔'' اور اس پر انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان بھی سنایا ہے کہ ''رشتہ توڑنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔''

''ابا ذرا سوچیں تو، یہ ساری باتیں ہم سے کیا مطالبہ کرتی ہیں؟'' انہیں خاموشی سے خود پہ نگاہیں جمائے دیکھ کر وہ تھک کر چپ ہو گیا تھا۔

اور اس کے خاموش ہوتے ہی وہ اٹھے اور اسے گلے لگا لیا تھا۔

''مجھے فخر ہے کہ میرا بیٹا ایک قابل افسر ہونے کے ساتھ، ساتھ ایک اچھا انسان بھی ہے، حق بات کہنے اور منوانے والا......تم تیار ہو جاؤ، میں تمہاری ماں کو بتا دوں کہ مغرب کے فوراً بعد ہم سیف اللہ کی طرف چل رہے ہیں وہ تیاری کر لے، رمضان المبارک کی ابتدا ہم ٹوٹے تعلق کو جوڑ کر کریں گے اور جانتے ہو فہد آج وفا کی پیدائش کا دن بھی ہے...... رمضان المبارک کا چاند نظر آتے ہی اس نے پہلی چیخ ماری تھی۔''

وہ ..... کہہ رہے تھے اور فہد حیرت و مسرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ جیسے چاچا سے ایک دم ناراض ہوئے تھے ویسے ہی راضی بھی ہو گئے تھے۔

''تو میں کیک کا انتظام کروں؟''

''کیک نہیں پتر......مٹھائی بھی......شادی کی تاریخ بھی تو طے کرنی ہے۔'' وہ خوش، خوش کچن کی جانب جا رہے تھے۔

''پہلے میں آپ کی بھتیجی کو سالگرہ کی مبارک باد تو دے لوں۔'' زیرلب کہتے ہوئے اس نے لبوں پر کھلی، کھلی مسکراہٹ لیے میز پر سے موبائل اٹھایا تھا۔

''آج تمہاری سالگرہ ہے
دیکھو ہم کو یاد ہے ناں''

ٹیکسٹ سینڈ کرتے ہوئے اس نے تصور ہی تصور میں اس کے چہرے کے بگڑتے زاویوں کو دیکھا تھا۔ زاویے تو بگڑنے ہی تھے حالات کہاں تھے سالگرہ کو یاد رکھنے یا منانے والے......لیکن وہ بے حد قدرت والا رب جو بے حد مہربان بھی ہے جب چاہے خیالات کو بدل دے، جب چاہے حالات کو بدل دے۔



عورت جاگیر

ایک عام تاثر یہی ہے کہ عورت ایک کمزور اور کم تر ہستی ہے . . . مگر یہی کمزور اور کم تر ہستی صنفِ مخالف پر کس، کس طرح اثر انداز ہوتی اور وقت پڑنے پر چٹان جیسی مضبوطی بھی دکھاتی ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے شروع ہونے والے اس نئے سلسلے عورت کہانی میں ہماری معروف قلم کار فرحین اظفر نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔

جُداگانہ موضوعات لیے کہانیوں کا نیا سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین کی نذر



''یہ اسکول کوئی آج کل کا ادارہ نہیں ہے۔ میں نے ایک دہائی سے زیادہ اپنی محنت، اپنی ذہانت، اپنے دن رات اس اسکول کو دیے ہیں۔ کسی پرانے بندے سے پوچھیں' آج سے پندرہ سال پہلے یہ اسکول کہاں تھا اور آج کہاں کھڑا ہے۔ اس وقت یہاں کیا معیار تھا۔ کیا سسٹم تھا اور آج کیا ہے۔ مجھے ہر شعبے کا تجربہ ہے۔ میں نے اکیڈمک میں بھی کام کیا ہے اور ایڈمن میں بھی...میں ایک عام ٹیچر سے چلی تھی، اس کے بعد میں انچارج بھی

رہی۔ کیشیئر بھی بنی، اکاؤنٹنٹ بھی۔ کوآرڈینیٹر بھی۔ وائس پرنسپل بھی اور اب مجھے چھ سال سے زیادہ ہو چکے ہیں پرنسپل کی سیٹ پہ آئے ہوئے......"

آفس کے مناسب طول وعرض میں ان کا ماتحت اسٹاف معتقدین کی سی کیفیت لیے ہوئے ان کی کئی بار کی سنائی ہوئی کہانی کو ایک بار پھر سن رہا تھا۔ سب کے چہروں پر بے انتہا متاثر ہو جانے والے تاثرات تھے۔ ان کی آواز ایک تمکنت کے ساتھ پورے آفس روم میں گونج رہی تھی۔

"آپ کو شاید جان کر ہنسی آئے مگر اب یہ اسکول مجھے اسکول کم اور اپنی جاگیر زیادہ لگتا ہے۔" کچھ خوشامد پسند ماتحت جلدی سے زبردستی مسکرانے لگے۔ حالانکہ یہ لمحۂ فکریہ تھا۔ کوئی بھی تعلیمی ادارہ چاہے وہ دینی ہو یا دنیاوی، کسی فردِ واحد کی ملکیت تو ہوسکتا ہے لیکن اسے جاگیر سمجھنا کسی بھی صورت خطرے سے خالی نہیں۔

وہ شکرے کی سی تیز نگاہوں سے اپنے اسٹاف سے بات کرتے ہوئے جانچ رہی تھیں۔ صورتِ حال کافی تسلی بخش تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ اپنی جدوجہد اور کامیابی کے سفر کی کہانی میں کچھ غلط یا جھوٹ نہ تھا۔

بلاشبہ انہوں نے اس سیٹ تک پہنچنے کے لیے بہت محنت کی تھی مگر محنت بھی مثبت اور منفی دونوں کاموں میں کی جاتی ہے۔ اور جن شعبہ جات کا ذکر انہوں نے کیا ان میں خدمات بھی انجام دی تھیں۔ اسکول کا پرانا اسٹاف ان کی اس محنت کا گواہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ کچھ اور ایسی چیزوں کے بھی گواہ تھے جن کے بارے میں بات کرتے ہوئے ان کی اپنی ہی جان جاتی تھی یا پھر نوکری۔

ویسے بھی اب مسز درانی، ادارے میں اس سیٹ پر پہنچ چکی تھیں جہاں ان کے ماتحت ان کی مرضی پر چلتے اور افسران کے مشورے کو ہی صائب مانتے تھے۔ لٰہذا ماضی میں اگر کبھی کوئی اونچ نیچ ہو بھی گئی تھی تو اسے بھول جانا ہی بہتر تھا۔

☆☆☆

"دُرِ نایاب اسکول میں اپائنٹ ہونے والی نئی ٹیچر تھی۔ اپنے طریقۂ تدریس اور دوستانہ مزاج کی وجہ سے اسٹوڈنٹس میں جلد ہی مقبول ہوگئی۔ لیکن اس کی بدقسمتی تھی کہ جتنی وہ بچوں کو پسند تھی، آدھے سے زیادہ اسٹاف اتنا ہی اس سے جلتا اور اسے ناپسند کرتا تھا۔

وجہ تھی اس کا نرم لیکن دوٹوک انداز۔ سچ بات کہنے میں اسے ذرا بھی عار محسوس نہ ہوتا تھا۔ پتا نہیں اسے محسوس نہیں ہوتا تھا یا وہ پروا نہیں کرتی تھی کہ اس کی کسی بات سے کسی کو آگ بھی لگ سکتی ہے یا اچھا خاصا ماحول خراب بھی ہوسکتا ہے۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ ہر وقت ہاتھ میں آئینہ لے کے کھڑی رہتی ہو لیکن جب کسی بات میں اس سے رائے مانگی جاتی یا معاملہ براہِ راست اس ہی سے منسلک ہوتا تو پھر وہ لگی لپٹی بغیر بات کرتی۔

اپنی عادت کا اسے بھی بخوبی علم تھا اسی وجہ سے کسی بھی معاملے میں جھوٹ، بے ایمانی یا آنا کانی نہیں کرتی تھی کہ بعد میں اپنے آپ کو کلیئر کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لینا پڑے۔

مسز درانی نے ہی اسے اپائنٹ کیا تھا اور اب اس کے چرچے ان کے چاہنے والوں کے توسط سے بہت جلد ان تک بھی پہنچ گئے تھے۔

"ریلیکس مس ناجیہ......! جوان خون ہے جوش کھا جاتا ہے۔"

ایسے ہی ایک عام سے دن ان کی خاص قریبی ماتحت کوآرڈینیٹر مس ناجیہ ان کے پاس دُرِ نایاب کی شکایت لے کے آئی تھیں۔

بقول ان کے، درنایاب نے ان کو امتحان کے کمرے میں اپنے کسی بھتیجے کی مدد کرتے ہوئے پکڑا تھا اور وہیں سب کے سامنے ٹوک بھی دیا تھا کہ......

"اگر ایسے ہی پیپر دلوانا تھا تو سارے سال کی محنت کا کیا۔ یہ تو آپ محبت کے بجائے دشمنی کر رہی ہیں.... مس ناجیہ پلیز ڈونٹ ڈو دِس ...."

اس نے تو اپنی طرف سے بہت نرمی سے ان کو ان کی

خامی کا احساس دلایا تھا مگر وہ بری طرح چراغ پا ہوگئیں۔

"میں دیکھ رہی ہوں یہ لڑکی جب سے آئی ہے کچھ زیادہ ہی ہوشیار بننے کی کوشش کرتی ہے۔"

مس ناجیہ اس سے کسی انگلش اسکول کی ٹیچر نہیں بلکہ کسی لوکلاس ڈرامے کا کردار زیادہ لگ رہی تھیں۔

"ڈونٹ وری مس ناجیہ...... یہ آج کل کی لڑکیاں بھی ناں، سچائی اور حقوق کی پاسداری کی بہت علمبردار بنی پھرتی ہیں۔ ان کا یہی علاج ہے کہ ان کو اگنور کیا جائے۔"

مسز درانی اپنے عہدے کے لحاظ سے بہت سنبھل کر اور بہت مروت سے بات کر رہی تھیں۔ لیکن انہیں.... مس ناجیہ کے اپنے بھتیجے کی مدد کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"لیکن میم میری انسلٹ ہوئی ہے۔ وہ بچے نہیں بلکہ بڑے ہیں۔ مس دُرِ نایاب کو اس طرح سب کے سامنے نہیں ٹوکنا چاہیے تھا۔ اسے کوئی ایشو ہے تو مجھ سے اکیلے میں بات کرے ناں۔"

مس ناجیہ، میم درانی کی منہ چڑھی ماتحت تھیں۔ اتنا احتجاج تو ان کا حق تھا لیکن مسز درانی بجائے اس کے کہ انہیں سمجھاتیں کہ ان کی حرکت قابلِ مذمت ہے اور انہیں کسی بھی قسم کی ہیلپ سے پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ یہ بات کسی کو بھی بری لگ سکتی ہے۔ ہوسکتا ہے مس دُرِ نایاب کی جگہ کوئی اسٹوڈنٹ پوائنٹ آؤٹ کرتا۔ تب ان کی کیا عزت رہ جاتی۔

انہوں نے الٹا درنایاب سے بات کرنے کی انہیں تسلی دے دی۔

☆☆☆

"یہ اچھا نہیں ہے دانش!"

وہ ہمیشہ کی طرح الجھ گئی تھی۔ کوئی بھی بات جس میں کسی جھوٹ کا خدشہ ہوتا اسے بے حد ڈسٹرب کرتی۔ جب بچپن سے جھوٹ نہ بولا ہو تو انسان اناڑی ہوتا ہے ایسے میں، اپنی ہی کہی باتوں کا پول خود ہی کھول بیٹھتا ہے اور دُرِ نایاب ایسے ہی کسی لمحے سے ڈرتی تھی۔

"ڈونٹ وری پیاری خالہ جانی۔ اس میں کچھ چھپانے والی کیا بات ہے۔ یہ تو بس ایسا ہے کہ آپ نے ضروری نہیں سمجھا تو نہیں بتایا۔"

"اور اگر بعد میں کسی کو پتا چلا تو......؟" اس کے لہجے میں آنے والے وقت کے اندیشے تھے۔

"کیوں چلے گا پتا...... کون بتائے گا میں...... یا آپ......؟"

درنایاب اس بحث سے اکتا گئی تھی۔ گہری سانس بھر کے چپ ہوگئی۔

یہ اسکول اس نے اپنے بھانجے، دانش کی خواہش پہ جوائن کیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے والے اسکول میں کم تنخواہ اور قدرے کم معروف اسکول ہونے کے باوجود اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ یہ تو دانش ہی چاہتا تھا کہ ماسٹرز کے بعد وہ کسی اور اچھی جگہ زیادہ اچھے چیلنج پہ جاب کرے۔ اس طرح آگے بڑھنے اور بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

پہلے ہی اس نے نہ چاہتے ہوئے جاب کے لیے اپلائی کیا اور اپائنٹ بھی ہوگئی۔ اب دانش چاہتا تھا کہ

خوش نصیب

بیمہ کمپنی کے ایجنٹ نے کہا۔ "آپ ہماری کمپنی کی پالیسی ضرور لیجیے......"

"آخر کیوں......؟ آپ کی کمپنی میں ایسی کون سی انوکھی بات ہے؟"

"دیکھیے ایک ماہ قبل آپ کے پڑوسی نے ہماری کمپنی کی ایک پالیسی لی تھی، اس واقعے کے دو روز بعد کار کے ایک حادثے میں اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ چند روز بعد ہم نے پالیسی کے دس ہزار روپے ادا کر دیے۔"

"تو پھر......؟"

"میرا مطلب ہے......کل آپ کی قسمت بھی تو یاوری کرسکتی ہے۔"

مرسلہ: نگہت غفار...... کراچی

اسکول میں کسی کو پتا نہ چلے کہ وہ اور دانش آپس میں خالہ بھانجے ہیں۔

بھلا ایسا کیسے ہوتا اور کب تک چلتا۔ اسے ابھی سے گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ بعد میں کسی کو پتا چلتا اور کوئی یہ اعتراض کرتا کہ درنایاب نے یہ بات جان بوجھ کر چھپائی ہے تو کیا ہوتا۔ وہ تو کوئی مضبوط دلیل بھی نہیں دے سکتی تھی۔ سب یہی کہتے کہ اس بات کو چھپانے کا مقصد درپردہ دانش کی مدد کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

مگر دانش کا کہنا تھا کہ اس طرح وہ خود سیف رہے گی، جب کسی اور کے اوپر فیورازم کی بات آئے گی تو وہ بچ جائے گی۔ کیونکہ کسی کو پتا ہی نہیں ہوگا کہ ان کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔

''سوچ لو دانش! ایسی باتیں چھپتی نہیں ہیں۔''

وہ پھر بھی متردد تھی۔ زندگی میں چند ایک بار جھوٹ بول کر پکڑے جانے کے بعد اس نے سیکھ لیا تھا کہ جھوٹ کے پاؤں تو نہیں ہوتے مگر یہ سر پہ جوتا ضرور پڑوا سکتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے زبان میں ہڈی نہیں ہوتی مگر انسان کا سر تڑوا سکتی ہے اور اس نے یہ بات بہت کم عمری میں ہی سیکھ لی تھی۔

بہرحال ڈرتے جھجکتے اس نے بھانجے کی خواہش پر نئے اسکول میں قدم رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

''مس آپ کو میم نے یاد کیا ہے۔'' اسٹاف روم میں داخل ہونے والی ایک ٹیچر کی اطلاع پر وہاں موجود سبھی ٹیچرز نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔

''آیئے مس دُرنایاب بیٹھیے۔'' میم درانی کے مزاج آج کچھ زیادہ ہی تیکھے لگ رہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ ان کا موڈ آف ہے۔ اسے بلا کر بٹھانے کے بعد وہ اپنے کام میں ایسی غرق ہوئیں کہ نایاب پہلو بدلنے لگی لیکن ان کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا۔

''میم آپ نے مجھے کسی کام سے بلایا تھا۔''

جب کافی دیر انتظار کے بعد بھی انہوں نے کوئی کلام نہ کیا تو مجبوراً اسے کہنا پڑا۔

وہ یوں چونکیں جیسے اس کی وہاں موجودگی کو بھول ہی گئی ہوں۔

''او ہاں...... مس درنایاب! کچھ عرصے سے آپ کے خلاف شکایات آرہی ہیں کہ آپ ڈیوٹی کے دوران اسٹڈیز پہ توجہ دینے کے بجائے، دوسری غیر متعلقہ باتوں کی طرف زیادہ دھیان دیتی ہیں۔''

''آں...... جی......''

میم کی بات سن کر اس کا تو فیوز ہی اڑ گیا۔

''ایسا بالکل نہیں ہے میم۔ کسی کو مس انڈرسٹینڈنگ ہوگئی ہوگی۔''

''دیکھیے۔ کمپلینٹ آئی ہے تو ہمیں آپ کو وارن تو کرنا ہی ہے اور یہ مس انڈراسٹینڈنگ ہے یا کچھ اور یہ تو آپ ثابت کر ہی دیں گی۔''

میم کا پروفیشنل انداز اور لیا دیا رویہ درنایاب کا دل جلا رہا تھا۔

''کس نے کی ہے یہ کمپلینٹ۔''

''آپ کو اس سے کنسرن نہیں ہونا چاہیے۔ آپ اپنی سرگرمیوں پہ توجہ دیں۔''

''پھر بھی مجھے پتا تو چلے، تاکہ میں اس سے خود کلیر کرلوں ورنہ آئندہ بھی......''

''مس درنایاب! آپ کو اب تک پتا نہیں چلا کہ آپ کو اکیلے میں آفس بلا کے یہ سب کہنے کا کیا مقصد ہے؟''

میم کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ وہ ہکا بکا سی رہ گئی۔

''جو کہا ہے اس پہ concentrate کیجیے۔ اپنے کام پہ توجہ دیجیے۔''

وہ مرے، مرے انداز میں باہر نکلی تو دل کر رہا تھا پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ بنا کسی وجہ کے اتنی جھاڑ......

''ہو گی کسی کی لگائی بجھائی...... تمہیں بھی تو کتنی بار سمجھایا ہے اپنے کام سے کام رکھو، تنخواہ پکڑو اور گھر جاؤ۔''

''اچھا...... اور میرا کام کیا ہے اس کی وضاحت کریں گی آپ......'' اس نے طنز بھری نظروں سے اپنی واحد دوست کو دیکھا جو اس سے آفس میں کیا بیتی کی روداد سن رہی تھی۔

''میں کوئی وضاحت نہیں کرنا چاہتی مگر تمہیں سمجھانا ضرور چاہتی ہوں۔ اب وہ دور ہے نہ زمانہ جب لوگ سچائی اور ایمان داری کی قدر کرتے تھے اور ان خصوصیات کے حامل بندے کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اب تو ایسے لوگ بیوقوف اور کھسکے ہوئے کہلاتے ہیں جو پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑائیں۔ میری مانو تو تم بھی اپنے آنکھیں، کان بند کر کے اپنا راستہ چلو......''

''ورنہ......'' وہ سارہ کی باتیں سن کر شاکڈ رہ گئی۔

''ورنہ مس فٹ کہہ کر ریجیکٹ کر دی جاؤ گی ہر موقع پر...... جاب سے نہیں نکالیں گے مگر اتنا تنگ کریں گے کہ تم خود ہی بھاگ جاؤ اور بعد میں سب کہتے پھریں گے کہ تمہیں پڑھانا نہیں آتا۔ اور تم بڑے اسکول میں پڑھانے کا کوئی تجربہ نہیں رکھتی تھیں۔''

سارہ کی باتیں اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ وہ تھکے، تھکے قدموں سے باہر نکل گئی۔ اسکول کی چھٹی ہو چکی تھی۔ بچے جا چکے تھے۔ وہ وین سے جاتی تھی۔

اس کا اور دانش کا معاملہ بھی اب تک اسی لیے چھپا ہوا تھا کیونکہ ان کے ٹائمنگز اور کنوینس الگ، الگ تھیں۔

وہ سارا راستہ اپنی منتشر سوچوں کو سمیٹتی رہی۔

کرپشن، بدعنوانی اور اقربا پروری کے عفریت نے درسگاہوں جیسی مقدس جگہوں کو بھی نہیں بخشا تھا۔

کل ہی کی بات تھی جب اسے پتا چلا کہ اسکول کی کچھ ٹیچرز اپنے اسٹوڈنٹس کو گھر پہ ٹیوشن بھی دیتی ہیں...... ڈسمسٹر کے بعد اس نے خود ان ٹیچرز کو اپنے ٹیوشن کے بچوں کے لیے دوسرے ٹیچرز سے سفارش کرتے دیکھا۔

''مس ربیعہ پلیز علیان کے پیپر میں ذرا چیکنگ میں ہلکا ہاتھ رکھیے گا۔ آپ کو تو پتا ہے۔ آج کل کے بچوں کو اردو ہی ٹھیک سے نہیں آتی تو پھر سندھی......''

''ہاں یار میں تو خود بیزار ہو جاتی ہوں۔ ایسے، ایسے جواب لکھ دیتے ہیں بچے، نقطے ٹھیک کرتے ہی عمر گزر جائے گی۔''

وہ حیرت سے بت بنی ان کی باتیں سنتی رہ گئی۔ سبجیکٹ ٹیچر اپنے ہی سبجیکٹ سے اتنی بیزار......

''پتا نہیں پڑھاتے ہی کیوں ہیں؟'' مس ربیعہ نے کوفت سے کاپیز ٹیبل پر پٹخی تھیں۔

کیسی عجیب بات تھی۔ بچے اگر کسی مضمون میں کمزور تھے تو ٹیچر سارا الزام ہی اس سبجیکٹ پر تھوپ رہی تھی۔ یعنی اس کی اپنی کوئی کارکردگی نہیں تھی۔ اور چلو مان لیا کہ سندھی مشکل تھی تو اور محنت کے بجائے اس طرح کہہ سن کر نمبر بڑھوا کے کیوں مستقبل کے معماروں سے کھیلا جا رہا تھا۔

جتنی حیرت اسے مس صدف کی بات پہ تھی اس سے کہیں زیادہ افسوس مس ربیعہ کے جواب پہ ہوا تھا۔

ایسی ہی ایک سفارش اس کے پاس بھی آئی تھی تو اس نے اپنا مخصوص ٹکا تو ڑ جواب دیا تھا۔ جس پہ اس کی ساتھی ٹیچر کا منہ لٹک گیا تھا۔

اسکول سے گھر واپسی پر وہ یہی سوچ رہی تھی۔

اس نے وہیں گاڑی میں بیٹھے، بیٹھے فیصلہ کیا کہ کل وہ ساری بات جا کے میم کو بتا دے گی۔ پھر وہ جانیں اور ان کا کام۔

گھر آچکا تھا۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں گم وین سے اتر کر اندر چلی گئی۔ اس کے بعد وین میں صرف ایک ہی ٹیچر باقی بچتی تھیں۔ اور وہ وہی مس ناجیہ تھیں جن سے کچھ دن پہلے اس کی تلخ کلامی ہو چکی تھی۔ اپنی دھن میں اندر جاتے ہوئے اس نے یہ نہیں دیکھا کہ اسی وقت کسی کام سے باہر نکلتے ہوئے دانش کو ناجیہ کی تیز نظروں نے نہ صرف دیکھ لیا تھا بلکہ اچھی طرح پہچان بھی لیا تھا۔

☆☆☆

وہ دوسرے دن بات نہیں کر سکی بلکہ آنے والے اگلے کئی دن تک بات نہیں کر سکی۔ کیونکہ رزلٹ نکلنے میں بہت کم دن باقی تھے اور اس کی کاپیز کے سیٹ ابھی تک کمپلیٹ نہیں ہوئے تھے۔

اسی وجہ سے اسے اس روز اسکول میں چھٹی کے بعد بھی رک کر کام کرنا پڑا۔ تمام لوگ گھر جا چکے تھے یہاں تک کہ آفس اسٹاف بھی۔ سارہ کو بھی اس نے دیر ہو جانے کے خیال سے جلدی روانہ کر دیا پھر مکمل توجہ کے ساتھ

جلدی، جلدی اپنا سیٹ کمپلیٹ کر کے، اسٹاف روم میں رکھنے آئی تو ایک حیرت آمیز منظر وہاں اس کا منتظر تھا۔

''میم......آپ یہاں؟''

مسز درانی نہ صرف وہاں موجود تھیں بلکہ کاپیوں کے ایک بنڈل پہ جھکی ہوئی بھی تھیں۔ درنایاب کو دیکھ کر فقط اِک لمحے کے لیے ان کا چہرہ سفید پڑا۔ جو اس کی نگاہوں میں آنے سے پہلے ہی نارمل ہوگیا۔

''یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا چاہیے کہ آپ یہاں؟''

انہوں نے خود کو سنبھال کر ایک ادا سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن اس کے دل میں کوئی چور نہیں تھا کہ وہ گھبرا جاتی۔

''جی میں یہ سیٹ رکھنے آئی تھی۔''

''او کے۔'' ان کا انداز ایسا تھا کہ رکھو اور جاؤ۔ اس نے چپ چاپ اپنا کام کیا پھر بھی اسکول سے نکلتے سے یونہی چوکیدار سے پوچھ لیا۔

''خان بابا، کیا سب چلے گئے؟''

''جی مس جی، سب لوگ چلا گیا۔''

خان کی بات پر وہ جتنا بھی حیران ہوتی کم تھا۔

☆☆☆

اگلے کچھ دن میں رزلٹ آؤٹ ہوا تو اس کی توقع کے بہت خلاف تھا۔ ڈیزرونگ اسٹوڈنٹ تو اچھے ہی نمبروں سے پاس ہوئے تھے مگر بہت سے بچے جو اس کے خیال میں اسکول کے اسٹینڈرڈ کے حساب سے انٹری ٹیسٹ میں بھی پاس نہیں ہو سکتے تھے امتیازی نمبروں سے پاس ہو چکے تھے۔

وہیں اس کے اپنے سبجیکٹ کا رزلٹ بہت خراب تھا۔

میٹنگ میں سب کے سامنے نہ صرف میم درانی نے اس بات کو پوائنٹ آؤٹ کیا اور وہیں اس کی کارکردگی بہتر بنانے پہ بھی زور دیا اور ان ہی باتوں کے دوران اس کی خوب کھنچائی بھی کی گئی۔

اب اس کے لیے بولنا بہت ضروری اور چپ رہنا... ناممکن تھا۔

''میرے سبجیکٹ میں نمبرز بالکل میرٹ کے عین مطابق ہیں میم...... کیونکہ میں گھر پہ بچوں کو ٹیوشن نہیں دیتی۔ ایکسٹرا مارک نہیں دیتی اور نہ ہی دوسری ٹیچرز کے پاس جا، جا کر اپنے اسٹوڈنٹس کی سفارش کرتی ہوں۔''

پورے ہال میں سب کو سانپ سونگھ گیا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا۔ کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟''

''میں نے کوئی اتنی مشکل بات نہیں کی کہ کسی کی سمجھ میں نہ آسکے۔ چیکنگ کے دوران میں نے یہ عام پریکٹس دیکھی ہے اور صرف یہی نہیں، پرائمری اسٹینڈرڈ میں تو بچوں کو پورے، پورے آنسرز بورڈ پر کروائے جاتے ہیں۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے میم! مس درنایاب کو یقیناً کوئی زبردست غلط فہمی ہوگئی ہے۔'' پرائمری انچارج تڑپ کر اٹھی اور تیز آواز میں اپنی ٹیچرز کا دفاع کیا۔

''آپ باقی سب کو چھوڑیں اپنی بات کریں مس...... ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ کی اپنی خراب پرفارمنس کی وجہ سے آپ کا رزلٹ خراب ہوا اور اب آپ دوسروں کو پوائنٹ آؤٹ کر کے اپنی طرف سے توجہ ہٹانا چاہتی ہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے میرے سبجیکٹ میں بھی ہائیسٹ مارکس ہیں......''

''ایسی ہی بات ہے مس درنایاب اور یہ سب بہانے اب بہت پرانے ہو چکے ہیں...... میم کے سامنے ان سب کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ مان لیں کہ اگر آپ نے ٹھیک سے محنت کی ہوتی تو آج آپ یوں دوسری ٹیچرز کا امیج خراب نہ کر رہی ہوتیں۔''

مس ناجیہ کے ہاتھ اپنی پرانی رقابت نکالنے کا بہترین موقع تھا۔ جسے ضائع کرنا یقیناً بیوقوفی تھی۔

''ہماری سبھی ٹیچرز اپنے، اپنے سبجیکٹس پر فل کمانڈ رکھتی ہیں اور بہت محنتی ہیں۔''

''میں بھی یہی کہہ رہی ہوں کہ محنتی ٹیچرز اگر صحیح ڈائریکشن میں اپنی محنت کو یوٹیلائز کریں تو آئندہ کسی میٹنگ میں یہ ایشو نہ اٹھے۔''

اس نے ذرا ناراضی والے انداز میں اپنی بات مکمل کی اور دھپ سے سیٹ پر بیٹھ گئی۔

میم کا چہرہ خطرناک حد تک سنجیدہ ہو چلا تھا۔

''بہر حال اگر کسی ایک بھی ٹیچر نے اسکول میں ایسا کچھ دیکھا ہے تو یقیناً اس کی کوئی نہ کوئی بنیاد ہے جبھی اس طرح کی باتیں سامنے آ رہی ہیں۔ میں حیران ہوں کہ ایک اتنے نامور ادارے میں اس طرح کی حرکتیں کیسے ہو سکتی ہیں۔ مس ناجیہ آپ، باقی انچارجز، اور کوآرڈینیٹرز کے ساتھ میرے آفس میں آئیں۔ اس پر فوری ایکشن لیا جائے گا۔''

میم کے الفاظ سے باقی ٹیچرز کو جہاں سانپ سونگھ گیا وہیں دُرِنایاب کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

اسے لگا حق اور سچ کی جیت ہمیشہ ہو کر رہتی ہے مگر بعض اوقات جیسا دکھتا ہے ویسا ہوتا نہیں۔

میم کے آفس میں جاتے سمے سبھی سینئرز کے چہرے پہ اطمینان اور لبوں پر اس کے لیے استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

دن پہ دن گزرتے چلے گئے۔ میٹنگ میں کیا فیصلہ ہوا، کچھ پتا نہیں چلا۔ دوسری ٹیچرز اس روز کے بعد سے ہی نہ صرف اس سے بلکہ اس کی وجہ سے سارہ سے بھی کھنچی، کھنچی رہنے لگی تھیں۔

اس نے بھی زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اپنی جگہ درست تھی اس کے اطمینان کو یہی بات کافی تھی مگر کوئی اور بھی تھا جس کا اطمینان اس کی صاف گوئی نے غارت کیا تھا اور وہ تھیں میم درانی......

اس کی بات صرف اسکول کے نام ہی کے لیے نہیں بلکہ ان کی کارکردگی کے لیے بھی ایک دھبے کی طرح تھی۔

اس الزام کو سچ مان کر وہ دوسرے لوگوں، خاص کر والدین کو اپنے لیے کوئی محاذ کھولنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھیں۔ ان کی بے چینی عروج پہ تھی۔ وہ کسی بھی صورت اس کا منہ بند کرنا چاہتی تھیں۔ تبھی انہوں نے اپنی کمرا بند میٹنگ میں نہ صرف ٹیچرز بلکہ ان اکیڈمک کوآرڈینیٹرز کو بھی دور رکھا تھا، جو حال ہی میں اپائنٹ ہوئی تھیں۔ ایک دوسرے نامور اسکول کی فرنچائز چھوڑ کر ان کے اسکول میں اپنے تجربے اور قابلیت کے باوجود خود نوکری مانگنے آئی تھیں۔ صد شکر کہ اس روز والی میٹنگ میں وہ وقت سے پہلے کسی ضروری کام سے گھر چلی گئی تھیں۔

مس ناجیہ پہلے ہی سے کسی ایسی ہی میٹنگ نما بلاوے کی منتظر تھیں۔ اس روز انہوں نے وہ راز منکشف کیا کہ جسے

سن کر میم درانی کی طبیعت بالکل ہلکی ہوگئی۔ ان کی ساری ٹینشن ختم ہوگئی اور دماغ میں ایک نئی پلاننگ پنپنے لگی۔ جس کی ہوا وہ کسی بھی شخص کو لگنے نہیں دینا چاہتی تھیں۔

”درنایاب کو یہ پتا نہیں لگنا چاہیے کہ ہم اس بات سے واقف ہوچکے ہیں کہ دانش خان ان کا بھانجا ہے۔“

”تو میم ہم ان سے یہ بات چھپا کر کیا کریں گے؟“

”ارے...... ہم تھوڑی چھپا رہے ہیں۔ چھپایا تو انہوں نے ہے ناں۔ اب وقت آئے گا تو وہ خود ہی بتا دیں گی۔“

انہوں نے لہجہ بالکل ہلکا پھلکا کرلیا۔

اس میٹنگ میں سبھی لوگ ان کے بھروسے کے تھے لیکن ان کی جاگیر کا حصے دار کوئی نہ تھا۔ جس کرسی پہ وہ براجمان تھیں، اب اس کی پارسائی پہ ذرا سی آنچ بھی ان کے اپنے تراشے گئے شخصیت کے بت کو زبردست دھچکا پہنچا سکتی تھی جو انہیں کسی صورت منظور نہ تھا۔

اسکول کے ورکنگ ڈیز معمول پہ آگئے۔ اور انہوں نے بظاہر سب کچھ حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

مگر اندر ہی اندر وہ کچھ اور ہی ٹھان چکی تھیں۔ جس کی ہوا بھی کسی کو نہیں لگ سکتی تھی۔

☆☆☆

فائنل ایگزامز کا موسم سر پہ آگیا۔ اس بار اس نے کسی بھی کمزوری سے بچنے کے لیے پہلے سے بڑھ کے محنت کی تھی، پوری امید تھی کہ اس کی محنت ضرور رنگ لائے گی۔ دوسری طرف میم درانی کے منصوبے کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کے دن بھی آگئے۔

پیپرز کے دوران جاب بوجھ کے بریک نہیں دیا گیا جس کی وجہ سے اس کی کاپیز کی چیکنگ لیٹ ہوگئی لیکن یہ مسئلہ نہیں تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی مگر چپ رہی کیونکہ جانبدارانہ رویّہ صرف اس کے ساتھ نہیں بلکہ اور کچھ ٹیچرز کے ساتھ بھی اپنایا جاتا تھا۔ جن کو چاپلوسی نہیں آتی تھی یا جو سیاست سے بچتے ہوئے اپنے کام سے کام رکھتی تھیں۔ اور ایسا تقریباً پورا سال ہی اس نے دیکھا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اگر وہ کچھ کہتی تو اس کے ساتھ ساتھ سیارہ بیچاری بے قصور ہوتے ہوئے بھی لپیٹ میں آجاتی تھی۔ کیونکہ وہ درنایاب کی دوست تھی۔

اصل مسئلہ اس دن ہوا جب پیپرز کے بعد اس کی جمع کرائی گئی کاپیز میں سے ایک کاپی گم ہونے کی اطلاع ملی۔ سونے پہ سہاگا اس دن اس کے کمرے میں دانش بھی پیپر دینے کے لیے موجود تھا۔

ٹیچرز پیپر کے بعد تمام اسٹوڈنٹس کو کاؤنٹ کر کے کاپیز کاؤنٹ کر کے انچارج کے پاس جمع کرادیتی تھیں۔

اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ کاپیز جمع کروا کے آفس سے نکل آئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اسے اطلاع ملی کہ اس کے ایگزام روم کے بچوں کی تعداد کے مطابق ایک کاپی کم ہے۔

اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ کاپی کم ہونے کا کیا مطلب تھا وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ دانش کا اس کلاس روم میں موجود ہونا اسے مسلسل کنفیوز کررہا تھا۔

وہ اس کا بھانجا تھا۔ اسے اپنی خالہ سے شرارت سوجھ رہی تھی۔ وہ اس کی کنفیوژن کو بھی سمجھ رہا تھا۔ اس لیے پیپر کے دوران بار بار شرارتی نظروں سے اسے دیکھ لیتا تھا۔ جس پہ وہ جھنجلا کے اسے ٹوک بھی چکی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کوئی اس کے اور دانش کے درمیان رشتے کو بھانپ نہ لے۔ اگر ایسا ہو بھی جاتا تو کوئی بڑی بات نہ ہوتی اگر وہ پہلے کسی اور کو رشتے داری میں فیور دینے پر ٹوک نہ چکی ہوتی۔

دل ہی دل میں ورد کرتی وہ اسٹاف روم میں آئی تو پتا چلا کہ کاپی کسی اور کی نہیں دانش کی ہی گم ہوئی ہے۔

حقیقت میں اس کے سر پہ بم گرا۔

مس ناجیہ تھانے داروں کی طرح اس سے سوال کررہی تھیں۔

”آج آپ کے روم میں کتنی کلاسز تھیں......؟ کون کون سی......؟ کتنے بچے تھے......آپ نے کاپیز کو اچھی طرح کاؤنٹ کیا تھا......؟“

وہ تھوک نگلتی جواب دے رہی تھی۔ مس ناجیہ کا لہجہ بہت تیکھا تھا۔ جسے برداشت کرنا اس کی مجبوری تھی۔

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اچھی طرح کاؤنٹنگ

کرلی گئی تھی تو کاپی گئی کہاں...... مس آپ نے خود مس صفیہ کو کاپیز اپنے ہاتھ سے کاؤنٹ کرنے کو دی تھیں۔“

”جی مس میں نے خود دی تھیں۔ آپ مس صفیہ سے پوچھیں ناں۔“

مس صفیہ بھی وہیں موجود تھیں۔

”نو مس...... میں تو وہاں تھی ہی نہیں۔ آپ کاپیز رکھ کر چلی گئی تھیں......“

مس صفیہ کی بات پر اس کے حواس سن سے ہو گئے۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ مس صفیہ اس وقت وہاں نہیں تھیں۔ وہ دونوں کلاسز کے سیٹ لے کے آفس میں آئی تھی اور بہت دیر انتظار کے بعد جب صفیہ کی آمد کے کوئی آثار دکھائی نہ دیے تو اس نے دونوں سیٹ الگ، الگ کر کے ان کی تعداد ایک چٹ پر لکھ کر کاپیز کے نیچے دبادی تھی۔

اس نے اپنا سر تھام لیا۔ یہ کیسی فاش غلطی ہوئی تھی اس سے...... جب اسکول کی انتظامیہ کو اس نے خود ہی اپنا حریف بنالیا تھا تو ایسی بے پروائی اس کے لیے کس قدر جان لیوا ہوسکتی تھی۔ اس نے کیوں نہیں سمجھی یہ بات......

”اب آپ بتائیں کہ میں دانش کے پیرنٹس سے کیا کہوں۔ کیا وہ بچہ فیل ہونے والا تھا؟“

”نہیں...... بالکل نہیں...... وہ تو......“ اس نے بے اختیار زبان دانتوں میں دبائی۔ وہ دانش کا کوئی سبجیکٹ نہیں لیتی تھی۔ پھر اس کے اسکول ریکارڈ کا اسے کیسے پتا چل سکتا تھا۔

”وہ تو شکل سے اچھا اسٹوڈنٹ لگتا ہے۔“

”ضروری تو نہیں کہ شکل سے لگتا تھا تو ہو بھی۔ ہو سکتا ہے وہ کاپی گھر لے گیا ہو اور آپ کو پتا ہی نہ چلا ہو۔“

مس ناجیہ نے آج اسے ہارٹ اٹیک دینے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ میم درانی اور ان کے غصے کا سوچ، سوچ کے اس کی جان نکلے جارہی تھی۔ اوپر سے دانش کی کاپی غائب ہونا۔ وہ کیسے سب کو یقین دلاتی کہ دانش ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ کیونکہ اس کا بھانجا ایسا نہیں تھا۔

”اینی ویز...... مس نایاب...... کہیں سے بھی کاپی ڈھونڈ کر لائیں ورنہ...... آپ جانتی ہیں آپ کو فائر بھی کیا جاسکتا ہے۔“

وہ لڑکھڑاتی ہوئی آفس سے نکلی تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر چکی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کے گرد کسی سازش کا تانا بانا بنا جاچکا تھا لیکن کیوں...... یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ بلکہ گمان سے بھی کوسوں دور......

اس نے خود اسٹاف روم میں آکر ایک، ایک سیٹ چیک کیا۔ یہاں وہاں اِدھر، اُدھر سب چھان مارا لیکن کاپی ہوتی تو ملتی ناں......

آخر میم درانی تک بھی بات پہنچی۔ انہوں نے اس کی خوب کلاس لی اور آخر میں فیصلہ سنا دیا کہ بچے کے والدین تک بات پہنچنے سے پہلے کاپی ان کی ٹیبل پہ ہو۔ ورنہ اس بے پروائی اسے اس کی جاب سے فارغ کردیا جائے گا۔

دُرِّنایاب نے ایک گہری سانس لی۔

”میم...... میں دانش کے پیرنٹس سے ملنا اور ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”وہ کس لیے؟“

میم بری طرح چونک پڑیں۔ درنایاب نے اب تک اپنی اور دانش کی کسی رشتے داری کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ جس کا ان کو شدت سے انتظار تھا۔ پر اب لگتا تھا کہ وہ وقت آنے ہی والا ہے۔

”میں ان کو اس مس ہیپ کے بارے میں خود بتا دوں گی اور ان سے ریکوئسٹ کروں گی کہ وہ دانش خان کا پیپر دوبارہ دلوادیں۔“

”واٹ...... آر یو میڈ مس دُرّے......؟“ میم نے اسے طنز سے اس کے آدھے نام کے ساتھ مخاطب کیا۔

”اور آپ کے خیال میں وہ مان جائیں گے؟ آپ جانتی نہیں ہیں آپ نے فائنل ایگزام کی آنسر شیٹ گم کر دی ہے میڈم۔ اس بچے کے ماں باپ کو پتا چلے گا تو وہ کیا طوفان اٹھائیں گے...... اور جو اسکول کی بدنامی ہوگی وہ...... اور سرتقی تک جب یہ بات پہنچے گی تو کیا ہوگا؟“

”ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ

ہے۔ وہ کسی کو کچھ بھی نہیں بتائیں گے اور دانش دوبارہ پیپر بھی دے لے گا۔ آئی پرامس!''

''آپ کیسے اتنے کانفیڈنس سے یہ بات کر رہی ہیں...... جبکہ پیرنٹس کو تو بہانہ چاہیے ہوتا ہے۔ اسکول والوں کی ذرا ذرا سی بات کی شکایت کرنے کا۔''

اس نے گہری سانس لی۔ اب اس بات کو کھولنے کا وقت آگیا تھا جسے اس نے اتنا عرصہ ڈھانپ کے رکھا تھا۔ محض کسی اسکینڈل سے بچنے کے لیے۔

''کیونکہ دانش میرا بھانجا ہے۔ میری بہن ہی کا بیٹا ہے۔''

''او... ہ......'' مس ناجیہ نے کمال کی ایکٹنگ کی۔

میم درانی کے لبوں پہ ایک موہوم سا پُراسرار تبسم ابھر کر معدوم ہوگیا۔

''خیر...... مجھے اس سے کوئی لینا دینا نہیں...... اگر آپ سیٹل منٹ کر سکتی ہیں تو ٹھیک ہے مگر مجھے سرتقی کو اس بارے میں ضرور بتانا ہوگا...... آئی ایم سوری...... میں مجبور ہوں۔ وہ اس اسکول کے مالک ہیں۔ اور اگر ان کو کہیں اور سے اس بات کی رپورٹ مل گئی تو میرے اوپر برائی آجائے گی۔''

وہ سر جھکا کر بیٹھی رہی۔

''یہ تو اچھا ہے کہ وہ بچہ آپ کا nephew ہے۔ اگر آپ چاہیں تو پیپر کے حوالے سے اس کی ہیلپ بھی کر سکتی ہیں۔ کیونکہ اب ان کے لیے تو ظاہری سی بات ہے دوسرا پیپر بنایا جائے گا......''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں مجھے۔ وہ بہت intellegent ہے۔ مجھے اس پہ ٹرسٹ ہے۔ وہ سالوں سے یہاں میری ہیلپ کے بغیر پڑھتا رہا ہے۔ ہی از آ بریلینٹ اسٹوڈنٹ۔''

مس ناجیہ نے میم کی آفر پہ ہونٹ دبا کے اپنی ہنسی روکی۔

''اینی ہاؤ...... اگر آپ چاہتی ہیں کہ کاپی والا معاملہ بھی سیٹل ڈاؤن ہو جائے تو کاپی ڈھونڈیے...... یقین کریں ہمیں خود بہت افسوس ہے کہ آپ کے ساتھ یہ مس ہیپ ہوگیا...... لیکن اگر اب بھی کاپی مل گئی تو؟''

''کاپی نہیں ملے گی میم...... نہ مجھے اسے ڈھونڈنے کی ضرورت ہے...... مجھے افسوس ہے کہ مجھے یہ بات بہت دیر سے سمجھ میں آئی۔ یہ اسکول کوئی ادارہ نہیں جسے ٹیم ورک کے تحت چلایا جاتا ہو۔ جہاں لوگوں کو ان کی قابلیت اور صلاحیت کے بل بوتے پر، پرکھا جاتا ہو اور اس کی قدر کی جاتی ہو......''

وہ بولتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''یہ پورا اسکول فردِ واحد کی جاگیر بن چکا ہے۔ اور میرے اندر کسی جاگیردار سے ٹکر لینے کی ہمت نہیں۔ رہی بات جاب جانے کی تو میں یہ جاب آج، ابھی اور اسی وقت چھوڑتی ہوں کہ جو میرے اوپر کسی چوری، جانبداری یا جھوٹ کا ٹھپا لگائے۔ میں نے اتنے دن جاب کر کے بھی غلطی ہی کی۔ مجھے تو اسی دن یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا جس دن میں نے آپ کو ڈیوٹی آورز کے بعد اسٹاف روم میں تنہا دیکھا تھا۔ اور چوکیدار کو آپ کی موجودگی سے متعلق جھوٹ بولتے ہوئے سنا تھا۔''

میم درانی اور مس ناجیہ کے چہرے دیکھنے والے ہوگئے۔

''میں بھی سمجھتی ہوں اور آپ بھی سمجھتی ہیں۔ وہ کاپی اب نہیں ملے گی...... چلتی ہوں...... اللہ حافظ!''

☆☆☆

ان کا ذہن گاڑی سے زیادہ تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔

سب کچھ پلان کے مطابق ہی ہوا تھا۔ سانپ بھی مر گیا تھا لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی تھی۔

انہوں نے ذہن میں شور مچاتی چند فضول سی باتوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے اپنا پرس کھولا۔ دہکتے ہوئے رنگ کی لپ اسٹک نکال کر لبوں پر تازہ تہ جمائی۔

لپ اسٹک واپس رکھ کر پرس میں سے فولڈ کیا ہوا کچھ اور باہر نکالا۔ ان کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

نام...... دانش خان

کلاس...... VIIIB

انہوں نے آنسر شیٹ کے پُرزے، پُرزے کیے اور سڑک پر دوڑتی گاڑی کی کھڑکی سے باہر اچھال دیے۔

ردی کی ٹوکری

ہاجرہ ریحان



''کوئی تیسری شادی ہے یہ اور ہر شادی سے پہلے زیورات، ملبوسات اور طرح، طرح کے خاندانی رسم و رواج کی تفصیلات...... ہر دلہن کا دولہا سے شادی سے پہلے غلط فہمی کے باعث ایک زبردست قسم کا جھگڑا اور پھر عین بارات یا ولیمے کے روز دلہن کا غلط فہمی کو سمجھنا اور پھر فرحتِ جذبات میں اسٹیج پر بے ہوش ہونا...... بڑی مشکل سے شادیوں سے جان چھوٹی ہی تھی کہ خاندان کے تمام بوڑھے جہانِ فانی سے کوچ کرنا شروع ہوگئے...... جیسے

سب انتظار میں بیٹھے تھے کہ اِدھر شادی بیاہ کی تقریبات ختم ہوں اُدھر ہم چلیں اور ہر میت پر پیچھے رہ جانے والوں کی طرح ،طرح کی آہ وبکا۔حد ہوگئی بھئی...... مانا کہ ہر ناول کا ایک فارمولا ہوتا ہے مگر ان محترمہ نے تو جیسے تمام قسم کے فارمولے اپنے ایک ہی ناول میں مکس چاٹ بنا کر ڈال دیے ہیں...... اُف پڑھ، پڑھ کر دماغ کی بتی ہی گل ہوگئی...... اب بتا رہی ہوں میں یہ جو چوتھی والی ہے ناں...... جو ناول کی ابتدا میں پہاڑوں کی سیر کو نکلی تو ابھی تک واپس ہی نہیں آئی...... آوارہ گرد کہیں کی...... بس اس کو میں کسی پہاڑ کی چوٹی سے گرا کر مار ہی ڈالوں گی...... اور ناول کا دی اینڈ...... بھئی یہ واپس آگئی تو پھر سے شادی بیاہ...... نہ بھئی نہ...... ناول کی طوالت بھی تو قابو میں رکھنی ہے کہ نہیں...... اور پھر اب تو کہانی میں کوئی بوڑھا بھی نہیں رہا جس کو شادی کے بعد مارا جائے...... ہیں جی...... آج کا دن تو ضائع گیا اب کل کا دن تو میں اس ناول پر ہرگز نہیں لگانے والی......'' رابعہ کب سے اسی قسم کی باتیں کرتی ہی چلی جارہی تھی اور میں اسے دلاسے میں کچھ کہہ بھی نہ سکی تھی کیونکہ میں خود ابھی ایک ایسی کہانی پڑھ کر فارغ ہوئی تھی جس میں ایک ایسے شوہر کی تفصیلات دی گئی تھیں جو اپنی بیوی کے سابقہ عشق کو جان کر نہ صرف بیوی کو معاف کردیتا ہے بلکہ بیوی کی ناجائز اولاد کو اپنے گھر تک لے آتا ہے پھر بھی بیوی، شوہر کو ذرا بھر لفٹ نہیں دیتی جس پر شوہر بیوی کے نت نئے طریقوں سے چونچلے اٹھاتا ہے اور ہر دو چار مہینوں بعد کسی نہ کسی بہانے بیوی کو بیرون ملک گھمانے لے کر جاتا ہے۔آخر میں بیوی کا سابقہ عاشق اچانک وارد ہوتا ہے۔شوہر، بیوی کو کھودینے کے خوف سے اپنی طبیعت خراب کرلیتا ہے اور تب جا کر بیوی کو احساس ہوتا ہے کہ اسے تو اصل میں اب اپنے سابقہ عاشق اور بچے کے حقیقی باپ سے محبت ہی نہیں رہی...... کہانی تو کسی نہ کسی طرح پڑھ ہی لی تھی مگر سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی گو کہ خود ابھی کنواری ہوں مگر کتنا آسان ہوگیا ہے آج کل کی مصنفات کا ناجائز اولاد کے بارے میں لکھنا...... شادی سے پہلے معاشقوں کا احوال ایسے دیتی ہیں جیسے خود ہی...... اور شوہر کا سب کچھ جان لینے پر بھی بیوی کے چونچلے اٹھانا کچھ اس مان اور حق سے لکھتی ہیں کہ بس...... ''بھئی کہاں ہوتے ہیں ایسے چونچلے اٹھانے والے شوہر...... کوئی مجھے بھی دلا دے...... زیادہ نہیں...... بس ایک ہی کافی ہے۔'' میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

ایڈیٹر کی بھی کیا زندگی ہے...... کہتے ہیں کہ کہانیاں بھی حقیقت سے ہی وجود میں آتی ہیں اور بیچارہ ایڈیٹر ساری عمر کہانیوں میں موجود حقیقت اور تخیلات کے فرق کو واضح کرتے پورا ہوجاتا ہے...... کہانی میں کرداروں کو اصل جگہوں پر پہنچاتے نہیں تھکتا...... ہر کہانی کے سبق کو نظروں میں لانے کے لیے جملوں کے ہیر پھیر کے کیسے، کیسے جتن کرتا پھرتا ہے...... مصنف کو اس کے حقیقی مقام تک پہنچانے میں ایڈیٹر ہی تو سب سے بڑا مددگار ہوتا ہے...... مگر پھر بھی بدنام ہے کہ رسالے کے لیے صرف اپنی پسند کی کہانیوں کا انتخاب کرتا ہے...... کبھی انجام تو کبھی نام بدل دیتا ہے...... بھئی اگر ہم ایسا نہ کریں تو قارئین کو جوڑے رکھنا مشکل ہوجائے اور رسالہ دو دن میں بند ہوجائے...... ابھی پچھلے ہی دنوں میری ایک مصنف دوست نے فون پر بتایا کہ اب تو اس کے سسرالی اس سے بات کرتے کتراتے ہیں یہاں تک کہ ساس صاحبہ نے جھگڑے کرنے بھی کم کردیے ہیں کہ کہیں وہ ان جھگڑوں کو من و عن کسی کہانی میں ہی نہ لکھ ڈالے...... دل تو چاہا کہ اسے بتاتی کہ بھئی مصنفین کے اگر اپنے مسئلے ہیں تو ہم ایڈیٹرز بھی کچھ کم مشکل میں نہیں رہتے۔اب یہی کیا کم ہے کہ میں اپنے خاندان میں ''ردی کی ٹوکری'' کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہوں...... پہلے پہل تو اپنے لیے ''ردی کی ٹوکری'' سننا کافی دلبرداشتہ کرنے جیسا لگا تھا...... ہوا تو بس اتنا ہی تھا کہ چھوٹے بھائی کی مہندی کی رسم کے لیے جب ہم سب تیار ہوکر مٹھائی، مہندی کی سجی ہوئی ٹرے، پھول اور دیگر اشیا کو گن رہے تھے تو میں نے بس یونہی سب

سے بڑی بہن اور سمجھدار نظر آنے کے ناتے ساتھ چلنے والے مہمانوں اور گھر والوں کو جمع کرکے ہدایات دے ڈالی تھیں کہ کون کس طرح اور کس وقت پر مایوں کی رسم کرے گا...... کس کو ہار پہنا کر مٹھائی بھی کھلانی ہے اور کون، کون فقط پھول کے ہار ڈال کر دلہن کے ساتھ بلاوجہ چمٹ کر بیٹھنے کے بجائے فوراً اسٹیج خالی کردے گا...... کس قسم کے مذاق برداشت نہیں کیے جائیں گے اور دلہن والوں کی طرف کی رسموں پر کہاں اور کب روک لگادینی ہے...... ہدایات تو اور بھی تھیں مگر بیچ میں ہمیشہ کی طرح وجیہہ نے میرا مذاق بنانا شروع کردیا تھا۔اس بیچارے کا بھی قصور نہیں وہ پچھلے دس سال سے امریکا میں مقیم تھا اور اب ہمارے سب سے بڑے پھوپی زاد ہونے کے ناتے چند ہفتوں کی چھٹی لے کر ہمارے درمیان تھا تو آئے دن ہر ایک رسم اور شادی کی تفصیلات میں طرح، طرح کے سوالات کرتے نہ تھکتا۔میری اور اس کی عمر میں بس ایک سال کا فرق تھا لہٰذا بے تکلفی بھی تھی۔جب میں نے اس کو یہ بتایا کہ میں تو صرف اس لیے یہ سب کررہی ہوں کہ مایوں کی رسم میں کسی قسم کی کوئی بدنظمی نہ ہو اور ہم سب ہر رسم، ہر وقت میں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ نظر آئیں...... کہ جب کہانیوں میں اس طرح کرداروں اور رسموں میں ہم آہنگی پڑھ کر قاری خوش ہوجاتا ہے تو اصل زندگی میں کسی رسم میں ایسا باقاعدہ ہوتا دیکھ کر لڑکی والوں پر ہمارے خاندان کا کتنا اچھا اثر پڑے گا۔ بس یہیں پر اس نے چونک کر مجھ سے میری نوکری کا پوچھا تھا اور امی جان کا فخریہ میرے بارے میں بتانا کہ میں ایک مشہور و معروف رسالے میں کئی سالوں سے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر کام کررہی ہوں، وجیہہ کو مزید شرارت پر مجبور کرگیا تھا...... اس نے پہلے تو غور سے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر مضحکہ خیز انداز میں بلند آواز میں کہا تھا۔

''اوہ اچھا تو تم ''ردی کی ٹوکری'' ہو...... یعنی یہاں کسی بیچارے نے اپنا خون پسینہ ایک کرکے کہانی لکھ کر تمہیں بھیجی نہیں کہ تم نے اسے پڑھے بغیر ردی کی ٹوکری میں ڈالا نہیں...... کیوں؟ واہ بھئی اللہ کی شان...... کیسی، کیسی شکلوں کے لوگ کیا، کیا کرنے لگ گئے......؟''

اب مسئلہ یہ آن پڑا کہ ان رشتے دار مہمانوں میں میرے ایسے بہت سے کزن یہاں تک کہ عمر رسیدہ ممانیاں اور چچیاں بھی موجود تھیں جنہوں نے مجھے کئی بار اپنی کہانیاں رسالے میں لگانے کو دی تھیں اور میں ان کو بارہا سمجھا چکی تھی کہ کسی کہانی کو پڑھ کر اس کی نوک پلک درست کرنے کے باوجود صرف میری ہی پسند پر رسالے کے لیے کہانیوں کا انتخاب نہیں کیا جاتا۔اس میں فیصلہ صرف ہماری ہیڈ ایڈیٹر کا چلتا ہے مگر وہ تمام کے تمام اپنی کہانیوں کو رسالے میں نہ پا کر صرف مجھے ہی موردِ الزام ٹھہراتے رہے تھے۔ایسے میں وجیہہ کی اس تضحیک پر سب نے دل کھول کر خوش دلی کا اظہار کیا تھا اور اس کے بعد سے خاندان بھر میں ''ردی کی ٹوکری'' میرا نام راسخ ہوگیا تھا اور اب تو مجھے بھی اپنے لیے ردی کی ٹوکری کہہ کر پکارے جانے کی اس قدر عادت ہوگئی ...... کہ اگر کسی محفل میں اپنے اصل نام سے بلائی جاؤں تو پکارنے والے کو یکسر نظر انداز کرکے آگے بڑھ جاتی ہوں۔

وجیہہ یوں تو شادی کے دوسرے دن ہی واپس امریکا سدھار گئے تھے مگر ان کے جانے کے بعد ایک ہفتے بعد ہی میرے نام پوسٹ سے ایک لفافہ آن پہنچا...... دفتر میں ہی امی جان نے فون کرکے بہت ہی خوشی اور جوش سے بتایا کہ وجیہہ نے میرے نام کچھ بھیجا ہے...... خیر گھر جا کر جو موٹا سا لفافہ کھولا تو کئی بے ترتیبی سے تہ شدہ اور مختلف سائز کے کاغذات کا اچھا خاصا بنڈل تھا...... اوپر ہی ایک چھوٹی سی پرچی لگی ہوئی تھی جس پر رائے دینے کے لیے کہا گیا تھا...... میں نے گہری سانس لی۔

''تو ان صاحب کو بھی کہانیاں لکھنے کا شوق ہوگیا ہے......'' پورا دن دفتر میں کیڑے مکوڑوں جیسی لکھائی اور اردو کی ٹانگ توڑتی تحریروں کو پڑھتے، پڑھتے اس

قدر دل اوب جاتا کہ گھر آ کر بس سکون کرنے کو چاہتا مگر یہاں امی جان نے مجھے طرح، طرح کی ہدایات دینی شروع کر دیں یہی کہ ''اتنے چاؤ سے اگر وجیہہ نے مجھے کہانیاں بھیجی ہیں تو میرا بھی فرض ہے کہ ان کا مان رکھوں......'' ہمت کر کے رات کھانے کے بعد پرچے اٹھائے تو پہلی کہانی پڑھتے ہی دماغ جھنجنا گیا۔

کہانی کسی چڑیل پر تھی جو پہلے ایک اچھی صورت کی بہت ہی معصوم سی عورت تھی مگر اس کو ایک مرد محبت کا دھوکا دیتا ہے جس کے بعد عورت خودکشی کر کے چڑیل بن جاتی ہے اور اپنے قبرستان کے باہر آتے جاتے ہر مرد کو کھانے لگتی ہے پھر اس کی ایک کالے کوّے سے دوستی ہو جاتی ہے اور پھر کالا کوّا کائیں، کائیں کر کے چڑیل کو انسان نہ کھانے پر آمادہ کر لیتا ہے......دوسری کہانیاں بھی کچھ کم اوٹ پٹانگ نہ تھیں کہ پڑھتے، پڑھتے مجھے غصہ آنے کے بجائے ہنسی آنے لگی......آخر ان سب کہانیوں کا مقصد کیا ہے؟ اوپر سے اردو اتنی خراب......لکھائی دوسری کلاس کے طالب علم سے بھی بری کہ سطریں صفحے کے آخر تک جاتے، جاتے ایک دوسرے یوں گتھم گتھا ہو جاتیں کہ اسکیل رکھ کر پڑھنا پڑتا۔

''میں جس ادارے میں کام کرتی ہوں ان کے رسالے میں مردوں کی کہانیاں نہیں لگائی جاتیں......''

دوسرے ہی دن جب وجیہہ کا رات گئے میرے پاس واٹس ایپ پر کہانیوں کے متعلق پوچھنے کا میسج آیا تو میں نے اپنی جان چھڑانی چاہی۔

''کوئی مسئلہ نہیں، تم ایسا کرو اسے کسی عورت کے فرضی نام سے لگا دو......ویسے جہاں دیدہ خاتون نام کیسا رہے گا؟'' فوراً ہی جواب حاضر تھا۔

''میں جانتے بوجھتے تو ایسا نہیں کر سکتی ناں۔'' میں نے بھی دوٹوک لکھا۔

''اوہ ہو، اچھا بھئی نہیں لگاؤ اپنے رسالے میں مگر کہانیوں پر رائے زنی تو کر سکتی ہو ناں؟''

وجیہہ کسی طرح بھی پیچھا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا......اور میں جان چھڑانے پر بضد تھی۔

''آپ کے اندر کہانیاں لکھنے کی صلاحیت ہے......آپ کوشش جاری رکھیں......ایک دن ضرور آپ اچھا لکھنا شروع کر دیں گے۔''

میں نے اب کی بار اپنا ازلی پیشہ ورانہ جملہ واٹس ایپ کر کے سکھ کی سانس لی کہ چلو بھئی قصہ مختصر ہوا۔ لکھنے کو تو میں نے لکھ دیا تھا مگر اب وجیہہ کی ایک 'ایک کوشش' مجھ پر کسی ڈرون کی طرح ہی وقت، دن، تاریخ بتائے بنا اچانک حملہ آور ہونے لگی۔ اس پر اسی رات سے واٹس ایپ پر ان کے میسجز کی لائن لگ جاتی۔ کہانیاں اوٹ پٹانگ ہونے کی حدود کو بھی پار کر گئی تھیں۔ میں بھی ان کو کہانیوں کے رموز سمجھاتی کبھی چڑ کر بے نقط سنا دیتی مگر مجال ہے جو اُن کی کہانیوں میں ذرا بھر بھی ذہنی بالیدگی یا پختگی آئی ہو۔ کٹ بحثی سے لبریز ان کے واٹس ایپ میسجز پڑھ، پڑھ کر میرا دماغ گھر پر بھی خالی ہونے لگا۔ اس طرف امی جان مجھے ایک دن بھی یہ جتائے بغیر نہ رہتیں کہ ''وجیہہ اگر مجھ سے کہانیوں کے سلسلے میں مدد لے رہے ہیں تو بڑی بات ہے......وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔'' یہ تو ہونا ہی تھا کہ خواہش ان کی سر آنکھوں پر رکھی جاتی ہے جو دل سے قریب ہوتے ہیں اور وجیہہ تو پورے خاندان والوں کے دل کیا گردے، جگر سب میں ہی سمائے ہوئے تھے......آخر کو تھے بھی تو ہیرو جیسی شکل صورت کے مالک......اوپر سے پورے خاندان کا نام بھی تو روشن کر چکے تھے۔ جب ان کو بوائز اسکاؤٹ کے طور پر پاکستان کی طرف سے حج میں خدمت کے لیے بھیجا گیا تھا تو ایک بوڑھے صاحب کو اپنے کندھے پر بٹھا کر طواف کرایا تھا اور یوں ان کو سعودی حکومت نے گولڈ میڈل سے نوازا تھا۔ ہمارے بڑوں کو نصیحت کے وقت مثال کے طور پر بس وجیہہ ہی ملتے تھے۔ ہمیں بھی ان کے قصے پوری تفصیل کے ساتھ رٹے ہوئے تھے کہ کس طرح اپنی بوڑھی بیوہ والدہ (پھوپی جان) کا سہارا بنے، کیسے اپنی محنت سے آج امریکا میں ایک مانے

ہوئے سرجن کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ ایسے میں ان کا مجھ سے اس طرح مدد لینا واقعی میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا......اب تو پھوپی جان بھی آئے دن گھر آنے لگی تھیں اور اکثر ہی مجھ سے وجیہہ کی تخلیقی صلاحیتوں پر بات چھیڑتی رہتیں۔ میں ممکن حد تک انہیں مطمئن کرتی کہ ایک دن وجیہہ کہانی لکھنے میں بھی اپنا ایک مقام بنالیں گے مگر مسئلہ تو یہ تھا کہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اور نہ جاننا چاہتا تھا کہ مجھ پر اتنی اوٹ پٹانگ سی کہانیاں پڑھ، پڑھ کر کیسی قیامتیں گزر رہی ہیں۔ مجھے ایک بات سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر اچانک وجیہہ کو کہانیاں لکھنے کا شوق کیوں ہو چلا تھا......ان کی شخصیت ہمیشہ سے بہت سنجیدہ اور کافی حد تک بارعب قسم کی رہی......ایک شخص جس نے اپنی عملی زندگی میں اس قدر محنت اور ذہنی پختگی کے ساتھ جدوجہد کی اور پھر کامیاب بھی ہو گیا اس کی کہانیاں ایسی بے ربط، فضول اور بے مقصد کیسے ہو سکتی ہیں۔ کبھی مجھے لگتا کہ وہ صرف مجھے ہی تنگ کرنے کے لیے یہ سب کر رہے ہیں مگر پھر سوچتی کہ وہ ایک مصروف، مکمل اور کامیاب انسان بھلا مجھ جیسی کے اوپر اپنا اتنا قیمتی وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔ آخر کار ایک دن میں حد سے زیادہ جھنجلا گئی......کیونکہ پہلے تو کہانیاں صرف دماغ پلپلاتی تھیں مگر اب کی بار جو وجیہہ کی طرف سے کہانی آئی اس نے میری دھڑکن ہی روک دی تھی۔

''یہ کیا لکھا آپ نے......ہوش میں ہیں کہ نہیں......؟'' میں نے رات گئے وجیہہ کو واٹس ایپ کیا۔

''بھئی اسی لیے تو میں نے آخر میں لکھ دیا تھا کہ اصل زندگی میں کسی بھی انسان سے کہانی کی مماثلت محض اتفاقی ہو سکتی ہے۔''

دوسری طرف سے بڑی چالاکی سے بات بنائی گئی اور میں ایک بار پھر سے ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی......کتنا آسان ہے کسی بھی تحریر کے شروع میں جملہ حقوق محفوظ کا پیغام دے دینا......یعنی اب کوئی بھی کبھی اس تحریر کو کہیں بھی کسی بھی طرح استعمال نہیں

دعائیہ مبارک باد

پیاری بیٹی ہنزہ کے لیے
محمد عیسیٰ کی دنیا میں آمد پر دعائیہ مبارک باد
مبارک ہو علی اور ہنزہ کو محمد عیسیٰ کی دنیا میں آمد اور یہ خوشیوں بھری ساعتیں
چہار جانب سے مل رہی ہیں علی اور ہنزہ کو مبارک بادیں
میری دعا ہے علی اور ہنزہ کو ملیں ہمیشہ اپنی اولاد سے راحتیں
محمد عیسیٰ کی عمر دراز ہو ہمیشہ دور رہیں اس سے زمانے کی آفتیں محمد عیسیٰ پر رہیں ہمیشہ رب کریم کی خاص عنایتیں
محمد عیسیٰ پائے ہمیشہ دادا، دادی اور نانا، نانی کی شفقتیں
محمد عیسیٰ پائے ہمیشہ مما، بابا کی محبتیں
محمد عیسیٰ پائے ہمیشہ زندگی میں سارے جہاں کی نعمتیں
محمد عیسیٰ کے ساتھ رہیں ہمیشہ رب کریم کی رحمتیں
قائم رہیں ہمیشہ علی اور ہنزہ کے آنگن کی یہ مسرتیں

دعا گو: شاعرہ صبا آصف، کراچی

کر سکے گا کاش کہ ہم اپنے اوپر گزر چکے وقت، حالات اور صدموں کے بھی ایسے ہی جملہ حقوق محفوظ کر سکتے اور پھر اس ایک خود پر ''گزر چکے صدمے'' کو صرف اس وقت اس لمحے میں دوبارہ پلٹ کر نہ دیکھنے کے لیے چھوڑ سکتے......کوئی بھی کبھی ہمیں یاد نہ دلا پاتا......کسی کو اجازت نہ ہوتی کہ اس ایک لمحے پر بات کر سکتا......یہاں تک کہ اپنا دل بھی......کاش یہ میرا دل بھی بھول جاتا......گو میں ایک ایڈیٹر ہوں مگر کیا ایڈیٹروں کے اپنے پاس کہانیاں نہیں ہوتیں؟ ہم بھی کہانیاں بنا سکتے ہیں، ہم بھی کہانیاں لکھ سکتے ہیں۔

ہاں ہے میرے پاس بھی ایک کہانی جو سنانی ہے یا پھر لکھنی ہے...... مگر اس کا سننے والا یا پڑھنے والا ابھی تک کوئی پیدا نہیں ہوا...... میں ٹھیلے پر سجائے کہانیاں پھر رہی ہوں...... ایسے ہی جیسے کبھی میں نے دیکھا تھا کہ حالات خراب ہوجانے پر کسی نے اپنے گھر میں اپنے ہی استعمال شدہ سامان کو بیچنا شروع کر دیا تھا اور شرمندہ بھی نہیں تھا کیونکہ اس کی بے بسی، بے کسی اس کی شرمندگی سے بڑھ کر تھی پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کا ایک خاص سامان جس کو انہوں نے بڑی محبت سے سینچ، سینچ کر رکھا تھا کسی قدردان خریدار کے انتظار میں پڑا رہا اور پھر جب سارا سامان بک گیا اور اس ایک خاص کے لیے کوئی قدردان نہ مل سکا تو وہ خاص بھی باقی تمام عام کی طرح کوڑیوں کے مول کسی کے ہتھے لگ گیا پھر بھی انہوں نے اس اجنبی کو بہت، بہت ہدایات دیں۔

''دیکھو اس کا خیال رکھنا...... اس کو عادت نہیں...... یہ بڑے ناز نہیں تو بہر حال بہت عزت و احترام سے رکھی گئی ہے...... گھر کی زینت بنی رہی ہے...... بہت محبت اور حفاظت میں رہی ہے......'' خریدار نے سر ہلا، ہلا کر سنا اور پھر وہ چیز بھی جو کسی کی بہت خاص چیز تھی کسی ناقدرے کے ہاتھوں لگ کر آخر کار مٹی میں مل گئی۔

میری یہ کہانی بھی بڑی حفاظت سے میرے ٹھیلے پر سجی ہوئی تھی...... مگر یہ کسی خاص کے لیے تھی...... کوئی ایسا جو اس کی قدر و منزلت کا احساس کر کے اسے مجھ سے بڑے چاؤ سے سنتا...... میں اسے سناتی تو وہ اس کی عزت و احترام کرتا، اپنے دل میں جگہ دیتا...... گو میں جانتی تھی کہ ایسا قدردان ملنا تو اب ناممکن ہے کہ انسان ایک ہی بار مٹی میں مل سکتا ہے اور مٹی میں مل جانے کے بعد جملہ حقوق محفوظ کا لیبل چسپاں کرنا کیسا بیکار کیسا بے معنی سا عمل ہے، میں جانتی تھی کہ میری اس کہانی پر آئے دن خاندان میں نئے، نئے زاویوں اور طریقوں سے رائے زنی ہوتی تھی مگر وجیہہ سے مجھے ایسی امید نہیں تھی کہ وہ بچپن سے حساس تھا، اس کے ساتھ کئی بار کھیل کود میں تو، تو میں، میں ہوئی مگر وہ تھوڑی ہی دیر میں میرے سامنے اڑنے کے بجائے اپنی ہار مان لیتا۔ پھر تھوڑی عقل آتے ہی وجیہہ نے جدوجہد...... کا راستہ چن لیا تھا...... میری شادی پر پھوپی کے ذریعے ہی وجیہہ نے مبارک باد بھیجی تھی اور طلاق پر اس نے مجھے فون کیا تھا مگر ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہہ سکے تھے اور کافی دیر خاموش رہنے کے بعد فون بند کر دیے گئے تھے اس کے بعد جہاں باقی رشتے دار مجھ سے باقاعدہ کترانے لگے تھے، وجیہہ کی طرف سے اکثر ہی خیریت کا میرے موبائل پر میسج آجاتا تھا...... ان سب چھوٹی، چھوٹی باتوں سے میرے دل میں خود بخود وجیہہ کے لیے عزت پیدا ہوگئی تھی اور میں غیر ارادی طور پر اس سے آپ جناب سے بات کرنے لگی تھی...... ایسے میں پتا نہیں کیوں مجھے لگا تھا کہ وہ مختلف ہے اور اب وجیہہ کی اس حرکت سے مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ میں نے فیصلہ کر کے دوبارہ وجیہہ سے بات نہ کرنے کا عہد کر کے اس کو واٹس ایپ پر بلاک کر دیا اور خاموشی اختیار کر لی...... ویسے بھی میں حال ہی میں اپنے چھوٹے بھائی کی شادی میں دیکھ چکی تھی کہ وجیہہ کی بس ذرا سی توجہ دلوانے کے لیے خاندان کی تمام چچیاں، پھوپیاں، ممانیاں اور خالائیں کیسے، کیسے اپنی بیٹیوں کو ایڑی چوٹی کا زور لگوا چکی تھیں...... اور اب تک تو یہ بات بھی تقریباً سب ہی جان گئے تھے کہ وجیہہ مجھ سے کہانیوں کے سلسلے میں اصلاح لینے لگے ہیں اور پھر پھوپی جان کا آئے دن ہمارے گھر کا چکر...... یہ سب کچھ خاندان میں... چہ مگوئیاں بیدار کر سکتا تھا یوں بھی اب میں اس طرح کی چہ مگوئیاں کے لیے کافی موزوں اور آسان شکار تھی۔

''جب گروپ فوٹو کھنچوائی جا رہی تھی تو ایک کے بعد دوسرے خاندان کی بہت ہی اہم شخصیات کے اضافے کے ساتھ ہی تم جگہ بنانے کے چکر میں سرک کر اسٹیج کے بالکل کونے پر جا کھڑی ہوئی تھیں...... میں نے

تو اسی وقت تاسف سے تمہاری کم مائیگی یا پھر احساسِ کمتری پر غصہ کیا تھا...... کیا ضروری تھا کہ کسی کے بھی گروپ میں اچانک شامل ہونے پر تم ہی کھسک کر جگہ بناتیں؟ تم تو خود دولہا کی بڑی بہن تھیں جس کا اسٹیج پر دولہا کے بالکل ساتھ کھڑا ہونا بنتا تھا، تم کیوں کسی کے لیے بھی اپنی جگہ سے دوسری جگہ جاتیں...... مسئلہ کیا تھا بس دھڑلے سے اپنی جگہ جمی رہتیں...... جو آرہا تھا تو اپنی مرضی سے آرہا تھا...... تمہاری دعوت پر تو نہیں شامل ہو رہا تھا جو تم احساسِ ذمے داری میں مری جا رہی تھیں...... مگر نہیں یہ تمہاری احساسِ ذمے داری، محبت یا احسان کی روش نہیں بلکہ یہ تمہارا احساسِ کمتری تھا جو تمہیں یوں ہر جگہ ذلیل ہی کرواتا ہے اب کس کو فرصت ہوگی کہ اتنے خوب صورت اور ہشاش بشاش چہروں کے گروپ فوٹو میں کونے میں دبکی اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کی کوشش میں نیچے دیکھتی ہوئی کسی 'ردی کی ٹوکری' کو ڈھونڈے......؟ نام کی ایڈیٹر ہو تم...... اپنی جگہ تک تو بنائی نہیں جاتی...... پتا نہیں کہانیوں میں کرداروں کی صحیح جگہ کا کیسے تعین کرتی ہوگی؟''

ایک بار پھر جو پرچوں کا بنڈل ملا تھا اس میں پہلے ہی صفحے پر اس تحریر کو پڑھ کر میرے چودہ طبق روشن ہو رہے تھے...... تو وجیہہ نے طے کر لیا ہے کہ وہ مسلسل اپنی کہانیوں میں مجھے لکھتے چلے جائیں گے اور پھر چاہیں گے کہ مجھ سے ہی اصلاح بھی لیں...... ان سے کسی بھی قسم کی کوئی بات کرنے کا اب فائدہ نہیں تھا...... ان کی طرف سے اب بھی مسلسل اسی طرح کہانیاں مل رہی تھیں مگر اب ہم رات گئے تک ایک دوسرے سے واٹس ایپ پر الجھنا چھوڑ چکے تھے...... نہ چاہتے ہوئے بھی میں کہانیاں ملتے ہی پڑھنے بیٹھ جاتی اور آج کی یہ چند سطریں پڑھ کر میں نے بجھے دل سے بھائی کی شادی کی وہی گروپ فوٹو دیکھی تھی...... واقعی میں کس قدر کونے میں دبکی کھڑی ہوں کہ مشکل سے ہی نظر آرہی ہوں...... پتا نہیں کب وجیہہ نے یہ سب نوٹ کیا اور اگر کر ہی لیا تھا تو لے آتے استعمال میں اپنی کسی کہانی میں خاموشی سے چپکے سے...... مجھے بتائے جتائے بغیر مگر نہیں...... وہ تو جیسے مشاہدے کی اپنی تمام تر صلاحیتوں کو فقط مجھ پر ہی آشکار کرنے پر بضد تھے۔

''اور پھر وہ زاہدہ...... مہندی کے اختتام پر کس طرح تم سے کہنے لگی کہ وہ تو چمکتے ہوئے صاف گلاس میں پانی پیتی ہے اور تم جو خود اتنی تھکی ہوئی تھیں میز سے تین چار گلاس سمیٹ کر کسی بیرے کی طرح لے گئیں اور پھر پتا نہیں تم نے کس طرح دھو دھا کر وہ گلاس واپس لا کر رکھے تھے کیونکہ زاہدہ میرے سامنے ہی ایک بیرے سے گلاس دھو کر لانے کا کہہ چکی تھی اور بیرے سے ٹکا سا جواب بھی پا چکی تھی۔ ''کھانے کے سمیٹے جانے کے بعد اگر اتنا ہی صاف گلاس چاہیے تو خود تکلیف اٹھالے......'' تمہیں ذرا شرم نہیں آئی تاں اس طرح زاہدہ کی ماسی گیری کرتے ہوئے؟ اصل میں تم واقعی میں ایک ''ردی کی ٹوکری'' بن گئی ہو بس لوگوں کو اسی وقت یاد آتی ہو جب ان کو اپنا کچرا ٹھکانے لگانا ہو، اس کام کے علاوہ کوئی تمہارے قریب تک نہیں پھٹکتا...... اور ایسا بن جانے میں خود تمہارا اپنا ہاتھ ہے۔''

''آخر آپ چاہتے کیا ہیں مجھ سے؟ کیوں مجھے اس طرح تکلیف دے رہے ہیں؟'' آخر کار ایک دن میری حد ہوگئی اور میں نے غصے سے واٹس ایپ کیا۔

''میں تو تم سے وہی چاہتا ہوں جو پہلے دن سے چاہتا تھا...... کہانی لکھی ہے تم اصلاح کر دو اور ہاں یہ بھی بتا دو کہ اس کا انجام کیا ہونا چاہیے۔'' جواب معصومیت سے دیا گیا جیسے ہمارے درمیان کوئی ان بن کبھی ہوئی ہی نہ ہو۔

''میں ایڈیٹر ہوں جناب وجیہہ صاحب...... مصنف نہیں کہ کہانیوں کے انجام بجھاتی پھروں سمجھے آپ...... اپنی کہانی خود مکمل کریں۔'' میں نے جھنجلا کر جواب دیا۔

''سوچ لو پھر تم کہیں یہ اعتراض نہ کرو کہ فلاں کردار کا تو کہانی میں کام ہی نہیں تھا زبردستی ڈالا گیا اور ہیروئن جس کو بنایا گیا اس کی جگہ وہ جو سائڈ ہیروئن تھی

اسے مرکز میں لے آتے تو کہانی اچھی بن جاتی......اور وہ ہیرو پوری کہانی میں کالے کوّے کی طرح کائیں، کائیں کیوں کرتا رہا......؟''

''آپ چاہیں تو چڑیلوں کی کالے کوؤں سے شادیاں کرائیں، چاہیں تو چھانگا مانگا کے جنگلوں میں ہیرو ہیروئن کو مور کی طرح نچوائیں......میری جان بخش دیں بس......مجھے معاف کریں......میرے متعلق اس طرح پرچے بازی بند کریں......رحم کریں مجھ پر......پلیز میں بہت تھک گئی ہوں۔''

دوسری طرف خاموشی چھا گئی اور میں مطمئن سی ہو کر آنسو بہانے لگی...... سچ بات تھی انہوں نے جم کر مجھے میری کم مائیگی اور کم حیثیت کا احساس دلا دیا تھا۔میں جس حقیقت سے دور بھاگ رہی تھی وہ اچانک میرے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور دل بہت اداس ہو گیا تھا......جب وجیہہ جیسے انسان سب کچھ دیکھ کر اتنی تفصیل سے لکھ سکتے تھے تو پھر دنیا نے کیا، کیا نہ محسوس کیا ہوگا......سچ ہی تو کہتے ہیں لوگ کہ کہانیاں، حقیقت سے ہی جنم لیتی ہیں......مگر ایسی کہانیاں ہوتی بہت جان لیوا ہیں......کہتے ہیں کہ کھل کر رونے کے بعد نیند بہت اچھی آتی ہے لہٰذا میں بھی روتے، روتے کب بے سدھ سو گئی پتا ہی نہیں چل سکا......

رات کے کسی پہر آنکھ کھلی، کمرے کی بتی جلی ہوئی تھی اور میں اس طرح دوبارہ سو جانے پر بضد تھی اور پھر یوں ہی کروٹ بدلتے ہوئے سرہانے بکھرے وجیہہ کے حالیہ بھیجے ہوئے بہت سے پرچوں میں سے ایک اٹھا لیا......کہانی ویسی ہی اوٹ پٹانگ تھی مگر اچانک مجھے احساس ہوا تھا کہ ان تمام ہی کہانیوں میں چاہے جیسے بھی حالات دکھائے گئے ہوں آخر میں کسی نہ کسی طرح ہیروئن کو پار لگا دیا گیا تھا......پار لگانے میں... مددگار بہت ہی عجیب و غریب کردار تھے کبھی کالا کوّا تو کبھی جنگل میں ناچتا مور کبھی کوئی پتنگا یا پھر بہت ہوا تو لنگور......شاید یہی وجہ تھی کہ میں تمام تر خامیوں کے باوجود کہانیاں پڑھتی رہی تھی......شاید کہیں دل سے میں بھی یہی چاہتی کہ کرداروں کو منزل مل جائے وہ بھٹک گئے ہیں تو راستہ پالیں......ایک بار پھر میں مسکرا گئی جو بوجھ کئی دنوں سے دل پر محسوس ہو رہا تھا وہ اتر گیا......جیسے اچانک کسی نے ہاتھ سے پکڑ کر گردن تک آ چکی دلدل سے مجھے باہر کھینچ لیا تھا......صبح اٹھ کر جب میں دفتر جانے کی تیاری کر رہی تھی تو واٹس ایپ دیکھنے کا اتفاق ہوا......چند ایک معمول کے میسجز اور اس کے بعد وجیہہ کا میسج۔

''میں نے کہانی مکمل کر لی ہے اور کیونکہ تم نے مجھے اجازت دے دی تھی اس لیے انجام بھی اپنی ہی مرضی کا دیا ہے......ٹھیک ہے ناں......؟اب برداشت کرنا نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

آج کئی دنوں بعد میں دفتر جانے سے پہلے گھر والوں کے ساتھ ناشتا کرنے بیٹھی تھی کہ اچانک امی جان مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

''آج تمہاری بڑی پھوپی ہار پھول مٹھائی لا رہی ہیں اس لیے تم جلدی گھر آ جانا......سمجھیں......''

چھوٹے بھائی کی بیوی شوخی سے چہکتی مجھ سے لپٹ گئی اور ناشتے پر موجود تمام ہی لوگ خوش دلی سے ایک دوسرے کو مبارک سلامت کہنے لگے۔

''ارے......مگر اتنی ابتری میں؟ اتنی جلدی میں کیسے......؟'' میرے منہ سے بدحواسی میں نکلا......سب کو سانپ سونگھ گیا۔

''ابتری......جلدی......کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' آخر کار امی جان نے کچھ دیر مجھے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا......میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''کچھ نہیں، وہ میں رات ایڈٹ کرنے کے لیے ایک ناول پڑھ رہی تھی ناں تو......اس میں......اس میں مطلب یہ کہ کہانی کا انجام بہت ابتری میں کر دیا گیا تھا......بس وہی منہ سے نکل گیا۔''

میں سب کی تولتی نظروں سے خود کو بچاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

آج پھر اس کی تائی کے سامنے پیشی تھی۔ وہ غضب ناک نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بے نقط سنا رہی تھیں۔

''آج کے بعد اگر کھانے میں نمک زیادہ ہوا تو دیکھ لینا لڑکی، میں تمہارا وہ حشر کروں گی کہ دنیا دیکھے گی۔'' انہوں نے شہادت کی انگلی اٹھا کر جیسے آخری دھمکی دی۔

عشال نے بے تاثر نگاہوں سے انہیں دیکھا اور پھر سامنے پردے کے ڈیزائن پر نظر جما دی۔

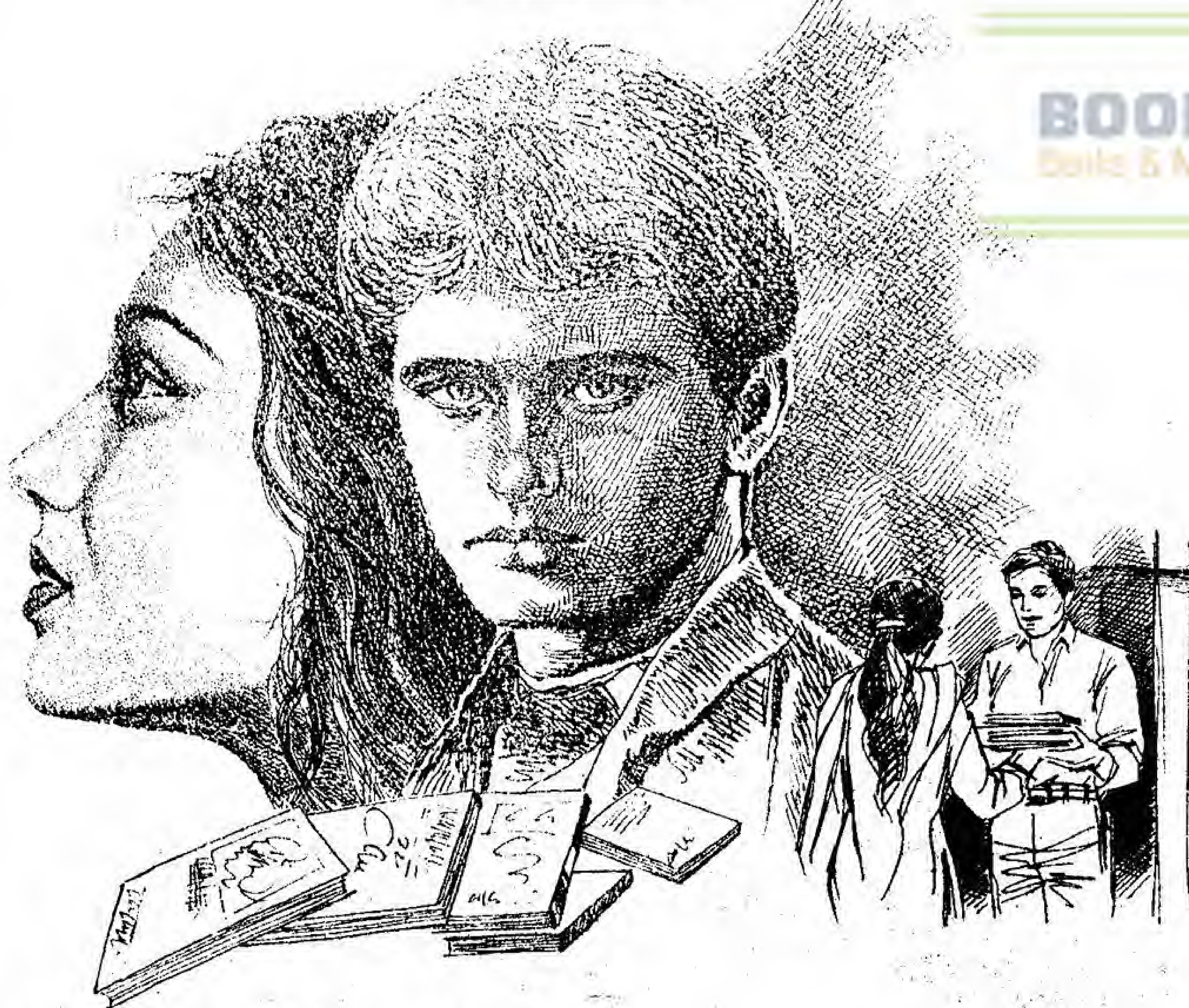
''اب منہ میں گھنگنیاں ڈالے کیوں بیٹھی ہو۔ کہو کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔'' وہ اس کے بے نیاز انداز پر تپ ہی تو گئیں۔

پردے سے نظر ہٹا کر اب وہ بیڈ شیٹ کے پرنٹ کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''لڑکی بہری ہو گئی ہو کیا؟ اِدھر دیکھو میری طرف۔'' انہیں اپنی گفتگو کے ضائع جانے کا احساس

محبت جگنوؤں سی روشنی

فرح بھٹو



آگ لگا گیا۔

''میرا نام عشال ہے تائی۔'' وہ بڑے آرام سے بولی۔

''ہاں، ہاں بھلے سے عشال ہو یا مشعال۔ کان کھول کر میری بات سنو اور عمل بھی کرو۔'' وہ چیں بہ جبیں ہوئیں۔

''کبھی کہتی ہیں میری طرف دیکھو، کبھی کہتی ہیں کان کھولو۔ کوئی ایک کام بتائیں تائی۔'' وہ اکتائے ہوئے انداز میں بازو لپیٹ کر کھڑی تھی۔

تائی نے غصے کے گھونٹ بھرے۔

''تم جان کر مجھے تپا رہی ہو۔ میرا بلڈ پریشر بڑھا رہی ہو۔ ناصرہ اری او ناصرہ۔'' چیخ کر بولتے ہوئے ان کا بھاری وجود اتھل پتھل ہونے لگا۔

''جی بھابی!'' ناصرہ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوئیں۔

''اپنی ڈھیٹ بیٹی کو سنبھالو۔ اس کو سمجھاؤ کہ کھانے میں نمک کم ڈالا کرے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔'' تائی نے کڑے انداز میں کہا تو ناصرہ نے عشال پر ملامتی نظر ڈالی۔ جو ہنوز بے نیاز سی کھڑی کمرے کی سیٹنگ پر غور کر رہی تھی۔

''دیکھو کیسے ڈھیٹ بن کر کھڑی ہے۔ بڑوں سے جتنی بدتمیزی اور منہ ماری یہ کرتی ہے ناں یہ سب تمہاری تربیت ہی کا نتیجہ ہے۔'' وہ اب ناصرہ پر چڑھ دوڑی تھیں۔

''آپ فکر نہ کریں بھابی، میں سمجھا دوں گی اسے۔'' وہ اتنا ہی کہہ سکیں۔

''اچھے سے سمجھانا۔ ورنہ اس کی کھال کھینچ کر اسی دیوار پر ٹانگ دوں گی جسے یہ دیکھ رہی ہے۔'' وہ تنفر سے بولیں تو عشال نے نظریں گھما کر اُن کا غرور جانچا۔

''پہلے کسی قسائی کی دکان پر کام کرتی تھیں کیا؟'' وہ بڑبڑائی تھی ناصرہ اس کا جملہ سن کر گھبرا گئیں اور بھابی کی طرف دیکھا۔ جو عشال کے ہلتے لبوں پر کان لگانے کی کوشش میں مصروف تھیں۔

''کیا کہہ رہی ہو ذرا اونچا بولو۔'' وہ تجسس سے بولیں تو عشال مبہم سا مسکرا دی۔

''کچھ نہیں۔'' وہ اطمینان سے کہہ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ پیچھے تائی دیر تک اماں کو لیکچر سناتی رہیں۔

☆☆☆

''عشال تم کیوں بھابی کو زچ کرتی رہتی ہو۔ اپنی اور میری زندگی عذاب میں ڈال دی ہے تم نے۔ اچھی بھلی کوکنگ تمہیں آتی ہے پھر نمک کیوں زیادہ ڈال دیتی ہو۔'' اماں، تائی کے کمرے سے سیدھا اس کی خبر لینے آئیں۔

''کوکنگ کا نہ مجھے شوق تھا نہ ہی ضرورت۔ زبردستی کچن میں دھکیلا ہے تو اب مزہ چکھیں۔'' عشال نے تڑخ کر اپنی بات کہی اور بستر جھاڑنے لگی۔

''یہ حذیفہ بھی ہر وقت بیڈ پر چڑھا رہتا ہے۔ کتابیں لے کر جیسے بقراط تو بن ہی جائے گا۔'' وہ بیڈ شیٹ کی شکنیں درست کر کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''عشال تم بہت ستا رہی ہو۔ قزلباش حیات ہوتے تو تمہیں انہی سے سیدھا کرواتی۔'' وہ روانی میں بول کر پھر افسردگی میں گھر گئیں۔ باپ کے نام پر عشال کے حلق میں پانی کا گولہ سا اٹکا۔

''وہ ہوتے تو میں ایسی ہوتی کیا؟'' اس نے بھرائی آواز میں کہا تو ناصرہ بے چین ہوئیں۔

''آج سفید اوور آل پہنے، اسٹیتھو اسکوپ گلے میں ڈالے میڈیکل کالج نہ جا رہی ہوتی۔ جیسے حدیقہ جاتی ہے؟'' وہ حسرت آمیز لہجے میں کہہ کر خاموش ہوئی۔

''سیلف فنانس پر ایڈمشن لے کر خود کو بڑی چیز سمجھ رہی ہے۔ میں تو پیور میرٹ پر داخلہ لے کر دکھاتی اماں۔''

''بس بیٹا، بھول جاؤ اب!'' اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا تو عشال نے شاکی نظروں سے انہیں دیکھا۔

''اپنا شوق بھول جاؤں لیکن بابا کی خواہش۔''

''عشال...... دیکھو، میرے یہ ہاتھ بندھے ہیں۔'' اماں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے آگے کیے۔

''ہم اتنے مجبور نہیں ہیں اماں جتنا آپ سمجھتی ہیں۔'' عشال نے ان کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھے۔

''آپ ذرا سی ہمت تو کریں، ہم اپنے فلیٹ میں جا کر رہ سکتے ہیں۔ بابا کی پینشن سے بہ آسانی گزارہ ہو جائے گا اماں۔'' وہ پُرجوش انداز میں ان کے ہاتھ دباتے بولی تو وہ دھیرے سے مسکرا دیں۔

''تم کیا سمجھتی ہو مجھے یہاں رہنے کا شوق ہے؟ تم دونوں کی خاطر بھابی کا تلخ رویہ ہنس کر برداشت کر رہی ہوں کہ زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ ایسا ٹھکانا کہیں اور میسر نہیں ہے۔ ایک جوان بیٹی اور کمسن بیٹے کو لے کر میں تنہا فلیٹ میں نہیں رہ سکتی۔'' ان کی بات پر عشال نے برا سا منہ بنایا۔

''تو وہاں ہم پر کون سے بارود برسیں گے جو یہ گھر ہمیں ان گولیوں سے بچا رہا ہے۔''

''ایک بیوہ عورت بارود کے دہانے پر ہی بیٹھی ہوتی ہے بیوقوف!'' ناصرہ نے جیسے سر پیٹا۔

''اب زیادہ بحث نہیں۔ آئندہ بھابی کو شکایت کا موقع نہ دینا۔'' انہوں نے اپنی طرف سے بات ختم کی۔

''اونہہ...... ہمیں بھلے کتنی شکایتیں ہوں ان سے بس اُن کو شکایت کا موقع نہ ملے۔'' وہ بڑبڑا کر بستر سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

''عشال میرے کپڑے پریس کر دو۔ صبح میڈیکل کالج جانا ہے۔'' رات کے کھانے کے بعد حدیقہ اپنے کپڑے بازوؤں میں اٹھائے چلی آئی تو عشال نے کھا جانے والی نظر اس پر ڈالی۔

''میں کیوں پریس کروں، تمہارے ہاتھ کیا گھاس توڑنے گئے ہیں۔'' وہ حسبِ عادت تڑخ کر بولی۔

''چچی آپ اسے دیکھ رہی ہیں۔ چھوٹا سا کام کہہ دو تو کس طرح لڑتی ہے۔'' حدیقہ نے ناصرہ کو متوجہ کیا۔

''عشال، بہن کہہ رہی ہے تو استری کر دو ناں...... دیر کتنی لگے گی۔ اسے پڑھائی بھی کرنی ہے۔''

اماں کی بات پر عشال نے خون کا گھونٹ بھرا اور ناچار حدیقہ کے ہاتھ سے کپڑے لے لیے۔

''دھیان سے پریس کرنا۔ خاص طور پر میرا اوور آل۔'' حدیقہ نے فاتحانہ انداز میں اترا کر کہا۔

عشال نے ناک پھلا کر اسٹینڈ پر کپڑے رکھے اور استری آن کی۔

دل تو چاہ رہا تھا کپڑوں کو ایسا جلائے کہ چیتھڑے بھی نظر نہ آئیں۔ پھر اپنی خواہش دبا کر شرافت سے کپڑوں پر استری پھیرنے لگی اور پریس کر کے حدیقہ کو دینے اس کے کمرے کی جانب بڑھی۔

دروازے پر ہی تائی کی اونچی بڑبڑاہٹ نے قدم جکڑ لیے۔

''ساری دنیا کے یتیم، یسیر ہمارے پاس منہ اٹھا کر ایسے دوڑے چلے آ رہے ہیں جیسے یہاں کوئی لنگر کھلا ہو۔''

''اب کون آ رہا ہے اماں؟'' حدیقہ نے موبائل پر انگلیاں چلاتے پوچھا۔

''ارحام آ رہا ہے ہمارے سر پر سوار ہونے۔ اسی شہر میں کوئی چھوٹی موٹی نوکری ملی ہے نواب صاحب کو۔ سو جب تک اپنا تبادلہ سکھر کروائے ادھر مونگ دلے گا۔'' آصفہ نے فون کھڑکایا اور تمہارے ابا جی جان سے تیار ہو گئے۔'' تائی نے زہر برساتے لہجے میں تفصیل سنائی۔

''ایک ناصرہ اور اس کے دو فتنے کم تھے کہ اب آصفہ اپنا فتنہ بھیج رہی ہے۔''

''ہم...... خیر ہمیں کیا کرے گا۔ سارا دن تو جاب پر ہوگا۔'' حدیقہ نے کندھے اچکائے۔

''دو وقت تو اِدھر سے ہی ٹھونسے گا ناں۔ بجلی، پانی، رہائش مفت ملے گی۔'' وہ اپنی مخصوص نچلے درجے کی سوچ پر اتری ہوئی تھیں۔

عشال نے سر جھٹکا اور کمرے کے اندر چلی آئی۔

''لو حدیقہ تمہارے کپڑے۔''

اس نے کپڑے پٹخنے کے انداز میں بیڈ پر رکھے۔

''عشال انہیں ہینگ کر دو اُدھر۔''

حدیقہ نے الماری کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہیں نہ لٹکا دوں ہینگر میں۔'' عشال نے

صرف سوچا اور واپس مڑ گئی۔
''اوہو، نخرہ تو دیکھو نواب زادی کا، ایسے ہی بیڈ پر پھینک گئی۔''
تائی کی بڑبڑاہٹ تیز ہوئی پر عشال نے پروا نہ کی۔

☆☆☆

''عشال، رات کے کھانے میں بس مونگ کی دال بنالو اور چپاتیاں، دال ذرا پتلی رکھنا۔ باپ کا گھر سمجھ کر ہر چیز استعمال کرتی ہو۔'' تائی کچن میں اس کے سر پر کھڑی تھیں۔
''اتنا سادہ مینو؟'' عشال نے کچھ حیران ہو کر انہیں دیکھا۔
''اور ہاں نمک بھلے جی بھر کر ڈالنا آج...... تمہیں بہت شوق ہے ناں۔''
وہ کہہ کر چلی گئیں تو عشال مارے حیرت کے بے ہوش ہونے لگی۔
پھر وہ ڈائننگ میز پر کھانا چننے آئی تو صرف اماں اور ارحام کو بیٹھا پایا۔
''تائی والے کہاں ہیں؟''
''معلوم نہیں غالباً کسی دعوت میں گئے ہیں۔''
ارحام نے بتایا تو وہ سب کچھ سمجھ کر سر ہلانے لگی۔
''حذیفہ، کھانا کھالو۔''
اماں نے آواز لگائی تو وہ کمرے سے نکلا۔
عشال بھی وہیں بیٹھ گئی۔ چاروں خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔
''یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ تم نوکری سے لگ گئے۔ آصفہ بہن کی جدوجہد کام آئی۔ بیوگی کے کڑے دن بہت صبر سے کاٹے اس نے۔''
اماں نے بات شروع کی تو ارحام کا ہاتھ کھانے سے رک گیا۔
''جی مامی، آپ کی طرح اماں بھی سسرال کی چھت تلے خود کو محفوظ سمجھ رہی تھیں۔ سو انہیں ہر طرح کا صبر کرنا پڑا۔'' اس کی بات عام سی مگر لہجہ گہرا تھا۔
''بیٹا اکیلی عورت پھر کہاں جائے...... بچے جن کا خون ہوتے ہیں وہ پھر بھی لحاظ کر لیتے ہیں۔ میکے میں تو والدین کے بعد جیسے بیگانے افراد بستے ہیں۔'' وہ آہ بھر کر خاموش ہوئیں۔
''مامی وقت برا ہو تو سب بیگانے ہی ہو جاتے ہیں۔'' وہ آہستگی سے کہہ کر کھانے کی طرف متوجہ ہوا۔
''بیگانے نہیں ظالم جابر حکمران...... دو نوالے کھلا کر لوگوں کو اپنا زر خرید سمجھ لیتے ہیں۔'' عشال کا لاوا باہر نکلا۔ ارحام نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''اس لڑکی کی زبان تو سات گز کی ہے۔'' ناصرہ کو ایک دم غصہ چڑھا۔
''آپی کی زبان آپ نے کب ناپ لی اماں۔'' حذیفہ نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔
''چپ بدمعاش۔'' دونوں بھائی بہن نے مجھے ستانے کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ جیٹھ جی کی مہربانی ہے کہ سر چھپانے کو بیوہ بھابی کو اپنے گھر میں آسرا دیا اور یہ دونوں ہیں کہ خود کو نواب سمجھے بیٹھے ہیں۔'' ناصرہ نے ارحام سے رونے روئے۔
''تو نوکر بن جائیں تائی کے؟ مجھے کچن میں جھونک رکھا ہے میرے بھائی کو باہر کے کاموں پر لگایا ہوا ہے۔ میرا تو بیڑا غرق ہو گیا ناں ڈاکٹری پڑھنا تھی نہیں پڑھ سکی۔ اب اسے بھی ناکارہ بنا دیں گی فضول کے کام کروا کر۔'' عشال جذباتی ہوئی۔
''مصلحت اندیشی سے تو دور کا واسطہ بھی نہیں اس لڑکی کا...... خدا ہی اسے عقل دے۔ کسی سے بنا کر نہیں رکھنا۔ سب سے بگاڑنا ہے۔ یہ چھت بھی گنوا دی تو روڈ پر رہیں گے تینوں۔'' وہ سر پر ہاتھ مار کر بولیں۔
''اس گھر سے تو بہتر ہوگا وہاں کم از کم کسی کی باتیں تو سننا نہیں پڑیں گی۔'' عشال نے پٹ سے کہا۔
''دیکھ رہے ہو بیٹا اس کی حرکتیں۔'' ناصرہ نے ارحام کو مخاطب کیا جو کافی سالوں بعد اپنی اس کزن کو ملاحظہ فرما رہا تھا۔
''غلط کیا کہا ہے میں نے؟'' عشال دال چاول مکس کر کے چمچ بھر کر کھاتی رہی۔
ناصرہ کھانا کھا کر عشا کی نماز پڑھنے چلی گئیں۔

حذیفہ بھی جلد ہی اٹھ کر بھاگا تھا۔
پیچھے میز پر یہ دونوں رہ گئے۔
''بہت بدظن ہو تم ان لوگوں سے عشال۔''
ارحام نے کہا تو اس نے ٹیڑھی نظر اس پر ڈالی۔
''لوگوں سے حسنِ ظن رکھ کر منہ کی کھائی ہے۔ یہ بدظنی ہی اچھی۔''
''دوسروں سے بدظن ہونا، جلنا کڑھنا انسان کی اپنی صلاحیتیں تباہ کر دیتا ہے عشال۔'' ارحام نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔
''صلاحیتیں تو تباہ ہو چکی ہیں۔ انٹر میں اتنے اچھے مارکس لیے۔ انٹری ٹیسٹ کی تیاری کر رہی تھی کہ بابا چل بسے۔ تائی نے اکیڈمی سے ہٹا دیا۔ میرا ذہن بھی زندگی کی ڈسٹربنس میں ٹھس ہو گیا۔ ایک سال ضائع ہو گیا اس دوران حدیقہ کو سیلف پر پرائیویٹ میڈیکل کالج میں ایڈمشن دلوا دیا گیا۔ میرے زخم ہرے ہو گئے...... جواب تک ہرے ہیں۔ وہ میڈیکل کے فورتھ ائیر میں ہے اور میں سمپل بی اے کر کے گھر بیٹھی ہوں۔ اب بھی کچھ نہ کہوں؟'' وہ تلخی سے کہتی رہی۔
''اس سب میں قصور کس کا ہے؟'' ارحام نے بڑے نرم لہجے میں سوال کیا۔
''حالات کا...... بابا کی وفات کا...... میری قسمت کا...... اور تائی کی خود غرضی کا۔'' عشال نے جل کر گنوایا۔
''نہیں...... تمہارا اور صرف تمہارا۔'' ارحام نے کہا تو عشال نے چونک کر دیکھا۔
''تم نے اپنی صلاحیتوں کو صرف ایک نقطے پر رکھا اور اپنی ساری توانائی اسی پر لگائی۔ کسی وجہ سے تمہارا وہ مقصد پورا نہ ہوا تو تم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئیں اور لگیں دوسروں کو کوسنے......'' وہ ہلکے سے مسکرایا۔
''کیا مطلب؟'' عشال نے غصے سے پوچھا۔
وہ یہ کیا کہہ رہا تھا۔
''تم ایک ذہین لڑکی ہو عشال۔ بچپن میں مجھ سے تو پڑھائی میں کئی گنا تیز تھیں۔ صرف ڈاکٹر بننا اپنا ایم کیوں بنا لیا اور بھی بہت سے شعبے ہیں۔ جن میں عزت بھی ہے اور پیسہ بھی۔ اگر کسی وجہ سے تم کس میڈیکل نہ پڑھو تو اس کا مطلب کہ اور شعبے ختم ہو گئے؟'' وہ اب ہاتھ میز پر رکھ کر آگے جھک آیا تھا۔
''مثلاً کون سے شعبے؟'' عشال نے کچھ سوچ کر کہا۔
''بہت سے ہیں بھئی، دیکھو میں نے بھی تو بے پناہ کوشش کر کے پڑھائی کی پھر جاب کے لیے اپلائی کیا۔ میرٹ پر مل ہی گئی ناں۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھا تھا۔
''اچھا...... اب ویکینسیز آئیں تو مجھے بھی بتانا۔'' عشال نے کہا تو وہ مسکرا دیا۔
''ایسا کرتا ہوں میں جنرل بکس تمہیں لا دیتا ہوں، تم اپنے طور پر تیاری کر لو کمیشن کے پیپرز کی۔ گریجویٹ تو تم ہو بس اپنے سبجیکٹ سلیکٹ کر لینا میں پاسٹ پیپرز وغیرہ بھی لا دوں گا۔ تم اس میں سے تیاری کرو۔'' ارحام نے میز سے اٹھتے ہوئے کہا۔
''او کے!'' عشال نے دھیمی سی آواز نکالی۔

☆☆☆

شب و روز تو ویسی ہی یکسانیت کا شکار تھے۔ ہاں مگر عشال کی توجہ اب کسی حد تک اپنی ناتمام خواہشوں کے واویلے سے ہٹ گئی تھی۔ ارحام نے اس کو کئی بکس لا کر دے دی تھیں جو اب فارغ وقت میں اس کی توجہ کا مرکز تھیں۔ اسے اچھا لگ رہا تھا دوبارہ کتابوں سے رشتہ جڑنا......
پہلے دن کے بعد ارحام سے اس کی بات چیت برائے نام تھی۔ وہ سارا دن نوکری پر ہوتا پھر رات کو بھی لیٹ آتا۔ کھانا اکثر باہر سے ہی کھا کر آتا۔ وہ تائی پر کم سے کم بوجھ بنا تھا۔ پھر بھی ان کو بے طرح کھٹکتا۔ تایا کی مرضی اسے رکھنے کی نہ ہوتی تو وہ نہ جانے کیا سلوک کرتیں۔ خیر بخشتی تو وہ اب بھی نہیں تھیں۔ صرف طنز و تحقیر کرنا ہی ان کا شیوہ تھا۔
حدیقہ کچھ لاابالی اور بے پروا تھی لیکن عشال کو جلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ اسے میڈیکل کے حوالے سے عشال کے جذبات کو چھیڑنا

مزہ دیتا تھا۔

نویر تھا تو تائی کا بیٹا لیکن کسی حد تک مہذب اور ہمدرد، وہ اپنی ماں اور بہن کے برعکس چاچی اور عشال کا احساس دل میں رکھتا تھا۔ کسی حد تک ہمدردی بھی کر لیتا لیکن عشال کو اس کی ہمدردی پسند نہ آتی تھی۔ وہ لفظوں کے پھائے رکھتا تھا۔ جو نا دیدہ اور بے اثر ہوتے۔ ماں کے سامنے کسی قسم کے فیور کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ارحام سے بھی اس کی اچھی دوستی تھی لیکن ماں کے سامنے اس سے اجنبیت ظاہر کرتا اور یہی بات عشال کو اس سے نالاں کرتی۔ وہ بینک میں اچھے عہدے پر تھا۔ تائی اس کے رشتے کے لیے کوشاں تھیں۔ انہیں بہت خوب صورت اور امیر لڑکی چاہیے تھی۔

☆☆☆

خاندان میں شادی کی دعوت تھی۔ عشال تو جانے پر رضا مند نہ تھی پر اماں کے اصرار پر جانے کو تیار ہونا پڑا۔ برائٹ پرپل کلر کا سوٹ جس پر ہلکا کام بنا تھا۔ اس نے منتخب کر کے پہن لیا۔ اپنے خوب صورت براؤن اسٹریٹ بال جو کمر تک آتے تھے اس نے کھلے چھوڑ دیے۔ ہلکا پھلکا میک اپ کر کے وہ کھل اٹھی تھی۔

کتنی ہی دیر خود کو آئینے میں دیکھتی رہی۔ خوب صورت تو وہ تھی لیکن بابا کے بعد اچھے کپڑے پہن کر تیار ہونا خواب ہو گیا تھا۔ اماں بابا کی پنشن کے محدود روپے بہت کفایت سے خرچ کرتی تھیں۔

حسبِ عادت ایسے موقعوں پر تائی نے ان کو پوچھنا بھی گوارا نہ کیا اور اپنی فیملی کے ساتھ اپنی کرولا کار میں جا بیٹھیں۔ تایا تو کہیں آتے جاتے نہ تھے۔ اسی لیے ڈرائیونگ سیٹ پر نویر بیٹھا تھا۔ تائی آگے اور حدیقہ پیچھے بیٹھی تھی۔ کار تقریباً خالی تھی۔ پھر بھی ان تینوں کی تو کیا دو کی بھی جگہ بھی نہیں نکلتی تھی۔

عشال، حذیفہ اور اماں چھوٹے گیٹ سے باہر نکلے تو بڑے گیٹ سے تائی کی گاڑی زن سے دھول اڑاتی آگے بڑھ گئی۔ عشال کی آنکھیں جلنے لگیں۔

''آپ لوگ کہیں جا رہے ہیں؟'' اتنے میں ارحام واپس آیا تھا۔ ان تینوں کو دیکھا تو بائیک روک دی۔

''بیٹا وہ فریحہ کے بیٹے کی شادی ہے ناں۔ وہیں جا رہے ہیں۔''

''اچھا، یہ بڑی مامی بھی تو شادی میں جا رہی تھیں۔ صبح بتایا تھا انہوں نے۔'' وہ روڈ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''جی ہاں ارحام بھیا!'' حذیفہ نے جواب دیا۔

''گاڑی تو خالی تھی، پیچھے آپ لوگوں کی جگہ بھی نکل آتی۔'' وہ کہہ کر خاموش سا ہو گیا۔

''دلوں میں جگہ نہ ہو تو گاڑیوں میں کیسے نکلے گی۔'' عشال نے چیخ کر کہا تو ارحام نے اسے بغور دیکھا اور پھر دیکھتے رہنے پر مجبور ہو گیا...... اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں وہ دمک رہی تھی۔ ہوا سے اڑتے براؤن بال اس کے شہابی چہرے سے ٹکرا کر اٹکھیلیاں کر رہے تھے اور وہ بیزاری سے ان کو دوپٹے میں قید کرنے کی کوشش میں تھی۔

''آپ لوگ یہیں رکیے، میں ٹیکسی کروا دیتا ہوں۔'' ارحام نے بہ مشکل عشال کے چہرے سے نظریں ہٹا کر بائیک کو کک لگائی۔

''رکشا ہی ٹھیک رہتا بیٹا۔ ٹیکسی تو کرایہ بھی زیادہ لے گی۔'' وہ ٹیکسی لے کر آیا تو ناصرہ نے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں مامی۔'' میں کرایہ دے چکا ہوں۔'' ارحام نے تسلی دی تو وہ دعائیں دیتی ٹیکسی میں بیٹھیں پھر حذیفہ اور آخر میں عشال بیٹھی۔

''سنو عشال گھر آ کر اپنی نظر ضرور اتار لینا۔ بہت اچھی لگ رہی ہو۔'' ارحام نے ٹیکسی کا دروازہ بند کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

عشال نے چونک کر اسے دیکھا۔ ارحام کی نظروں میں ستائش تھی۔

''چلو بھائی۔'' ناصرہ کے کہتے ہی ٹیکسی جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ عشال نے سیٹ کی پشت پر سر ٹکا دیا۔

☆☆☆

اگلے دن اتوار تھا اور خلافِ معمول ارحام گھر پر

نظر آیا۔ عشال دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی جب وہ کچن میں چلا آیا۔

''ایک کپ چائے ملے گی۔'' وہ ڈائننگ کی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

عشال نے بغور اسے دیکھا۔ الجھے سے بالوں میں ہاتھ پھیرتا وہ کچھ پریشان نظر آیا۔

''کیا بات ہے، کوئی پریشانی ہے کیا؟'' وہ چائے کا کپ اس کے سامنے رکھ کر پوچھ بیٹھی۔

''آہاں...... نہیں کچھ خاص نہیں۔'' وہ پرچ کے سرے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''بتانا نہیں چاہتے تو اور بات ہے ورنہ پریشان ہو یہ چہرے پر لکھا ہے۔'' عشال نے سنجیدگی سے کہا۔

''چہرے پڑھنا جانتی ہو اس کا مطلب ہے۔'' وہ ہلکے سے مسکرایا۔

''اتنے سال سے یہی تو کر رہی ہوں۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''کل نظر اتاری تھی۔'' ارحام نے بات بدلی۔

''نہیں۔''

''کیوں نہیں اتاری، بیمار پڑ جاؤ گی۔''

''نظر لگائی کس نے؟'' عشال نے پوچھا تو وہ ہنس دیا۔

''میں نے اور میری نظر بہت کالی ہے میری اسکن کی طرح سمجھیں۔'' وہ اپنے سانولے پن پر خود ہی چوٹ کرتا بولا تو عشال نے اسے گھور کر دیکھا۔

''اس دن مجھے سمجھا رہے تھے آج خود احساسِ کمتری کا شکار ہو رہے ہو۔''

''ارے یہ احساسِ کمتری نہیں خود آگاہی ہے ڈیئر۔''

''پھر بھی...... اتنے کالے بھی نہیں ہو۔'' وہ اس کے پرکشش چہرے پر نظر جمائے کہنے لگی۔

''اچھے خاصے نقوش ہیں۔'' عشال نے مزید کہا تو ارحام کھل کر ہنسا۔

''چلو اسی بہانے تم نے اپنے ڈیئر کزن پر غور تو کیا۔''

''کوئی نہیں... جیسے ہو وہی بتا رہی ہوں۔'' وہ جھینپ گئی تو ارحام نے اسے... دلچسپی سے دیکھا۔

''ابھی سب نواب اپنی خواب گاہوں سے جاگ کر اِدھر کا رخ کریں گے سو میں جلدی سے کھانا پکا لوں۔'' عشال اپنی نشست سے اٹھی تو وہ بھی چائے پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''کھانا کچھ دیر میں تیار ہو جائے گا۔'' وہ بے اختیار بول اٹھی۔

''نہیں عشال، مجھے کہیں کام سے نکلنا ہے۔''

اس نے فوراً انکار کیا تو عشال خاموش سی ہو گئی۔

''اوکے پھر چلتا ہوں۔''

وہ دروازے کی طرف بڑھا تو عشال اس کی پیٹھ دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

عشال نے اس کی مدد سے اپنے ضروری ڈاکومنٹس وغیرہ جمع کروا دیے تھے۔ اور وہ امتحان کی تیاری میں جت گئی۔ اسے تین ماہ میں اچھی خاصی تیاری کرنا تھی۔

اس دوران ارحام نے اپنے لیے کرایے کا گھر دیکھ لیا اور وہاں شفٹ ہو گیا...... عشال کو اس کے چلے جانے سے یک دم خالی پن کا احساس ہوا۔

وہ سارا دن باہر رہتا تھا۔ گفتگو بھی برائے نام ہی کرتا تھا لیکن وہ عشال کو نہ جانے کیوں اپنا سب سے بڑا خیر خواہ لگنے لگا تھا...... اس اجنبی سی دنیا میں ایک... پُرخلوص انسان۔ عشال نے اس کا سیل نمبر محفوظ کر لیا تھا۔ اب وہ اس سے اپنی اکثر باتیں شیئر کر لیتی تھی۔

اس کے پیپرز ہو چکے تھے اور وہ اپنے امتحانی نتیجے کو لے کر بہت تحفظات کا شکار تھی۔

''اگر میں پاس نہ ہو سکی تو؟''

یہ سوال تھا یا خدشہ۔ ارحام اس سے قطع نظر اسے حوصلہ دیتا۔

''تو تم اگلی بار appere ہو جانا۔ بھئی جتنی دفعہ ہار اتنی کوشش بار، بار''۔ وہ ہنس کر کہتا۔

''میں بھی دو بار objective paper

میں فیل ہوا۔ آخر ہو گیا ناں کلیر۔''

وہ اپنی مثال دیتا۔ عشال کو تسلی ہو جاتی۔ حالات اور لوگوں کے حوصلہ شکن رویّوں نے اس کو اندر سے بہت کمزور کر ڈالا تھا۔ بظاہر وہ مضبوط نظر آتی تھی۔ ارحام اس کی یہ کمزوری جان گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس کی حوصلہ افزائی کر کے اسے مضبوط بنائے...... اور پھر رزلٹ آیا تو ارحام نے ہی اسے پیپرز کلیر ہونے کی خوشخبری سنائی۔ عشال حیرت آمیز خوشی میں گھر گئی۔

اب انٹرویو کا مرحلہ تھا۔

''اب اچھے سے انٹرویو کی تیاری کرنا۔ بی کانفیڈنٹ،'' اس نے پھر تاکید کی تو عشال مسکرا دی۔

☆☆☆

ٹھیک چھ ماہ بعد اس کا انٹرویو تھا۔ جو بہت بہترین ہوا۔ وہ گھر آئی اور گنگناتی ہوئی کام کاج نمٹانے لگی۔ سہ پہر کو حدیقہ خوشی سے دمکتے چہرے کے ساتھ ڈاکٹری کی ڈگری اور سر پر کالی ٹوپی پہنے گھر آئی۔ آج اس کا کانوویکشن تھا۔ تایا اور تائی بھی اس کے ساتھ فنکشن میں گئے تھے۔ دونوں فخر سے حدیقہ کو دیکھ رہے تھے جو گھر آ کر بھی مختلف پوز دے کر ڈگری ہاتھ میں لیے اپنی سیلفیاں بنانے میں مصروف تھی۔

''ناؤ آئی ایم اے ایم بی بی ایس ڈاکٹر......''

عشال شام کی چائے لے کر آئی تو حدیقہ فیس بک پر لائیو جا کر پوز مار رہی تھی۔

''مجھے مبارک باد نہیں دو گی عشال۔'' حدیقہ نے اترا کر اسے دیکھا۔

''بہت مبارک ہو حدیقہ۔ دعا ہے تمہارا فیوچر بہت تابناک ہو۔''

وہ کپ اس کے آگے رکھتی سادگی سے بولی تو حدیقہ نے اس پر ایک مشکوک نظر ڈالی۔

''دل سے دعا کر رہی ہو ناں؟''

''نہیں زبان سے......'' عشال مسکرا دی۔

حدیقہ کچھ بدمزہ ہوئی۔ وہ عشال کو جلانا چاہتی تھی مگر وہ جلنے کے موڈ میں نہ تھی۔ ہنستی مسکراتی عشال اسے غصہ دلا گئی۔ وہ چائے وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

عشال کو اتنی اچھی سرکاری نوکری ملنے کی خبر نے گھر بھر کو سکتے میں ڈال دیا۔ تائی کو اماں نے خوشی سے یہ خبر مٹھائی کے ساتھ سنائی تو ان کی آنکھیں مانو باہر ہی نکل آئیں۔

''کب امتحان دیا، کب انٹرویو ہوا، ہمیں تو خبر نہ ہوئی۔ ایک چھت تلے رہتے اتنی بڑی بات چھپا لی ناصرہ، شاباش ہے تمہیں۔'' وہ ہوش میں آ کر اماں پر چڑھ دوڑیں۔

''بھابی میں نے سوچا بس شوق پورا کر لے۔ پہلے سے کیا بتاتی۔''

''نہ جی نہ...... کھاؤ یہاں سے پہنو، سوؤ یہیں اور من مانی کر کے ہم ہی سے راز چھپاؤ...... واہ جی واہ۔''

''تم کیوں اپنا بلڈ پریشر بڑھا رہی ہو بیگم۔ اچھی بات ہے بچی کا مستقبل سنور گیا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی ناصرہ۔'' تایا نے کہا تو تائی منہ بنا کر چپ ہو گئیں۔

پھر تایا دیگر تفصیلات اور تنخواہ وغیرہ کا پوچھنے لگے۔ اور تائی بڑی خاموشی سے ناصرہ کے جوابات سنتی رہیں۔

☆☆☆

''بہت بہت مبارک ہو محترمہ۔''

ارحام کیک لے کر آیا اور خوب صورت بکے پیش کر کے مبارک دی۔

عشال کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔

''سارا کریڈٹ تمہیں جاتا ہے ارحام۔ میں تو لکیر ہی پیٹنے میں لگی تھی تم نے مجھے آگے کا رستہ دکھایا۔'' وہ بھیگی آواز میں بولی۔

''ارے نہیں، تم بہت ٹیلینٹڈ ہو لڑکی۔ بس اپنی توانائی جل کڑھ کر ضائع کر رہی تھیں۔ میں نے تمہیں توانائی صحیح جگہ استعمال کرنے کا بتایا اور بس۔'' وہ صوفے پر بیٹھ کر مزے سے بولا عشال اسے تشکر سے دیکھنے لگی۔

''ایسے لوگ بہت نایاب ہوتے ہیں ارحام جو

دوسروں کو سیدھی راہ دکھائیں، ان کے اندھیرے راستوں میں جگنو بکھیر دیں۔'' عشال نے جذب سے کہا۔

''بس اب میری اتنی تعریف نہ کرو۔ ہضم نہیں ہو رہی مجھ سے۔ لو تم یہ کیک کھاؤ۔''

ارحام نے ایک کیک پیس اس کی طرف بڑھایا تو اس نے مسکرا کر لے لیا۔

☆☆☆

عشال کی زندگی خوشگوار گزرنے لگی۔ وہ آدھا دن جاب پر ہوتی پھر گھر آ کر کام کاج بھی نمٹاتی۔ ناصرہ دوپہر کا کھانا بنا لیتیں اور یہ رات کا۔

تائی کا رویّہ بہت حد تک اچھا ہو گیا تھا۔

عشال کو پہلی تنخواہ ملی تو ماں کو آ کر دی۔ ناصرہ کتنی ہی دیر دعائیں دیتی رہی۔ حذیفہ کو عشال نے قدرے بہتر اسکول میں داخلہ دلوا دیا۔ اب وہ اس کا مستقبل سنوارنا چاہتی تھی۔

رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہوا تو روٹین کچھ ٹف ہو گئی۔ وہ جاب سے آتے ہی افطاری کی تیاری میں لگ جاتی۔ اب اس کو کوئی کام کرتے برا نہ لگتا۔

ماہ رمضان کے آخری عشرے کے دن اپنی برکتیں نچھاور کر کے اختتام پزیر ہوئے تو چاند رات کو تائی نے ایک دھماکا کر دیا۔ ناصرہ کو بلا کر کہا۔ ''میں نے عشال اور نویر کا رشتہ پکا کر دیا ہے۔ عید کے دوسرے روز منگنی کرنی ہے، تم تیاری کر لو۔''

ناصرہ تو ہکّا بکّا رہ گئیں۔ جیٹھانی یوں اچانک عشال کا ہاتھ مانگیں گی یہ کبھی سوچا نہ تھا۔ بلکہ مانگ تو کیا رہی تھیں بس رشتہ طے کر کے اطلاع ہی دے رہی تھیں۔ لیکن ساری حیرانی کے باوجود وہ خوش تھیں۔ جیٹھ کا کھاتا پیتا گھرانا اور نویر جیسا ہونہار سپوت۔ عشال کو مستقل بنیادوں پر ملنے والا سائبان۔ اور بھلا کیا چاہیے تھا انہیں۔

وہ خوشی، خوشی عشال کو بتانے آئیں۔

''اماں آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟'' عشال تو سن کر چکرا ہی گئی۔

''تائی نے کس حق سے میرا رشتہ اپنے بیٹے سے طے کر لیا؟''

''تو کیا برائی ہے نویر میں۔ بھابی مزاج کی اکھڑ سہی۔ یہ بچہ تو لاکھوں میں ایک ہے۔'' وہ چمکتی آنکھوں سے بولیں۔

''اماں مجھے نہیں کرنی نویر سے شادی۔'' وہ چیخ اٹھی۔

''آخر کیوں عشال؟'' ناصرہ بدمزہ ہوئیں۔

''اتنے سالوں سے انہیں میں دکھائی نہ دی، اب اچھی جاب کر رہی ہوں تو لالچ میں رشتہ کر رہی ہیں۔ بہت خوب......'' وہ نروٹھے پن سے بولی تو ناصرہ خاموش ہو گئیں۔

''بابا کا فلیٹ بھی ہے؟ میں کما بھی رہی ہوں اب تو مجھ سے شادی کروائیں گی ناں نویر کی۔'' اس کی زبان کی تلخی لوٹ آئی تھی۔

''تو کیا ہوا بیٹا، لوگ تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اپنا مفاد دیکھتے ہیں۔'' ناصرہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

''کچھ لوگ بے لوث بھی ہوتے ہیں اماں۔ بغیر کسی صلے کی امید کے دوسروں کے کام آتے ہیں۔''

عشال نے کہا تو ناصرہ نے چونک کر اس کی شکل دیکھی جہاں ارحام کا عکس جگمگا رہا تھا۔

''میں تو تمہارا سکھ دیکھ رہی ہوں عشال۔ ارحام کو ابھی بڑے مرحلے کاٹنے ہیں تب جا کر وہ تمہیں سہولیات والی زندگی دینے کے قابل ہو گا۔'' وہ ماں بن کر سوچ رہی تھیں۔

''سب سے بڑا سکھ سکون والی زندگی میں ہوتا ہے اماں...... اور تائی کی بہو بن کر مجھے کبھی پُرسکون زندگی نہیں مل سکتی۔'' وہ بے لاگ بولی تھی۔

''سہولیات تو وقت کے ساتھ مل ہی جائیں گی۔ پُرخلوص ساتھی بہت مشکل سے ملتے ہیں...... اور تائی جیسی ساس سے پھپو معصومہ ہزار درجہ بہتر ہیں۔'' عشال کا لہجہ دوٹوک تھا۔ ناصرہ نے سمجھ کر سر ہلایا۔

''اب کیا کہوں میں بھابی کو۔'' انہوں نے کمزور سی آواز میں پوچھا تو وہ مسکرا دی۔

''آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تائی کو اپنا فیصلہ میں خود سناؤں گی...... پہلے کسی سے بات کرلوں۔''

وہ زیرِ لب مسکرائی اور موبائل اٹھا کر کال ملانے لگی۔

''السلام علیکم۔'' کال اٹھالی گئی تھی۔

''وعلیکم السلام، ہاں کہو عشال۔'' وہ مصروف انداز میں بولا۔

''ارحام ابھی ہماری طرف آسکتے ہو!''

''ابھی......اس وقت تو میں مصروف ہوں یار۔''

ارحام نے کہا تو آگے سے عشال خاموش ہوگئی۔

''کل عید پر آجاؤں گا ناں۔'' وہ رسان سے بولا۔ دوسری طرف سے جواب ندارد......

''عشال بات تو کرو۔ اچھا تھوڑی دیر بعد آتا ہوں۔'' وہ بولا۔

اِدھر بدستور خاموشی۔

''اوکے ابھی نکلتا ہوں۔ اب خوش!''

ارحام کے کہتے ہی وہ کھلکھلائی۔

اوکے۔'' پھر فون بند کیا۔

''اب بتاؤ کیا بات ہے۔ مجھے ضروری کام چھوڑ کر یہاں آنا پڑا۔'' ارحام دس منٹ پندرہ بعد اس کے سامنے تھا۔

''ارحام اس عید پر میری منگنی ہو رہی ہے۔''

عشال نے سنجیدہ صورت بنا کر اطلاع دی۔

ارحام نے چونک کر اسے دیکھا اور چند ساعت وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

''منگنی مبارک ہو۔'' پھر لہجہ بشاش بنا کر بولا۔

''پوچھو گے نہیں کس کے ساتھ؟'' عشال نے لب دبائے۔

''کوئی خوش نصیب ہی ہوگا۔'' وہ پھیکا سا مسکرایا۔

''وہ لکی انسان نویر ہے۔'' عشال کے کہتے ہی ارحام کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

''اوہ اچھا......خوش رہو۔'' وہ بہ مشکل کہہ سکا۔

''تم اس بات سے ڈس ہارٹ ہوئے ہو؟''

عشال نے پوچھا تو ارحام نے نظریں چرائیں

''نہیں تو۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔

''جھوٹ مت بولو ارحام، تم اس بات پر ڈس ہارٹ ہوئے ہوناں۔'' عشال نے تیز لہجے میں کہا اور وہ اس کے نزدیک چلی آئی۔

''ہوا تو ہوں۔'' ارحام نے سادگی سے اعتراف کیا۔

''کیوں؟'' عشال کے سوال پر اس نے مجروح نگاہ اٹھائی۔

''بتاؤ ناں کیوں۔'' عشال نے اصرار کیا۔

''اب کوئی فائدہ نہیں اس ''کیوں'' کے جواب کا عشال۔'' ارحام نے گہری سانس بھر کر کہا۔

''فائدہ ہے ارحام......اس ''کیوں'' کے جواب میں ہی میرا مستقبل پوشیدہ ہے۔''

عشال نے کہا تو ارحام نے ابرو سکوڑے پھر صوفے پر ڈھیلا سا ہو کر بیٹھ گیا۔

''کیونکہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' اس نے شکست خوردہ لہجے میں اعتراف کیا تھا۔

عشال بے اختیار مسکرائی۔

''میں بھی۔'' اس کی کھنکتی آواز پر ارحام نے سر اٹھایا۔

''ہاں ارحام، میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں...... اور تمہی کو اپنا ہم سفر بنانا چاہتی ہوں۔'' وہ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی تھی۔ ارحام نے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا۔

''مگر تم تو نویر سے۔'' پھر الجھی نظر اس پر ڈالی۔

''وہ تو تمہارا اعترافِ محبت سننے کے لیے سین کیا۔'' عشال کھلکھلائی۔

''ہمم......م......ستادوں سے استادی۔''

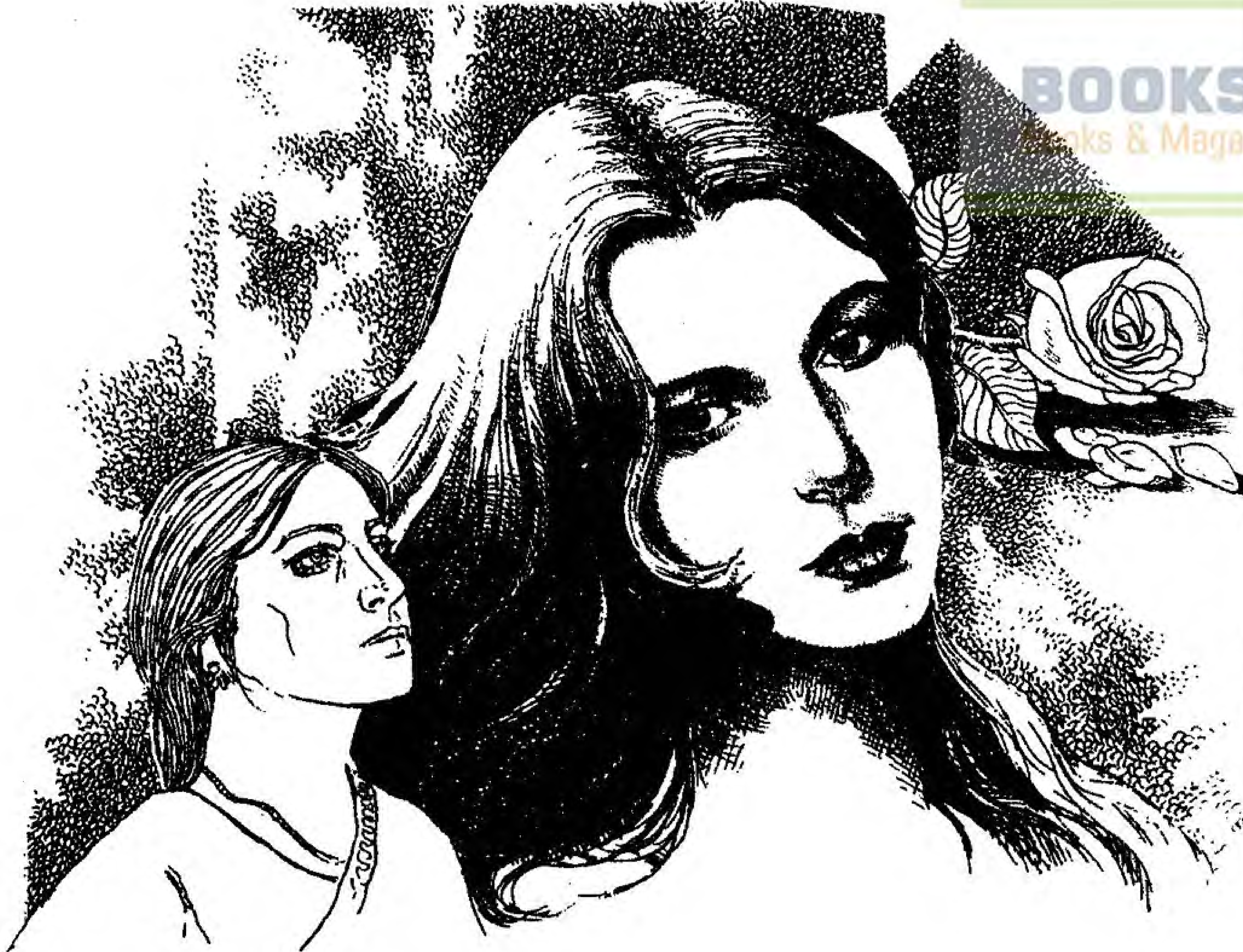
ارحام نے مکا لہرایا تو عشال نے کشن اٹھا کر اپنا چہرہ چھپالیا۔

زندگی کی اندھیری راہوں میں اب محبت کے جگنو جگمگانے لگے تھے۔



چھوٹی سی بات

سیما بنت عاصم



''کبھی، کبھی کوئی معمولی سی غلطی کسی بڑے نقصان کی وجہ......اور چھوٹی سی بات کسی اہم فیصلے کا محرک بن جاتی ہے۔''

یہ بات دانیال نے مجھے پرپوز کر کے اور پھر میرا انکار سننے کے بعد کہی تھی۔

وہ میرا کولیگ تھا......ہم ایک ہی رستے آتے جاتے، سو کچھ دن وہ مجھے اپنی ریڈ کرولا سے پک اینڈ ڈراپ کرتا رہا...... جو باس کی عطا کردہ تھی......وہ آفس

کے لیے آؤٹ ڈور ڈیلنگ کرتا تھا۔ اسی دوران میری فیملی سے اس کی واقفیت بڑھی اور میں نے جانا کہ دنیا میں وہ یک وتنہا ہے...... مگر ہے بے حد نائس اور ملنسار شخص اِک عمر سوتیلے رشتوں کی بے مہری سہتے گزاری تھی...... ایسے لوگ یا تو بہت برے ثابت ہوتے ہیں یا پھر بہت اچھے...... سو وہ بہت اچھا تھا مگر میرے زیرِ نظر کچھ اور معاملات تھے شاید میں ایک پل کو نہ سوچتی اگر...... میرے کندھے پر دُگنی فیملی کا بار نہ ہوتا۔

تین سال پہلے میری بڑی بہن سارہ، بیوگی کی سفید چادر اوڑھے میکے کی دہلیز پر واپس لوٹی تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ کہ میری حیات کا اِک بڑا حصہ صرف اسی کے لیے وقف ہوگا۔

ہوتا ہے ناں کبھی، کبھی کوئی ایک لمحہ ساری حیات کا رخ پلٹ دیتا ہے۔ شاید یہی وہ لمحہ تھا۔

اورنگ زیب! وہ سارہ کا شوہر ہونے سے پہلے میرا ہیرے جیسا کزن تھا...... جسے شاید ہم سب کی... بدقسمتی کھا گئی...... کیا وقت تھا...... جب ہم ساتھ مل کر ہنستے، گاتے محفل جماتے بس اِک حادثہ ہی تو تھا...... اِک روڈ ایکسیڈنٹ جو سارہ کی سب خوشیوں کو نگل گیا۔ وہ گھر کے ہر معاملے میں امی کا مشیرِ خاص...... ان کا دستِ راست اور امی کہتیں۔ ’’اورنگ زیب ان کا بیٹا ہے۔‘‘ دنیا سارہ سے شادی کو کہتی تو وہ کہتی...... ’’کوئی اورنگ زیب جیسا بھی تو ہو......‘‘

امی سے بڑھ کر کون جانتا تھا...... بیوگی کا دکھ اور اس کے عذاب کیا ہوتے ہیں...... خود انہوں نے اپنی زندگی ہم دونوں بیٹوں کے لیے وقف کردی تھی۔ خیر سے اسٹیٹ بینک سے ریٹائرڈ تھیں...... مگر جب سارہ نے اپنی ڈگریوں کی دھول جھاڑی تو امی بکھر گئیں وہ ذرا ...... ذرا سی بات پر چھپ، چھپ کر رونے والی سارہ ...... بھلا دنیا کو جھیلنے کی سکت کہاں رکھتی تھی۔ بچے تینوں اسکول گوئنگ تھے ظاہر ہے انہیں ماں کی ضرورت تھی۔

اور وہ وقتِ گزشتہ سے جڑا اِک منظر تو جیسے ذہن و دل پر نقش ہو کے رہ گیا تھا۔ جب دانی اونچائی پر چڑھ بیٹھا...... اورنگ زیب نے اسے سنبھالنے کو ہاتھ اوپر اٹھائے۔

’’بابا میں گر جاؤں گا......‘‘ وہ بسورا تھا۔

’’نہیں بیٹا، بابا تمہیں گرنے نہیں دیں گے۔ آؤ جمپ لگاؤ۔‘‘

اور دانی نے جمپ لگادی...... لیکن اورنگ زیب نے ہاتھ چھوڑ دیے۔ دانی گر گیا اور رونے لگا اب زیب اس کے قریب بیٹھا تھا۔

’’بیٹا تمہیں پتا ہے بابا نے تمہیں کیوں چھوڑ دیا؟‘‘

’’تاکہ میں گر جاؤں......‘‘ وہ روتا رہا۔

’’نہیں...... بلکہ اس لیے کہ تم زندگی میں کبھی کسی پر بھروسا نہیں کرسکو......‘‘ بات چھوٹی تھی اور سوچ مثبت تھی...... میں اسے منفی لیتی رہی تو میری سمجھ کا پھیر تھا...... مگر یہ بات بہت آگے جا کر پتا چلی کہ اورنگ زیب نے اپنی زندگی خود جینے کا سبق دیا تھا۔

اب میں بی اے کے بعد کچھ شارٹ کورسز میں سر کھپا رہی تھی۔ وہی کام آئے...... اِک بہتر نوکری مل ہی گئی...... ترقی کے بھی چانسز تھے...... خود کے لیے سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ وہ تینوں میرے کندھے سے لٹک کر فرمائشیں گنواتے تو مجھے لگتا...... تقدیر نے ان کی صورت مجھے اِک راستہ بتادیا ہے۔ اور مجھے اپنی ڈگر نہیں بھولنی تھی...... میری تنخواہ امی کے اکاؤنٹ میں منتقل ہوجاتی...... یہ اِک معمولی سا خراج تھا، آتشیں حالات میں اک ادنیٰ سا قطرہ اور دانیال ان سب حقائق سے بے خبر نہ تھا...... کہتا کہ ہم مل جل کر اِک دوسرے کے مسائل بانٹ لیں گے...... اب ایسا کہاں ہوتا ہے۔ اپنا دکھ تو بس اپنا ہی ہوتا ہے ناں...... ایسے وعدے...... دعوے تو سب ہی کرتے ہیں مگر......

اس جہاں میں کیا کسی کا درد اپناتے ہیں لوگ......

وہ تب ہی سے ہی مجھ سے منہ پھیر کر گزرتا...... شاید اسے امید تھی...... یوں آخرکار وہ مجھے منالے گا...... بے وقوف...... مجھے خاک بھی پروا نہ تھی...... پک اینڈ ڈراپ کا سلسلہ بھی عرصہ ہوا ختم ہوگیا تھا۔

تتلیاں اڑتی ہیں
اور ان کو پکڑنے والے
سعیِ ناکام میں
اپنوں سے بچھڑ جاتے ہیں

مگر میں خواہش کی کسی نادیدہ تتلی کے تعاقب میں رستہ کھودینے والوں میں سے نہ تھی...... زندگی کبھی، کبھی ہم سے بہت کچھ مانگتی ہے۔ میں ویسی ہی ہنستی مسکراتی کام میں مگن نظر آتی...... رج کے سجتی سنورتی۔

لنچ ٹائم کے بعد آفس میں شور اٹھا...... باہر دھواں دھار بارش ہورہی ہے۔

’’ہائیں۔‘‘ میں سٹپٹائی...... صبح تک تو ایسے کوئی آثار نہیں تھے۔ ایک ہی جست میں اپنے کیبن سے نکل کر کاریڈور عبور کیا...... کاریڈور کے اختتام پر بیرونی رستہ اور منظر واضح تھا...... باہر کے منظر نے میری آنکھیں چوپٹ کھول دیں...... یہاں سے وہاں تک پانی کی ایک موٹی چادر تنی تھی...... پُرشور آواز...... کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ لوٹتے سمے سیکنڈ باس نے مجھے اپنے کیبن میں اشارہ کرکے بلایا۔

’’ثمر...... آپ نکل جائیں، بارش تیز ہے، زیادہ دیر ہوئی تو راستے بند ہوجائیں گے۔‘‘ انہوں نے میرا جواب سنے بغیر انٹرکام اٹھا کر دانیال کو بلایا...... اور مجھے ڈراپ کرنے کو کہا۔

توقع کے عین مطابق اس نے صاف بہانہ کردیا...... کہ اسے کسی امپورٹنٹ آفیشل کام سے الگ دوسری سمت جانا ہے...... تو مجھے بھی کہنا پڑا کہ میں ٹیکسی لے لوں گی...... مگر اس کے لیے بھی تو آفس سے نکل کر کچھ واک لازمی تھی...... میں اپنے کیبن میں بیٹھ کر تاسف سے اپنا خوب صورت کلف دار سی گرین ڈریس دیکھنے لگی۔

میں نے کلائی میں پڑا میچنگ کڑا...... اور گھڑی اتار کر موبائل آف کیا تھا اور سب چیزیں پلاسٹک میں رکھ کر پرس میں ڈال لیں۔ آفس سے نکل کر ہی بارش کی اصل تیزی وشدت سے آشنائی ہوسکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں سڑکیں ندی نالہ بن گئی تھیں۔ رکشا، ٹیکسی گویا عنقا تھے۔ ہر طرف اِک افراتفری کا سماں تھا۔ اسکوٹر، سائیکل سوار تک اتر کر بڑی مشکلوں سے اپنی سواریاں دھکیل رہے تھے۔ بارش کی تیز بوچھاڑ نے یہاں سے وہاں تک سب جل تھل کردیا تھا۔ دور، دور تک پانی ہی پانی تھا۔ سڑکوں پر رواں پانی کئی فٹ اونچا چل رہا تھا۔ توقع کے عین مطابق مطلوبہ اسٹاپ تک پہنچتے ہی میں سارا سی گرین رنگ نکل گیا تھا۔ کتنے چاؤ سے نئی گولڈن سینڈل پہنی تھی، جس کا کراؤن، کچھ قدم کی مسافت سے ہی جانے کہاں نکل کر تیر رہا ہوگا...... بارش کی دبیز ہوتی چادر کے سبب سامنے کا منظر دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں جو بدوقت خود کو گھسیٹتی، دھکیلتی ٹامک ٹوئیاں مارتی اسٹاپ تک پہنچی تھی مگر دور...... دور تک کسی بس کا نام و نشان نہ تھا، جو تھیں وہ سبز جھنڈی دکھاتی منہ چڑاتی خالی خولی نو لفٹ کرتی بہ مشکل آگے بڑھ رہی تھیں۔ مجھے دقت خود کو گھسیٹتے ہوئے اک کونے کھانچے میں تنہا کھڑی لدی پھندی بس تک لانا پڑا...... دھکم پیل کے بعد... بہ مشکل مردوں کے کمپارٹمنٹ میں جگہ ملی تھی وہ بھی اس لیے کہ کچھ مرد تعظیماً اپنی سیٹ چھوڑنے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ کھچا کھچ بھری بس میں سانس بھی لینا دوبھر تھا۔ بس کی چھت کھڑکیوں یہاں وہاں ہر جگہ سے پانی ہی پانی اور اک شور...... تیز برستی بارش سے باہر کے منظر میں اک بھاگ دوڑ اور افراتفری تھی...... کھڑکی وچھت سے آتا پانی نیچے قدموں تلے سے سرسراتا گزر رہا تھا...... مجھے اپنے وجود میں لرزش سی محسوس ہونے لگی تھی۔ شور ہی شور...... اور اتنا تیز شور کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے رہی تھی۔ بس آگے بڑھنے پر آمادہ تھی، یہ بھی کم نہ تھا۔ جس کو جہاں جگہ ملی سوار ہوگیا تھا...... کنڈیکٹر نے بس اسٹارٹ ہوتے ہی ڈبل کرایے کا اعلان کیا تھا...... اس سے بتیس تو کیا بتیس سو بھی کم تھے۔ سچ مچ منوں پانی اور دھند میں، بارش کی موٹی چادر کو چیرتے ہوئے اٹکل سے بس چلانا، موت کے کنویں میں سائیکل چلانے سے بڑھ کر خطرناک اور

رکی تھا۔ نہ جانے مجھے آفس سے نکلے کتنی دیر گزری تھی۔ وقت پوچھا تو دو بجے تھے اور فضا ایسی جیسے دن بھی نہ ... بیدار ہوا ہو...... دھند کے سبب نیم اندھیرا اور نمی کے سبب مدھم سی خنکی...... آس پاس کی سب جگہ لباس کے نچڑتے رنگ سے سبز ہی سبز ہوگئی تھی۔ کچھ خواتین باقاعدہ ورد کررہی تھیں، بچے رو رہے تھے، اِک چیخم پکار اور سہمی ہوئی فضا سی تھی۔

منظر کتنی جلدی بدلتے ہیں، چار سو اک خوف و وحشت کا عالم تھا، اس تیز برستی برسات، چھاجوں چھاج برستے پانی کے ریلے سڑکوں پر اِک رفتار سے سفر کررہے تھے۔ گرجتے برستے بادلوں کے شور اور بجلی کی کڑکتی آواز...... صاف ظاہر تھا کہ سفر آسان نہ تھا۔ بس ہچکولے کھاتی، ڈگمگاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ اور پھر وہی ہوا... جس کا ڈر تھا کہ بس نے سفر کرنے سے انکار نہ کردے...... تیز برستی برسات نے سڑکوں کا پانی بس کے پائدان ہی تک پہنچادیا تھا...... ڈرائیور نے کوئی شارٹ کٹ راستہ اپنایا تھا۔ مگر بیچ سڑک پر ساری ٹریفک رک گئی تھی۔ سڑکوں کا پانی نکل کر جائے تو چلیں...... میرا دل دھک، دھک کرنے لگا تھا۔ انجان راستہ، دھواں دھار برستی برسات...... ”اگر راستہ اتر کر چلنا پڑا تو کہاں اور کیسے جاؤں گی......“ بے ساختہ اورنگ زیب کی شبیہہ نے نظروں تلے چھب دکھائی۔ ہوا تیز چلتی تو وہ دھان پان سی سارہ کو سمیٹ لیتا کہ کہیں وہ لڑکھڑا نہ جائے، میری آنکھوں میں ساون آن اترا تو کھڑکی سے منہ نکال دیا...... ڈھیروں ڈھیر برستے پانی نے اکادکا آنسو کا بھرم رکھ لیا۔

”کہاں جانا ہے......؟“ میری بغل سے لگی خاتون نے پوچھا...... میں نے بتایا تو ان کی بتیسی نکل پڑی۔ انہیں بھی وہیں جانا تھا۔ اِک ہی رستے پر سب ایک ہی سمت کے مسافر ہوتے ہیں...... بس کسی کی منزل جلد تو کوئی اخیر تک کا مسافر...... وہ بھی تنہا تھیں مگر یہ بس مین روڈ پر اتارتی تھی...... اندر تک کے لیے رکشا کرنا پڑتا۔ خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا، انہوں نے مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں مگر جواب ہوں، ہاں میں ملنے پر تو خاموش ہوگئیں...... میں نے ترچھی نظر سے دیکھا۔ ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔ سڑک دو پر کٹروں کے ڈھکن ترچھے کیے گئے تھے مگر موسلا دھار بارش کا زور نہ ٹوٹ رہا تھا۔ کچھ پانی نکلا اس سے زیادہ بڑھا مگر ٹریفک رفتہ، رفتہ سرکنے لگی تھی۔ میں نے شکر کا کلمہ پڑھا...... جانے کتنا وقت گزرا تھا۔ مجھے امی اور سارہ کا خیال تھا۔ ان کا دم حلق میں آن اٹکا ہوگا...... یہاں میری بھی تو جان پر بنی تھی...... حالانکہ میں اتنی آسانی سے حوصلہ کھونے والی لڑکی نہ تھی...... اک وہ آفس کے باس تھے کس مزے سے اپنی کلٹس میں سوار میرے سامنے سے گزرے تھے۔ جب میں بارش کی موٹی چادر سے نبرد آزما گھٹنوں، گھٹنوں پانی میں... بہ مشکل خود کو گھسیٹتی دھکیلتی آگے بڑھ رہی تھی...... کیا تھا جو اپنی گاڑی میں پہلے مجھے ڈراپ کروادیتے...... مگر نہ...... آفس میں، میں اکیلی لڑکی تھی، وہ سب تو رات بھی وہیں گزار لیتے تو کیا جاتا...... میرا دھیان بار، بار بھٹک جاتا تھا۔ اور وہ دانیال، ہائے رے اس کی بناوٹی بے نیازی، کس مزے سے سب نے آفس کا کام ڈراپ کردیا تھا۔ میں نے نکلتے سمے سنا...... وہ سب گرما گرم چائے کے ساتھ پکوڑوں، سموسوں، جلیبیوں کے پروگرام بنا رہے تھے۔ مجھے ہنسی آئی جانے کس اسٹال سے نصیب ہوں گے۔ ٹھیلوں، چھابڑیوں والے تو اسباب سمیٹ کر بھاگتے نظر آرہے تھے۔ ہوٹل والوں نے کڑاہا اوندھے کر کے شیڈ آدھے کر رکھے تھے۔ اِک بھگدڑ مچی تھی...... اور اک وہ سیکنڈ باس تھے...... دانیال کو بلا کر جیسے فرض ادا ہوگیا تھا، آفس میں میرا واسطہ زیادہ تر ان ہی سے رہتا...... باس، ملازم جیسا تو کوئی رابطہ ہی نہیں تھا۔ وہ جمعہ کی نماز کو جاتے تو میرے لیے ضرور کچھ نہ کچھ لے کر آتے، چاکلیٹ سے لے کر سکٹ تک......

میں ان سے جو چاہے منوالیتی اور یہ سب ہی جانتے تھے آخری ون ڈے میچ پر سب کے لیے کام کے بوجھ کے باوجود اس دن کی چھٹی میں نے ہی منظور کروائی تھی...... سنڈے ورک کی شرط پہ میں نے سر جھٹک دیا...... میں کچھوے کی رفتار سے رینگتی کچھ آگے بڑھی تو مجھے یاد آیا کنڈیکٹر کو کرایے کے لیے سو کا نوٹ پکڑایا تھا۔ مجھے پیسے کی قدر و قیمت پروفیشنل لائف میں قدم رکھنے کے بعد پتا چلی تھی ورنہ میں پچاس، ساٹھ کے لیے بحث کرنے والی کہاں...... ساتھ بیٹھی خاتون نے تصدیق کی تو اسے دیتے ہی بن پڑی...... پھر وہ بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا...... مجھے غصہ تو آیا مگر پی گئی۔

جانے کتنا وقت بیتا تھا اور کتنا سفر طے ہوا...... بس کے اندر کی دھکم پیل، شور ہنگامے، چیخم پکار سے بے نیاز کھڑکی سے سر ٹکائے باہر کے دوڑتے بھاگتے مناظر میں گم رہی۔ ڈگمگاتی بس نے منٹوں کا فاصلہ گھنٹوں میں طے کیا تھا...... دھواں دھار برستی برسات کسی طاقتور اژدھے کے مانند سب کچھ آگے دھکیل رہی تھی۔ بالآخر کافی راستہ طے ہو ہی گیا...... مطلوبہ اسٹاپ تک جاتی سڑک بالکل سیدھی تھی...... راستہ شناسا سا تھا، مجھے قدرے تسلی ہوئی۔ اب تاخیر بھی رہی تو رستے تو آشنا تھے۔ بالآخر مطلوبہ مقام آہی گیا۔ اندرونی راستے تک رکشا جاتا تھا۔ میں اِک دھکم پیل کو چیرتی اسٹاپ پر اتری وہی معمر خاتون ہمراہ تھیں۔

بارش کی شدت زور پکڑ گئی تھی۔ بادلوں کی گرج چمک اور کڑکتی بجلی کا شور...... اندرونی رستے کو جانے والی سڑک پر جیسے انسانی قد سے اونچا پانی چل رہا تھا۔ اور رکشے والے بھی تو انسان ہی تھے...... میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ خاتون کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آگے کا رستہ دشوار ترین تھا...... پیدل مارچ بھی ناممکن تھی۔ میرا بھی دل دھک، دھک کرنے لگا۔ اب شاید سرپہر ڈھلنے کا وقت تھا۔ اور رات کا سا سماں، شام گہری پڑ گئی تھی۔ اس پر بادلوں کی گرج چمک، بجلی کی کڑک اور آسمان تاریک ہونے لگا تھا۔ میں نے دہل کر ان خاتون کا ہاتھ تھام لیا۔ اور یہاں بھی اسی افراتفری کا عالم کہ ہر

کتابوں کی دنیا

کتابوں کی دنیا میں آکر تو دیکھو
ذرا ان سے دل کو لگا کر تو دیکھو

یہ دکھ بانٹتی ہیں محبت ہیں دیتی
کتابوں کی بستی میں آکر تو دیکھو

یہ ساتھی ہیں دکھ کی محبت نبھائیں
انہیں تم اپنا بنا کر تو دیکھو

سکوں تم کو دیں گی بہت ہی زیادہ
انہیں تم گلے سے لگا کر تو دیکھو

یہ نظمیں، یہ غزلیں، یہ اشعار سارے
بہت خوب صورت ہیں گا کر تو دیکھو

کبھی یہ ہنسائیں، کبھی یہ رُلائیں
فسانے کہانی اٹھا کر تو دیکھو

بڑھاتی ہیں عقل و سمجھ یہ تمہاری
انہیں گھر کے اندر تم لا کر تو دیکھو

نہیں ان سے بہتر کوئی اور ساتھی
تم ان سے محبت نبھا کر تو دیکھو

یہ شور وفغاں سے بہت دور بھاگیں
سکوں بخش دیتی ہیں پا کر تو دیکھو

یہ سیرِ جہاں کا موجب ہیں بنتی
انہیں اپنا ساتھی بنا کر تو دیکھو

کتابوں کی دنیا بہت پیاری دنیا
انہیں اپنے من میں بسا کر تو دیکھو

کنولؔ ہے اسیرانِ کی مدت سے اے دل
ذرا تم بھی آنکھیں ملا کر تو دیکھو

شاعرہ: یاسمین کنول، پسرور

کوئی منہ پھیرتا بہ مشکل اِک رکشا منہ مانگے داموں اندر تک جانے کو آمادہ ہوا۔ ہم جھٹ سوار ہو گئے۔ اس نے مین روڈ پر کچھ آگے بڑھ کر ایک گلی میں رکشا موڑ دیا یونہی وہ گلیوں میں گھماتا چلنے لگا۔ مگر ہائے ری قسمت......اِک ہڑبونگ کا سماں تھا......اور گلیوں میں سفر کرتی پانی کی اندھا دھند رفتار، لوگ اپنے گھروں کے سامنے راستے بنا رہے تھے۔ بارش کا تیز و تند سیل رواں از خود رستے بناتا چلا جارہا تھا۔ فٹوں اونچا چلتا پانی، پائدان سے اوپر آرہا تھا۔ رکشا بار، بار ہچکولے کھاتا انجن بے ہنگم آواز نکالتا بار، بار رکتا مگر اس نے ہمت نہ ہاری، رکشا گھماتے موڑتے اس نے کچھ فاصلہ تو طے کر ہی لیا تھا۔ اور بالآخر ہار گیا۔ آگے کا سفر کیونکر طے ہو......؟ ہمارے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ آگے کا راستہ ناممکن تھا۔ رکشا اِک میدان میں کھڑا تھا۔ مگر میں ہمت ہار رہی تھی۔ بہ مشکل رکشا بھگتایا اور معمر خاتون کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بارش کے

برستے پانی کو چیرتی آگے بڑھنے کی سعی کی۔ پانی ہمارے گھٹنوں سے اوپر تھا۔ اور اب گلیوں، گلیوں گھوم کر بھی اپنے گھر کا نشان سجھائی نہ دیتا تھا۔ بس اتنا معلوم تھا کہ آگے بڑھ رہے تھے۔ کئی موڑ گھمائے گھر تک رستہ سیدھ میں تھا اور یہ گمان پختہ کہ سمت درست ہی ہے۔ فاصلہ نصف بھی نہ طے ہوا تھا اور اِک، اِک قدم پھونک پھونک کر رکھنا تھا۔ جگہ، جگہ مین ہول کھلے پڑے تھے۔ مجھے کچھ سجھائی دیتا نہ سجھتا...... بارش کی تیز برستی بوچھاڑ سے سرتاپا شرابور وجود نظروں کے سامنے پانی موٹی چادر، اور گھٹنوں، گھٹنوں پانی میں اِک، اِک قدم دوبھر...... جانے کتنا وقت بیتا تھا۔ لگتا تھا کہ رات پڑ گئی ہو......اِک اِک قدم بھاری پڑتا......اور تیز برستی بارش سے سامنے کا رستہ دھندلا جاتا۔

میرا دھیان بار، بار گھر کی طرف جاتا......موبائل پرس میں لپیٹ کر اڑسا ہوا تھا۔ نہ کوئی پرسانِ حال تھا اور نہ ہی رابطہ ممکن تھا۔ اور اگر رابطہ ہو بھی جاتا تو کون آتا اور

میں کیا بتاتی...... مجھے خود پتا نہ تھا۔ میں کہاں ہوں، بس آگے بڑھنا تھا۔ اور کوئی آشنا نشان پا کر اگلی سمت کا تعین کرنا تھا...... راستوں میں گھماؤ تھے، موڑ تھے، جہاں سہل راہ ملتی......ہم وہیں مڑ جاتے اور اگر ان معمر خاتون کا بھی سہارا نہ ملتا تو ان انجان گلیوں میں...... ناآشنا راستوں پر بھٹکتے میرا کیا بنتا......سوچیں چاروں طرف سے میرا احاطہ کر رہی تھیں، غم و غصہ، بے بسی، خوف میرا دل دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا ابھرتا جارہا تھا۔ اِک، اِک قدم پھونک پھونک کر رکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک دم چیخ سی ابھری تو میں چونکی۔ معمر خاتون کا پیر رپٹ گیا تھا۔ کسی نے آگے بڑھ کے سہارا دیا، وہ دو نوجوان لڑکے تھے۔

''ہم تو بارش انجوائے کرنے نکلے تھے۔ اگر آپ ذرا عقل سے کام لیتیں......اور مین روڈ پر اک اسٹاپ پہلے اتر جاتیں تو اندر آنے والا رستہ صاف تھا......بس ذرا گھر تک جانے کے لیے واک کرنی پڑتی۔''

میں نے سر پیٹ لیا، مجھے اب یاد آیا......واقعی وہاں نالے سڑک کے ساتھ چلتے تھے۔ راستہ پختہ اور ہموار ہی تھا...... بارش کا پانی سیدھے سبھاؤ نالوں میں جا کر گرتا......بات تو سچ تھی مگر بات تھی رسوائی کی۔ مگر انسان بے خبری سے ہی تو مات کھاتا ہے۔ مجھے پچھتاوے گھیرنے لگے۔ یہ جو ہم خود پر ڈگریوں کے لیبل لگائے پھرتے ہیں، کبھی، کبھی عقل کو ہی پچھاڑ کے رکھ دیتے ہیں۔ ان دونوں لڑکوں نے ہمارے ہاتھ تھام لیے تھے۔ اب ہم اِک قطار کی صورت آگے بڑھ رہے تھے اب ہم نے ایک دوسرے کے تھام رکھے تھے۔ پہلے معمر خاتون پھر لڑکا...پھر لڑکا اور پھر میں......ترتیب کچھ بھی رہتی، میرا ہاتھ اِک ناآشنا ہاتھ نے پکڑنا ہی تھا۔ یہ بچاؤ اس لیے تھا کہ قدم، قدم پر فٹوں پانی تلے کھلے مین ہول تھے اور رکاوٹیں ہم سب بار، بار لڑکھڑائے مگر نوجوانوں کے قدم مضبوط تھے...... وہ بار، بار معمر خاتون تو کبھی مجھے تھامتے۔ اِک مین ہول آیا

میں لڑکھڑائی، ساتھ چلنے والے نے مجھے سہارا دیا۔ میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کی گرفت میں بدلتی نیت کی سختی اُمڈ آئی۔ میں نے ہاتھ جھٹکنا چاہا گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ وہ راستے کے رہبر تھے مگر بھروسا کھو بیٹھے تھے۔ گھر کا رستہ جان لیتے تو جانے کیا کرتے بہانہ کر کے بہ مشکل جان چھڑائی......اب آگے کا سفر تنہا طے کرنا تھا۔ اور منزل ہنوز بے نشان تھی۔ سو ہمارا سفر ان ہی کٹھنائیوں، رکاوٹوں کو جھیلتے جاری رہا۔ اور جانے مزید کتنا وقت بیت گیا۔

''ارے وہ سرخ دیوار دیکھتی ہو؟'' معمر خاتون کی آواز میں اِک سرخوشی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور جیسے میرے آس پاس کئی برقی قمقمے جلتے بجھنے لگے۔

''اوہ وہاں......'' میرے علاقے کی گلیاں پار کر کے اِک میدان پڑتا تھا۔ اس میدان کی عقبی سخت دکانیں شادی ہال پھر ہاسٹل اور وہ نکڑ جہاں رکشے کھڑے ہوتے تھے۔ سامنے سڑک کی دوسری جانب پان کا کھوکا اور جناب ہماری گلی کو جاتا راستہ......یعنی میں اپنے علاقے کی عقبی جانب کھڑی تھی۔ اس سرخ دیوار کی اگلی جانب معمر خاتون کا رستہ پڑتا تھا میرا، ان کا ساتھ بس اتنا ہی تھا مگر غنیمت تھا۔ میری جانے کب کی اٹکی سانس بحال ہوئی۔ دل اِک سرخوشی سے دھک، دھک کرنے لگا تھا۔ مگر انہیں سمت بدلنی تھی۔ وہ مڑ گئیں۔ اور میں یک و تنہا، گرجتے بادلوں کے شور میں کڑکتی بجلی اور دھواں دھار برستا پانی...... مگر میری منزل نزدیک تھی قدموں کی رفتار بڑھ گئی۔ اندھیرا گہرا پڑنے لگا۔ اور اِک، اِک قدم منوں وزنی تند بارش کے تیز ریلے قدموں کو چھو کر گزر رہے تھے۔ بجلی زوردار آواز کے ساتھ کڑکی اور ڈھلتی شام کے گہرے ہوتے اندھیرے میں اِک بائیک میرے نزدیک آکر رکی تھی، اِک موہوم سا ہیولہ...... برستی بارش کی موٹی چادر کے عقب میں ابھرا......میرے لبوں سے چیخ ابھرنے کو تھی......اس نے گھسیٹ کر مجھے جکڑا......اور میرے منہ پر اپنا مضبوط ہاتھ دھر دیا۔ میں ہوش کھودینے کو تھی

مگر میری ساری مزاحمت اگلے پل دم توڑ گئی۔ وہ سر سے ہیلمٹ اتار رہا تھا۔ اِک خوف سے پھٹتی میری آنکھیں مسکراتی چلی گئیں۔

''دا......نی......یا......ل......'' حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

''جی جناب صرف آپ کی خاطر، درد کا صحرا بلکہ سمندر عبور کر کے اور اپنی جان پر کھیل کر یہاں تک آیا ہوں......''

''اُف خدایا......'' میرے منہ سے بے اختیار اِک گہری سانس برآمد ہوئی۔ اگلے ہی پل میں اس کے ساتھ لگی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ منزل سامنے آئی تو حوصلہ کھو دیا۔ بدقت تمام ہمتیں مجتمع کر رکھی تھیں۔ میری سسکیوں میں گزرے لمحات کا عکس تھا۔ اور وہ ان کہی پر دسترس رکھتا تھا۔ تنہائی، اور موسم کے ڈراتے، سہاتے تیوڑ میں عورت نہ ہوتی تو کیوں...... یہ کڑی کٹھنائیاں جھیلتی۔

''زندگی کے سفر میں کبھی سمندر، کبھی صحراؤں جیسی کٹھنائیاں تو آتی ہی ہیں۔ انسان تنہا چلتا ہے تو جلدی تھک جاتا ہے اور کبھی، کبھی تو ہار ہی جاتا ہے۔'' اس کا تسلی آمیز لہجہ مجھے احساس ہو گیا......سمندروں کا سینہ چیر کر سفر کرنے والے منزل کا نشان پا کر کیونکر شاد کام نظر آتے ہیں۔

بات چھوٹی سی تھی اور اب میری سمجھ میں آگئی تھی، ساتھ چلنا ہم سفری نہیں ساتھ دینا ہم سفری ہے میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا......اِک نئے سفر کے آغاز کے لیے......

زندگی کے سفر میں اک مضبوط سہارا......سفر کو سہل بناتا ہے۔

مجھے یقین تھا وہ میرے رستے کی تمام کٹھنائیاں سمیٹ لے گا۔

یہی وہ چھوٹی سی بات......اور معمولی سی غلطی تھی جو اس اہم فیصلے کا محرک ٹھہری......

ناولٹ

رسوائے محبت

سعدیہ رئیس

رنگوں اور روشنیوں کے ساتھ تھرکتی ہوئی زندگی کسی دلربا حسینہ کی طرح اپنی چنچل اداؤں کے ساتھ رواں دواں تھی۔ میوزک کنسرٹ اپنے عروج پر تھا۔ سیٹیوں اور تالیوں کے شور میں مدہوش نوجوان لڑکے اور لڑکیاں پوری طرح سے ماحول کی رنگینی میں گم تھے۔ شیراز نے پینٹ کی جیب سے موبائل نکال کر وقت دیکھا اور پاس بیٹھے مگن سے ساغر کی پسلی میں کہنی ماری...... توقع کے مطابق ساغر کا سارا دھیان ایک پل میں ہی ٹوٹ گیا۔

''آؤچ...... کیا بدتمیزی ہے یار۔'' وہ پسلی پکڑ کر اسے گھورنے لگا۔

''نواب صاحب، ٹائم دیکھ کیا ہوا ہے؟ دو بج رہے ہیں۔'' اس نے یاد دلایا۔

''اتنے اچھے نظارے مل رہے ہیں دیکھنے کو...... اور تم چلنے کو کہہ رہے ہو؟'' وہ اطراف میں بکھرے رنگ برنگ نسوانی وجودوں کو دیکھ کر چھچھورپن سے بولا۔

''جب گھر جا کر خالو کے جوتے کھاؤ گے تب تمہارا سارا نشہ ہرن ہو جائے گا۔ گھر سے کتنی مسڈ کالز آئی ہوئی ہیں۔ فوراً اٹھ جاؤ۔''

اس کے فیصلہ کن انداز پر ساغر مزید کچھ نہ کہہ سکا البتہ اس کا منہ بن گیا تھا لیکن پھر ابا جی کا خوف بھی آڑے آ رہا تھا۔ شیراز اس کے موڈ کو بالکل بھی خاطر



میں نہ لایا، وہ ان شور ہنگاموں سے دور ہی بھاگتا تھا اور اب بھی صرف ساغر کی وجہ سے اس کے ساتھ آ گیا تھا... ساغر اس کا خالہ زاد تھا اور شیراز کی بہ نسبت کچھ شوخ، زندہ دل اور حسن پرست تھا اس کے برعکس شیراز کی سوچ میں پختگی اور سنجیدگی تھی لیکن کزن ہونے اور ہم عمر ہونے کی وجہ سے دونوں کی بن جاتی تھی۔

''تیرا ہونے لگا ہوں...... کھونے لگا ہوں، جب سے ملا ہوں......'' ہال سے باہر نکلتے ہوئے ساغر... سرشاری سے گنگنانے لگا۔

لیکن باہر سڑک پر ناچتی ویرانی اور ہر سو چھائے گہرے اندھیرے نے اس کی آواز کو بریک لگا دیے۔ سر پر تاروں بھرا آسمان تھا اور ہال میں گائے جانے والے گانوں کے سُر سنسان اور اندھیری سڑک پر کسی مشاق طوائف کے گھنگروؤں کی جھنکار کی طرح بکھر رہے تھے۔

''یار، واقعی بہت دیر ہوگئی۔'' ساغر کے اب صحیح معنوں میں جیسے حواس جاگے تھے۔

''ہاں...... تم کو تو ہر بات دیر میں ہی سمجھ میں آتی ہے۔'' شیراز نے لطیف سی چوٹ ماری اور کک لگا کر بائیک اسٹارٹ کر دی۔ کچھ ہی دیر میں بائیک فراٹے بھرتی خالی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

''ہاہ...ہا... کیا خوب صورت نظارے تھے، ایک سے بڑھ کر ایک...... نگاہ ہی نہیں ہٹ رہی تھی۔'' ٹھنڈی ہوا نے ساغر کو ایک بار پھر چونچال کر دیا۔

''شرم کرو یار، مجھے بڑا چیپ لگتا ہے لڑکیوں کے متعلق اس طرح اظہارِ خیال کرنا۔'' شیراز نے ناگواری سے اسے ٹوکا۔

''تم سدا کے غیر جذباتی اور ان رومینٹک...... تم کیا جانو ان باتوں کو...... سنا نہیں کہ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ......'' اس پر شیراز کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

''ساغر بیٹا، صنفِ نازک کے لیے ہماری نظروں میں احترام ہونا چاہیے۔ تمہارا انداز سطحی ہے۔ اس طرح اس کی تحقیر ہوتی ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے سمجھایا۔

''جی بڑے ابا! سمجھ گیا......'' اس نے مؤدبانہ و برجستہ انداز میں ہنسی اڑانے والے انداز میں جواب دیا۔

''تم نہیں سدھرو گے......'' شیراز نے کچھ غصے سے اسپیڈ بڑھا دی۔

''تم کو میری باتیں بری لگ رہی ہیں اور وہ لڑکیاں جو خود اپنا اشتہار لگا رہی ہیں، وہ نظر نہیں آ رہا...... تم مجھے ایسا سمجھتے ہو؟ میں جس سے محبت کروں گا اسے اشتہار بنا کر گلی کوچوں میں نہیں چھوڑوں گا...... میں اسے عزت سے اپنے دل میں رکھوں گا۔'' شیراز کی ناراضی محسوس کر کے وہ صفائیاں دینے لگا۔

''نو...... نیور...... امپاسبل...... تم محبت کر ہی نہیں سکتے...... محبت ایک احساس ہے۔ جو روح میں سما جاتا ہے، محبت میں سچائی کی ضرورت ہے اور وہ تم میں بالکل نہیں ہے، محبت میں استقلال درکار ہوتا ہے اور تمہارے اندر پارہ بھرا ہوا ہے، محبت میں گہرائی ہے اور تم سطحِ آب پر تیرنے والے ہو، تم اس کی گہرائی کو کبھی نہیں ناپ سکتے۔'' شیراز نے بھی آج اسے آئینہ دکھانے کی قسم کھالی تھی۔

''مائی گاڈ شیراز...... تم مجھے چیلنج کر رہے ہو؟'' اسے سچ مچ تاؤ آ گیا۔ اسی کے ساتھ بائیک ایک جھٹکے سے رک گئی۔ گھر آ چکا تھا۔

''گدھے...... میں تمہاری آنکھیں کھول رہا ہوں کیونکہ سچی محبت کو صرف خوش قسمت لوگ ہی پاتے ہیں۔'' شیراز نے دوستانہ سے انداز میں قدرے ڈپٹ کر کہا۔ اس وقت اس کی گہری نظروں میں ایک جلتا ہوا احساس تھا جیسے وہ خود بھی اسی راہ کا مسافر ہو، اس سے پہلے کہ وہ کوئی نتیجہ اخذ کرتا وہ بائے کہہ کر بائیک لے اڑا۔

وہ کچھ دیر تک گم صم سا کھڑا رہ گیا۔ تیز ہوا سر پر سے شیراز کی باتوں کی طرح گزر گئی اور اگلے ہی پل وہ سارے خیالات کو جھٹکتا گیٹ کی طرف متوجہ ہوا جو بند پڑا ہوا تھا۔ بیرونی لائٹ کی ملگجی سی روشنی میں سارا گھر رات کے گمبھیر سناٹے میں ڈوبا یہ باور کرا رہا تھا کہ سب نفوس سو چکے ہیں اور اب اندر جانے کے لیے یا تو گیٹ پھاندنا پڑے گا یا کسی طرح سے دیوار لانگنی پڑے

گی۔ گھنٹی بجانا اپنی شامت کو آواز دینا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہناتا اوپری منزل کے کمرے کی کھڑکی روشن ہوگئی اور اس میں عندلیب کا رخِ زیبا صبح کے ستارے کی طرح نمودار ہوا۔ جو ہمیشہ بھٹکے ہوئے کو راستہ دکھاتا ہے۔ وہ بھی ہمیشہ آڑے وقت میں اسی طرح اس کا بچاؤ کرتی تھی۔ عندلیب نے اسے پچھلی طرف آنے کا اشارہ کیا یوں ایک بڑا مرحلہ سر ہو گیا ورنہ ابا جی کے عتاب سے بچنا ناممکن تھا۔

وہ اندر داخل ہوا اور بلی کی چاپ سے اپنے کمرے میں آ گیا، پیچھے، پیچھے وہ بھی چلی آئی۔ شب خوابی سے بوجھل پپوٹے اور ادھ کھلے بکھرے سے بال جنہیں وہ بار، بار سمیٹ رہی تھی اور وہ شانوں پر پھسلے جاتے تھے۔ اس وقت اس سوئی جاگی کیفیت میں اس کے موٹے، موٹے نقوش کچھ اور بھی نمایاں ہو گئے تھے۔ چہرے پر جھلکتی خفگی نے اس کے منہ کے زاویے کچھ اور بھی بگاڑ دیے تھے۔

''ابا جی نے دو بار تمہارا پوچھا پھر دیر تک صحن میں ٹہلتے رہے تھے۔ ابا جی بہت پریشان ہو جاتے ہیں، تم کو ان کا خیال کرنا چاہیے۔'' اسے اطلاعات فراہم کرنے کے ساتھ، ساتھ حسبِ عادت اس نے سمجھانا شروع کر دیا۔ اسی عادت سے وہ چڑتا تھا...... یہی باتیں اسے بری لگتی تھیں۔

''بہت شکریہ تمہاری عنایت کا باقی میں دیکھ لوں گا...... صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔ اب تم جاؤ پلیز، مجھے سونے دو...... میرا موڈ خراب نہ کرو۔''

اگلے ہی پل اس نے تیور بدل کر اس سے رکھائی سے کہا، ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر ایک نامعلوم سی راکھ سی اڑی مگر پھر وہ طنزیہ مسکراہٹ میں ڈھل گئی۔ ہر بار ہی وہ اس کے لیے یوں رات آنکھوں میں کاٹتی تھی اور ہر بار ہی وہ اس کے احسان کو فراموش کر دیا کرتا تھا اس کے باوجود ہر بار وہ دکھ سے ہمکنار ہوتی تھی۔

اس نے ایک خاموش مگر بھرپور شکوہ کناں نظر اس پر ڈالی اور بے چاپ پلٹ گئی۔ صبح اپنے جوبن کے ساتھ نمودار ہوئی وہ تر و تازہ، ہشاش بشاش سا ہو کر ناشتے کے لیے میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ ابا جی کی متوقع پیشی سے بچنے کے بعد اس کا موڈ خود بخود خوشگوار ہو جاتا تھا۔ عندلیب کی جھلک کچن سے نظر آ رہی تھی۔ وہ دھلے برتن کیبنٹ میں رکھ رہی تھی۔ اس نے بال لپیٹ کر کیچر میں مقید کر رکھے تھے۔ تاہم کچھ شرارتی لٹیں قید سے آزاد ہو کر اس کے پھولے، پھولے سے گالوں پر لہرا رہی تھیں۔ اس نے متوجہ کرنے کے لیے دھیرے سے میز کو انگلیوں سے بجایا۔ دوسرے کمرے سے امو جان چلی آئیں۔ انہوں نے منہ سے تو کچھ نہ کہا بس ایک خفگی بھری نظر ڈال کر اگلی نظر گھڑی پر ڈالی۔

''سوری امو جان...... دراصل رات کو بہت......'' اس نے وضاحت دینی شروع کی۔

''بس...... بس...... نہ تمہاری صبح کا پتا ہے نہ رات کا...... یہ کوئی طریقہ نہیں زندگی گزارنے کا......'' وہ ناراضی سے بولیں۔

اس اثنا میں عندلیب دوپٹے کے پلو سے ہاتھ تھپتھپاتی مصروف سے انداز میں کچن سے نمودار ہوئی۔

''سخت بھوک لگ رہی ہے پلیز...... جلدی سے ناشتا بنا دو، چوہے دوڑ، دوڑ کر تھکنے لگے ہیں اب تو۔'' اس کی شکل دیکھتے ہی اس نے بلا جھجک فرمائش کی۔

اپنا ہر کام اس سے نکلوانا اور کروانا وہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ عندلیب نے صرف ایک نظر ہی اس پر ڈالی اور خاموشی سے پلٹ گئی۔

اس کی نظروں میں شکوہ، دکھ اور ہزاروں سوال مچل رہے تھے۔ وہ اسے ہمیشہ ہر وقت، ہر گام اہمیت دیتی تھی مگر وہ صرف کام کے وقت اسے یاد رکھتا تھا اور اب اس کا یہ رویہ عندلیب کو بے حد کھٹکنے لگا تھا۔ لیکن ہر بار کی طرح ساغر نے سرسری سا احساس کرنے کے بعد یہ خیال جھٹک دیا۔

اسے عندلیب میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ

ہونے کا امکان تھا۔ وہ اس کے لیے گھر کے ایک عام فرد کی طرح تھی۔ وہ اسے بچپن سے اسی گھر میں دیکھتا آرہا تھا۔ اسی طرح سر جھکائے، خاموشی سے اپنے حصے کے کام کرتے ہوئے۔ نہ مسکراہٹ......نہ کوئی شرارت، نہ کوئی خواہش اور نہ فرمائش......بس وہ ایک مشینی روبوٹ کی طرح لگتی تھی......زندگی سے سمجھوتا اس نے اسی گھر میں آکر کیا تھا۔ اس کے ہونے سے ماحول میں نہ رنگینی محسوس ہوتی اور نہ ہی کوئی ہلچل......ایک سپاٹ اور بے تاثر چہرے کے ساتھ وہ اسے کبھی بھی اچھی نہیں لگی۔

''بھلا ایسی ہوتی ہیں لڑکیاں؟ نہ کوئی رنگ نہ ڈھنگ، نہ ادا نہ کوئی اسٹائل......کتنی عجیب ہے یہ۔'' وہ دل میں سوچ کر رہ جاتا۔

ان دونوں کے درمیان کبھی ہنسی مذاق کی نوبت ہی نہیں آئی تھی کیونکہ وہ بہت ریزرو رہتی تھی۔ عائزہ پھپو کی موت کے بعد ابا جی نے اسے باپ بن کر اپنی... سرپرستی میں لے لیا تھا۔ اس کے اپنے باپ نے تو چھ ماہ بعد ہی دوسری شادی رچالی تھی۔ جو غم اسے چھوٹی عمر میں ملا اس نے اس کی فطرت میں لوچ، تابعداری اور سنجیدگی سی پیدا کردی تھی۔ اس نے ایک خول خود پر چڑھا لیا تھا لیکن ساغر نے کبھی اس خول کو چٹخانے کی کوشش نہ کی، کبھی اس خول کو توڑ کر اس کے وجود میں گم قہقہوں اور مسکراہٹوں کو کھوجنے کی کوشش نہ کی، اس کی نظر میں وہ اس کے ہر حکم پر بلا چون وچرا عمل کرنے والی ایک ڈمی تھی اور بس......!

اگر جو وہ اس کے وجود کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھ لیتا تو وہاں موجود ایک خوش رنگ وخوش جمال وادی میں اسے ہر سو محبت کی رنگین تتلیاں دکھائی دیتیں لیکن اس نے کبھی ضرورت ہی محسوس نہ کی کیونکہ اسے متوجہ کرنے کے لیے اس کے آس پاس بہت سے رنگ اور روشنیاں تھیں جن کی چکاچوند سے اس کی نگاہیں چندھیائی جارہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں عندلیب نے لوازمات سے پُر ناشتا اس کے سامنے میز پر چن دیا۔ گرما گرم پراٹھا، ہاف فرائی انڈا اور گھر کا تیار کردہ کیک......ساری باتیں بھول کر وہ ناشتے پر ٹوٹ پڑا کہ ناشتا اس کا پسندیدہ تھا اور مزے دار بھی تھا......یہ اور بات تھی کہ کبھی اس نے تعریف کرنے کی زحمت نہیں کی تھی کیونکہ یہ لذت اور ذائقہ اسے ہمیشہ سے ہی میسر تھا۔

''سنو......! مجھے فرحت کے ہاں جانا ہے۔'' کچھ دیر بعد اسے قریب سے عندلیب کی آواز سنائی دی۔

رغبت سے ناشتا کرتے ہوئے اس نے دیکھا ہی نہیں کہ عندلیب کافی دیر سے اس کے پاس کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

''اُف، فضول کی ڈیوٹی......'' وہ دل ہی دل میں جلبلایا۔

''یہ تم ہر وقت سہیلیوں کے ہاں کیوں جاتی رہتی ہو، بیکار میں فضول باتوں میں وقت ضائع کرنا۔'' مزے دار ناشتے سے بھرپور انصاف کرنے کے بعد وہ پھر اپنی اصل روش پر لوٹ آیا۔

کٹھور لہجے میں اسے صاف منع کردیا......اس سمے اسے عندلیب کے چہرے پر اڑتا دکھ کا غبار بالکل نظر نہیں آیا۔

اس کی شبنمی آنکھوں میں حیرت اور تاسف جھلک رہا تھا۔ کاسنی ...گلابی امتزاج کے پھولدار سوٹ میں بلاشبہ وہ موسم بہار کی طرح دلکش ودل آویز لگ رہی تھی مگر خزاؤں کی زد میں آکر جیسے زردی سی پڑ گئی تھی۔ اسے محسوس تو ہوا مگر نظر انداز کردیا۔

''ساغر......! ابھی اور اسی وقت عندلیب کو فرحت کے گھر لے جاؤ.... اسے بہت ضروری نوٹس لینے ہیں۔'' امو جان نے حتمی انداز میں حکم دیا اور امو جان کا حکم ٹالنے کی اس میں تاب نہیں تھی لیکن دل میں عندلیب کے لیے اور بھی تنفر بڑھ گیا۔ جب بھی امو جان یا ابا جی اسے اہمیت دیتے تھے تو اس کا غصہ سوا ہوجاتا تھا۔ اکلوتا وہ تھا اور ناز اس کے اٹھائے جاتے تھے۔ یہی بات اس کا جی جلاتی تھی۔

کچھ ہی دیر میں وہ جھٹ پٹ تیار ہوکر آگئی۔

زعفرانی وخاکی شیڈ کے لباس میں اس کی کھلتی ہوئی رنگت میں سرسوں سی گھل گئی تھی۔ جب وہ سعادت مندی سے اس کے قریب آکر کھڑی ہوئی تو اس نے سارا غصہ زور سے بائیک کو کک لگا کر اتارا اور عندلیب اس کے بگڑے تیوروں سے خائف ہوکر چور سی بن گئی۔

وہ اس کے موڈ اور مزاج کی اِک، اِک رگ سے واقف تھی۔ وہ کب اس سے دوستانہ انداز میں بات کرتا ہے اور کب انجان اور بے مہر بن جاتا ہے وہ سب جانتی تھی مگر وہ اس پر ایک نگاہِ غلط بھی نہ ڈالتا تھا۔

وہ بس اسے گوارا ہی تھی اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا مگر پھر بھی وہ اس کی نگاہِ التفات کی منتظر تھی۔

اسے یہ نرم گرم رویہ سہنے کی عادت سی ہوگئی تھی، اسے امید تھی کہ اس کے جذبوں کی تپش ایک روز اسے موم کردے گی کیونکہ ہر مشکل میں وہ صرف اسے ہی آواز دیتا......اور وہ اس کی ہر پکار پر لبیک کہتی......لیکن اس کے دل کی پکار اسے کبھی سنائی نہیں دیتی اس کے باوجود وہ اس کی تپسیا کیے جارہی تھی۔

☆☆☆

اس رات بھی وہ بہت دیر سے گھر آیا تھا حسبِ معمول پورا گھر رات کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور سب طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ ہمیشہ کی طرح اوپری کمرے کی کھڑکی روشن ہوگئی۔ عندلیب نے اسے پیچھے کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ عقبی دروازے پر پہنچا تو عندلیب اس کی منتظر کھڑی تھی۔

''آج ابا جی بہت غصے میں تھے۔'' اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے اطلاع دی۔

''یہ کون سی نئی بات ہے۔'' وہ ہمیشہ ہی مجھ پر گرم رہتے ہیں۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''امو جان کو بھی باتیں سنائی ہیں خوب، ان کا خیال ہے کہ یہ اُن کی ڈھیل کا نتیجہ ہے۔'' وہ آواز دبا کر بولی۔

''کیسی ڈھیل......؟ کیسا نتیجہ......خواہ مخواہ کی باتیں ہیں اُن کی......میں دور کردوں گا ان کی سب شکایتیں......'' وہ رکھائی سے بولا۔

''مگر امو جان کب تک سنتی رہیں گی، تم ان کا ہی خیال کرلو......'' وہ پھر سمجھانے چلی۔

''پلیز بند کرو اپنا لیکچر، میں اپنا مسئلہ خود حل کرسکتا ہوں۔ بہت شکریہ تمہارے اس احسان کا کہ میرے لیے دروازہ کھولا۔'' اگلے ہی پل اس کا لہجہ بدل گیا۔ عندلیب نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اس آسانی سے اس کے دل میں پنپتے جذبوں کو روند دیا کرتا تھا کہ ہر بار وہ نئے سرے سے دکھ اٹھاتی تھی۔

''میں تو تمہیں ابا جی کی پھٹکار سے بچانے کے لیے ایسا کرتی ہوں۔'' وہ کبھی جتاتی تو نہیں تھی مگر اس وقت کہہ گئی۔

''اچھا، بہت جلد تمہاری یہ ڈیوٹی ختم ہوجائے گی اور یہ بھی سن لو کہ مجھے ابا جی کی پھٹکار کا کوئی خوف نہیں......'' اس نے بدلحاظی سے کہا۔

اتنی سبکی اس سے پہلے کبھی نہ اٹھائی تھی۔ آج تو اس کا لہجہ، اس کا انداز ہی بدلا ہوا تھا۔ چہرے پر سختی اور بیزاری تھی۔ وہ بہ مشکل آنسو پیتی وہاں سے پلٹ گئی۔

نئے دن کی نئی صبح ہمیشہ کی طرح نئے موسم اور نئی امنگ لے کر نمودار ہوئی۔ صبح وہ خلافِ توقع جلدی اٹھ گیا......جس وقت وہ ابا جی کے روبرو کرسی کھینچ کر بیٹھا عندلیب نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ آج اس کے چہرے پر کوئی ڈر نہ تھا۔ ایک عجیب سی فتح وسرشاری تھی جیسے نئی دنیاؤں کو دریافت کرلیا ہو۔

''حیرت ہے یہ آج سورج مشرق کے بجائے مغرب سے کیسے نکل گیا؟'' ابا جی نے طنزیہ چوٹ کی۔

مگر اس نے بالکل بھی برا نہ مانا بلکہ ایک دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پر دوڑ گئی۔ لیکن پھر وہ زیادہ دیر تک صبر نہ کرسکا اور اپنی ملنے والی جاب کی خوشخبری سنادی۔ اس خبر نے جیسے ابا جی کی خوشی دو چند کردی۔ آج فرزندِ ارجمند نے نہ صرف صبح ہی صبح دیدار کرایا تھا بلکہ جاب کی خوشخبری بھی دی تھی۔ ہمیشہ ناراض اور گرجنے برسنے والے ابا جی نے اس کی پیٹھ ٹھونک کر اسے داد دی لیکن جیسے ہی امو جان کو یہ معلوم ہوا کہ اس کی جاب اسلام آباد

... میں لگی ہے انہوں نے فوراً منع کر دیا۔

''ارے امو جان.....کون سا میں امریکا جا رہا ہوں، اب فاصلے کوئی فاصلے نہیں رہے، اتنی پُرکشش جاب کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہے۔'' اس نے بہت منایا مگر امو جان ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

تب ابا جی نے ان کے کان میں جانے کیا صور پھونکا کہ پھر وہ فوراً مان گئیں اور ان کا اقرار سن کر وہ خوشی سے ان سے لپٹ گیا۔ اپنی خوشی میں اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ عندلیب وہیں کہیں دیوار کی اوٹ میں کھڑی اس کی خوشی پر رب کی شکر گزار تھی اور اپنی بے بسی پر حد درجہ ملول بھی۔ وقت کم تھا اور کام بہت...... پیکنگ کے لیے کپڑوں کا انتخاب کرنا مشکل ہوگیا۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے عندلیب کے کمرے میں آ گیا۔ وہ سر پر دوپٹا لپیٹے ہوئے تھی شاید ابھی نماز پڑھ کر اٹھی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر گھلے سوز میں ایک عجیب چمک سی تھی۔ غلافی بوجھل پپوٹے کچھ متورم سے تھے جیسے کہ وہ روئی ہو۔ آنسوؤں سے دھلا چہرہ ہمیشہ سے مختلف اور بہت مقدس لگ رہا تھا۔ وہ چند لمحوں تک نظریں نہ ہٹا سکا لیکن پھر اگلے ہی پل کپڑوں کا ڈھیر اس کے بیڈ پر ڈال دیا۔

''یہ کام تو تمہارا ہی ہے، میرے بس کا نہیں ہے۔'' ہمیشہ کی طرح اس نے بڑے حق سے اسے کام سونپا۔

عندلیب نے چونک کر اسے دیکھا وہ دوستانہ مسکراہٹ لیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر نگاہوں کا رخ بدل لیا۔

''کچھ ضروری شاپنگ کی لسٹ بھی بنائی ہے میں نے، تم وہ بھی دیکھ لینا شاید میں کچھ بھول گیا ہوں۔'' اس نے عام سے انداز میں اسے ہدایت دی تھی لیکن اسے وہ بہت خاص لگا۔ اک ذرا سی نظرِ عنایت ہی اس کے لیے کافی ہوتی تھی، ہمیشہ کی طرح اس نے اپنی مدد کے لیے اسے ہی پکارا تھا۔

''ہاں دکھا دینا لسٹ، میں دیکھ لوں گی۔'' وہ انکساری سے بولی۔

''ہوں...... ابھی تو میں ذرا باہر جا رہا ہوں تم جب تک یہ کپڑے دیکھ لو اور جن شرٹس کے بٹن ٹوٹے ہوئے ہیں وہ ضرور ٹانک دینا......'' اس نے مزید کام بتایا۔

''اگر تمہیں کچھ منگوانا ہو تو بتا دو میں لے آؤں گا۔'' اس وقت تو اس نے حیران کرنے کی ٹھانی ہوئی تھی۔

عندلیب نے بغور اسے دیکھا مگر جب تک وہ پلٹ چکا تھا۔ اس نے بیڈ پر پڑے کپڑوں کو بہت انہماک سے دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ ہر جوڑے کو جیسے بڑی عقیدت سے بہت احتیاط سے سنبھال، سنبھال کر رکھ رہی تھی۔ تبھی وہ ایک بار پھر آ گیا۔

''ذرا چائے تو بنا دو پہلے، مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' وہ عجلت میں کہہ کر فون کان سے لگائے پلٹ گیا۔

چائے پینے کے بعد وہ اپنے کسی ضروری کام سے چلا گیا مگر چائے پینے کے دوران وہ بہت خوشگوار موڈ میں اسے اپنے ہوٹل میں قیام کے بارے میں بتاتا رہا۔ اپنے ساتھیوں اور دوستوں کا ذکر کرتا رہا۔

اور یہ لمحے اس کے لیے یادگار لمحے تھے کہ جب اس کی نظرِ کرم اس پر ہوئی تھی۔ وہ محبت کو عقیدت سے سنبھالے، عبادت کی طرح ادا کر رہی تھی...... وہ پرستش کر رہی تھی بغیر کسی صلے اور تمنا کے...... اس نے آس کا دیا روشن کر رکھا تھا...... وہ سچی محبت اور سچی رفاقت کے لیے دعا گو تھی۔

اور اس کی دعائیں عرش پر کسی روشن چراغ کی طرح تھرتھرا رہی تھیں۔ شیراز بھی اسے مبارک باد دینے آیا مگر اس وقت وہ گھر سے باہر تھا۔ اسے اپنے بہت سے کام نمٹانے تھے اس لیے مصروفیت بہت زیادہ تھی۔ اگلے روز بھی اس کی غیر موجودگی میں شیراز آ کر چلا گیا۔ پہلے تو وہ اکثر ہی آ جایا کرتا تھا مگر پھر بہت سی مصروفیات کا بہانہ کر کے آنا کم کر دیا بلکہ برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ اب اتنے عرصے بعد وہ آیا اور ملے بغیر چلا گیا اس کا ساغر کو بہت افسوس ہوا۔

رات وہ دیر سے گھر لوٹا اور ابا جی کو اپنے انتظار میں جاگتے دیکھ کر ٹھٹک گیا... اگرچہ اب وہ نالائقی کی فہرست سے خارج ہو چکا تھا مگر پھر بھی گھبرا سا گیا۔

''ہاں بھئی ساغر بیٹے، ہوگئی تیاری مکمل......؟'' انہوں نے نرم لہجے میں دریافت کیا۔

''جی ابا جی! تقریباً......'' اس نے مؤدبانہ جواب دیا۔

''اگر ساری تیاری ہوگئی ہے تو کچھ دیر ہمارے پاس بھی بیٹھ جاؤ......'' ابا جی کے عقب سے اندھیرے کمرے سے امو جان کی آواز سنائی دی تو وہ چونک گیا۔

زندگی کے سفر میں پہلا قدم بڑھایا ہی تھا کہ معتبر ٹھہرا دیا گیا، وہ سرشار سے انداز میں دوڑ کر امو جان کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''ارے امو جان، آپ کے اور ابا جی کے لیے میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔'' اس نے فرمانبرداری کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔

''بیٹے مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' امو جان نے تمہید باندھنے میں دیر نہ کی، اسے معلوم تھا کہ ہمیشہ کی طرح وہ اسے لمبی چوڑی نصیحت کریں گی جس میں زمانے کی اونچ نیچ یا دھوکا اور فریب اور سچ، جھوٹ کی باتیں ہوں گی۔ اس وقت اسے لگتا کہ امو جان بلاوجہ اسے یہ سب بتا رہی ہیں کیونکہ وہ اب باشعور ہوگیا ہے اسے بھی اچھے اور برے کی پہچان ہے۔ اسے بھی اب معلوم ہے کہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ زندگی کبھی، کبھی بہت سخت امتحان بھی لے لیتی ہے۔ جو سبق انسان کسی کتاب میں نہیں پڑھتا وہ زندگی پڑھا دیتی ہے۔

''تمہاری امو جان کو تمہاری فکر ہے، وہاں اکیلے کیسے رہو گے تم؟'' ابا جی نے بات کا آغاز کر دیا۔

''امو جان......! میں کوئی بچہ تھوڑی ہوں اور میرے ساتھ میرا کولیگ بھی ہوگا۔'' اس نے اطمینان دلایا۔

''لیکن تم پہلی بار گھر سے دور جا رہے ہو اور پھر دو لڑکوں کا اکیلے جانا اور رہنا بھی ٹھیک نہیں۔'' امو جان کی اپنی ہی سوچ تھی۔

''دو لڑکے اکیلے کیسے ہوگئے امو جان......'' وہ ان کی بچکانہ سی بات پر ہنس دیا۔ سچ تو یہ تھا کہ اسے اب اپنی سوچ اور سمجھ پختہ لگتی تھی اور امو جان کی باتوں میں معصومیت سی لگتی تھی اور خود کو عقلِ کُل سمجھنا ہی ناپختگی کی نشانی ہے کیونکہ انسان اپنے جھولے سے اپنی موت تک زندگی سے ہر لمحہ کچھ نہ کچھ سیکھتا ہی رہتا ہے۔ زندگی پینترے بدل، بدل کر اسے دنیا کے رنگ دکھاتی ہے۔ وہ تجربے کی بھٹی میں تپ کر زندگی کا فلسفہ سمجھتا ہے۔

''تم ابھی ناتجربے کار اور ناسمجھ ہو، تم نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے؟ میں نے بھائی امداد حسین سے بات کر لی ہے وہ میرے چچا زاد بھائی ہیں اور عرصے سے اسلام آباد میں رہتے ہیں۔ تم انہی کے گھر رہنا۔'' اس کا جواب جاننے کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

وہ ہکا بکا سا حیران، پریشان انہیں دیکھتا رہ گیا۔ انہوں نے اس سے مشورہ لینا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''مگر امو جان......'' اس نے انکار کرنا چاہا۔

''کوئی اگر مگر نہیں، وہ بہت پیسے والے ہیں، کپڑے کا بڑا کارخانہ ہے ان کا، اور سواری کی بھی فکر نہیں کرو، وہ بندوبست کر دیں گے۔'' وہ سب کچھ طے کر چکی تھیں وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

''ایک بات تو ہوگئی اب دوسری بھی کر لیں۔'' اسے رضامند پا کر ابا جی نے اگلی بات نکالی اس نے ٹھٹک کر دونوں کو دیکھا۔ دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ سی تھی۔

''تمہارے ابا جی کی خواہش ہے کہ اب عندلیب کی شادی ہو جانی چاہیے آج کل اس کے رشتے بھی آ رہے ہیں۔'' امو جان نے بلا تاخیر مطلوبہ ذکر نکال لیا۔

''مگر ابھی تو مجھے فوری جانا ہے، مجھے اپنی سیٹ سنبھالنی ہے، تھوڑا سیٹ ہو جاؤں تو پھر رکھ لیں شادی اس کی۔'' وہ سمجھا کہ عندلیب کی شادی تک رکنے کے لیے کہہ رہے ہیں تاکہ وہ بھی شریک ہو۔

''میں صدقے جاؤں، میں تو کہہ ہی رہی تھی میرا پتر

فوراً مان لے گا میری بات......'' اموجان کچھ اور ہی سمجھیں۔
''تو پھر ٹھیک ہے جانے سے پہلے اسے اپنے نام کی انگوٹھی پہنا دو......'' ابا جی نے نہال ہوتے ہوئے تجویز دی۔
''جی ......کیا! عندلیب اور میں......مگر......'' وہ بری طرح پریشان ہوگیا۔
''سوچنا سمجھنا کیسا وہ اپنی دیکھی بھالی، نیک، سلجھی ہوئی بچی ہے۔ بس تم بسم اللہ کرو......سب خیر ہوگی۔'' اموجان نے اس کا اقرار سمجھ کر جھٹ پٹ دعا بھی دے ڈالی۔ اسے لگا کہ اس کا دل بیٹھتا جارہا ہے۔ وہ دل ہتھیلی پر سرسوں جمارہے تھے اور انہیں صاف انکار کرتے اسے پسینے آرہے تھے۔
وہ انہیں کوئی واضح انکار کیے بغیر خاموشی سے کمرے میں آگیا۔ اسے سخت غصہ آرہا تھا۔ بیٹھے بٹھائے کی نئی مصیبت گلے پڑ رہی تھی۔
شامت کی مار کہ اسی وقت عندلیب اس کے دُھلے کپڑے تہ کر کے کمرے میں لے آئی اور اسے دیکھتے ہی اس کا خون ابلنے لگا مگر ضبط کیے رہا۔ اس وقت وہ اسے دنیا کی سب سے بری لڑکی لگ رہی تھی۔ اپنے پھولے، پھولے گال، گداز کلائیوں اور فربہی مائل جسم کے ساتھ وہ بے حد بری لگی اور اس کے اندرونی احساسات سے بے خبر وہ مگن اور مصروف سی جیسے اپنے حال سے بھی بے خبر سی تھی۔ اس کی پیکنگ اور دیگر فوری کاموں کے باعث اس کے چہرے پر تھکن تھی اور بال بھی کچھ بکھرے ہوئے تھے۔
''لو بھئی......تمہارا یہ آخری سوٹ بھی استری کردیا ہے۔ اب اگر مزید کچھ کام باقی ہے تو ابھی سوچ لو، کل کا کچھ پتا نہیں، شاید کل کچھ اور کام نکل آئے۔'' اس کے احساسات سے بے خبر وہ شرارتی سے انداز میں بولی۔
اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اس سے اتنی ....بے تکلفی سے بات کررہی تھی کیونکہ پچھلے دنوں ان کے درمیان خوشگوار تعلقات تھے۔ وہ اسے پہلی بار اتنی لفٹ کروا رہا تھا۔ ہر کام کے لیے اسے ہی بلا رہا تھا اور وہ بھی بلاتردد اس کا ہر کام کرتی جارہی تھی۔
اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کی سفید رنگت اور عام سے نقوش میں کوئی کشش نہ تھی۔
دل نے اسی وقت اسے رد کردیا......اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنا انکار اموجان تک کیسے پہنچائے پھر اچانک ہی اسے شیراز کی یاد آگئی، ہر ایسے موقع پر اسے شیراز ہی مشورہ دیا کرتا تھا۔ یعنی اپنے وقت پر کام نکلوالینا اس کی عادت بن چکی تھی۔ اور یہ عادت اتنی پختہ ہوچکی تھی کہ وہ اس خامی کو خوبی سمجھ کر بڑے حق سے اپنے مطلب نکالنا جان گیا تھا۔
''یار شیراز......اب تم ہی اس مسئلے کو حل کرو......'' اسے ساری بات بتا کر اپنا بوجھ اس کے سر ڈال کر وہ ہلکا پھلکا ہوگیا۔
''کیا بات کررہے ہو؟ تو تم عندلیب کے لیے منع کررہے ہو؟'' وہ حیران ہوا۔
''صاف بات ہے یار، اس میں وہ کوالیٹز نہیں ہیں جو میں اپنی بیوی میں دیکھنا چاہتا ہوں، ویسے بھی وہ روکھے سوکھے مزاج کی بورنگ سی لڑکی ہے۔'' اس نے کچھ نہ چھپایا۔
''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم دونوں کے درمیان کوئی کمٹ منٹ ہے۔'' اس نے تصدیق چاہی۔
''توبہ کرو...... میری چوائس اتنی عام سی نہیں ہوگی۔'' وہ کندھے جھٹک کر بے پروائی سے بولا۔
''آ......آچھا......مگر ساغر......وہ ایک بے مثال لڑکی ہے......'' اس نے کمزور سے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔
مگر ساغر کا انکار حتمی تھا۔ اس کے لہجے میں... قطعیت اور چہرے پر سختی تھی۔
''سوری ساغر، اس بار میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا کیونکہ میں نے کبھی کسی کا دل نہیں توڑا......میں نے ہمیشہ اس لڑکی کو خوشی، خوشی تمہارا ہر کام کرتے دیکھا ہے۔ وہ ایک سچا موتی ہے......بہت قیمتی ہے وہ......'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیپ سے جلے۔

محبتوں کا چراغاں جانے کب سے اس کے دل میں ہورہا تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا بس وہ ان چراغوں کو شوریدہ ہواؤں سے بچائے جارہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں آندھیوں کی زد میں آکر چراغ نہ بجھ جائیں......کہیں کوئی ان چراغوں کی روشنیوں کا راز نہ پالے......ساغر نے ٹھٹک کر اسے دیکھا......اسے کچھ نیا پن محسوس ہوا۔
''مجھے تو تمہارا معاملہ گڑبڑ لگ رہا ہے کون ہے وہ حسینہ جس نے دیوانہ بنا رکھا ہے۔'' اس نے اچانک ہی اس کی سرزمینِ دل پر چھاپا مار دیا۔
شیراز نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ ساغر اسے ہی دیکھ رہا تھا اسے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی اور وہ اس کا مسئلہ حل کیے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ اور ساغر کوفت میں مبتلا اس نئی الجھن کا حل سوچنے لگا بالآخر ایک حل اس نے سوچ ہی لیا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔
جانے سے ایک دن پہلے اس نے اموجان سے بے دلی سے آمادگی ظاہر کردی۔ وہ اسی میں بے حد خوش ہوگئیں۔ عندلیب چائے لے کر آئی تو وہ اموجان سے خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ وہ بھی وہیں بیٹھ گئی اس کے جانے کے خیال سے وہ بھی اداس تھی؟ اس کا سادہ سا سراپا سوز میں گھلا ہوا تھا۔ گھنیری پلکوں پر شبنم سی چمک رہی تھی۔ چلتے وقت وہ خاص طور پر اس کے پاس آیا۔ وہ کچھ گھبرا سی گئی اس کے چہرے پر فطری شرم وحیا کا نور سا پھیل گیا۔ اموجان کی خواہش اس کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی اور یہ خوشی اس سے سنبھالے نہ سنبھل رہی تھی۔
''عندلیب میرے جانے کا وقت ہوگیا ہے...... ہر کسی کو ایک نہ ایک دن جانا ہوتا ہے...... ہر کسی کا اپنا الگ راستہ اور منزل ہوتی ہے۔ میں ابھی اپنی منزل کی تلاش میں ہوں......اس مشکل وقت میں تم ہی میرے کام آسکتی ہو......اموجان کو سمجھانا میرے بس میں نہیں اس لیے بہتر ہے کہ تم خود اس رشتے سے انکار کردو......''
اس کے لفظ پتھر کی طرح اسے لگے......وہ جیسے

ناقابل فراموش

''تین وجوہات سے میں اس واعظ کو پسند نہیں کرتا۔''
''پہلی بات یہ کہ مجھے اس کا وعظ پسند نہیں، دوسری وجہ یہ کہ چندہ کی اپیل کرتا ہے، تیسری وجہ یہ کہ اس واعظ نے میرا اور میری بیوی کا نکاح پڑھایا تھا اور یہ ایک ایسا حادثہ ہے جس کو میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔''

راہِ فرار

مہمان ایک شخص کی طرف مخاطب ہوکر اس گیت پر اظہار خیال کرنے لگا جو ابھی، ابھی ایک خاتون نے پارٹی میں پیش کیا تھا۔
''کتنی دلخراش اور ہیبت ناک آواز ہے اس خاتون کی۔ آپ جانتے ہیں یہ خاتون کون ہے؟''
''جی ہاں......'' اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں اچھی طرح جانتا ہوں، یہ خاتون میری بیوی ہے۔''
''معاف کیجیے گا۔ میرا مطلب ہے، دراصل یہ آواز کا بھی قصور نہیں ہے۔''
مہمان نے گھبراہٹ میں صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''بعض گیتوں کی بندش ہی کچھ ایسی بے ہودہ ہوتی ہے کہ گانے والا باوجود انتہائی کوشش کے کچھ نہیں کر پاتا۔ آپ مجھ سے اتفاق فرمائیں گے کہ یہ گیت کسی ایسے نالائق اور کم سمجھ آدمی نے لکھا ہے، جسے فنونِ لطیفہ سے دور کا بھی واسطہ معلوم نہیں ہوتا۔ کس کا گیت ہے یہ؟''
''میرا......'' اس شخص نے جواب دیا۔
انتخاب: نفیسہ آرا، راس الخیمہ

صلیب پر چڑھ گئی...... اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل پائی اور دل میں ماتم برپا ہوگیا...... وجود میں نوحے گونجنے لگے...... آنکھوں کی جوت بجھ گئی۔ وہ کھوئی، کھوئی سی خالی نظریں، خالی دل لیے اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔ وہ ایک بار پھر اپنا کام نکلوا کر اسے اکیلا چھوڑ گیا تھا۔ وہ اکیلی رہ گئی تھی...... ہمیشہ کے لیے اکیلی......

''اس نے تو گلاب بوئے تھے' اسے ببول کیوں ملے......'' وہ خود سے سوال کرتی رہی۔ اسے جواب نہ ملا...... سب طرف گہری دبیز خاموشی کی ردا تنی رہی......

اس خاموشی کے پیچھے بہت سے راز تھے...... مگر ان کا افشا ہونا قبل از وقت تھا۔ اموجان گھبرا گئیں...... اسے چپ ہی لگ گئی تھی۔ کام کرتی تو کیسے جاتی، کیسے جاتی...... اسے اپنی خبر بھی نہیں تھی۔ بس اپنے حال میں مست...... خیالوں میں کھوئی...... چہرے پر ویرانیوں کو سجائے جی رہی تھی۔

''ہائے ربا...... یہ کچھ بولتی ... کیوں نہیں......'' اموجان فکر میں ڈوب گئیں۔ ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ اس پر کیا گزری ہے بس وہ تو اپنے ہی خیالوں میں تھیں۔

''ساغر کے جانے کو بہت محسوس کرلیا اس نے......'' وہ اپنے تئیں یہی سمجھ رہی تھیں' اس کی حالت ان کی سمجھ سے باہر تھی۔ مگر شیراز کو کچھ، کچھ اندازہ ہوگیا تھا۔ ساغر کے جانے کے بعد اموجان کی خبر گیری اور دلجوئی کے لیے وہ بلا ناغہ آنے لگا تھا۔

عندلیب نے خود پر خول چڑھا لیا تھا اور اس خول کو توڑنا بہت مشکل کام تھا مگر شیراز کو یقین تھا کہ ایک روز گلابوں کی خوشبو سب طرف پھیل جائے گی...... اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی شادابی لوٹ آئے گی۔

☆☆☆

ماموں امداد حسین کے گھر کے بیرونی تاثر نے ہی اسے مرعوب کر ڈالا جدید انداز کا چھ سو گز پر بنا بنگلوز اسٹائل گھر جس کے پرلی طرف سرسبز باغ اسے کچھ اور بھی نمایاں کررہا تھا۔ وسیع پورچ میں تین چار گاڑیاں کھڑی تھیں جن میں سے دو گرد سے اٹ رہی تھیں یعنی وہ کسی کے استعمال میں نہ تھیں۔ ماموں امداد حسین اس سے بڑے تپاک سے ملے اور مامی نے بھی شفقت و محبت سے استقبال کیا اس کا مطلب تھا کہ وہاں اموجان کی ٹھیک ٹھاک صاحب سلامت تھی۔ ان کے دونوں بیٹے ارحم اور اشرف بھی خوش مزاج تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ان سب میں گھل مل گیا تھا۔ جیسے بہت دوستانہ ہو، لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ ان کے درمیان اجنبی ہے۔ دل پر پڑا بوجھ بالآخر چپکے سے دھیرے سے جانے کہاں چلا گیا ورنہ سارا رستہ سفر کے دوران وہ عجیب سی اداسی محسوس کرتا رہا۔ اسے بار، بار عندلیب کی حیران نظریں اور ان میں اترتی ویرانی یاد آتی رہی تھی۔

اگلی صبح اسے اپنی سیٹ سنبھالنی تھی۔ اس کا آفس وہاں سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اشرف نے اسے بائیک دے دی تھی' اتنی اہمیت اور عزت اس سے سنبھالے نہ سنبھل رہی تھی۔ پہلا دن دلچسپ، انوکھا اور مصروف گزرا...... اسے بہت مزہ آیا۔ شام کو گھر لوٹا تو اشرف تازہ دم ہو کر تاش کے پتے سنبھال کر اس کا منتظر بیٹھا تھا۔ یہ دوستانہ ماحول عین اس کے مزاج اور خواہش کے مطابق تھا۔ اسے اشرف اور ارحم کے ساتھ کھیلتے ہوئے بہت مزہ آیا مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ اس کی اتنی تدبیروں اور چالوں کے بعد بھی وہ ہمیشہ بازی ہار جاتا تھا اور بازی چالوں سے بدلتی ہے یا قسمت سے...... یا پھر انسان کی سوچ سے...... وہ یہ بات ابھی نہیں سمجھ رہا تھا۔

اموجان اور اباجی سے تقریباً روز ہی بات ہوتی تھی مگر جب اموجان کہتیں ''عندلیب کو تو چپ ہی لگ گئی ہے تمہارے جانے کے بعد سے'' تو وہ بری طرح ڈسٹرب ہوجاتا...... اسے معلوم تھا کہ اس کے آنے کی وجہ سے اموجان پہلے ہی بہت اداس اور... فکرمند تھیں اور اب عندلیب کا یہ رویہ انہیں اور پریشان کررہا تھا لیکن پھر شیراز کی وہاں روز آمد کا سن کر وہ اموجان کی طرف سے مطمئن ہوگیا کیونکہ اسے شیراز پر

بھروسا تھا وہ ہر جگہ بگڑی بات کو سنبھال لیتا تھا۔

ہفتہ بھر بعد پہلا ویک اینڈ آنے پر وہ بہت خوشی محسوس کررہا تھا۔ اشرف نے اچانک ہی ایک پروگرام بنا ڈالا۔

''جناب آج میں تم کو ایک ایسی خوب صورت جگہ دکھاتا ہوں کہ لطف دوبالا ہوجائے گا۔ اماں جان کو شیریں خالہ کو کچھ سامان بھجوانا ہے اس لیے سوچا کہ لگے ہاتھوں تم کو بھی وہ خوب صورت جگہ دکھا دوں۔''

گرے کرولا میں بیٹھتے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اسے تفصیل بتائی۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ شیریں خالہ اس کی سگی خالہ ہیں یا پھر کوئی رشتے دار لیکن اتنا اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ جو بھی تھیں ان سے بے حد گہرے مراسم تھے، وہ ایک نواحی بستی میں مقیم تھیں اور ان کا گھر یہاں سے چالیس' پچاس کلو میٹر کے فاصلے پر تھا لیکن اشرف کے ساتھ باتوں میں اور پھر خوشگوار آب وہوا کی وجہ سے سفر بہت اچھا گزرا۔

شیریں خالہ کی چھوٹی سی بستی بہت سرسبز اور خوب صورت تھی۔ پھلوں سے لدے درخت رستوں میں پھولوں کے پودے جا بجا تھے۔ ان کا چھوٹا سا گھر سادگی کا نمونہ تھا اور ان کی سفید پوشی کو ظاہر کررہا تھا لیکن رکھ رکھاؤ اور رہن سہن میں بہت وضع داری کی جھلک تھی۔ فرشی نشستوں پر گول تکیے اور فرل والے کشن سجے ہوئے تھے۔ گھر کی ہر شے سے قرینہ اور نفاست ٹپک رہی تھی۔ وہاں جا کر اسے معلوم ہوا کہ وہ اشرف کی سگی خالہ تھیں۔ شیریں خالہ نے بہت والہانہ انداز اور محبت سے ان کا استقبال کیا۔ ان سے سامان وصول کرکے وہ شاپر لے کر اندر چلی گئیں۔ اشرف بے تکلفی سے کھلے برآمدے میں رکھی چھوٹی گول میز کے گرد دھری بید کی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو ساغر بھی وہیں ٹک گیا...... وہاں کی فضا میں بہت تازگی تھی...... دیوار پر بہت خوب صورت بیڈورک کا شاہکار لگا ہوا تھا۔ موتیوں سے اللہ اور محمدﷺ کا نام جگمگا رہا تھا۔

''شیریں خالہ کی سب بیٹیاں ہنرمند اور ہرفن

مولا ہیں، گھریلو دستکاری میں ماہر ہیں اور اس گھر میں ہر جگہ ان کے بنائے شاہکار نظر آئیں گے۔'' اس کی نظروں کا ارتکاز محسوس کر کے اشرف نے اطلاع دی۔

''اچھا...... لیکن بیٹی تو ان کی کوئی بھی نظر نہیں آ رہی...... بڑی خاموشی سے ہے یہاں تو......''

اسے یہ سب سن کر حیرانی ہوئی۔

''ماشاء اللہ پانچ بیٹیوں کی تو شادی ہوگئی۔ اب صرف دو بچی ہیں، وہ دونوں ہوں گی یہیں کہیں...... دراصل خالہ کے حالات کافی تنگ رہے...... سات بیٹیاں ہیں ان کی مگر کبھی بوجھ نہیں سمجھا انہیں۔ آج سب اپنے گھروں میں راج کر رہی ہیں۔'' وہ خود ہی تفصیل بتانے لگا جسے ساغر نے پوری توجہ سے سنا۔

اسی اثنا میں خالہ کی معیت میں لمبی سی دبلی پتلی پُرکشش لڑکی چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹھنڈے مشروب سے بھرے گلاسوں کی ٹرے تھی۔ اس کے آتے ہی کمرے کے ماحول پر ٹھنڈک سی چھا گئی۔

''یہ سامعہ ہے، میری بیٹی۔'' شیریں خالہ کے مختصر ترین تعارف میں بہت وضاحت تھی۔

ساغر نے پہلی نظر میں ہی بغور اسے دیکھ لیا تھا۔ اس کے نازک سے کھڑے، کھڑے نقوش میں اتنی نفاست تھی... جیسے باقاعدہ ناپ کر تراشے گئے ہوں۔ دل میں ایک شور برپا ہوا اور ساغر نے بے چین ہو کر پہلو بدلا...... وہ حسن کے اور اس کے اپنے معیار پر پوری اترتی تھی۔ اس کی رنگت کسی نایاب ہیرے کی طرح دمکتی سی تھی اور مسکراہٹ اس قدر دل آویز کہ وہ دیکھتا رہ گیا۔

وہ پہلی ہی نظر میں گھائل ہو گیا اور دل تھام کر رہ گیا۔ دل میں مچلتے جذبے... سرگوشیاں کرنے لگے...... وہ سرگوشیاں محبت کا راگ الاپ رہی تھیں۔

شام کی چائے پینے کے بعد دونوں علاقے میں سرگشت کرنے نکل گئے...... گھر لوٹے تو ایک نیا چہرہ اور نیا تعارف نظر آیا...... سامعہ کی چھوٹی بہن آمنہ بہت پٹاخہ لڑکی تھی، وہ شیریں خالہ کی سب سے چھوٹی اور شرارتی بیٹی...... بلا کی باتونی اور حاضر جواب تھی۔ غیر ضروری اعتماد نے اسے اپنی عمر سے کہیں بڑا بنا دیا تھا...... اس کے مزاج میں بچپنا بھی تھا، اس کے برعکس سامعہ کسی جھیل کی لہروں میں ڈولتے چاند کی طرح دلنشین تھیں۔

اس کا حسن چاندنی رات کی طرح خوابناک تھا وہ سارا وقت نظر بچا، بچا کر اس کے کاسنی آنچل سے ڈھکے وجود اور کمر پر پھسلتی موٹی سی چوٹی کو دیکھتا رہا۔

رات گئے تک آمنہ نے باتوں کی محفل جما کے رکھی۔ لطیفے، چٹکلوں میں سب ہی اس کے ساتھ شامل ہو گئے تھے...... اس دوران اس کی کھنکتی ہنسی اور کلائی میں پڑی روپہلی چوڑیوں کی کھنک اس کے دل میں محبت کے نئے سر چھیڑتی رہی...... اگلے روز شام سے پہلے، پہلے روانگی کا ارادہ تھا اور جیسے، جیسے وقت گزر رہا تھا اسے لگ رہا تھا کہ یہ لمحے اس کی گرفت سے پھسل رہے ہیں وہ کوشش کے باوجود اس سے کوئی خاص بات نہ کر پایا تھا۔ وہ اتنی جلدی وقت گزرنے پر کچھ دلگرفتہ سا ہو گیا تھا۔

دوپہر کھانے کے فوراً بعد ہی سامعہ نے چائے بنا دی تھی کیونکہ ان کو جلدی نکلنا تھا۔ ابھی چائے کا دور چل ہی رہا تھا کہ شیریں خالہ کے شوہر جلال احمد کی تیز چیخ نے سب کو بوکھلا دیا...... وہ وضو کرنے واش روم گئے تھے اور ان کا پاؤں پھسل گیا...... سب چائے چھوڑ کر اُن کی طرف دوڑے جہاں وہ بری طرح کراہ رہے تھے۔ زمین پر پاؤں ٹکاتے ہی ان کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ معاملہ سیریس تھا۔ اس وقت اشرف اور ساغر ہی وہاں دستیاب تھے۔ دونوں بھاگ دوڑ کر کے ان کو علاقے کے چھوٹے سے شفاخانے لے گئے۔ ان کی ٹخنے کی ہڈی میں بال آ گیا تھا جب وہ لوگ گھر پہنچے تو شام گہری ہو چلی تھی۔ شیریں خالہ نے انہیں اس وقت سفر کی اجازت نہ دی۔ نئی، نئی جاب میں اس کی پہلی چھٹی بڑی جلد ہوگئی تھی مگر پھر بھی وہ خوش تھا۔ اس کی تو دلی مراد بر آئی تھی۔ سامعہ سے حالِ دل کہنے کا موقع اسے قدرت نے دیا تھا۔

رات گئے تک جلال خالو کی دلجوئی کے لیے اُن کے پاس بیٹھنا پڑا، اس دوران وہ کچن سے برآمدے اور برآمدے سے کمرے تک پھرتے سامعہ کے وجود کو دیکھتا رہا...... جلال خالو دواؤں کے زیر اثر بہت جلدی گہری نیند میں سو گئے...... برآمدے کی کرسیوں پر سامعہ اور آمنہ کتابیں کھول کر بیٹھی تھیں۔

''اوہو...... یہاں تو پڑھا کو لوگ پڑھ رہے ہیں۔'' اس نے آمنہ کو چھیڑا۔

''تو کیا آپ کو بھی پڑھنا ہے؟ آپ کو کیا سمجھ نہیں آ رہا...... آپ بھی سمجھ لیں۔'' آمنہ نے پٹاخ سے جواب دیا۔

جبکہ سامعہ بے نیازی سی بنی کتاب پر جھکی رہی۔ اس کی جھکی نظروں پر گھنیری پلکیں جیسے دل پر قیامت ڈھا رہی تھیں۔ اس سے بڑھ کر اس کی بے نیازی اور بے خبری اسے مارے ڈال رہی تھی۔

''مجھے زندگی کی کتاب میں محبت کا فلسفہ سمجھنا ہے۔'' وہ خود کو روک نہ سکا۔

''ایں...... یہ کون سی کتاب ہے...... اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ باجی مجھے کیمسٹری پڑھا رہی ہیں......'' اس نے مزاحیہ سے انداز میں کہا۔

''وہ تو ان کو پتا ہے کہ مجھے کیا پڑھنا ہے۔'' وہ شوخی سے بولا۔

''جی......'' سامعہ نے حیران نظروں سے اسے دیکھا...... ''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ میں سمجھی نہیں۔'' اس کے انداز میں ناگواری سی تھی۔

''تو اجازت ہے آپ کی...... میں کہہ دوں جو کہنا ہے؟ آپ سن لیں گی؟ بزبان شاعر کہوں یا......'' اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

''پلیز...... اسٹاپ اٹ...... میں آپ کو بالکل بھی نہیں پڑھا سکتی۔'' اس نے سامنے حیران، پریشان بیٹھی آمنہ کو خفت سے دیکھتے ہوئے نازک سا ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ اس وقت اس کے چہرے پر شرم کی لالی پھیلی تھی کہ غصے کی وہ سمجھ نہ پایا۔ اس کے انداز میں

محبت آسان کب ہے

محبت کو سمجھنا
کھیل آساں سا
مگر یہ کھیل کب ہے؟
جو اس کو کھیل سمجھے ہیں
وہ شکاری، جسم و جاں کے
فقط نوچے کھسوٹے ہیں
مگر اے کاش
کوئی ان کو سمجھائے
محبت رنگ ہے
اس ذات ربی کا
کہ جس کے ''کن'' سے
قائم یہ دنیا ہے
محبت وصف ہے
محبوب ربی کا
محبت ماں کی ممتا ہے
محبت فضلِ ربی ہے
محبت حبِ وطنی ہے
اگر یہ نہ ہو تو
سب کچھ بے معنی ہے

کاوش: نبیلہ خان، ڈی آئی خان

خفگی سی تھی۔

''آئی ایم سیریس سامعہ......'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

سامعہ نے جیسے ہی نظر اٹھا کر اسے دیکھا اس کی نظروں سے پھوٹتی شعاعوں سے خائف ہو کر نظر جھکا لی۔

اور آمنہ ان دونوں کے مبہم مکالموں کے نہ سمجھ آنے پر رجسٹر میں اپنا کام کرنے میں منہمک ہوگئی تھی۔

وہ بھی پھر وہاں نہ رکا اور فوراً پلٹ کر کمرے میں آ گیا جہاں اشرف بیڈ پر بے سدھ سو رہا تھا مگر وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔

وہ ماموں امداد حسین کے گھر لوٹا تو دل کھویا، کھویا

سا تھا...... بار، بار سامعہ کے چہرے پر بکھرے رنگ تصور میں آرہے تھے۔ بے شک اس نے کسی بھی اشارے کنائے میں اس کے سوال کا جواب نہ دیا تھا مگر روانگی کے وقت اس کی آنکھوں میں اداسی تیر رہی تھی ۔ اس کی آس بھری نظروں میں واپسی کا تقاضا تھا۔مصروف سے روز وشب میں بھی وہ اس کو ایک لمحہ بھی بھلا نہ پایا تھا۔کئی روز سے امو جان کو بھی فون نہ کرسکا تو ایک دن ان کا فون چلا آیا۔ وہ بار، بار اس سے گھر آنے کا تقاضا کررہی تھیں تب اس پر یہ سنگین حقیقت آشکار ہوئی کہ وہ امو جان کو بھی ایک جھوٹا آسرا دے کر آیا تھا۔اسے عندلیب پر بے تحاشا غصہ آیا جس نے ابھی تک امو جان تک اپنا انکار نہیں پہنچایا تھا۔اپنا بوجھ اس کے کاندھوں پر رکھ کر وہ بہت مطمئن ہوگیا تھا مگر خود کو بے بس پا رہا تھا جب تک عندلیب اور اس کا رشتہ ختم ہونے کی وضاحت نہیں ہوجاتی تب تک وہ امو جان کو اپنی پسند کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا۔

اگلا ویک اینڈ آنے کو تھا...... مامی جی، جلال خالو کی خیریت کے لیے جارہی تھیں۔ جس وقت وہ ڈرائیور کے ہمراہ نکلنے ہی کو تھیں تو وہ شارٹ لیو لے کر آگیا تھا۔گزرے کل میں اسے مامی جی کے جانے کی سن گن مل گئی تھی اس لیے وہ عین وقت پر وہاں پہنچا تھا اور ان پر بھی یہ ظاہر کیا کہ اتفاقاً ہی گھر آ گیا۔

''تم یہاں اکیلے کیا کروگے، اشرف بھی گھر پر نہیں ہے اور میں بھی جارہی ہوں، میرے ساتھ ہی چلے چلو......'' انہوں نے اس کے دل کی بات کہہ دی۔نیکی اور پوچھ پوچھ اس نے بھی مروتاً انکار نہ کیا۔آئندہ کے لیے بھی اس نے یہی سوچا ہوا تھا کہ اپنی خواہش کے حصول کے لیے وہ بالکل بھی مروت نہیں برتے گا۔

جس وقت شیریں خالہ کے چھوٹے سے گھر میں وہ داخل ہوئے تو عصر کی اذان شروع ہوگئی تھی۔ سورج کی تب وتاب ماند پڑ گئی تھی لیکن اس کی روپہلی شعاعوں نے جاتے وقت بھی ہر طرف روشنی بکھیر رکھی تھی ۔ ایسے میں اچانک ہی سامنے سے سامعہ نمودار ہوئی تو وہ مبہوت رہ گیا جیسے سلطنتِ دل پر چودھویں کا چاند نمودار ہوگیا ہو۔

سفید دوپٹے پر روپہلی بوٹیاں تھیں اور اس کے ہالے میں اس کا سادہ سا پُرنور چہرہ دمک رہا تھا۔وہ بھی اسے یوں سامنے پا کر ٹھٹک سی گئی۔ اس کی نظروں میں پہلے حیرانی اور پھر ایک خوشی کی چمک سی ابھری اور ہونٹوں پر دلنشیں مسکراہٹ پھیل گئی۔

شیریں خالہ اور مامی جی کو باتوں میں منہمک پا کر وہ چپکے سے وہاں سے اٹھ کر کچن کے دروازے تک چلا آیا جہاں سامعہ اس کی آمد سے بے خبر شیلف پر رکھے برتن کیبنٹ میں سیٹ کررہی تھی۔ کبھی وہ تھوڑا ترچھی ہوتی تو اس کے رخ کی جھلک سی نظر آتی پھر غائب ہوجاتی۔ جیسے چاند بدلیوں سے جھانکتا ہے اور پھر چھپ جاتا ہے۔وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔چند لمحوں بعد وہ مگن سے انداز میں پلٹی تو سامنے وہ بازو سینے پر باندھے دروازے سے ٹیک لگائے بڑے انہماک سے اسے دیکھ رہا تھا۔اس کے گالوں پر پھوٹتی شفق اس سے مخفی نہ رہی۔

''ارے......آپ!'' وہ بری طرح چونک کر بس اتنا ہی کہہ سکی۔

''کیوں کیا''میں......''نہیں ہوسکتا؟'' اس نے معنی خیزی سے سوال کیا۔اس سوال کی وضاحت اس کی نظروں میں اس قدر نمایاں تھی کہ اس نے گھبرا کر نظر چرا لی۔

اتنے سادہ سے انداز میں کتنا خاص سوال کرلیا تھا اس نے......وہ سوالی بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا اور سامعہ کی دھڑکنوں کو منتشر کررہا تھا۔

''خوشبو کے جزیروں سے ستاروں کی حد تک
اس شہر میں سب کچھ ہے بس اِک تری کمی ہے''

اس کے گمبھیر لہجے میں مخفی جذبے جھلک رہے تھے سامعہ کے ہاتھ میں تھما چمچہ زمین پر گر پڑا۔اس نے سٹپٹا کر جھک کر چمچہ اٹھانا چاہا تو اس کا دوپٹا شانے سے پھسلتا چلا گیا اور کان کے پیچھے اڑسی ہوئی لٹ گال کو چھونے لگی۔وہ دل میں اتر جانے کی حد تک پیاری لگ

رہی تھی۔

وہ وقت اور وہ لمحات اس نے رائگاں نہ جانے دیے اس بار وہ سرشار سا گھر لوٹا کیونکہ وہ سامعہ کی پلکوں پر بہت سے خواب سجا کر آیا تھا بس ایک صرف امو جان کو منانے کا دشوار مرحلہ سر کرنا باقی تھا کیونکہ امو جان سے جب بھی فون پر بات ہوتی ان کی بات کا شروع اور اخیر عندلیب ہی ہوتی تھی۔ ان کی باتوں سے اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ عندلیب نے اس کی کسی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔

☆☆☆

روز وشب معمول کے مطابق گزر رہے تھے مگر ان میں ایک نیا پن سا آ گیا تھا۔سامعہ اس کی زندگی میں خوشگوار جھونکا بن کر آ گئی تھی ۔اسے ہر موسم اچھا لگ رہا تھا۔اس دن بھی سہ پہر ڈھل رہی تھی، شام کی آمد، آمد تھی ۔اس کا کام میں بالکل بھی دل نہیں لگ رہا تھا اس لیے وہ ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے ہی آفس سے نکل گیا۔وہ گھر میں داخل ہوا تو کچھ غیر معمولی پن محسوس ہوا۔خاموش اور سنجیدہ سی رہنے والی مامی کی تیز ہنسی کی آواز لان تک آرہی تھی۔ وہ کچھ حیران سا لاؤنج میں داخل ہوا تو وہاں سب خوشگوار موڈ کے ساتھ بیٹھے نظر آئے ان کے درمیان ایک اجنبی چہرہ بھی موجود تھا جو اس کے لیے بالکل ناآشنا تھا۔

''آؤ بھئی ساغر......ٹھیک وقت پر آئے تم ہماری بیٹی رعنا سے ملو۔'' ماموں چہک کر بولے۔

''بیٹی......؟'' یہ انکشاف اس کے لیے بالکل نیا اور غیر متوقع تھا۔اس نے بغور سامنے براجمان رعنا کو دیکھا جو چہرے پر مسکان سجائے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔اس کے جدید انداز میں تراشے گئے بال اس کے کاندھوں پر پڑے تھے۔ نیلی جینز پر اس نے سفید کرتی پہن رکھی تھی جس پر نیلے رنگ کی تارکشی سے چھوٹے، چھوٹے پھول کڑھے ہوئے تھے۔اس کے انداز میں تمکنت اور عجیب سی شان تھی ۔اسے وہ کافی مغرور سی لگی۔

''ماشاء اللہ ڈاکٹر ہے میری بیٹی......جس دن تم آئے تھے اس سے ایک دن پہلے ہی یہ امدادی ٹیم کے ساتھ ذیلی بستیوں اور دیہاتوں میں گئی ہوئی تھی۔'' ماموں امداد حسین نے بڑے فخر کے ساتھ اس کا تعارف مکمل کرایا۔اس کے ڈاکٹر ہونے کی اطلاع پچھلی تمام اطلاعات سے زیادہ حیران کن تھی۔

''تو آپ ڈاکٹر ہیں؟'' کوئی مناسب جملہ کہنے کے بجائے اس کے منہ سے بس یہی نکل پایا۔

''جی ہاں! کوئی شک ہے کیا......؟'' وہ کھلکھلا پڑی۔ وہاں موجود سب نفوس کے چہروں پر دبی، دبی مسکراہٹ ابھر آئی۔

وہ بھی خجالت سے مسکرادیا۔ اپنی بوکھلاہٹ میں وہ بے وقوفانہ سوال کر بیٹھا تھا۔وہ شریر سے انداز میں اسے مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ اسے اس کا چہرہ کچھ مانوس سا لگا جیسے پہلے بھی کبھی دیکھا ہو مگر کچھ یاد نہ آیا۔

''شک دور کرنے کے لیے تو مریض بننا پڑے گا اور ابھی فی الحال میرا بیمار ہونے کا کوئی موڈ نہیں۔'' اس کا جواب زبردست رہا۔

جلال ماموں نے تالیاں بجا کر داد دی اور رعنا نے بھی کافی لطف لیا۔پہلی ملاقات کا تاثر خوشگوار رہا۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا اور گپ چپ ہوتی رہی...... وہ سارا وقت رعنا کو ہی دیکھتا رہا۔سرو قد سی تیکھے نقوش والی رعنا کا لہجہ بھی بہت دھیما اور رسیلا تھا۔

اگلے دن کا سورج نئی توانائی اور امیدوں کے ساتھ طلوع ہوا۔ ناشتے کی میز پر آج رعنا کا خوب صورت اضافہ گل دان میں سجے تروتازہ پھولوں کے مانند محسوس ہوا۔ناشتے کے دوران ہلکی پھلکی باتوں کے درمیان اسے بارہا اس کی مسکراہٹ میں کوئی جانی پہچانی شبیہہ محسوس ہوئی مگر وہ سمجھ نہ پایا۔

وہ آفس جانے کے لیے نکلا تو بائیک پنکچر کھڑی تھی۔ وہ بے مزہ سا منہ بسور کر کھڑا ہوگیا۔ اسی اثنا میں روش پر سفید آلٹو چلتی ہوئی اس کے پاس آ کر رکی۔

''اینی پرابلم......؟ اگر چاہیں تو مجھ سے لفٹ لے لیں، میں ڈراپ کردیتی ہوں۔'' اس نے پیشکش کی

اور اندھا کیا چاہے دو آنکھیں کے مصداق وہ فوراً ہی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''ویسے میں عام طور پر یوں ہر کسی کو لفٹ نہیں کرواتی مگر تھوڑی بہت جان پہچان ہو تو پھر دے دیتی ہوں لفٹ......'' اس کے انداز میں اپنائیت بھی تھی اور شرارت بھی۔

ایک عجیب سی کشش تھی اس کی باتوں میں...... بے اختیاری کی ایک انوکھی کیفیت نے ساغر کو جیسے ... بے بس سا کر دیا...... سارا راستہ وہ اس کے مہارت سے ڈرائیو کرتے گداز اور صاف رنگت کے ہاتھوں کو دیکھتا رہا...... اس کا دل کچھ نئے تقاضے کرنے لگا۔ اس پل اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہ مختصر سفر، عارضی سفر ایک پائدار سفر بن جائے...... وہ اس کی ہم سفر بن جائے۔

وہ سارا دن عجیب سی کشمکش میں گزرا۔ رعنا سے ملنے کے بعد اس کی نظر میں سامعہ ایک جھینپو سی، کم اعتماد، اور کم گو اور گھریلو سادہ سی لڑکی قرار پائی جبکہ رعنا بہت خود اعتماد، خوش لباس اور بلا کی حاضر جواب تھی۔ رعنا ایک سمجھدار اور سوشل لڑکی تھی جبکہ سامعہ حالات کے مطابق کچھ دبی ہوئی شخصیت کی لڑکی تھی اور رعنا کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔

''تو پھر سامعہ کو کیوں آس دلائی؟ کیا تم اس سے فلرٹ کر رہے تھے؟'' دل کی بدلتی کیفیت نے اسے ضمیر کی عدالت میں لا کھڑا کیا۔ وہ پشیمانی کے گہرے سمندر میں ڈبکیاں کھانے لگا مگر نفس کے .... بے لگام گھوڑے نے اسے کھینچ کر اس سمندر سے نکال لیا۔

''وہ محض میری جذباتیت اور جلد بازی تھی۔ غلطی تو ہر انسان سے ہوتی ہے۔ میں نے سامعہ سے کب کہا کہ مجھے اس سے محبت ہے؟ نہیں...... میں نے اس سے کوئی اقرار نہیں کیا۔'' ضمیر کو تھپکی دے کر اس نے دوبارہ سلا دیا۔

اس کے پاس ہر سوال کا جواب تھا، ہر اعتراض کی دلیل موجود تھی۔ اپنی مختلف تاویلوں سے وہ بہت جلد پُرسکون ہو گیا۔

شام کو گھر پہنچا تو غیر معمولی رونق نظر آئی۔ شیریں خالہ اور سامعہ، رعنا سے ملنے آئی ہوئی تھیں۔ سامعہ کی آمد کا سن کر ایک مجرمانہ سے احساس نے اسے چند لمحے کے لیے شرمندہ کیا۔ اسے دیکھ کر سامعہ کی آنکھوں میں روشنی سی بھر گئی۔ وہ اس سے نظر نہ ملا سکا اور جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا۔

''بے وقوف لڑکی، ذرا سی بات کیا کر لی، پتا نہیں کیا سمجھ بیٹھی...... میں نے کون سا اظہارِ محبت کر دیا تھا۔'' اس نے کندھے جھٹک کر جیسے ہر خیال جھٹک دیا۔

محبت اور نفرت کے پیمانے نہیں ہوتے، یہ صرف رویّے اور انداز سے ہی نظر آجاتی ہے۔ اس کے لیے لفظوں کی ضرورت کم ہی پڑتی ہے۔ یہ بات ساغر شاید ابھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

وہ اس روز جان بوجھ کر سب کے درمیان کم بیٹھا...... اور بلاوجہ لان میں چہل قدمی کرنے لگا...... سامعہ اسے ڈھونڈتی وہاں پہنچی تو ایک لمحے کو وہ چکرا سا گیا۔ اس کے لبوں پر مسکان تھی اور نگاہوں میں الفت تھی۔ اس سمے وہ گلاب کے پودے کے پاس کھڑی بلاشبہ انہی پھولوں کا حصہ لگ رہی تھی مگر اسے وہ اس وقت ایک دھندلا عکس ایک مٹتی ہوئی پرچھائی کی طرح محسوس ہوئی کیونکہ وہ اب اس کے دل سے نکل چکی تھی...... اس کے خیالات بدل چکے تھے۔

''آپ یہاں ہیں اور وہاں سب آپ کو پوچھ رہے ہیں۔'' اس نے محتاط الفاظ کا انتخاب کیا۔ دراصل تو وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ میں آپ کی منتظر تھی۔ میرا دل آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔

''آں...... دراصل مجھے اپنے ایک دوست کے ساتھ ضروری کام سے جانا ہے' اسی کا ویٹ کر رہا تھا...... اور وہ آ بھی گیا ہے۔ اوکے میں چلتا ہوں اب......'' اس نے رسمی سے روکھے پھیکے انداز میں جواب دیا اس نے اس کی آنکھوں میں چمکتے جگنو ماند پڑتے دیکھے اور بے اعتنائی سے آگے بڑھ گیا۔

اس وقت وہ اس کے جذبوں اور خوابوں کو.... بے دردی سے روندتا اور کچلتا ہوا چلتا چلا گیا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سامعہ اس سے کوئی توقعات رکھے...... اسے یقین تھا کہ وہ بھولی لڑکی چند دن رو دھو کر اس چند روزہ محبت پر فاتحہ پڑھ لے گی' اسی لیے اس نے اس کی کوئی حوصلہ افزائی نہ کی۔

وہ تو بری طرح سے رعنا کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا، وہ اس کے تراشے ہوئے خیالی پیکر کے عین مطابق خوب صورت، ایڈوانس اور ہنس مکھ تھی۔ اس کا سیٹ اپ بھی اچھا تھا اور وہ صرف گھریلو لڑکی نہیں بلکہ سوشل بھی تھی اور بولڈ بھی اور سب سے بڑی بات کہ ماموں امداد حسین کی بیٹی تھی ایک دولت مند اور خاندانی شخص کی نورِ نظر تھی۔ انہی دنوں اموجان کے فون نے اس کی پریشانی مزید بڑھا دی...... وہ اس سے گھر واپسی کا مطالبہ کر رہی تھیں۔

''گھر کب آؤ گے ساغر......؟ چند دن کی چھٹی لے کر آ جاؤ بیٹا...... میں تمہاری اور عندلیب کی منگنی کرنا چاہ رہی ہوں۔ عندلیب بھی جب سے تم گئے ہو بہت اداس رہتی ہے۔''

اموجان کی باتیں سن کر اسے عندلیب کی ڈھٹائی پر بہت غصہ آیا۔ وہ روکھی پھیکی، ڈل، خاموش اور سنجیدہ طبع لڑکی اسے اس لحاظ سے کبھی بھی ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔ کجا یہ کہ ساری عمر کے لیے ہم سفر بنتی، اسے فرار کا رستہ کہیں بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ اس کا دل رعنا میں اٹک گیا تھا اور سامعہ پھانس بن کر دل میں اٹک گئی تھی۔ وہ شکر کر رہا تھا کہ اس نے جلد بازی میں سامعہ کا ذکر اموجان سے نہیں کیا مگر اب رعنا کا ذکر کرنا تو ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اموجان کوئی ناپسندیدہ قدم اٹھا لیتیں اسے فوری طور پر کچھ کرنا تھا۔ سوچ، سوچ کر اس کا دماغ شل ہو گیا تو وہ کمرے سے نکل کر لان کے ساتھ بنی پتلی سی روش پر ٹہلنے لگا۔ گہری رات میں سب مکین نیند کے مزے لوٹ رہے تھے اور وہ ایک مثلث میں پھنسا اس کا حل تلاش کر رہا تھا۔

عندلیب پھر سامعہ اور اب رعنا...... یہ تینوں لڑکیاں جانے انجانے میں اس کی ذات سے منسلک ہو کر اسے بری طرح پریشان کر رہی تھیں۔ بہر حال اس کا آخری فیصلہ تو رعنا ہی تھی' وہ ایک ٹک ایک سنسان گوشے کو دیکھتے ہوئے سوچے جا رہا تھا کہ یکایک اس اندھیرے ویران گوشے سے مثلِ ماہتاب کے رعنا نمودار ہو گئی۔ چاند کی دلفریب روشنی میں وہ چند قدم چلنے کے بعد اس کے روبرو کھڑی چاندی کی مورتی لگ رہی تھی جس کے رنگ روپ کی شعاعیں سب طرف جلوہ بکھیر رہی تھیں۔

''خیریت......!'' یہ اختر شماری کس سلسلے میں ہے؟ کہیں عشق وشق کا چکر تو نہیں؟'' رعنا نے شریر سے انداز میں کھنک دار آواز میں اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا' دل میں آیا کہ اسی وقت ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اعترافِ محبت کر لے مگر اس طرح اس کے سچے جذبے بے مول ہو جاتے اور نہ ہی رعنا اس کا یقین کرتی۔

''اور اگر یہی سوال میں تم سے کروں تو......؟'' اس نے سوال در سوال کر ڈالا......

''تو پھر یہ کہ روز رات کو واک کرنا میری کافی پرانی عادت ہے۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''امیزنگ...... میری بھی یہی عادت ہے۔ روز گھر سے باہر واک کرتا ہوں آج کچھ سستی آئی اور اس طرف نکل آیا تو تم سے ملاقات ہو گئی اور شاید تمہاری ہی وجہ سے اِدھر نکل آیا میں۔'' اس نے سوچے سمجھے انداز میں نپا تلا جواب دیا۔

''میری وجہ سے......؟'' اس نے ابرو اچکائے۔

''مطلب یہ کہ جو کام اس طرح از خود اور اتفاقی ہو اس کے پیچھے اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ کوئی بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے جیسے اس وقت تم سے ملاقات کا بہانہ بن گیا۔'' اس نے سمجھداری سے جواب دیا۔

یہ سب باتیں دراصل آئندہ کی ملاقاتوں کی تمہید تھیں جن میں وہ اپنا مدعا اس سے بہ آسانی بیان کر سکتا تھا۔

''اوہ......! بہت خوب بول لیتے ہو تم...... بلکہ بنا

لیتے ہوتم......اپنے وقت کے اچھے ڈبیٹر لگتے ہو۔'' اپنی بات کہہ کروہ بے اختیار ہنس پڑی۔

اردگرد کی خالی سنسان رہ گزر اور اطراف کے پھولوں' پودوں میں اس کی ہنسی کا ترنم دور تک بکھرتا گیا۔اس کے ساتھ ہی اس کے دل کی رہ گزر میں اس کی ہنسی کا جلترنگ نئے سُروں اور نئے ساز کے ساتھ بجتا چلا گیا۔

''بولتی تو تم بھی کچھ کم نہیں...... وہ کیا کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ

جب سے تیرے نام زندگی کی اچھی لگی
تیرا غم اچھا لگا، تیری خوشی اچھی لگی
تیرا پیکر، تیری خوشبو، تیرا لہجہ، تیری بات
دل کو تیری گفتگو کی سادگی اچھی لگی''

اس نے بڑی مشاقی سے بروقت و برجستہ اشعار پڑھ ڈالے۔ رعنا کی آنکھوں میں اس کے لیے بیک وقت ستائش بھی تھی اور تحیر بھی......

''اوہ تو جنابِ شاعر بھی ہیں۔'' اس بار اس کے لہجے کی مٹھاس میں مرغوبیت سی بھی تھی۔وہ اس کی باتوں کے اثر میں یقیناً اس سے بہت زیادہ متاثر ہوگئی تھی۔جو کچھ وہ چاہتا تھا وہ اس نے حاصل کرلیا تھا اور بعد میں اپنی مہارت اور فنکاری پر وہ خود بھی حیران ہوتا رہا۔

اگلے آنے والے دنوں میں بہت رعنائی اور دلکشی تھی۔وہ سب گزشتہ دنوں سے بڑھ کر حسین اور... یادگار رہے۔وہ رعنا کو متاثر کرچکا تھا۔رعنا اب ہر بات میں اسے اہمیت دے رہی تھی۔ ان مختصر دنوں میں وہ دونوں ایک دوسرے کی پسند ناپسند اور جذبوں سے آگاہ ہوگئے تھے۔اس نے رعنا کو پرپوز کردیا تھا اور رعنا کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ یہ اس کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

اب سب سے بڑا مشکل مرحلہ امو جان کو منانے کا تھا۔عندلیب کی اسے پروانہ تھی اس جیسی ستی ساوتری قسم کی لڑکیوں سے دنیا بھری پڑی تھی۔ بہت سوچ سمجھ کر اس نے بالآخر شیراز کو فون کرکے ساری صورتِ حال بتادی اور اس کی نرالی بات سن کر شیراز ہکا بکا رہ گیا۔

''آر یو سیریس......؟ کیا تم سچ میں عندلیب میں بالکل انٹرسٹڈ نہیں ہو؟'' کافی دیر چپ سادھنے کے بعد اسی کی ہیلو، ہیلو کی گردان کے بعد اس نے پوچھا۔

''لگتا ہے عندلیب سے زیادہ اس کو غم لگ گیا۔'' ساغر نے بھنا کر سوچا۔

''پلیز شیراز تم امو جان سے بات کرلو۔'' اس نے شیراز سے التجا کی۔

''کیا تم سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کررہے ہو؟ دیکھو ایک بار اور سوچ لو۔'' شیراز نے پھر تصدیق چاہی۔

''میں اپنے ہوش و حواس میں سوچ سمجھ کر یہ بات کررہا ہوں۔'' اس کے بار، بار پوچھنے پر اس نے چبا، چبا کر جواب دیا اور فون بند کردیا کہ جیسے عندلیب کا باب بالکل بند ہوگیا ہو۔

اگلے دن ہی امو جان کا جلال بھرا فون آگیا۔

''وہ تمہارے نام پر بیٹھی رہی اور میں ہر رشتہ لوٹاتی رہی۔ اب میں کیا منہ دکھاؤں گی تم نے میرے سارے فخر اور مان کو خاک میں ملا دیا۔'' امو جان کے لفظ لفظ میں آنسو اور ملامت تھی۔

وہ چپ چاپ جھڑکیاں سنتا رہا کیونکہ اس وقت وہ یہی کرسکتا تھا۔ابھی رعنا کا نام لینا بھی مناسب نہ تھا کیونکہ وہ غصے میں تھیں۔اسے اس کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنا تھا اور رعنا کے ساتھ اپنی محبت کو مستحکم کرنا تھا۔

☆☆☆

وہ خوشگوار دن یونہی سیر سپاٹوں ، ہنسی مذاق اور کھیل تفریح میں گزر رہے تھے۔سامعہ ایک بھولی بسری یاد بن گئی تھی اور عندلیب کا بوجھ بھی وہ خود پر سے ہٹا چکا تھا۔اب وہ اپنی من مرضی کی ایک خوب صورت زندگی گزار رہا تھا جہاں سب طرف رعنا کی دلکشی اور حسین رفاقت تھی۔

اس روز موسم ابر آلود تھا۔صبح ہی رعنا اور اس نے آؤٹنگ کا پروگرام بنالیا تھا سو وہ آفس سے جلدی اٹھ آیا۔گھر پہنچا تو رعنا گھر میں موجود نہ تھی۔

''امی اور آپا تو شیریں خالہ کے گھر گئی ہیں۔'' اشرف نے اطلاع دی تو وہ بدمزہ ہوگیا کچھ ہی دیر میں رعنا کا فون بھی آگیا۔

''سوری ساغر، امی کے ساتھ اچانک پروگرام بن گیا۔ اب کل ہی ہماری ملاقات ہوگی کیونکہ میں رات کو یہیں رکوں گی۔'' اس نے معذرت کرلی۔

اس کو لگا کہ جیسے اس کا دل خالی ہوگیا۔سب طرف گہری خاموشی تھی اور خالی گھر بھائیں، بھائیں کررہا تھا۔ان لمحات میں اس پر یہ آشکار ہوا کہ دل سے قریب لوگ جب دور چلے جائیں تو زندگی میں بس ویرانی رہ جاتی ہے۔

صنفِ نازک کے بغیر نہ گھر آباد ہوتے ہیں اور نہ دل آباد ہوتے ہیں۔ دنیا کی رنگینی اور دلکشی صنفِ نازک کے وجود سے ہے.جو چھوٹی سی خوشی میں خوش اور چھوٹے سے غم پر پریشان ہوجاتی ہے لیکن پوری زندگی پہاڑ جیسے مسائل کو حل کرتے گزار دیتی ہے۔محبت کا خودرو پودا اس کے وجود میں نمو پاتا ہے تو کبھی کوئی اسے اکھاڑ نہیں سکتا...... اور اگر وقت کی گردش سے وہ پورا اجڑ بھی جاتا ہے تو اس کی جڑیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔

اگلے دن وہ آفس سے گھر لوٹا تو رعنا کو لاؤنج میں موجود پاکر کھل اٹھا' وہ ہمیشہ کی طرح شگفتہ اور کھلی نکھری سی جیسے اس کی منتظر تھی۔

''اوہ......! تو آگئی آپ کی سواری......!'' اس نے کچھ طنزیہ سے انداز میں سواگت کیا۔

''ہاں بھئی! اور لوگ ہیں کہ خاطر میں ہی نہیں لارہے۔بغیر بتائے چلے جاتے ہیں۔'' اس نے بھی اسی کا انداز اپنایا۔

وہ سنجیدہ سی بیٹھی رہی اس کے مذاق پر ذرہ بھر بھی نہ مسکرائی۔

''کچھ وجہ ہی ایسی تھی، شیریں خالہ بہت پریشان تھیں۔'' اس نے سرسری سا بتایا۔یقیناً کوئی بڑی بات تھی جو وہ اتنی سنجیدہ لگ رہی تھی۔

''خیریت ہے، شیریں خالہ کو ایسی کیا پریشانی ہوگئی؟'' اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''وہ تمہیں بھی بہت یاد کررہی تھیں، کہہ رہی تھیں ساغر بہت دنوں سے نہیں آیا، پہلے تو وہ بہت آیا کرتا تھا۔'' اس کے سوال کا جواب دیے بغیر اس نے ایک نئی بات کہی، اس کا رنگ اُڑ گیا......معاملہ بہت گہرا لگ رہا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اسے بہت کچھ بتانا چاہتی ہے۔ جیسے کچھ غلط ہونے والا ہو......اس کے دل میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔

''مجھے کیوں یاد کررہی تھیں؟'' اس نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

''اس وجہ سے......'' اگلے پل اس نے ایک نیلے کور کی ڈائری اپنے برابر سے اٹھا کر اس کے سامنے کردی۔

وہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگا اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا' اس کی نظروں میں سوال تھا۔

''ساغر یہ دیکھو...... یہ کیا ہے؟'' رعنا نے ڈائری کا ایک صفحہ کھول کر اسے دکھایا۔

''یہ سامعہ کی ڈائری کا وہ صفحہ ہے جس میں اس نے تمہاری محبت کی پزیرائی کرتے ہوئے تمہاری محبت کا کھلے دل سے استقبال کیا ہے۔ خالہ اس کی شادی کرنا چاہتی ہیں اور وہ تمہاری وجہ سے شادی سے انکار کررہی ہے۔ وہ کئی روز سے بیمار ہے...... یہ سب کیا ہے ساغر......؟'' رعنا نے سختی سے سوال کیا۔اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

ساغر کے چہرے کی رنگت متغیر ہوگئی اور کنپٹیاں سلگنے لگیں......سامعہ سے ایسی بے وقوفی اور انتہا پسندی کی توقع نہ تھی۔ وہ کوئی جواب دینے سے قاصر تھا۔مگر اس نے سوچ لیا تھا کہ رعنا کو مطمئن کردے گا......اس کے پاس بہت سے جواز تھے مگر ابھی فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

''ساغر! تم جانتے نہیں ہو شاید کہ سامعہ اور میں سگی بہنیں ہیں' میں شیریں خالہ کی سگی اولاد ہوں لیکن

مجھے میری خالہ نے پالا ہے کیونکہ ان کی کوئی بیٹی نہ تھی اور شیریں خالہ کی کئی بیٹیاں تھیں، ہمارے مذہب میں بیک وقت دو بہنیں ایک شخص کے ساتھ انوالو نہیں ہوسکتیں تمہیں سامعہ کے ساتھ یہ کھیل کھیلتے ہوئے کچھ تو سوچنا چاہیے تھا یا پھر تم مجھ سے فلرٹ کررہے تھے۔ تمہاری اس گھٹیا حرکت پر مجھے بہت افسوس ہوا۔ محبت کسے کہتے ہیں' یہ تم کیا جانو......!'' اس کے لہجے میں سوز اتر آیا تھا۔

''تم جیسے لوگ محبت کے بیوپاری ہوتے ہیں۔ محبت تو روح کی گہرائیوں میں گونجتا ہوا وہ نغمہ ہے جو ہر طرف خوب صورت سریلے ساز بکھیرتا ہے مگر تم نے محبت کو آبلہ بنادیا۔ محبت تو عبادت ہوتی ہے...... پاکیزہ ہوتی ہے...... تم نے محبت کی شدید توہین کی ہے...... تم نے محبت کے عظیم جذبے کا ہی نہیں ہم بہنوں کے خالص جذبوں کا بھی مذاق اڑایا ہے۔'' وہ بول رہی تھی اور اس کے کان سائیں، سائیں کررہے تھے۔

ایک بری اور ذلت آمیز شکست کے بعد وہ بیچ منجدھار میں ڈوبا تھا۔ وہ رعنا کو جتنا آسان ہدف سمجھ رہا تھا وہ اتنی ہی مشکل نکلی اور سامعہ کو جتنا کمزور سمجھ رہا تھا وہ اتنی ہی کمزور نہ نکلی...... وہاں رکنے کا اب کوئی جواز نہ رہا تھا کہ اب وہ منہ دکھانے کے بھی قابل نہ رہا تھا اسے پہلی بار اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا ادراک ہوا۔ امو جان اور عندلیب کا دل دکھانے کی اسے بہت بڑی سزا ملی تھی۔ اس نے اسی وقت اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کے ازالے کا فیصلہ کرلیا۔ عندلیب کا سادہ سا سراپا نظروں میں گھوم گیا اور دل عقیدت سے بھر گیا۔ اب تک وہ بڑی نخوت سے اسے مسترد کرتا آیا مگر جب خود ٹھوکر کھائی تو آنکھ کھل گئیں۔

وہ اچانک ہی گھر لوٹا تھا اس کا خیال تھا کہ امو جان اس سے ناراض ہوں گی، ابا جی کی گھن گرج ہوگی اور عندلیب کا ستا ہوا چہرہ ہوگا مگر ایسا کچھ نہ تھا۔ شاید وہ لوگ اسے معاف کرچکے تھے۔ ہمیشہ سے مختلف نکھری، کھلی تازہ دم اور شاداب چہرہ لیے عندلیب چائے کی ٹرالی سجائے اندر داخل ہوئی تو وہ دیکھتا رہ گیا۔

اتنی پیاری، خوب صورت، باوقار اور خود اعتماد وہ اس سے پہلے کبھی نہ لگی تھی۔ عندلیب کے پیچھے، پیچھے ہی شیراز بھی مسکراتا ہوا وہاں چلا آیا۔

''ارے...... تو تم کو بھی میرے آنے کی خبر ہوگئی تھی...... پہلے سے موجود ہو یہاں پر۔'' اس نے ہنس کر پوچھا۔

''بڑے اچھے وقت پر آئے ہو تم...... تمہارے پیچھے شیراز ہی سب کام سنبھال رہا تھا ہمارے...... زندگی کا حق ادا کردیا شیراز نے۔ کل عندلیب اور شیراز کی منگنی کی رسم ہے' اچھا ہے تم بھی شریک ہوجاؤ گے۔'' ابا جی نے اطلاع دی تھی یا پھر ایک ڈرون حملہ ہوا تھا۔ وہ حیران وششدر، لب بستہ سا شیراز اور عندلیب کے چمکتے، مسکراتے چہروں کو دیکھ رہا تھا۔

عندلیب کے لیے صاف انکار سننے کے بعد شیراز نے فوراً ہی امو جان کے سامنے عندلیب کے لیے جھولی پھیلادی کیونکہ وہ بھی ایک عرصے سے عندلیب کو چاہتا آرہا تھا لیکن چونکہ عندلیب کے ساتھ ساغر کا نام سنتا آرہا تھا اس لیے چپ سادھے رہا اور جب محبت کو صادق کرنے کا وقت آیا تو فوراً محبت کا ہاتھ تھام لیا اور عندلیب نے بھی شیراز کی گہری اور خالص محبت سے پچھلی تمام کسک اور تشنگی کو دھوڈالا۔

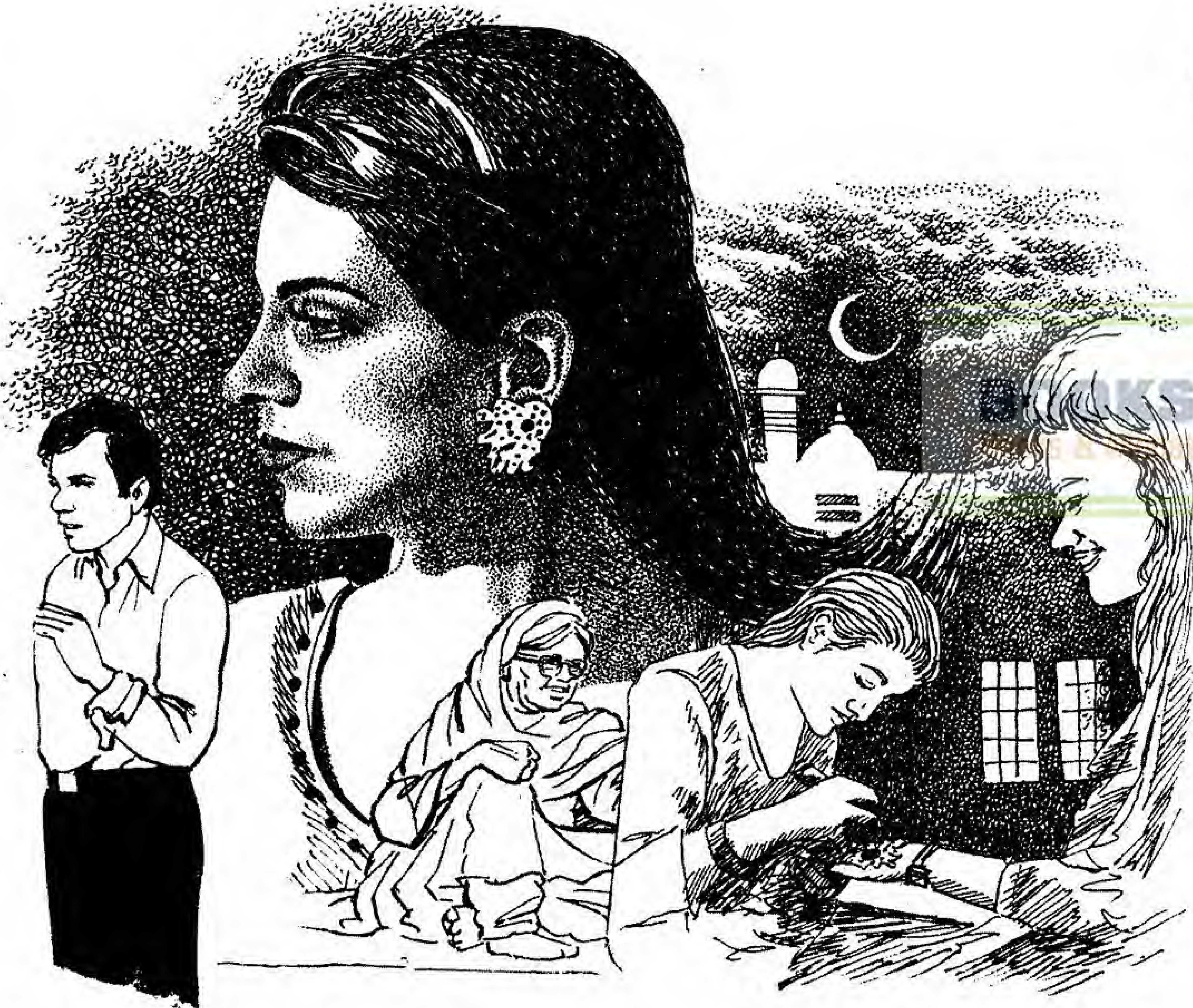
اب وہ دونوں ساتھ کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر جیت کا نشہ اور سچی محبت کا فخر جھلک رہا تھا۔ شیراز نے محبت کا بھکاری بن کر اپنا کشکول بھرلیا تھا اور ساغر نے محبت کا بیوپاری بن کر اپنا سب کچھ گنوادیا تھا۔

''آہ......'' اس کے اندر ہی کہیں اس کی روح میں اس کی کراہ گونج کر رہ گئی۔ ایک بہت بڑے نقصان کے بعد اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ محبت بے غرض ہوتی ہے اس میں غرض ہوتی ہے نہ کوئی مفاد......

محبت کرنے والے کبھی محبت کی توہین نہیں کرتے اور نہ محبت کو رسوا کرتے ہیں۔

گیدڑ سنگھی

فوزیہ سرور



''یاسر بیٹا...... حمنیٰ کی ایم اے کی ایڈمیشن فیس جمع کروانی ہے۔ پرسوں لاسٹ ڈیٹ ہے۔'' یاسر ناشتے سے بھرپور انصاف کرنے کے بعد ٹیبل سے اٹھا ہی تھا جب ساجدہ بیگم دھیمے لہجے میں بولیں۔ وہ فوراً سے بیشتر اپنے کمرے میں گیا اور بیس ہزار کی رقم بڑے احترام اور محبت سے ماں کے سامنے رکھ دی۔ ساجدہ بیگم بیٹے کی سعادت مندی پر نہال ہوگئیں...... بے ساختہ دل سے یاسر کی ترقی وکامیابی کی دعا نکلی جو سیدھی عرش

پر جا پہنچی۔ یاسر اپنے بیوی، بچوں کے ساتھ بیوہ ماں اور بہن کا بھی بے حد خیال رکھتا تھا۔

”اماں یہ کریڈٹ کارڈ رکھ لیں آپ...... ماریہ کے ساتھ جا کر عید کی شاپنگ کر لیجیے گا۔“ یاسر نے والٹ سے کریڈٹ کارڈ نکال کر ساجدہ بیگم کو تھمایا۔

”ارے بیٹا یہ ماریہ کو پکڑاؤ تم۔“ ساجدہ بیگم دل ہی دل میں بیٹے کے خود کو اس قدر عزت و مان دینے پر جھوم اٹھی تھیں۔ یاسر نے مسکرا کر اپنی زوجہ کو دیکھا جس کے چہرے پر پیاری سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ یاسر کو ماریہ نے ہی خاص تاکید کی تھی۔ ”ہر معاملے میں امی کو مان دیں...... وہ ماں ہیں...... ماں کو بیٹا مان دے تو ماں پُرسکون رہتی ہے۔“ ماریہ ایک اچھی بیوی اور فرمانبردار بہو تھی۔

”امی جان...... لے لیں ناں، ہم آج جائیں گے اور خوب شاپنگ کریں گے۔“

”اوکے بھئی، میں تو چلا...... ہوسکتا ہے میں آج لیٹ ہو جاؤں...... ہاں گاڑی کی چابی بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی دراز میں پڑی ہے گاڑی احتیاط سے ڈرائیو کرنا۔ میں آج نئی گاڑی پر آفس جاؤں گا۔ پرانی گاڑی اب گھر کے استعمال میں ہوگی۔“ یاسر رسٹ واچ پر ٹائم دیکھتا ہوا عجلت میں بولا۔

”اوکے جناب...... جو آپ کا حکم......!“ ماریہ محبت سے بولی۔ یاسر نے کچھ دن قبل ہی نئی گاڑی خریدی تھی۔ لیکن آفس پرانی گاڑی پر ہی جاتا تھا۔ ماریہ کو یاسر نے خود ڈرائیونگ سکھائی تھی تاکہ کبھی ضروری کہیں جانا پڑے تو میری ماں، بیوی، بہن رکشوں میں دھکے نہ کھائیں۔

”اوکے امی اجازت دیں۔“ یاسر نے ماں کے سامنے سر جھکا دیا۔ ساجدہ بیگم نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔

”فی امان اللہ! بیٹا دعا پڑھ کر جانا۔“ ساجدہ بیگم کی تاکید پر یاسر نے محبت سے اثبات میں سر ہلایا اور خدا حافظ کہہ کر لاؤنج کی دہلیز عبور کر گیا۔ ساجدہ بیگم کی سماعتوں سے بالائی پورشن سے گونجنے والی آوازیں ٹکرائیں تو دل سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ ماریہ نے پوری شدت سے ان کے دکھ کو محسوس کیا تھا۔

”آپ نے کچھ دیکھا۔“ سونیا نے پُرتجسس لہجے میں عامر کو مخاطب کیا جو خود کسی سوچ میں گم تھا۔ سونیا کو اس کا بازو ہلا کر متوجہ کرنا پڑا۔

”کیا ہے بھئی......؟“ عامر چڑ گیا۔

”عامر گیراج میں نئی نکور گاڑی کھڑی تھی آج صبح جب میں بچوں کو وین میں بٹھانے گئی تھی اور تو اور پرانی گاڑی بھی قریب ہی کھڑی تھی۔ ہماری گاڑی تو نظر بٹو لگ رہی تھی دونوں کے پاس کھڑی۔“ سونیا نے عامر کے چڑنے کا ذرا بھی اثر نہ لیا اور اپنی کہے گئی۔

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں صبح سے...... آخر یاسر کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے۔“ انداز پُرسوچ تھا۔

”مجھے تو لگتا ہے امی نے حمنیٰ والا پلاٹ بیچ کر رقم یاسر کو دے دی ہے۔ ایسے تو ہن نہیں برسنے لگا ناں یا سر پر......“ سونیا نے تیلی لگائی۔ جواباً عامر پوری طرح بھڑک اٹھا۔

”اگر امی نے ایسا کیا بھی ہے تو صرف یاسر ہی ان کا بیٹا نہیں ہے، میں بھی ان کا بیٹا ہوں۔ مجھے کیسے بھول گئیں وہ...... بلکہ نہیں...... مجھے یقین ہے، امی نے پلاٹ نہیں بیچا کوئی اور چکر ہے۔“

”ایک اور بات بتاؤں آپ کو...... شام کو امی، حمنیٰ اور ماریہ گاڑی کی ڈگی سے ڈھیر سارے شاپنگ بیگز نکال رہی تھیں۔ اتنی زیادہ شاپنگ اور ماریہ نے خود... گاڑی ڈرائیو کی تھی۔“ اس کے لہجے میں حسد کی بُو رچی تھی۔

”نہ جانے یاسر کے ہاتھ کون سی گیدڑ سنگھی لگ گئی ہے جو روز بروز امیر ہوتا جارہا ہے، ہم تو ابھی تک گاڑی نہ بدل سکے۔“ عامر خود جل بھن گیا تھا۔ ”خیر معلوم کرلوں گا میں وہ گیدڑ سنگھی کون سی ہے۔ تم جلدی سے چائے پلا دو......“ سونیا کچن میں چلی گئی تھی جبکہ عامر وہیں لاؤنج میں بیٹھا نیوز چینل دیکھنے میں مصروف تھا۔

”اوکے میڈم ضرور پتا لگاؤں گا۔“ عامر کہہ کر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

السلام علیکم......“ بچوں کی پُرجوش آواز پر سونیا نے بلند آواز میں وعلیکم السلام کہتے ہوئے کچن کی کھڑکی سے لاؤنج میں جھانکا۔ ایمان اور احمد صوفوں پر بیگ سمیت ڈھے چکے تھے۔ سونیا کو دونوں کی یہ حرکت ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہ بہت اصول پسند تھی۔ وہ بچوں کو کچھ پل کی ڈھیل دینے کے حق میں نہ ہوتی تھی۔

”احمد اور ایمان اپنے بیگ اپنے، اپنے کمروں میں رکھو اور یونیفارم چینج کر کے فوراً آؤ۔“ سونیا نے سخت لہجے میں دونوں کو گھرکا۔

”اُفوہ بھئی...... ایک دم ہٹلر بن جاتی ہو، ان کو دو گھڑی سکون کی سانس تو لینے دو......“ کمرے سے باہر نکلتا عامر، ایمان اور احمد کے منہ بسورنے پر سونیا کو سرزنش کیے بنا نہ رہ سکا۔ وہ جانتا تھا سونیا کو بے ترتیبی ناپسند تھی۔ لیکن ایسا بھی کیا اصول پسند ہونا۔

”یہ پیدل اسکول سے نہیں آئے وین پر آئے ہیں، فوراً اٹھو دونوں کپڑے بدلو جا کر......“ برتنوں میں کھانا نکالتی سونیا کا مکمل دھیان بچوں کی جانب تھا۔

”السلام علیکم......“ کی آواز پر وہ چونکا۔ سیڑھیوں کے دروازے سے اوپر لاؤنج میں قدم رکھتی ساجدہ بیگم کے سلام کرنے پر سونیا کو گویا سانپ سونگھ گیا۔

”یہ کیا لینے آئی ہیں اس وقت......“ وہ محض بڑبڑا کر رہ گئی۔ دونوں بچوں نے ایک نگاہ دادی پر ڈالی اور سلام کا جواب دیے بنا اپنے، اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ماں کی خصوصی تاکید تھی، نیچے والوں سے دور ہی رہنا ہے۔ عامر نے زیرِ لب وعلیکم السلام کہا جو ماں کی سماعتوں تک رسائی حاصل نہ کرسکا۔ ساجدہ بیگم دکھ میں ڈوب سی گئیں۔ بیٹے کو اور پوتے، پوتی کو دیکھنے کی چاہ انہیں سیڑھیاں چڑھنے پر مجبور کر گئی تھی لیکن یہاں ان کا استقبال ہمیشہ کی طرح آج بھی بہت روکھا پھیکا تھا۔ سونیا نے کچن سے باہر نکلنا گوارا نہ کیا جبکہ عامر بھی وہاں سے اٹھ کر کمرے میں غڑاپ ہوگیا۔ سونیا کی گھورتی نگاہوں نے اسے ماں کے قریب کھڑا رہنے کی اجازت کب دی تھی۔ ساجدہ بیگم لاؤنج میں تنہا کھڑی رہ گئیں۔ آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔ کتنے رمضان، کتنی عیدیں آئیں لیکن عامر ان کا بیٹا کبھی عید پر ماں سے ملنے نیچے نہیں آیا تھا۔ بیوی کے کہنے پر ماں سے تعلق توڑ بیٹھا تھا پگلا...... ساجدہ بیگم نے کچن سے نکلتی سونیا کو محبت سے دیکھا جس کے چہرے پر ناگواری رقم تھی۔

”سونیا کیسی ہو بیٹی......“ بہ محبت اسے استفسار کیا گیا۔

”ٹھیک ہوں۔“ لٹھ مار انداز...... ساجدہ بیگم کا چہرہ تاریک ہوا۔ تڑپ کر بیٹے کے کمرے کی جانب دیکھا۔ ماں کو دکھی کرنے والا بیٹا چپ کی چادر تانے کمرے میں بند تھا۔ در و بام کیسے نہ سہتے، رب کی رحمت اٹھنے لگی تھی۔ دعاؤں کی قبولیت رکنے لگی تھی۔ ماں کے لرزتے قدم پلٹ گئے۔ سونیا نے تمسخرانہ نگاہوں سے ساجدہ بیگم کو سیڑھیاں واپس اترتے دیکھا، گویا جنت کی خوشبو اس گھر سے لمحہ بہ لمحہ دور جارہی ہو لیکن اس گھر کے مکینوں کے دلوں پر مہر لگی تھی۔ نہ جانے کب دلوں پر لگا قفل کھلنا تھا۔

”امی...... ایسے کیوں بیٹھی ہیں؟“ ساجدہ بیگم کے بالائی پورشن سے آنے کے بعد کافی دیر تک ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے رہنے کے باعث ماریہ نے استفسار کیا۔ ساجدہ بیگم نے دھیرے، دھیرے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو آنکھوں سے سیلِ رواں جاری تھا۔ ماریہ دھک سے رہ گئی۔

”کیا ہوا امی...... آپ رو رہی ہیں۔“ تڑپ کر پوچھا۔ اس وقت کتنی خوش، خوش بازار سے آئی تھیں۔ بچوں کی آوازیں سن کر ان کے پیچھے چلی گئی تھیں۔ نہ جانے سونیا بھابی نے اب کیا کہہ دیا تھا۔

”ماریہ بیٹا...... کیا میں بوجھ ہوں تم لوگوں پر......؟“ لہجہ رندھا ہوا تھا۔

”امی آپ نے یہ سب سوچ بھی کیسے لیا...... کیا میری خدمت میں کوئی کوتاہی رہ گئی ہے۔“ ماریہ اپنے روز و شب کی کھنگال کر اپنی تقصیر ڈھونڈنے لگی۔

''ارے نہیں بیٹا، تم سے تو میں بہت خوش ہوں، اٹھتے بیٹھتے تمہارے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں، حمنیٰ کا تم بالکل بہنوں جیسا خیال رکھتی ہو، مجھے ماں کہتی ہی نہیں، سمجھتی بھی ہو......بس دل میں یونہی بیٹھے، بیٹھے خیال گزرا کہیں میں بوجھ تو نہیں بن گئی۔'' ساجدہ بیگم کے دل کو سونیا کے رویّے نے گھاؤ لگایا تھا۔ دل پر غم کا اتنا بوجھ بڑھا کہ دل سنبھالنے سے انکاری ہوگیا۔ ماریہ کے استفسار پر درد بھری سوچ کو زبان مل گئی۔

''ہم سب آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں، بچے آپ سے محبت کرتے ہیں، آپ بوجھ ہرگز نہیں ہیں، آپ تو دعا ہیں...... اور دعائیں کبھی بوجھ نہیں ہوتیں، آپ ماں ہیں ہماری اور مائیں اولاد کے لیے باعثِ فخر ہوتی ہیں۔'' وہ رونا بھول گئی تھیں۔ پلکوں پر موتی ٹنگے تھے۔

''تم مجھ سے محبت کرتی ہو ناں......'' ماریہ نے آنکھوں کے بھیگے کنارے صاف کیے اور سر اثبات میں ہلاتے ہوئے انہیں خود سے لپٹالیا۔ ساجدہ بیگم کے وجود میں ٹھنڈک اتر گئی پر دل میں اب بھی درد بھرا خیال جاگزیں تھا۔ ''کیا کبھی عامر اور سونیا بھی مجھے ایسا محبت بھرا مان دیں گے اور اپنی عید کی خوشیاں ماں کے سنگ گزاریں گے۔'' لیکن اس خیال کے پورا ہونے کا یقین کہاں سے لاتیں۔ ماریہ کی محبت کو دل سے محسوس کرتے وہ خود کو پُرسکون کرنے لگیں۔

☆☆☆

احسان صاحب اور ساجدہ بیگم کی کل کائنات تین بچے عامر، یاسر اور حمنیٰ تھے...... عامر اور یاسر جڑواں، حمنیٰ دونوں بھائیوں سے آٹھ سال چھوٹی تھی۔ احسان صاحب گورنمنٹ کے ادارے میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ 15 مرلے کا مکان اس طرز پر تعمیر کروایا تاکہ دونوں بیٹے پُرسکون ہوکر رہ سکیں۔ پانچ مرلے کا پلاٹ حمنیٰ کے نام الگ کردیا...... حمنیٰ ان کی لاڈلی بیٹی تھی۔ اوپر تلے دو پورشن نہایت شاندار انداز سے تعمیر کروانے کے بعد نچلے پورشن میں رہائش اختیار کرلی۔ عامر اور یاسر ایم بی اے کرچکے تھے۔ حمنیٰ اے لیول کی اسٹوڈنٹ تھی۔ احسان صاحب نے اپنے بچوں کی پرورش بہت ناز و نعم سے کی تھی۔ ساجدہ بیگم اپنی جنت میں خوش و خرم تھیں۔ احسان صاحب کی ریٹائرمنٹ ہوئی تو عامر اور یاسر نے گارمنٹس کا بزنس کرنے میں دلچسپی ظاہر کی۔ احسان صاحب نے ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والی رقم تینوں بچوں میں شرعی حصے کے مطابق تقسیم کردی۔ دونوں میاں، بیوی کا حج کا بھی ارادہ تھا، حج کے اخراجات پر اٹھنے والی رقم احسان صاحب نے الگ کرلی تھی۔ پنشن کی مد میں بھی خاصی رقم وصول کرتے تھے۔ عامر اور یاسر نے بزنس شروع کرلیا تھا۔ دونوں نے اپنا الگ، الگ آفس تشکیل دیا تھا۔ عامر نے کافی لوگ ملازم رکھ لیے تھے۔ ان میں سونیا بھی شامل تھی۔ طرح دار حسینہ، اس نے دنوں میں عامر کا دل مٹھی میں کرلیا تھا۔ غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والی سونیا کے خیالات بہت اونچے تھے۔ باپ کا سایہ سر پر نہ تھا، وہ اپنے گھر کی کفالت کرنے کے لیے کسی امیر بندے کو پھانسنا چاہتی تھی تاکہ شادی کے بعد اپنی ماں اور دو عدد بہنوں اور ایک بھائی کی ضرورت بھی پوری کرتی رہے۔ عامر کی صورت وہ بندہ مل چکا تھا۔ عامر تیزی سے ترقی کا خواہش مند تھا اس کے برعکس یاسر کے مزاج میں ٹھہراؤ تھا لیکن قسمت عامر کی تیز نکلی۔ اس کا کاروبار پھلنے پھولنے لگا۔ جبکہ یاسر کی ابھی لگی بندھی آمدنی تھی۔ عامر نے گاڑی خرید لی تھی۔ یاسر کے پاس پرانی بائیک ہی تھی۔ عامر کی طرح یاسر کو بھی اپنی پسند کی لڑکی مل چکی تھی۔ ماریہ ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کرتی تھی۔ یاسر اور ماریہ دونوں کا روٹ ایک تھا۔ ماریہ پیدل جاتی تھی یاسر، ماریہ کی شرافت اور حیا سے بے حد متاثر تھا۔ نظریں نیچی کیے وہ روزانہ اپنا راستہ طے کرتی۔ یوں روز، روز کا دیکھنا یاسر کے دل میں ماریہ کی محبت کا دیپ جلا گیا۔ وہ اب اس کا منتظر رہنے لگا۔ جس دن نہ دیکھتا سارا دن بے چین رہتا۔ ایک دن لنچ کے وقت گھر واپسی پر یاسر

نے تیز طوفانی بارش میں بے اختیار ماریہ کے قریب بائیک روکی۔ جو بارش کے پانی سے مکمل طور پر بھیگ چکی تھی۔

''آیئے آپ کو گھر چھوڑ دوں۔'' نرمی و حلاوت لہجے میں سمو کر یاسر نے اسے مخاطب کیا۔

ماریہ ایک اجنبی لڑکے کو قریب کھڑے دیکھ کر سٹ پٹا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اردگرد کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ بارش تھمنے کے آثار بھی نہیں تھے۔ ماریہ نے خوف سے تھوک نگلا۔ نظریں جھکا کر چلنے والی لڑکی کیا جانے اس کی محبت۔

''آپ ڈریں نہیں، میں بہت شریف لڑکا ہوں، آپ کے گھر سے کچھ فاصلے پر چھوڑ دوں گا۔'' یاسر کا لہجہ اس کی سچائی کا گواہ تھا۔ ماریہ چیں بہ جبیں ہوئی۔ وہ اپنی بھابیوں کی وجہ سے یاسر کی پیشکش ماننے میں متامل تھی۔ آسمان پر کالی گھٹائیں بڑھتی جارہی تھیں۔ ہر سو اندھیرے کا راج ہونے لگا تھا ایسے میں تنہا جانے کے بجائے یاسر کی پیشکش پر دل نے ہاں کہہ دی تھی۔ لیکن بھابیاں ایک اجنبی کے ساتھ اگر اسے دیکھ لیں گی تو رائی کا پہاڑ بنادیں گی۔ یہی خیال اسے گومگو کی کیفیت میں ڈال گیا تھا۔ ماں، باپ کی وفات کے بعد بھائیوں کے در پر پڑی ماریہ کا دونوں بھابیوں نے جینا محال کر رکھا تھا۔ ماریہ کو اتنی دور جاب کرنا پڑی۔ تنخواہ کا زیادہ تر حصہ دونوں بھابیوں کے ہاتھ پر رکھتی تھی تب کہیں جا کے دونوں کے منہ سیدھے ہوتے تھے۔

''بارش لمحہ بہ لمحہ تیز ہورہی ہے۔'' ماریہ کو سوچ بچار میں گم دیکھ کر یاسر نے بارش کی تیزی کو تشویش سے دیکھ کر ماریہ کو مخاطب کیا۔ اسے چاروناچار یاسر کی بات ماننا پڑی۔ یاسر خود کسی قیمت پر اس جوان جہاں لڑکی کو تنہا چھوڑ کر جانے کے حق میں نہیں تھا۔ اس دوران کوئی رکشا بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ اس کامنی سی لڑکی کو اس پر بٹھا کر مطمئن ہوجاتا۔ ماریہ احتیاط سے یاسر کے پیچھے اس طرح بیٹھ گئی کہ دونوں کے بیچ خاصا فاصلہ تھا۔ ماریہ کی احتیاط پسندی نے یاسر کے دل میں ماریہ کا مقام اور اونچا کردیا تھا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر ماریہ کو اتار کر یاسر وہیں کھڑا رہا تاوقتیکہ وہ گھر کے اندر نہ چلی گئی۔ یاسر اس کے گھر کا پتا جان کر مسرور سا گھر لوٹا تھا۔ احسان صاحب اور ساجدہ بیگم بیٹی کو لے کر حج پر گئے ہوئے تھے، دونوں بھائی اپنے والدین کی آمد کے شدت سے منتظر تھے۔

''کیوں برخوردار......اب تمہاری شادی کردیں کیا۔'' احسان صاحب نے شگفتہ لہجے میں یاسر سے استفسار کیا۔ حج سے واپس آئے انہیں مہینہ ہونے کو آیا تھا۔ ساجدہ بیگم اب جلد از جلد دونوں بیٹوں کے سر پر سہرے کے پھول کھلانے کی خواہش مند تھیں۔ احسان صاحب بھی اپنی بیگم کے ہمنوا تھے۔ حمنیٰ تو ابھی بہت چھوٹی تھی ان کی نظر میں...... ماں، باپ دونوں نے ناشتے کی ٹیبل پر ہی یاسر کو گھیرلیا۔ عامر ابھی تک ناشتے کے لیے کمرے سے نہ نکلا تھا۔ یاسر کی آنکھوں کے سامنے چھم سے ماریہ کا سراپا لہرایا تو لبوں پر میٹھی مسکان بکھر گئی۔ ساجدہ بیگم نے بغور بیٹے کے انداز ملاحظہ کیے تھے۔ بیٹا کسی کو پسند کرتا تھا وہ جان گئی تھیں۔

''کون ہے کہاں رہتی ہے؟'' ساجدہ بیگم نے بنا تمہید باندھے استفسار کیا تو یاسر چونک گیا۔

''امی آپ کو کیسے علم ہوا؟'' لہجے میں حیرت تھی۔

''بیٹا جی ماں ہوں، کیسے علم نہ ہوتا مجھے۔'' یاسر نے ماریہ کا نام لے دیا۔ ان دونوں کو بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ وہ بیٹے کی اچھی فطرت سے آگاہ تھے۔ ان کے لیے تو دونوں بیٹے ایک جیسے تھے۔ دونوں کی شادی وہ ایک ساتھ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اسی دوران عامر بھی آکر بیٹھ گیا تھا۔ انہوں نے اسے بھی دھرلیا۔ عامر نے بے خوفی سے سونیا کا نام لے دیا۔ ماں بیٹوں کی خوشی میں خوش تھیں۔ ان کے بیٹوں نے ان کو بہو۔یں ڈھونڈنے کی زحمت سے بچالیا تھا۔ یوں بعد کے مرحلے آسانی سے طے ہوتے گئے۔ سونیا کے گھر والوں کو تو پہلے ہی یقین تھا سو جھٹ ہاں کہہ دی۔ ماریہ کی بھابیاں بھی ماریہ سے تنگ پڑنے لگی تھیں سو فیصلہ

جلد ہوگیا۔ یوں سونیا اور ماریہ نے احسان ولا میں قدم رکھے تھے۔

سونیا کی فطرت آہستہ، آہستہ ساجدہ بیگم پر کھلنے لگی تھی۔ بالائی پورشن کی سیڑھیاں لان سے اوپر جاتی تھیں۔ بالائی پورشن سونیا اور عامر کے پاس اور نچلا پورشن یاسر اور ماریہ کے پاس تھا۔ ماں، باپ اور حمنیٰ بھی نچلے پورشن میں رہتے تھے۔ کچن سب کا سانجھا تھا۔ صفائی دھلائی کے لیے ملازمہ آتی تھی.... کچن میں دونوں بھائی ہر ماہ راشن ڈلواتے تھے۔ سونیا نے کبھی کچن میں جھانکنے کی زحمت نہ کی تھی۔ ماریہ پیشانی پر شکن لائے بغیر کچن کے کام کرتی رہتی۔ ساجدہ بیگم کو سونیا کے انداز بالکل اچھے نہ لگتے۔ لیکن فطرتاً وہ صلح جُو تھیں کبھی بات کو بڑھاوا نہ دیا۔ نہ بیٹے کو بہو کی شکایت لگائی لیکن جب سونیا نے اپنا وتیرہ جاری رکھا تو انہوں نے کچن الگ کردیا وہ کیوں ماریہ پر اضافی بوجھ ڈالتیں۔ دونوں بہویں اب امید سے تھیں تو ایک آرام کرتی اور دوسری کچن میں سر کھپاتی، یہ ان کے نزدیک ناانصافی تھی۔ سونیا کو تو ساجدہ بیگم کے فیصلے سے آگ ہی لگ گئی۔ اچھا بھلا آرام میسر تھا۔ جو چھن گیا تھا اس کی کھولن اس نے عامر کے سامنے نکالی۔

''امی تو دونوں بھائیوں کو اکٹھا دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ اب خود دیکھیں، مل بیٹھ کر کھاتے پیتے تھے پکڑ کر الگ کردیا ہم دونوں کو......'' مگر مچھ کے دو چار آنسو بھی بہا ڈالے۔ بات عامر کے دل کو بھی لگی۔ وہ سب تو نیچے مل کر کھاتے ناشتا، لنچ، ڈنر اور یہ دونوں میاں بیوی الگ کھاتے۔ عامر کو بھی برا لگا لیکن ماں کے آگے زبان چلانے کی ہمت نہ تھی۔ سو بیوی کو تسلی دے ڈالی لیکن دل میں گرہ ضرور پڑ گئی۔

سونیا نے اس بات کا بدلہ اس طرح لیا کہ عامر جو ہر ماہ والدین کو خرچ دیتا تھا، وہ بند کردیا۔ دونوں میاں بیوی نے عامر سے بازپرس تک نہ کی۔ کیونکہ پنشن کی رقم مل جاتی تھی۔ وہ کافی تھی۔ ان دنوں یاسر کا بزنس مکمل نقصان میں جارہا تھا۔ پرافٹ کیا نکلتا کاروبار کے بند ہونے کا اندیشہ ہوگیا۔ احسان صاحب نے گھر اور گھر کی ضروریات پر پنشن خرچ کرنا شروع کردی...... دونوں بیٹوں کو اللہ نے نعمت سے نوازا تھا۔ سونیا کی آغوش میں احمد اور ماریہ کی آغوش میں ارمغان نے آنکھ کھولی۔ دادا، دادی پوتوں کو پا کر خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ دونوں کی بچوں میں جان تھی۔

یاسر کا کاروبار بالکل بند ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ضروریات بڑھ چکی تھیں، پنشن کی رقم کم پڑنے لگی۔ عامر اور سونیا بھی احمد کو پا کر خوش تھے، سونیا عامر کو تو پابند کرچکی تھی کہ اپنے والدین کو اب خرچہ نہیں دینا۔ اس لیے کہ ان کا اپنا خرچ بڑھا ہے، پنشن کی رقم آتی تو ہے ہر ماہ۔ عامر بھی یہی سوچ کر مطمئن تھا۔ لیکن سونیا ہر ماہ تگڑی رقم اپنی ماں کو ضرور دیتی تھی۔ وہ بھی عامر سے نظر بچا کر۔ یاسر کی پریشانی بڑھنے لگی تھی۔ احسان صاحب ہارٹ پیشنٹ تھے۔ باقاعدگی سے میڈیسن کا استعمال کرنے کے باعث وہ چاق و چوبند رہتے تھے لیکن پنشن کی رقم گھر کی ضروریات پر استعمال ہونے کے باعث وہ دوائیں نہیں خرید سکتے تھے۔ دواؤں میں بے قاعدگی آتے ہی ان کی طبیعت روز بروز بگڑنے لگی۔ عامر سے دنوں ملاقات نہ ہو پاتی۔ وہ کاروبار میں بے حد مصروف ہوگیا تھا۔ والدین کے لیے تو اس کے پاس پہلے بھی وقت نہ ہوتا تھا اب تو دکھائی بھی نہ دیتا۔ یاسر سے کیا کہتے وہ خود ڈوبتے کاروبار کو بچانے کی تگ و دو میں لگا تھا۔ اس وقت ساجدہ بیگم شوہر کی بگڑتی طبیعت کے پیش نظر بیٹے کے پورشن میں بات کرنے کی غرض سے چلی گئیں۔

عامر بیڈ پر لیپ ٹاپ کھولے میلز چیک کررہا تھا جبکہ سونیا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی نائٹ کریم کا مساج کرنے میں مصروف تھی۔ گاہے بہ گاہے نگاہ عامر پر بھی ڈال لیتی' دروازے پر ہلکی دستک نے دونوں کو کمرے کے دروازے کی جانب دیکھنے پر مجبور کردیا تھا۔ احمد بیڈ پر گہری نیند سورہا تھا۔ سونیا دوسری دفعہ امید سے تھی۔ عامر نے ہی اٹھ کر دروازے کا لاک کھولا۔

ساجدہ بیگم کو دہلیز کے پاس کھڑے دیکھ کر فوراً بولا۔

''اندر آئیں امی......'' ساجدہ بیگم دھیمے قدموں سے چلتی کمرے میں آگئیں۔ سونیا ساس کو دیکھ کر اندر ہی اندر کھول کر رہ گئی۔ اسے اپنی ساس انتہائی ناپسند تھیں۔ ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر انہیں دیکھا پھر اپنے کام میں منہمک ہوگئی۔ درد کی ایک تیز لہر ساجدہ بیگم کے دل سے ہوتی پورے وجود میں دوڑ گئی۔ زیادہ دکھ تو بیٹے کی بے حسی پر ہوا۔ جس نے بیوی کے اتنے غیر اخلاقی رویے کو ذرا برابر محسوس نہ کیا تھا۔

''بیٹھیے امی......کھڑی کیوں ہیں......'' لیپ ٹاپ کو دوبارہ کھولتے ہوئے عامر نے ماں کو پکارا۔

''وہ بیٹا ایک بات کرنی تھی تم سے؟'' ساجدہ بیگم کو اس پل اپنا بیٹا بھی اجنبی ہی لگا تھا۔ لہجے میں ہچکچاہٹ خود بخود در آئی۔

''جی کہیے......؟'' نگاہیں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر گاڑھے عامر نے استفسار کیا۔

''تمہارے بابا کی میڈیسن لانی ہیں اور تفصیلی چیک اپ بھی کروانا ہے۔ ان کی طبیعت کافی خراب رہنے لگی ہے، دو گھڑی باپ کے پاس بھی بیٹھ جایا کرو......وہ تمہیں یاد کرتے ہیں...... تمہارے پاس گاڑی ہے، ذرا سکون سے وہ اسپتال تک کا سفر طے ہوجائے گا۔'' احسان صاحب کی اگرچہ اپنی گاڑی بھی تھی مگر اسے بیچ کر اس کی رقم بھی یاسر کے کاروبار میں لگائی جاچکی تھی وہ بھی ڈوب گئی تھی۔

''ہونہہ کام کے وقت عامر، عامر ہونے لگتی ہے اور اپنی جمع پونجی حتیٰ کہ پنشن بھی یاسر صاحب پر خرچ ہورہی ہے۔'' سونیا کھولتے ہوئے زیرِلب بڑبڑائی۔ ساجدہ بیگم کے پژمردہ تھکے، تھکے لہجے پر عامر کے دل کو کچھ ہوا۔ سونیا جتنا بھی اس کے کان بھرے ماں، باپ تو اسے بھی پیارے تھے۔

''آپ فکر نہ کریں امی، میں کل لنچ کے وقت جب آؤں گا گھر تب بابا کو لے جاؤں گا کارڈیو میڈیسن بھی لے لوں گا۔'' عامر کی بات پر ساجدہ بیگم کا

نظم

میرے رتجگوں کو
نکھار دیتا ہے
چاند ہر سوال کا
جواب دیتا ہے
میرے رخسار پر
جب بڑھ جاتی ہے
آنسوؤں کی تپش
وہ اپنی ٹھنڈک کا
احساس دیتا ہے
جب تک میں
نہیں سوتی ہوں
وہ بھی سنگ میرے
جاگتا رہتا ہے
کیوں اک بے وفا کی خاطر
تنہائی کو گلے
لگا بیٹھی ہو
یہ بات مجھ سے
چاند اکثر
پوچھتا رہتا ہے

کاوش: سیدہ عروج فاطمہ، ملتان

ستارے خرید کردو

میں نے کہا مجھے لے دو بادل
شام سے پہلے اس نے میرے گھر میں
بھیج دیے غم کے بادل
یہ اس کی محبت کی حد نہیں تو کیا ہے
میں نے کہا ستارے خرید کر دو
اس نے فوراً میری آنکھوں کو
جھلمل ستاروں سے بھر دیا

کاوش: شبانہ ندیم

پسند: آسیہ عامر، کراچی

دل خوشی سے کھل اٹھا۔ بے ساختہ محبت سے بیٹے کی پیشانی چومی۔

''جیتے رہو۔'' سونیا عامر کی بات پر گویا جلتے توے پر جابیٹھی تھی۔ چہرہ غصے کے باعث سیاہ پڑ گیا وہ عامر پر صرف اپنا ہی حق سمجھتی تھی۔ ساجدہ بیگم سونیا کے سر پر دستِ شفقت رکھنے کی غرض سے اس کے قریب آئیں۔ عامر لیپ ٹاپ پر بزی ہو چکا تھا۔ بہت ضروری میلز تھیں جو اسی وقت چیک کرنا لازمی تھیں۔ سونیا ساس کو قریب دیکھ کر اونہہ کہہ کر رخ پھیر گئی لیکن وہ اس کے رویے کو نظر انداز کرتے اس کے سر پر دستِ شفقت پھیر کر کمرے کی دہلیز عبور کر گئیں۔

☆☆☆

''میں پوچھتی ہوں آپ نے عامر کو نوچنا بند کرنا ہے یا نہیں۔ سارا کچھ یاسر کو کھلا دیا۔ خرچے کے وقت عامر یاد آ گیا۔'' اگلے دن ناشتے کے بعد جب یاسر اور عامر جا چکے تھے تو سونیا نچلے پورشن کے لاؤنج میں چلی آئی اور کمر پر ہاتھ رکھ کر لڑاکا انداز میں ہاتھ نچا، نچا کر بدتمیزی سے تڑخ کر بولی۔ احسان صاحب اور ساجدہ بیگم جو صوفوں پر براجمان تھے۔ سونیا کی بدتمیزی کو ضبط سے برداشت کیا۔

''یہ کس لہجے اور زبان میں بات کر رہی ہو تم۔'' ساجدہ بیگم بول ہی اٹھیں۔ ''بڑوں سے بات کیسے کی جاتی ہے، تمہیں کسی نے نہیں سکھایا۔'' ساجدہ بیگم کو تو یقین نہیں آیا تھا یہ سونیا ہی بولی ہے۔

''میں اسی لہجے میں ہی بات کروں گی۔ برداشت کی حد ختم ہو گئی ہے میری۔ نیا خرچہ نکال کر رکھ دیتے ہیں آپ لوگ عامر کے سامنے۔ بیوی بچوں کے لیے بھی اسے کچھ کر لینے دیں۔'' سونیا نے ذرہ برابر بھی لحاظ نہ کیا تھا ساس سسر کا۔

''کون سے خرچے کیے ہیں عامر نے ہم پر بہو۔ پہلی بار ہی اس کے پاس گئی تھی اور بیٹا ہے میرا وہ... حق ہے ہمارا اس پر۔ تمہیں کیوں اعتراض اٹھ رہے ہیں۔'' ساجدہ بیگم کو تحمل مزاج خاتون تھیں لیکن سونیا کی بدزبانی تحمل کا دامن چھڑا گئی تھی۔ شوہر کی طبیعت بگڑنے کا بھی ڈر تھا۔

''آپ اعتراض کی بات کرتی ہیں، مجھے اعتراضات ہیں یاسر کو مصیبت ڈالیں۔ اس سے کہیں وہ چیک اپ کروائے اور میڈیسن خرید کر دے۔'' سونیا نے بدلحاظی اور بدتمیزی کی انتہا کر دی۔ اسے کوئی ڈر خوف نہ تھا کہ اگر عامر کے علم میں یہ سب باتیں آ گئیں تو وہ سونیا پر بگڑے گا۔ سونیا جانتی تھی۔ عامر کو کیسے ہینڈل کرنا ہے۔ دو چار جھوٹ موٹ کے آنسو اور فقط اتنا کہہ دینا۔ مجھ پر الزام لگایا گیا ہے میں بھلا یہ سب باتیں کیسے کہہ سکتی ہوں عامر... لیکن سونیا کی چنگھاڑتی آواز پر احسان صاحب کا ہاتھ دل پر پڑا تھا۔ ''کیا وہ بوجھ بن گئے ہیں۔ اپنے ہی بیٹوں پر۔ کیا انہیں نہیں علم ان کے باپ نے ان کے لیے کیا، کیا نہیں کیا۔ عامر کی بیوی کی جرأت کیونکر ہوئی کہ اپنے ساس سسر سے اس لب و لہجے میں بات کرے۔'' قصور یقیناً بیٹے کا تھا۔ محبت اور احساس کی موت ہو گئی تھی بیٹوں کے دل میں۔ انہیں یاسر سے بھی شکوہ تھا۔ ''کچھ تو کرتا باپ کے لیے۔'' انہی تکلیف دہ سوچوں نے ان کی روح پر تازیانہ لگایا۔ وہ دل پر ہاتھ رکھے جھکتے چلے گئے۔ ماریہ اپنے بیٹے کو کمرے میں سلا رہی تھی۔ سونیا کی بلند چنگھاڑتی آواز سن کر دوڑتی ہوئی لاؤنج میں آئی تھی لیکن لاؤنج کے منظر نے اس کے قدموں تلے سے زمین سرکا دی۔ ساجدہ بیگم روتے ہوئے احسان صاحب کو سنبھال رہی تھیں۔ جنہیں سانس رک، رک کر آ رہی تھی۔

ہونہہ ڈرامے بازیاں۔'' سونیا تنفر سے سر جھٹکتی لاؤنج سے نکل گئی۔ ماریہ نے دکھ اور طیش سے اس... بے رحم حسینہ کو دیکھا جو اپنی زبان کے نشتروں سے لہولہان کر کے جا چکی تھی۔ ماریہ نے اس پر نفرین بھیج کر جلدی سے یاسر کو کال ملائی۔ لیکن اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ یاسر کا نمبر بند تھا۔

''یا اللہ بابا کو کچھ نہ ہو۔'' بے ساختہ لبوں سے دعا نکلی۔ حمنیٰ اسکول گئی ہوئی تھی۔ ماریہ نے سرعت سے آگے بڑھ کر سسر کو سیدھا کیا۔ لیکن اجل آ پہنچی تھی۔

احسان صاحب اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔ پھر بھی وہ دوپٹا سنبھالے گلی میں قائم کلینک سے ڈاکٹر کو بلا لائی تھی جس نے ان کی موت کی تصدیق کر دی تھی۔

ساجدہ بیگم اور حمنیٰ کی سسکیاں آہیں ماریہ کی روح میں چھید کر رہی تھیں۔ وہ خود بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ آنسو نہیں تھے تو صرف سونیا کی آنکھوں میں، دنیا دکھاوے کو چہرے پر دکھ طاری کر رکھا تھا۔ ماریہ کو اس کا چہرہ کسی ڈائن کا چہرہ لگتا جو پل بھر میں اتنے مشفق انسان کو کھا گئی ہو۔ عامر اور یاسر بھی غم سے نڈھال اپنی، اپنی جگہ خود کو کوس رہے تھے۔ یاسر کو یہ دکھ کھائے جا رہا تھا وہ اپنے باپ سے غافل کیونکر ہوا۔ ان کے چیک اپ، ان کی میڈیسن کا وہ تو اتنا خیال رکھتا تھا۔ ان گزرے مہینوں میں کوتاہی کیونکر ہوئی۔ اس کا دل دکھ سے پھٹ رہا تھا۔ بن کہے کیوں نہ اس نے باپ کی ضرورت سمجھی۔ باپ اپنا آرام تیاگ کر اولاد کو سکون اور خوشیاں فراہم کرتا ہے اور بدلے میں اولاد کیا کرتی ہے۔ اپنے حساب کتاب میں الجھی رہتی ہے۔ کہاں والدین پر خرچ کی گنجائش نکلتی ہے کہاں نہیں۔ اولاد بیمار ہو جائے تو والدین ساری رات سو نہیں پاتے اور اولاد، والدین کی بیماری پر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتی ہے۔ میرے اکیلے کے والدین تو نہیں ہیں۔ تمہارے بھی ہیں۔ تم بھی کچھ کر لو۔ ایک دوسرے پر لاد کر اسی چکر میں والدین جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ نادان یہ نہیں جانتے والدین کی ضروریات کا اولاد سے وابستہ ہونا اللہ کا خاص کرم ہے۔ خوش قسمت ہے وہ اولاد جس کے گھر سے والدین رزق کھائیں۔ بس اولاد سمجھتی ہی تو نہیں ہے جب تک خود والدین کے عہدے پر فائز نہ ہو جائے۔ عامر بھی کم و بیش اسی قسم کی پشیمانی کے احساس میں جکڑا تھا۔ اسی وقت باپ کو اسپتال لے کر کیوں نہ گیا۔ وہ اتنا غافل کیوں کر رہ گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا یہ سارا کیا دھرا اس کی بیوی کا تھا لیکن اس کے کرتوت سے کون آگاہ کرتا۔ ساجدہ بیگم صبر کا گھونٹ پی چکی تھیں۔

☆☆☆

زندگی معمول پر آ چکی تھی۔ ساجدہ بیگم اور حمنیٰ کو بھی صبر آ چکا تھا۔ ماریہ تو ساجدہ بیگم کے منہ سے نکلے الفاظ اسی وقت پورے کر دیتی بدلے میں ڈھیروں دعائیں سمیٹتی۔ یاسر خود بھی ماں کے منہ سے نکلے کلمات پورے کرنے میں جان لڑا دیتا۔ وقت ریت کے مانند ہاتھ سے پھسلتا گیا۔ یاسر کا کاروبار بھی پھلنے پھولنے لگا تھا۔ وہ ماں کی ضروریات کا خود دھیان رکھنے لگا تھا۔ دوسری طرف عامر نے پہلے پہل ماں کا دل ٹھنڈا رکھا، آنے جانے لگا۔ ضروریات کا خیال رکھنے لگا لیکن بیوی اس کو غیر محسوس طریقے سے اپنوں سے الگ کرتی گئی۔ سونیا کی گود میں ایمان اور ماریہ کی گود میں پریشے آ گئی تھی۔ جواب اتنی بڑی ہو گئی تھیں کہ اسکول جانے لگی تھیں۔ حمنیٰ کی تعلیم مکمل ہونے والی تھی۔ ساجدہ بیگم اب اس کی شادی کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ سونیا سے جو شکوہ تھا وہ وقت کی دھول میں دب چکا تھا۔ وہ خود بیٹے سے ملنے اس کے پورشن میں چلی جاتی تھیں۔ نتیجتاً ڈھیروں دکھ سمیٹتی۔ ماریہ ان کو دکھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ اور یاسر جتنا بھی ان کا خیال رکھ لیں لیکن عامر کی لاتعلقی ان کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے۔

''اس عید کے بعد میری پیاری بہن بھی وداع ہو جائے گی۔'' یاسر محبت سے حمنیٰ کو ساتھ لگا کر بولا۔ حمنیٰ بری طرح شرما گئی۔ لیکن دل سے ہوک اٹھی۔ ''کبھی عامر بھائی بھی اس طرح پیار کریں۔ کتنی عیدیں گزر گئیں، کسی عید پر انہوں نے سر پر ہاتھ رکھا نہ عیدی دی۔ یہ تو میری اس گھر میں آخری عید ہے۔ کاش وہ بہن کی محبت کو محسوس کر لیں۔'' گھر کے افراد اس وقت لاؤنج میں صوفوں پر براجمان تھے۔ حمنیٰ، یاسر کے ساتھ بیٹھی تھی۔ افطاری میں ایک گھنٹا رہتا تھا۔

حمنیٰ کی آنکھیں نم تھیں۔ رمضان کا مقدس مہینہ اپنے انوار و برکات سے ہر مومن کی روح کو بھگوتا آخری عشرے کی جانب گامزن تھا۔ یاسر اور ماریہ نے اپنا حق ادا کر دیا تھا۔ حمنیٰ کا شاندار جگہ رشتہ طے کر کے۔

ساجدہ بیگم' یاسر سے بہت خوش تھیں ہر وقت یاسر کے لیے لبوں سے دعائیں نکلتیں۔ ان کا دل مزید دکھ کی لپیٹ میں تب آیا تھا جب یاسر نے رشتہ طے کرتے وقت عامر کو بلایا تھا۔ لیکن عامر نے بہن کی خوشی میں شرکت کرنا گوارا نہ کیا تھا۔ ماں تھیں ہر بات سے بیٹے کو بری الذمہ کر کے پھر امید باندھ لیتیں۔ اب یاسر مٹی کو بھی ہاتھ لگاتا تو وہ سونا بن جاتی۔ ''یہ سب میری ماں کی دعا کا کرشمہ ہے۔'' یاسر برملا کہتا تھا۔

''بہو آج بیسواں روزہ ہے۔ تم عامر اور سونیا کو افطاری کی دعوت دے آؤ۔ کیا پتا آ ہی جائیں۔'' ساجدہ بیگم کا لہجہ یاسیت زدہ تھا۔ ماریہ کے دل کو کچھ ہوا۔

''ضرور امی، میں جاؤں گی اور تاکید کر کے آؤں گی۔ بس آپ مینو بتا دیں افطاری میں کیا بناؤں۔'' ماریہ خوش دلی سے گویا ہوئی۔

''پہلے دعوت تو دے آؤ اور ان کی مرضی معلوم کر لینا۔ پھر افطاری بنانا۔'' ساجدہ بیگم نے اسی وقت اسے بالائی پورشن روانہ کیا۔

جیسے ہی ماریہ اوپر والے پورشن میں پہنچی تو عامر اور سونیا کو لاؤنج میں صوفوں پر براجمان گفتگو میں مصروف پایا۔ ماریہ کو دیکھ کر دونوں نے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ کافی عرصے بعد اوپر آئی تھی۔ سونیا نے گھر کو بہت خوب صورتی سے سجا رکھا تھا۔

''بیٹھیے بھابی۔'' بالآخر عامر کو شرم آ ہی گئی۔ ماریہ عین سونیا کے سامنے سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔ سونیا کو کوفت ہونے لگی۔ دل ہی دل میں خوب سنائیں ماریہ کو۔

''منہ میں گھنگنیاں ڈال کر آئی ہے جو کچھ پھوٹ ہی نہیں رہی۔''

''وہ عامر بھائی امی نے آپ سب کو افطاری کی آج دعوت دی ہے۔ پلیز آپ ضرور آیئے گا۔'' ماریہ کا لہجہ صرف ساجدہ بیگم کی خاطر ملتجی ہو گیا۔ سونیا پھر کر انکار کرنے ہی والی تھی کہ کچھ سوچ کر زبان دانتوں تلے داب لی۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں عامر پر جانے کی آمادگی ظاہر کر دی۔ عامر کی اجازت طلب نگاہیں بھی سونیا کی نگاہوں پر مرکوز تھیں۔ سونیا کی ہاں پر عامر نے خوش اخلاقی سے اپنے آنے کا عندیہ دے دیا۔ ماریہ خوشی سے پھولے نہ سمائی' یہ مرحلہ اتنی آسانی سے طے ہو جائے گا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ وفورِ مسرت سے وہ سرعت سے اٹھی۔

''میں امی کو بتاتی ہوں۔'' ماریہ دھپ دھپ کرتی سیڑھیاں اتر گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی دونوں میاں بیوی کس وجہ سے فوراً مان گئے تھے۔

شاندار ڈائننگ ٹیبل پر افطاری کے لیے انواع و اقسام کے کھانے سجے تھے۔ ماریہ اور حمنیٰ کو ساجدہ بیگم نے چند کھانے پکانے کا حکم دیا تھا۔ دونوں نے دل لگا کر سب ڈشز تیار کی تھیں۔ ٹیبل کے گرد چیئرز پر بیٹھے سونیا اور عامر کی آنکھیں تو لاؤنج میں سجی قیمتی اشیا کو دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ انواع و اقسام کے کھانے قیمتی برتنوں میں دیکھ کر سونیا کو تو باقاعدہ چکر آنے لگے۔ اتنی دولت یاسر کے ہاتھ ایک دم کہاں سے آ گئی۔ اسے علامر کی کہی بات سچ لگنے لگی۔ یقیناً یاسر کے ہاتھ کوئی گیدڑ سنگھی لگ گئی ہے، جس کے کرشماتی اثر کی بدولت اس گھر پر ہن برسنے لگا ہے۔ یہی حال عامر کا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا یاسر کا لائف اسٹائل اتنا شاہانہ ہو چکا ہوگا۔ آنا جانا جو نہیں تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی اپنے ذہن میں کلبلاتے تجسس کے کیڑے کو مارنے آئے تھے لیکن یہاں شان و شوکت اور نگاہوں کو خیرہ کرتی اشیا دیکھ کر تجسس کا کیڑا باقاعدہ اچھل کود کرنے لگا تھا۔ اب تو پوچھنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ ساجدہ بیگم خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھیں۔ بہو بیٹا پوتا پوتی آج نگاہوں کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ دید کی پیاس بجھا رہی تھیں۔ یاسر اور ماریہ ماں کی خوشی میں خوش تھے۔ حمنیٰ بھی بھائی کے گلے لگ کر رو دی تھی جس پر عامر کو شدید شرمندگی اور تاسف نے آ گھیرا تھا۔ افطاری خوشگوار ماحول میں تناول کی گئی۔ افطاری کے بعد یاسر مسجد میں نماز ادا کرنے چلا گیا۔

عامر اور سونیا نمازوں کے چور تھے۔ ماں کا دل

دکھانے والے کو اللہ بھی اپنے دربار میں نہیں بلاتا۔ توفیق ہی نہیں دیتا اپنے سامنے کھڑے ہونے کی۔ ماریہ، حمنیٰ اور ساجدہ بیگم نے نمازِ مغرب ادا کی۔ ارمغان اور پریشے، احمد اور ایمان کو لے کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ماریہ نے ارمغان اور پریشے کو اپنے ساتھ نماز پڑھا کر کمرے میں جانے دیا تھا۔ عامر سب دیکھ رہا تھا۔ ماحول میں پاکیزگی اور سکون طاری تھا۔ کہیں نہ کہیں وہ غلط تھا۔ اس کو شدت سے کچھ احساس ہوا۔

یاسر مغرب ادا کر کے گھر آیا تو عامر اور سونیا اس کے سامنے صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ ساجدہ بیگم مغرب کے بعد کے اذکار میں مشغول تھیں۔ نماز پڑھنے کی جگہ لاؤنج سے ہٹ کر تھی۔ ماریہ اور حمنیٰ کچن میں تھیں۔ ابھی سب کو چائے سرو کرنا تھی اور کھانے کو فائنل کرنا تھا۔ وہ لاؤنج میں آئیں تو تینوں چپ بیٹھے تھے۔ بالآخر عامر نے ہی چپ کی مالا توڑی۔

''لگتا ہے یاسر تمہارے ہاتھ کوئی گیدڑ سنگھی لگ گئی ہے جو تمہارا کاروبار ترقی کی بلندیوں تک جا پہنچا ہے۔'' ابھی ابھی اسے یاسر کی زبانی علم ہوا تھا کہ اس نے اپنے آفس کے لیے ذاتی جگہ بھی خرید لی ہے۔ عامر جاننے کے لیے مزید بے چین ہوا اٹھا تھا۔ عامر اور سونیا کی نظریں یاسر کے چہرے پر گڑی تھیں جس کے چہرے پر عامر کے سوال نے عجیب سا اسرار پھیلا دیا تھا۔ وہ آگے کو جھک کر لہجے کو پُراسرار بناتے ہوئے دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔

''وہ گیدڑ سنگھی تم بھی حاصل کر سکتے ہو بھائی۔''

''وہ کیسے؟'' عامر نے بے چینی بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ سونیا کا بھی علامر جیسا حال تھا۔ یاسر جلدی سے اگل دے۔ وہ گیدڑ سنگھی عامر کے ہاتھ کیسے لگ سکتی ہے۔

''تو سنو عامر۔'' سونیا اور عامر ہمہ تن گوش تھے۔

''میں نے باپ کے مرنے کے بعد اپنی کوتاہی اور فرض میں غفلت کو جانا تو میں خود سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہا۔ میں ادھار پکڑ کر بھی اپنے باپ کی میڈیسن لا سکتا تھا۔ ان کا چیک اپ کروا سکتا تھا لیکن میں نے نہیں کیا ایسا۔ تب میں نے سوچا اگر میں بیمار ہوتا تو کیا میرا باپ صرف یہی سوچتے ہوئے مجھے مرنے دیتا کہ میرے پاس علاج کے لیے رقم نہیں...... نہیں عامر، میرا باپ ہرگز ایسا نہ کرتا۔ وہ ہاتھ پھیلا لیتا لیکن مجھے یوں بے یار و مددگار نہ چھوڑتا۔ پھر میں نے خود سے عہد کیا۔ باپ کو تو اپنی غفلت سے کھو دیا۔ پھر اب ماں کی ضروریات کو جاننا اپنا فرض عین بنا لوں گا۔''

عامر کا دل کہیں شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب ابھر رہا تھا۔ وہ اپنے سوال کو بھول کر اپنی غلطیوں کے سمندر میں غوطہ کھانے لگا جن میں یاسر کی پُررقت گفتگو اسے دھکیل چکی تھی۔ سونیا بیزار بیٹھی تھی۔ اسے ان بلاتوں کو سننے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے صرف گیدڑ سنگھی کا راز جاننا تھا۔ یاسر کی بات ابھی جاری تھی۔ وہ برے، برے منہ بناتی سننے لگی۔

''پھر میں نے اپنی ماں کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت کا خیال رکھنا شروع کیا۔ کبھی میں نے ان کو اس نہج پر آنے نہیں دیا کہ وہ میرے سامنے اپنی ضرورت کے لیے ہاتھ پھیلائیں بنا کہے ان کی ہر ضرورت پوری کی۔ اگر کبھی انہیں سوال کرنا پڑ گیا تو اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال کر ان کی ضرورت پوری کی۔ وہ ہزار مانگتیں میں پانچ ہزار دیتا کہ دوبارہ ان کو نہ مانگنا پڑیں اگر کم پڑ جائیں تو...... میری ماں کا دل مجھ سے راضی رہا۔ میری ماں مجھ سے راضی تھی۔ دعاؤں کا جھرنا تھا جو میری پیاری ماں کے لبوں سے بہتا تھا۔ مجھے میری ماں کی دعائیں لگ گئیں عامر۔ میں نے کبھی ماں کو ''نہ'' نہیں کی اور میرے رب نے مجھے کبھی ''نہ'' نہیں کی۔ مجھے اتنا نوازا ہے میرے رب نے۔ اور یہ میری ماں کی دعاؤں کے سبب ہے۔ میری ماں کی دعائیں ہی وہ گیدڑ سنگھی ہیں جو میرے ہر کام کو درست سمت عطا کرتی گئیں۔ رزق کے دہانے میرے لیے کھلتے چلے گئے۔ انشاء اللہ میں اس سال امی کو حج پر لے

جارہا ہوں۔ ماریہ اور بچے بھی ساتھ ہوں گے۔ حمنیٰ اپنے گھر کی ہوجائے گی۔ امی پُرسکون ہوجائیں گی تو میں بھی پُرسکون ہوجاؤں گا لیکن میں جانتا ہوں عامر وہ تب بھی بے سکون رہیں گی۔ جانتے ہو کیوں؟'' عامر جو شرمندگی سے اپنی نگاہیں کارپٹ پر گاڑھے بیٹھا تھا۔ یاسر اچانک چپ ہوا تو عامر نے ندامت وشرمندگی بھری نگاہوں سے بھائی کو دیکھا جو رب کی خوشنودی کو پا گیا تھا۔

''وہ اس لیے عامر کہ وہ صرف میری اور حمنیٰ کی ماں نہیں ہیں' وہ تمہاری بھی ماں ہیں۔ تم بھی ان کے لختِ جگر ہو۔ ان کا دل تمہیں دیکھنے، باتیں کرنے کو تڑپتا ہے۔ وہ تم سے دوری سہہ نہیں پاتیں۔ ان کے دل سے یہ دکھ ہٹا دو عامر۔ ان کو مکمل سکون صرف اس صورت میں ہی مل سکتا ہے جب تم بھی ان کو وہ مان اور محبت دو۔ جو ایک بیٹے کا فرض ہے۔ وہ تمہارے روپے پیسے کی طلب گار نہیں صرف تم سے محبت اور مان چاہتی ہیں۔'' یاسر کا لہجہ بھیگ گیا۔ وہ ہی تو جانتا تھا ماں ان اوقات میں گیٹ پر نگاہیں جما کر بیٹھ جاتی ہے۔ جو اوقات عامر کے گھر آنے جانے کے ہوتے تھے۔ عامر کے دل پر آنسو بے آواز گرنے لگے۔ سونیا کو عجیب سی بے چینی لاحق ہونے لگی تھی۔ وہ کیا جاننے آئے تھے۔ یہاں تو عامر ہی اسے بدلا، بدلا لگنے لگا تھا۔

''افوہ عامر! اصل بات تو پوچھیں، جانے یاسر کون سی فضول کہانیاں سنائے جارہا ہے۔ اگر یاسر نے نہیں بتانا تو اٹھیں۔ مجھے نہیں بیٹھنا یہاں فضول قسم کے لیکچر سننے۔'' سونیا ہمیشہ کی طرح بنا لحاظ ومروت بولی۔ یاسر کے چہرے پر ناگواری کا تاثر پھیل گیا۔ عامر کو پہلی بار بیوی کے خوب صورت چہرے کے پیچھے ایک مکار عورت کا چہرہ نظر آیا تھا۔ اسی خوب صورت چہرے کے عشق نے تو اس کی سدھ بدھ کھو دی تھی۔ وہ اس کے کانوں سے سنتا، اس کی آنکھوں سے دیکھتا اور اسی کی زبان سے بولتا تھا۔ قصور تو سراسر اس کا تھا۔

''اصل بات پوچھیں ناں؟ آپ اس سے کہ.....امی نے حمنیٰ کے حصے کی رقم اور پلاٹ بیچ کر حاصل ہونے والی رقم یاسر کو دی ہے ناں۔ یوں ہی تو کاروبار نہیں چمکا۔'' سونیا کے دل کی بات بالآخر زبان پر آہی گئی۔ سونیا کی سطحی سوچ نے یاسر کو حقیقتاً دکھ پہنچایا۔ حمنیٰ اور ماریہ گفتگو کی نوعیت جان کر کچن سمیٹ کر چائے سرو کرنا ملتوی کرکے کمرے میں جا چکی تھیں۔ ساجدہ بیگم ابھی تک ذکرواذکار میں مشغول تھیں۔ ان کا دل پُرسکون تھا بیٹا اور بہو ابھی بیٹھے ہیں۔ لاؤنج میں یاسر، بھاوج کی بدگمانی پر تڑپ اٹھا تھا۔

''حمنیٰ کی رقم اور پلاٹ صرف حمنیٰ کا ہے بھابی۔ بالکل محفوظ، ان کو چھیڑا بھی نہیں گیا۔ وہ حمنیٰ کی امانت ہے میں خیانت کا مرتکب کیونکر ہوتا۔'' یاسر کا لفظ، لفظ سچائی میں ڈوبا تھا۔ عامر نے قہر بھری نگاہ بیوی پر ڈالی تو اس کو اور تپ چڑھ گئی۔ اس نے سالوں عامر کے دل پر بلاغیرے شرکت حکومت کی تھی۔ ہمیشہ کامیاب ٹھہری تھی۔ اتنی جلدی وہ عامر کے دباؤ میں آنے والی نہ تھی۔

''چلو عامر اٹھو' اب اٹھ کیوں نہیں رہے۔ احمد، ایمان جلدی آؤ۔ ہم جارہے ہیں۔'' وہ تڑخ کر بولی۔ سخت لہجے میں شوہر کو حکم دیتی بچوں کو آواز دینے لگی۔ اسے سالوں کی محنت اکارت نہیں کرنی تھی۔ عامر کا ماں بہن بھائی کے لیے سویا ہوا جذبۂ محبت پھر نہ جاگ جائے۔ اسے شوہر کو فوراً لے کر وہاں سے چلے جانا تھا۔ اس کی بلا سے ساجدہ بیگم کل کی مرتی آج ابھی مرجائیں۔ زہرخند سوچ سوچتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بیٹھو تم......اور خبردار آئندہ تم نے مجھے میرے اپنوں سے بدگمان کرنے کی کوشش کی۔ اگر کبھی کوشش کی بھی تو ایک منٹ نہیں لگاؤں گا باہر کا راستہ دکھادوں گا۔ زبان کھینچ لوں گا تمہاری اگر میری ماں سے گستاخ لہجے میں بات کرنے کی جرأت بھی کی تو۔'' عامر شیر کی طرح دھاڑا تھا۔ سونیا حیران' پریشان اس سے سے اچھا تھا عامر کو اکساتی ہی تاں۔ یہ کیا ہوگیا سب کچھ الٹ ہوگیا۔ بچے باپ کی بلند دھاڑ پر کمرے سے نکل آئے تھے۔ عامر نے دونوں کو سہمتے ہوئے دیکھا۔

''تم دونوں جاؤ کھیلو ارمغان اور پریشے کے ساتھ۔'' عامر نرمی سے بولا تو دونوں خوشی، خوشی جلدی سے کمرے میں چلے گئے۔ یاسر نے سراہتی نگاہ بھائی پر ڈالی۔ یہ مرد ہی ہے جو بیوی سے اپنے سے وابستہ رشتوں کی عزت کرواتا ہے۔ عامر جو جورو کا غلام بن کر رہ گیا تھا۔ اس پل اس نے اپنا منصب پہچان لیا تھا۔ یاسر کے چہرے پر پھیلے سکون نے عامر کو اچھی طرح احساس دلادیا تھا کہ وہ بیوی کے پیچھے لگ کر اپنی جنت سے محروم ہونے جارہا تھا۔ سونیا چپکی بیٹھی رہی۔ عامر کی دھاڑ نے اسے بھیگی بلی بنادیا تھا۔

''یاسر مجھے بھی وہ گیدڑ سنگھی حاصل کرنی ہے جو مجھے جنت کا وارث بنا دے۔ میں اپنی ماں کا مجرم ہوں۔ مجھے ان سے معافی مانگنی ہے۔'' وہ ایک عزم سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی پل ساجدہ بیگم لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ بیٹے کے چہرے پر چھائے شرمندگی کے بادل ماں کی زیرک نگاہوں سے مخفی نہ رہ سکے۔ وہ ٹھہر گئیں۔ دل کو انہونی کے ہونے کا یقین ہونے لگا۔ ان کا بیٹا پلٹ آیا تھا۔ اس خیال نے ان کے وجود میں سکون بھردیا۔ عامر چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتا ماں کے سامنے آکھڑا ہوا۔ ہاتھ جوڑ کر معافی کا طلب گار ہوا۔ ماں نے بندھے ہاتھ کھول کر اپنے پیارے بیٹے کو ممتا میں سمولیا۔ دونوں ماں بیٹا کے محبت بھرے ملن پر درودیوار بھی مسکرا اٹھے تھے۔ رب کی رحمت نے اپنا رخ عامر کے دل کی طرف کردیا تھا۔ ماریہ، حمنیٰ اور یاسر ساجدہ بیگم کو خوش دیکھ کر پُرسکون ہوگئے۔ اس رمضان کے مقدس مہینے میں ساجدہ بیگم کو وہ سب خوشیاں حاصل ہوگئی تھیں جو ہر سال رمضان اور عید کے موقع پر نہ ہونے کے باعث ان کے دل کو بے چین رکھتی تھیں۔

☆☆☆

''چلو بھئی بچوں جلدی گاڑی میں بیٹھو۔ ورنہ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔'' عامر نے بچوں کو دھمکایا۔ جو گاڑی میں بیٹھنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ آج چاند رات تھی۔ گھر کے سب افراد بازار جانے کے لیے گاڑیوں میں بیٹھ چکے تھے۔ عامر نے ساجدہ بیگم کو اپنی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر بٹھایا تو یاسر مصنوعی خفگی سے چلایا۔

''عامر امی کو کبھی میری گاڑی میں بھی بیٹھنے دیا کرو۔'' جواباً عامر انگوٹھا لہرا کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ سونیا پچھلی سیٹ پر براجمان تھی۔ عامر نے اسے تیر کی طرح سیدھا کردیا تھا۔ امی جی، امی جی کہتے اس کی اب زبان سوکھتی تھی۔ سب کچھ صحیح ہو چکا تھا۔ ساجدہ بیگم کا دل اپنے بچوں کی محبت پر رب کے حضور شکر گزار تھا۔

عید کا دن خوشیاں لیے طلوع ہوا تھا۔ نچلے پورشن کے لاؤنج میں ہڑبونگ مچی تھی۔ یاسر اور عامر تیار ہوکر ساجدہ بیگم کے سامنے جا کھڑا ہوئے۔ ساجدہ بیگم کے دائیں بائیں ایمان' احمد اور ارمغان' پریشے کھڑے تھے۔ اس خوب صورت منظر کو دیکھنے کی انہوں نے کتنی چاہ کی تھی۔ رب نے اس مبارک عید پر یہ منظر ان کی آنکھوں کو دکھا دیا تھا۔ ساجدہ بیگم کا رواں رواں رب کا شکر گزار تھا۔ محبت سے دونوں بیٹوں کا ماتھا چوما۔ پوتوں' پوتیوں کو محبت سے ساتھ لگا کر عیدی دی۔

''ہماری عیدی امی جان، تین چوڑیوں بھرے ہاتھ بیک وقت ان کے سامنے پھیلے۔ سونیا، ماریہ اور حمنیٰ..... چہرے پر محبت کے رنگ سجائے عیدی کی منتظر کھڑی تھیں۔ ساجدہ بیگم نے دل کھول کر تینوں کو عیدی دی اور محبت سے ساتھ لگالیا۔ وہ کیوں دل کھول کر عیدی نہ دیتیں۔ ان کے بیٹوں نے رات ہی ان کو خاصی تگڑی رقم پکڑا دی تھی۔ ہر سو خوشیوں اور سکون کا راج تھا۔ سونیا بھی ماریہ کی طرح ان کے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ بدگمانیوں اور نفرت کے بادل چھٹ چکے تھے۔ مطلع صاف ہوچکا تھا۔ عید کا دن ساجدہ بیگم کے لیے خوشیوں کا پیام لایا تھا اور یاسر اور عامر نے گیدڑ سنگھی کو اپنے قابو میں کرلیا تھا۔ وہ گیدڑ سنگھی یقیناً ان کی ماں کی دعائیں تھیں۔



اختر شجاعت

معرفت...... علمِ الٰہی

تمام تر تعریف اور حمد و ثنا اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جو رب العالمین ہے کیونکہ وہی اس تعریف کا حقدار ہے کہ جب اس نے آسمان و زمین کو خلق کیا تو کسی کو گواہ نہیں بنایا اور جب جانداروں کو پیدا کیا تو اپنا کوئی مدد گار نہیں ٹھہرایا...... الوہیت میں کوئی اس کا شریک نہیں اور وحدت میں کوئی اس کا معاون نہیں...... زبانیں اس کی انتہائی صفات کے بیان کرنے سے گنگ اور عقلیں اس کی معرفت کی تہ تک پہنچنے سے عاجز ہیں۔

اے اللہ تو خاتم الانبیاء سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور ان کی آلؓ پر رحمت نازل فرما...... اور ہمیں ان کی شفاعت سے بہرہ مند فرما...... (آمین)

ہمارا موضوع ''معرفت ہے۔'' معرفت کے لغوی معنی پہچان، خدا شناسی، ذریعہ سبب، وسیلہ ہے' اور اصطلاحاً اس سے مراد اللہ جل شانہ کی پہچان یا علمِ الٰہی ہے...... معرفت یعنی خدا شناسی...... خدا کی ذات کا عرفان...... ہمارے لیے ضروری ہے کہ بندہ اپنے خالق اپنے رب کو پہچانے اور اپنے اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ معلوم کرے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ'' انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر نہ جانی جیسا کہ اس کا حق ہے۔'' معرفت کی حقیقت یہ ہے کہ دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ زندہ ہو اور اس کا باطن ماسوا اللہ سے خالی ہو...... ہر ایک کی قدر و منزلت معرفت سے ہے...... اور جسے معرفت نہیں وہ بے قیمت ہے پس علماً فقہا اللہ تعالیٰ کے علم کی صحت کو ہی معرفت کہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ معرفت (پہچان) کو علم سے زیادہ فضیلت حاصل ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''جنوں اور...... انسانوں کو عبادت کے لیے پیدا کیا۔'' یعنی میں نے جنوں اور انسانوں کو معرفت کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا...... مگر اکثر خلقت اس سے روگرداں ہے سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ عز و جل...... نے برگزیدہ کیا...... اور دنیا کی ظلمتوں اور تاریکیوں سے نجات دی اور سچی بات تو یہ ہے کہ خدا کی محبت کی حقیقت اور ولایت کا ثبوت اس کی معرفت کے بغیر درست قرار نہیں پاتا۔

حدیث قدسی ہے کہ ''میں ایک مخفی خزانہ تھا پس میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں پس میں نے خلقت کو پیدا کیا۔'' یعنی اللہ کی رضا یہی ہے کہ مخلوق میری معرفت حاصل کرے اور عبادت کرے اس لیے انسان کا فرض بنتا ہے کہ اس جہان کی ان گنت نشانیوں سے خالقِ کائنات کی معرفت حاصل کرے۔

ارشادِ خداوندی ہے...... ''اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر یہ بڑی بے پروائی سے منہ موڑ کر گزر جاتے ہیں......'' مزید ارشادِ خداوندی ہے کہ...... ''اور انہیں ہم اپنی نشانیاں آفاق (جہان) میں دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفسوں میں تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ وہ واقعی حق ہے۔'' جو لوگ ایک سرسری سی نگاہ ڈال کر گزر جاتے ہیں ان کے دیکھنے اور ایک جانور کے دیکھنے میں کوئی فرق نہیں...... ان ندی نالوں کے پانیوں کو تو جانور بھی دیکھتا ہے اور اپنی ضرورت کے مطابق ان کا مصرف بھی جانتا ہے لیکن انسانوں کو تو سوچنے والا دماغ بھی دیا گیا ہے۔ جن سے جانور عاری ہیں اس لیے انسان کا فرض بنتا ہے کہ حقیقت کی جستجو کرے اور راستے کے نشانات کی مدد سے منزل تک پہنچنے کی کوشش کرے...... اور فکر و تدبر سے خدا کی ذات اور صفات تک رسائی حاصل کرے...... قدرت کے مظاہر کی ایک، ایک چیز عرفانِ خداوندی کی نشان دہی کرتی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جب معرفت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؓ نے فرمایا۔

''میں نے خدا کو اس کی مدد سے پہچانا اور ماسوا کو اسی کے نور سے جانا۔''

حضرت امام جعفر صادقؒ کا ارشاد ہے کہ ''جسے اللہ کی معرفت حاصل ہوگئی وہ ماسوا اللہ سے کنارہ کش ہوگیا۔'' اس لیے کہ جو شخص خدا سے واصل ہو جاتا ہے اس کے دل میں غیر کی کوئی قدر و منزلت باقی نہیں رہتی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''جو شخص مُردہ تھا اسے ہم نے زندہ کیا...... اس فرمان میں ہر قسم کی زندگانی کا اپنے قبضے میں ہونا بیان فرمایا ہے۔ اور پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اور ہم نے اس کے لیے نور مقرر کیا جس کے ساتھ وہ چلتا ہے......'' مطلب یہ کہ ایسے نور کا پیدا کرنے والا جس کی روشنی میں مسلمان چلیں وہ میں ہوں...... اور یہ بھی فرمایا کہ دل کی کشادگی اللہ تعالیٰ کے قبضے و اختیار میں ہے، اسی طرح اس کی بندش بھی اس کے قبضۂ اختیار میں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے ہمیں ایمان کی محبت دی اور اسی نے ہمارے دلوں کو اس سے مزین فرمایا...... تقویٰ اور اللہ کی محبت میں قائم رہنا عین معرفت ہے اور اسی کی جانب سے ہے جب تک اللہ خود اپنی معرفت نہ کرائے لوگوں کے نصیب میں اس کی معرفت ممکن نہیں......

حضرت ابوالحسن نوریؒ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ پر اس کے سوا کوئی دلیل و رہنما نہیں...... علم تو خدمت (عبادت) کا طریقہ سیکھنے کے لیے حاصل کرتے ہیں۔''

معرفت کی حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز خدا کی ملکیت سمجھے اور جب بندہ یہ جان لیتا ہے کہ ہر چیز خدا کی ملکیت ہے اور اسی کے تصرف میں ہے تو پھر اسے کسی مخلوق سے کوئی سروکار نہیں رہتا حتیٰ کہ خود اپنے آپ سے بھی نہیں......

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''جس نے اپنے آپ کو فنا سے پہچان لیا اس نے حق تعالیٰ کو بقا سے پہچان لیا۔''

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ ''معرفت یہ ہے کہ تم جان لو کہ خلق کی تمام حرکت و سکون حق تعالیٰ سے ہے۔''

حضرت ابوبکر واسطیؒ فرماتے ہیں کہ ''جس نے اللہ کو پہچان لیا وہ ہر ایک سے نہ صرف جدا ہوگیا بلکہ گونگا اور دلبر داشتہ بھی ہوگیا۔''

حضرت جنید بغدادیؒ علم و معرفت میں کوئی فرق نہیں کرتے لیکن تسلیم کرتے ہیں کہ عوام اور خواص کے علم باری تعالیٰ میں مدارج کا فرق ضرور ہے۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق عوام کا علم ادنیٰ درجے کا اور خواص کا علم اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے۔ علما یہ کہتے ہیں کہ عقل کے ذریعے سے اللہ کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ صوفیاء کہتے ہیں کہ معرفت کا علم عقل کے ذریعے نہیں بلکہ قلب کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اور ہمارے علمِ باری تعالیٰ کا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ ہم اس کی احدیت کا اقرار کریں اور انتہائی درجہ یہ ہے کہ ہمارے اندر تقویٰ زہد و ورع اور پاکی قلب و نظر پیدا ہو جائے اور ہم ہر شے میں اسی کا جلوہ دیکھیں اور ہر وقت اسی کی حمد و ثنا کرتے رہیں اور اسے اپنی جانوں سے بھی زیادہ محبوب رکھیں۔

اللہ عز و جل کی معرفت حاصل ہو جانے کے بعد کوئی مسلمان غیر اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کر سکتا۔ یعنی معرفت آخری منزل نہیں ہے بلکہ توحید کے مقام پر فائز ہو جانا آخری منزل ہے اور یہی مقصودِ حیات ہے۔ جان لو کہ اللہ کی عبادت کی پہلی شرط اس کی معرفت ہے اور معرفت کی اصل یہ ہے کہ تم اس بات کا سچے دل سے اقرار کر لو کہ وہ وحدہ لاشریک ہے۔ اور اس کی احدیت

کا تقاضا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں ان سوالات کے جوابات کے امکان کی مکمل نفی کر دو مثلاً وہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ کیونکر ہے؟ کہاں ہے؟ کب سے ہے؟

ہم صرف اللہ ہی کی مدد سے اور توفیق سے اس کی طرف راہ پا سکتے ہیں اور جب توفیقِ ایزدی کسی بندے کو حاصل ہوتی ہے تو اسے توحید کی نعمت نصیب ہو جاتی ہے اور جب بندے کو معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اس کے احکام کا دل و جان سے اتباع کرنے لگتا ہے۔ اس اتباع سے اس کو قربِ الٰہی حاصل ہو جاتا ہے۔ اور قرب کا ثمرہ مشاہدہ ہے...... اور اب وہ یقین کر لیتا ہے کہ درحقیقت اللہ کے سوا اور کوئی شے موجود نہیں اور جب یہ صورت ہوتی ہے تو اس کے نفس کے تقاضے سب زائل ہو جاتے ہیں اور اسے حضوری کا صلہ نصیب ہو جاتا ہے تب وہ پورے طور سے اللہ کے حضور میں زندگی بسر کرتا ہے...... لیکن یہ بات ضرور جان لو کہ تم خود اللہ تک نہیں پہنچ سکتے لیکن تم اللہ کے ذریعے سے اس تک پہنچ سکتے ہو...... وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تمہیں خود اپنے تک پہنچنے کا راستہ دکھاتا ہے تو گویا وہ تمہیں دعوت دیتا ہے کہ اس تک پہنچو...... پھر لازمی طور پر تم وہ اعمال بجا لاتے ہو جن کی بدولت خدارسی کی راہیں تم پر کھولی جاتی ہیں۔

☆☆☆

حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا......"اے اللہ! تجھے کس طرح پہچانیں......؟" فرمایا۔

"اے میرے پیغمبر......! تو اپنے نفس کو پہچان لے تو مجھے پہچان لے گا۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں "جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا جیسا کہ پہچاننے کا حق ہے تو وہ پوری طاقت سے اس کی عبادت کرتا ہے۔ کیونکہ پہچاننے والا اس کو اس کے انعام اور احسان ہی سے پہچانتا ہے۔"

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ "عارف وہ ہے جو بجز وصل اور دیدارِ الٰہی کے کسی چیز پر رضامند نہ ہو......" مزید فرمایا......"عارف وہ ہے جو اپنے مال و ملکیت سے اظہارِ بیزاری کرے اور حق تو یہ ہے کہ اگر دونوں جہان بھی محبتِ الٰہی پر قربان کر دے تو تھوڑا ہے۔"

حضرت اویس قرنیؓ نے فرمایا......"سب سے بڑی وصیت یہ ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی امر کو نہ پہچانو اور جب تم مانتے ہو کہ اللہ تمہیں پہچانتا ہے تو بس اسی کو کافی ہو کہ وہ تمہیں پہچانتا ہے اور یہ آرزو ہرگز دل میں نہ رکھو کہ اس کے سوا کوئی اور بھی تمہیں پہچانے......"

جس دل کو محبتِ الٰہی کی دولت نصیب ہو جائے اسے انسانوں سے ملنا جلنا نقصان نہیں دیتا اور جو مخلوق کی محبت میں گرفتار ہو اس کے دل پر اللہ کی محبت کا گزر نہیں ہوتا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟"

☆☆☆

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے ایک پہاڑ پر بہت سے بیمار دیکھے...... میں نے ان سے اس طرح اکٹھے ہونے کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ یہاں پر اللہ تعالیٰ کا بندہ عبادت و ریاضت میں مشغول رہتا ہے اور سال میں ایک مرتبہ مریضوں پر کچھ دم کرتا ہے جس سے مریض شفایاب ہو جاتے ہیں...... حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بھی کچھ مدت ان بزرگ کا انتظار کیا اور پھر جب وہ اپنی عبادت گاہ سے باہر نکلے تو ان کی آنکھوں کے گرد حلقے بنے ہوئے تھے اور بہت زیادہ کمزور تھے...... انہوں نے آسمان کی طرف نگاہیں بلند کیں اور کچھ پڑھ کر بیماروں پر دم کیا۔ چنانچہ فوری طور پر سب صحت یاب ہو گئے...... پھر جب وہ واپس اپنی عبادت گاہ میں جانے لگے تو میں نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا...... اور کہا کہ ظاہری بیماری والوں کو تو صحت یابی ہو گئی مگر میری باطنی بیماری کو دور فرما دیجیے...... بزرگ نے یہ سنا تو فرمایا......"اے ذوالنون......! میرے ہاتھ کو چھوڑ دو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ

دیکھ رہا ہے کہ تو نے اس کے دستِ کرم کو چھوڑ کر دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا ہے......" اتنا کہہ کر انہوں نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور عبادت گاہ میں چلے گئے۔

ایک بار کوہ لبنان کے ایک غار میں حضرت ... ذوالنون مصریؒ کی ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی...... جن کا جسم نہایت لاغر تھا اور نماز پڑھنے میں مشغول تھے...... وہ مستقل عبادت میں مصروف تھے آپ تین دن تک اسی آس میں پڑے رہے...... بالآخر جاتے ہوئے آپؒ نے ان سے فرمایا......"حضرت میں تو تین روز سے اسی امید پر یہاں رہا کہ شیخ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں گے......" کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ فرمانے لگے......"اللہ تعالیٰ کو دوست رکھ اور اس کے سوا کسی کی چاہت نہ کر...... اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو دوست رکھنے والے ہی تمام بندوں کے سرتاج اور اللہ تعالیٰ کے مقبول اور اس کے خالص بندے ہوتے ہیں۔"

ایک بار حضرت حسن بصریؒ نے حضرت مالک بن دینار سے فرمایا...... کہ "لوگوں کی تباہی مردہ دلی میں ہے" اور مردہ دلی سے مراد دلوں کا دنیا کی طرف راغب ہو جانا ہے آپؒ...... نے فرمایا۔ صحابہ کرامؓ کی عشقِ الٰہی میں یہ حالت ہو چکی تھی کہ "تم انہیں دیکھ لیتے تو دیوانہ سمجھتے مگر تمہاری حالت (ہم مسلمان) وہ تمہیں دیکھ لیتے تو تمہیں مسلمان بھی نہ تصور کرتے پھر آپؒ نے فرمایا...... کہ وہ تو برق رفتار گھوڑوں پر سوار آئے اور چلے گئے اور ہم اپنے زخم خوردہ خچروں پر پیچھے رہ گئے جو زخمی کمر کی وجہ سے چلنے پر بھی قادر نہیں۔"

حضرت حسن بصریؒ فرماتے تھے کہ "جو وسوسے دل میں پیدا ہوں اور نکل جائیں وہ شیطان کی طرف سے ہیں، ان کے ازالے کے لیے ذکرِ الٰہی اور تلاوت قرآن سے مدد لینی چاہیے اور جو وسوسے دل میں پیدا ہو کر قائم ہو جائیں، وہ نفس کی جانب سے ہیں ہمیں انہیں دور کرنے کے لیے کثرتِ نماز و روزہ اور ریاضت و مجاہدہ سے مدد لینی چاہیے۔ آپؒ نے فرمایا...... توبہ کرنے سے اللہ کے ساتھ قربت میں اضافہ ہو جاتا .... لہٰذا توبہ میں کثرت کرنی چاہیے۔"

مزید فرمایا۔ "میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو دنیا کا طالب ہو مگر اسے آخرت بھی ساتھ مل گئی ہو...... لیکن اس کے برعکس جو آخرت چاہتا ہے اسے دنیا بھی خود ہی مل جاتی ہے۔"

☆☆☆

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ "میری تیس برس کی محنت سے ایک شہزادہ صحیح معنوں میں ہدایت یافتہ ہو سکا......" وہ بھی اس طرح کہ ایک دفعہ وہ میری مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا تو میں اس وقت یہ جملہ کہہ رہا تھا کہ "کمزور کا طاقتور سے جنگ کرنا نہایت احمقانہ فعل ہے......" یہ سن کر شہزادے نے کہا کہ میں آپ کے جملے کا مفہوم نہیں سمجھا...... آپؒ نے فرمایا...... کہ اس سے زیادہ احمق کون ہو سکتا ہے جو خدا سے جنگ کرے...... یہ سن کر وہ چلا گیا اور دوسرے دن آ کر مجھ سے پوچھنے لگا کہ وصالِ خداوندی کے لیے کون سی راہ اختیار کی جائے؟ میں نے کہا دو راہیں ہیں ایک آسان اور دوسری مشکل...... آسان تو یہ ہے کہ خواہشاتِ دنیا اور معصیت (گناہ) کو چھوڑ دے اور مشکل راہ یہ ہے کہ خدا کے سوا سب سے کنارہ کش ہو جائے...... اس نے عرض کیا کہ میں یہی مشکل راہ اختیار کرنا چاہتا ہوں اور اس کے بعد وہ اپنی عبادت و ریاضت سے ابدالوں کے مقام تک پہنچ گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ "احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اگر تو اسے نہ دیکھ سکتا ہو تو یہ خیال کرے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔" قربِ الٰہی کے لیے یہ حدیث مینارہ نور ہے یہ تصوف کی جان ہے اور طریقت و معرفت کی روح ہے...... اللہ کی اس کیفیتِ قرب کا ادراک، حواس، عقلی استقلال یا بصارت سے نہیں بلکہ بصیرت سے ممکن ہے...... یہ ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ باطنی آنکھوں اور کیفیاتِ قلبی اور نورِ فراست سے کیا جا سکتا ہے۔ قربِ الٰہی پر

متعدد آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ شاہد ہیں۔

''اور ہم انسان کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔''

''اور وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو۔''

''تم جس طرف بھی رخ کرو اُدھر ہی اللہ ہے۔''

''اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اور جب میرے بندے میرے بارے میں تم سے پوچھیں تو فرما دیجیے میں قریب ہی ہوں۔''

درحقیقت مومن کا دل اللہ تعالیٰ کا عرش ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا ''میرا رب میرے ساتھ ہے۔'' گویا قرب و معیت موجود تو ہے لیکن اسے محض فراستِ ایمانی سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

''تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے''

☆☆☆

اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان کوئی دوری نہیں وہ تو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب اور ہر وقت ہمارے ساتھ ہے، ہمارے اور اس کے درمیان جو دوری ہے وہ محض غفلت کی دوری ہے۔ یہ ظلماتی حجابات ہیں اور دل پر جب پردے پڑے ہوں تو اللہ کے قریب ہونے کے باوجود اس کا قرب محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن جب انسان سچے دل اور لگن کے ساتھ توبہ، ذکر، مجاہدہ، تزکیۂ نفس اور اتباعِ سنت سے طلبِ صادق اختیار کرتا ہے تو یہ حجابات خود بخود دور ہوتے چلے جاتے ہیں اور رب کریم کی معیت (ساتھ) اور عشق نصیب ہوتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں......

''اگر تو اللہ تعالیٰ سے دور ہے تو تجھ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ تو اس کے قریب ہونے کے لیے مخلصانہ طور پر جدوجہد کرے اور ان اسباب کی تحقیق کرے جو تجھے اپنے خالق اور پروردگار سے دور رکھے ہوئے ہیں۔''

نعت شریف

ہر اِک زباں پہ درود و سلام آتا ہے
خدا کے بعد محمد ﷺ کا نام آتا ہے

فلک کے چاند ستارو! یہ تم بھی دیکھو آج
زمیں سے عرش پہ خیرُالانام آتا ہے

چمک اٹھا ہے ہر اِک ذرہ کہکشاں بن کر
پڑھانے نفل فلک پر امام آتا ہے

حضور پاکؐ کی شفقت کا فیض ہے اتنا
کہ اُن سے ملنے ہر اِک خاص و عام آتا ہے

چلا ہے آج ہر اِک فرد جانبِ سرورؐ
وہ جن کے پاس خدا کا پیام آتا ہے

اثر یہ رب کا کرم ہے کہ رنج و راحت میں
رسولِ پاکؐ کا بس لب پہ نام آتا ہے

شاعر: اثر جون پوری

پسند: فضہ بتول، بہارہ کہو

قربِ خداوندی کے ذرائع، سچی توبہ، مخالفتِ نفس، مجاہدہ، اتباعِ سنت، حُبِ خدا، جذب و عشق، ذکر، نفلی عبادات، نماز و قیام اللیل، صحبتِ اہلِ اللہ، مخلوق سے اجتناب اور توکل علی اللہ اور تلاوتِ قرآن پاک اور سب سے ضروری لقمۂ حلال۔

ایک شخص رات کو ذکر اللہ میں مشغول تھا...... اور اس کی زبان پر اللہ، اللہ کا ورد جاری تھا۔ شیطان نے اسے جھڑک کر کہا...... اے کمبخت...... کب تک اللہ، اللہ کی رٹ لگائے جائے گا اُدھر سے تو کوئی جواب

نہیں ملتا اور تو ہے کہ مسلسل اسی کو پکارے جا رہا ہے۔ شیطان کی یہ بات سن کر اس شخص کا دل ٹوٹ گیا۔ خاموشی سے سر جھکایا تو نیند آ گئی۔ عالمِ خواب میں دیکھا کہ، حضرت خضر علیہ السلام تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ اے نیک بخت...... تو نے ذکرِ حق کیوں چھوڑ دیا؟ اس شخص نے کہا کہ بارگاہ الٰہی سے مجھے کوئی جواب نہیں ملتا...... اس لیے فکر مند ہوں کہ میرے ذکرِ اللہ کو رد ہی نہ کر دیا گیا ہو...... حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا۔ مجھے بارگاہِ خداوندی سے حکم ہوا ہے کہ تیرے پاس جاؤں اور تجھ کو بتاؤں کہ تو جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے وہی ہمارا جواب ہے۔ تیرے دل میں جو سوز و گداز پیدا ہوتا ہے وہ ہمارا ہی تو پیدا کیا ہوا ہے۔ اور یہ ہمارا ہی کام ہے کہ تجھ کو ذکر اللہ میں مشغول کر دیا ہے...... تیرے ہر ''اللہ'' کہنے میں ہماری سو لبیک پوشیدہ ہیں۔ یعنی ایک جاہل اور غافل کو سچے دل سے دعا کی توفیق ہی نہیں ہوتی کیونکہ ''یارب'' کہنا اس کی عادت ہی نہیں......

تو خدا کے قرب کے حصول کے لیے اور اللہ کے محبوب بننے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتِ مبارکہ کی کامل پیروی کرنی ہے کیونکہ یہی وہ راستہ ہے جو فلاح و کامرانی کے حصول کا ذریعہ ہے اور اس راہِ مستقیم کی طرف خود ذات باری تعالیٰ نے رہنمائی فرمائی ہے...... اس لیے حب الٰہی اور عشق خداوندی کی تکمیل کے لیے تقلیدِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت ضروری ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو اس کی معرفت حاصل ہو۔

☆☆☆

خوش نصیب ہیں وہ ہستیاں جنہیں رب تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ جان لیتے ہیں کہ اپنے رب کے لیے کس طرح جیتے ہیں۔ ''اللہ کے لیے جینے'' کے معنی یہ نہیں کہ انسان دنیا و مافیہا سے قطع تعلق کرے...... اور ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر عبادت کرنے لگے۔ وہ شادی بھی کرے، کھائے بھی اور اللہ کی مخلوق سے ملے بھی لیکن اس طرح کہ وہ علائقِ ہجوم اور تعلقات کے اژدھام میں گرفتار ہو کر اپنے معبودِ حقیقی کو نہ بھول جائے۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھائے لیکن دنیا کی محبت اس کے دل میں جگہ نہ حاصل کرنے پائے، وہ ہر کام میں رضائے الٰہی کا طلبگار ہو...... اللہ کے لیے جینا نیت کا ایک زبردست انقلاب ہے۔ وہ دنیا کا ہر کام کرتا ہے لیکن اس کی نیت عام انسانوں سے مختلف ہوتی ہے۔

تو کیا ہم اپنے پیارے رب کے لیے جو ہمارا مالک و خالق ہے اس کی اطاعت میں زندگی نہیں بسر کر سکتے......؟ اس کی رحمت پکار، پکار کر کہہ رہی ہے کہ اے انسان! باز آجا، باز آجا...... تو جو کچھ بھی ہے گناہوں سے باز آ...... ہماری طرف لوٹ آ...... ہماری بارگاہ ایسی ہے جہاں ناامیدی کی کوئی گنجائش نہیں تو اگر 100 بار بھی توبہ توڑ چکا ہے پھر بھی ہماری رحمت کو مائل بہ کرم پائے گا۔

اپنے رب سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی معرفت عطا فرمائے...... آمین......

حرفِ آخر:

موضوعِ معرفت بہت زیادہ مشکل لگ رہا تھا اور درحقیقت یہ موضوع اپنے اندر اتنا کچھ سمیٹے ہوئے ہے کہ اس کو تحریر کرنا حقیقتاً بہت مشکل تھا اللہ کی معرفت کوئی آسان بات نہیں کہ چند صفحات پر تحریر کر دیا جائے.... بہرحال تشنگی رہی، بہت وسیع اور گمبھیر موضوع ہے۔

بہرحال اس مضمون میں کوئی کمی، کوئی غلطی کوتاہی دانستہ یا نادانستہ ہو گئی ہو تو اپنے عظیم رب کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ وہ مجھے اس کوتاہی پر معاف فرمائے اور میری اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما لے...... اور آخرت کے لیے توشۂ آخرت بنا دے۔ ان تمام ہستیوں کی تہِ دل سے شکر گزار ہوں جن کی کتب سے میں نے مضامین کا انتخاب کیا۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے...... آمین

☆☆☆

سنگ، سنگ چلیں ماہنامہ پاکیزہ کراچی کے

قاری بہنیں

وقت کا پہیا اپنی مخصوص رفتار سے رواں دواں ہے...... کبھی معلوم ہوتا ہے یہ پہیا رک گیا ہے اور کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تیز بہت تیز گھومتا چلا جا رہا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کا گھومنا سب کو اپنے، اپنے حساب سے کم یا زیادہ لگا کرتا ہے۔ انسانی زندگی کے پانچ دور بچپن، نوعمری، جوانی، ادھیڑ عمری اور بڑھاپا ویسے عام طور پر تو لوگ چار دور ہی شمار کرتے ہیں خیر جانے دیجیے۔ ہمیں تو اپنے پاکیزہ ساتھیوں سے ان کا بچپن، نوعمری، جوانی اور ادھیڑ عمری کے تجربات، واقعات، مشاہدات سننے ہیں تو پھر آپ بھی تیار ہو جائیں۔ خصوصیت سے وہ تمام بہنیں جو اوّل دنوں سے ماہنامہ پاکیزہ کے ساتھ ہیں اس سلسلے میں ضرور حصہ لیں اور نئے قارئین بھی اپنی رائے سے آگاہ کریں۔ اگر پرانا ترین رسالہ ابھی تک موجود ہے تو اس کے سرورق کی واضح تصویر بھی بھیج سکتی ہیں۔ اس کے لیے یہ سوالات مرتب کیے ہیں۔

1۔ ماہنامہ پاکیزہ سے تعارف کی مختصر کہانی اپنے الفاظ میں......؟

2۔ اس پورے عرصے میں پانچ ایسی نمایاں باتیں جو پاکیزہ سے ناتا جوڑے رہیں۔ مثلاً کہانیاں، سلسلے، مصنفات یا کچھ اور......؟

3۔ ماہنامہ پاکیزہ کس طرح آپ کا دوست، رہنما اور ناصح ثابت ہوا؟

☆یاسمین کنول...... پسرور

1۔ پاکیزہ سے تعارف دراصل اس کی کہانیاں، اشعار اور انجم انصار کی مزے، مزے کی باتیں پڑھ کر ہوا۔ ہماری ہمسائی مونا پاکیزہ لیتی تھی اور ہمارے گھر میں اس کا داخلہ ممنوع تھا کیونکہ اباجی کہتے تھے پہلے اپنی کورس کی کتابوں کا مطالعہ کرو پھر ڈائجسٹ پڑھنا لیکن وہ کہتے ہیں ناں شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا تو جناب ہم برسوں مونا سے پاکیزہ لے کر کورس کی کتابوں میں چھپا، چھپا کر پڑھتے رہے اور اس کے سلسلوں میں بھی شرکت کرتے رہے۔

2۔ کبھی کوئی سلسلے وار کہانی ناتا جوڑے رکھتی کبھی مختلف سلسلے خصوصاً شاعری کے سلسلے، نظمیں، غزلیں وغیرہ کیونکہ میں خود شاعرہ ہوں اور ان سلسلوں میں شمولیت کرتی رہتی ہوں، مجھے یاد ہے شادی سے پہلے میری کئی غزلیں پاکیزہ کی زینت بنی ہیں اور وہ رسالے میں نے خرید کے چھپا کے الماری میں رکھے ہوئے تھے اور کبھی، کبھی ان کو کھول کر اپنی چھپی ہوئی غزلیں دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ شادی کے بعد جب میکے آئی تو الماری سے رسالے غائب تھے وہ چھوٹی بہنوں نے ردی کی نذر کر دیے تھے، اس کا بہت افسوس ہے وہ اب میرے پاس نہیں...... نگہت عبداللہ، تسنیم قریشی، انجم انصار اور شازیہ چوہدری کی کہانیوں کا انتظار رہتا تھا۔

3۔ پاکیزہ میں مقصدی کہانیاں اور افسانے شائع ہوتے ہیں جن سے ہماری ذہنی تعلیم و تربیت ہوئی، اچھے برے کی پہچان ہوئی، زندگی کے کئی مسائل کا حل ہمیں ان کہانیوں کے ذریعے ملا جو موقع محل کے مطابق ہوتی تھیں علاوہ ازیں انجم انصار کی پُرخلوص محبت پاکیزہ پڑھنے پر مجبور کرتی رہی حالانکہ لوگ کہتے تھے کہ پاکیزہ



کی کہانیاں اتنی رومانی نہیں ہوتیں تاہم مجھے تو پاکیزہ ایک دوست اور رہنما لگا جس نے قدم، قدم پر میری رہنمائی کی، یہ الگ بات کہ زندگی کی مصروفیات میں سے میں اس کے لیے وقت نہ نکال سکی، اتنا وقت جتنا ایک دوست کا حق ہوتا ہے۔

☆صائمہ پرویز...... کراچی

1۔ 1998ء میں سیدہ غزالہ عالم جو کہ پاکیزہ کی قاری تھی کسی محفل میں ان سے دوستی ہوئی اور انہوں نے مجھے پاکیزہ پڑھنے کو دیا اور اس کے بعد سے پاکیزہ ایسے دل کو بھایا کہ کچھ عرصہ بچھڑنے کے بعد بھی میں آج پھر آپ سب کے ساتھ ہوں۔

2۔ تمام رسالوں میں سب سے زیادہ خوب صورت اور بہت زیادہ سلسلے والا رسالہ ہے، رسالے کی شروعات ہی بہت خوب صورت انداز میں ہوتی ہے۔ اس میں پانچ نہیں بہت ساری خصوصیات ہیں۔ بہنوں کی محفل مجھے سب سے زیادہ پسند ہے، ایسا لگتا ہے کہ سب بہنیں ایک ہی گھر کا حصہ ہیں، سلسلے تو ہیں ہی لاجواب، مصنفات میں سے عالیہ حرا، رضوانہ پرنس، صائمہ اکرم، فائزہ افتخار کے افسانے لاجواب ہوتے ہیں۔ میں اکثر گنگناتی ہوں، پاکیزہ ڈائری دل کو بہت بھاتی ہیں۔

3۔ پاکیزہ ہمارا بہترین دوست ہے، ہمیں کبھی بور نہیں ہونے دیتا۔ اس میں کہانیاں سبق آموز ہوتی ہیں، کسی بھی بہن کو کوئی دکھ ہوتا ہے وہ دکھ اگر ہم کسی اور سے نہیں کہہ سکتے تو ہم اپنے پیارے پاکیزہ کی پیاری آپی سے کہہ کر اپنے دکھ کو ہلکا کر لیتے ہیں، یوں پاکیزہ ہمارا ناصح اور ساتھی ہے، اللہ تعالیٰ پاکیزہ کو بہت ساری خوشیاں ملیں، آمین......

☆شازیہ سرفراز...... کراچی

انداز بیاں گرچہ میرا شوخ نہیں ہے
شاید کہ تیرے دل میں اتر جاتے میری بات

میں، مجموعی طور پر پاکیزہ سے تعارف اور پھر اس سے کیا کیا سیکھا بتاؤں گی۔

پاکیزہ سے دلی طور پر بیس بائیس سالوں سے وابستہ رہی ہوں، لکھنے اور پڑھنے اور خریدنے میں بیچ میں گیپ بھی آئے۔ مجھے پاکیزہ کے حوالے سے انجم انصار کا نام حفظ رہا اور اس کے ساتھ عذرا رسول کا بھی۔ آمنہ حماد بھی آپ لوگ کا ایک خاص حصہ اور معاون ہیں۔ ان کی بھی بہت محنت ہے اور اب نزہت اصغر آپ سے تعارف ہوا اب پاکیزہ کی ڈور آپ کے ہاتھ میں ہے۔ انجم کے بعد بہنوں کو اکٹھا رکھنے کی ذمے داری بہت بھاری آپ کے سپرد کی گئی ہے۔



پاکیزہ فروری 18ء کا ایسا تھا کہ دل بے قرار



www.bookspk.site

ہوگیا کہ اپنے جذبات کو کاغذ پر ڈال دوں۔ مگر گھر کی ذمے داریوں سے زیادہ بچوں کی مصروفیات ہیں۔ عورت کو ماں بن کر زندگی مشین ہوجاتی ہے اپنی ذات یا اپنے مشاغل کے لیے وقت نکالنا بہت بھاری پڑ جاتا ہے۔ میرے بچے ماشاء اللہ پوزیشن ہولڈر ہیں۔ اسکول سے آنے کے بعد میں بچوں کی ہر بات سنتی ہوں وہ ہر بات شیئر کرتے ہیں، ان کو بھی عادت پڑ گئی ہے جب تک چھوٹی، چھوٹی بات مجھے اسکول کی نہ بتائیں چین نہیں ملتا۔ (یہی تو ضروری ہے) ضرورت پڑنے پر میڈم اور ٹیچرز سے بات کرتی ہوں، غلطیاں درست کرواتی ہوں شاید یہی وجہ ہے کہ دو سال سے مجھے ریگولر بیسٹ مدر کا سرٹیفکیٹ ہال میں اینول فنکشن میں ملا ہے جس کا آپ بھی ایک ماں ہونے کے ناتے اندازہ لگا سکتی ہیں کہ کتنا میرے لیے باعثِ فخر ہوتا ہوگا۔ میرے لیے اپنا انٹروڈکشن کرانا بھی ضروری ہے کیونکہ آپ سے پاکیزہ سے آگے بھی اپنا تعلق برقرار رکھنا ہے، یہ سمجھیں کہ زندگی کے ان 39 سالوں میں اب اپنی ذات کے نام پر بس یہ ایک ہابی ہے کہ ڈائجسٹوں سے ناتا اور قلمی ناتا پاکیزہ کے ساتھ۔

میرے ابو مرحوم جب مجھے جذبات میں آکر آرٹیکل لکھتے دیکھتے تو کہتے تھے یہ جرنلسٹ بنے گی، بس ان کی اس حوصلہ افزائی سے میرا قلم سے ناتا اتنا مضبوط ہوگیا کہ جو بات زبان کا سلیقہ طے کر کے پہنچا نہیں پاتی وہ قلم بہ آسانی کر دیتا تھا۔ کسی کے گھر میں لڑائی جھگڑے ہوں، کوئی لڑکی محلے میں بدنام ہو، میں سب کو سدھارنے کے چکر میں خاموش اور بے نام اجنبی بن کر ان کے گھر میں اپنا لفافہ ڈال آتی تھی، آج بھی اپنے بچوں کو جب یہ باتیں بتاتی ہوں تو اپنے کارناموں پر ہنسی بہت آتی ہے۔ اپنے ابو کے بارے میں تو پہلے بھی لکھ چکی ہوں جو آپ نے پاکیزہ میں چھاپا تھا۔

جب چھوٹی بہن تین ماہ کی تھی تو امی کا ٹی بی میں انتقال ہوگیا۔ بڑے دو بہن، بھائی وقت کی خاطر بڑے بن گئے۔ پہلی امی کو دیکھا نہیں ہوش میں، دوسری امی اتنی اچھی آئیں کہ سگی ماں کو بھول ہی گئے۔ آج بھی انہی اسٹیپ مدر کی اپنے بچوں کو جب باتیں بتاتی ہوں تو فخر ہوتا ہے اور افسوس بھی کہ جتنا انہوں نے کیا اور دیا ہم کچھ نہیں دے پائے مگر والدین اور بزرگوں کے جانے کے بعد غلطیوں پر افسوس اور خالی پچھتاوے رہ جاتے ہیں۔ گزرا وقت لوٹ کر نہیں آسکتا سوائے اس کے کہ اپنی نئی نسل کی پرورش اچھے ماں، باپ بن کر کریں کیونکہ آج کی بھاری ذمے داری اپنی اولاد کو بے راہ روی اور گندے ماحول سے دور رکھنا ہے۔ اور یہی عقل و شعور پاکیزہ کی کہانیوں سے سیکھا۔ میرے ابو کا مطالعہ اتنا زیادہ تھا کہ گھر میں کتابوں کا خزانہ جمع تھا، آج بھی ان کی یادوں کے نام پر محفوظ ہے۔ میں نے اپنے بچوں میں خاص کر رسالے کا شوق ابھارا ہے تاکہ ان کو بھی ان چیزوں سے محبت رہے۔ میرے بچوں کی ڈرائنگ، مصوری چھپتی رہتی ہے۔ بچوں کے رسالے میں۔ میں بھی پاکیزہ کی بہنوں میں اپنا نام اور مقام رکھنا چاہتی ہوں۔ (جی آپ تو ہیں ہی پاکیزہ کی ساتھی)

اب میں آپ سے اصرار تو نہیں کروں گی کہ مجھے جگہ ملے گی ان دو ماہ کے اندر بہنوں کی محفل یا سروے میں...... کیونکہ ہمیں صرف کوشش اور محنت کرنی ہے۔ فیصلہ کرنا آپ لوگوں پر ہے۔ پاکیزہ خواتین کا ایک معیاری رسالہ ہے۔ اس میں لکھنے والی ساری ہماری اپنی بہنیں ہیں، ایک دوسرے کا دکھ درد سمجھتی ہیں۔ غرضیکہ پاکیزہ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

☆نگہت آصف...... لاہور

1۔ پاکیزہ سے تعارف کی کہانی تو ہماری پیدائش سے پہلے کی ہے وہ اس طرح کہ ہمارے خاندان کی خواتین کا پسندیدہ رسالہ رہا اب تو اس کو چھیالیس، سینتالیس سال ہوگئے ہیں، ہم نے بھی شعور کی منازل طے کیں تو پاکیزہ کو اپنے گرد پایا بلکہ گھر کے بڑے تو جاسوسی اور سسپنس بڑے شوق سے پڑھتے تھے اور ہم اس پر بنی ہوئی حسیناؤں کو دیکھتے رہتے مگر پستول سے ڈر لگتا تھا۔

2۔ پانچ باتیں تو بہت کم ہیں نزہت آپی دراصل اس سے ہی سب کچھ سیکھتے ہیں، میں تو کہتی ہوں اگر کوئی سیکھنا چاہے تو پاکیزہ میں چھپے لفظ، لفظ میں سبق ہے،



ہدایت ہے اور ایک اچھے راستے کی طرف قدم ہے۔ میں تو کہتی ہوں آج کل کے چوتھی، پانچویں کے بچوں کو بھی اتنی سمجھ آجاتی ہے اور پھر موبائل کا دور ہے تو پھر بچیوں کو رسالے پڑھنے سے کیوں روکا جاتا ہے جبکہ پاکیزہ جیسا ڈائجسٹ تو ان کی ہر قدم پر رہنمائی کرتا ہے۔

3۔ پاکیزہ کی اچھی باتیں، نصیحتیں اور باتوں، باتوں میں ہی سبق دینے کا عمل اس سے نزدیکی کا باعث بنا، میرے تو خیر سے بیٹے ہیں مگر میں تو اپنی اسٹوڈنٹس کو بھی پاکیزہ پڑھنے کا مشورہ دیتی ہوں کہ اس میں آج کے دور کے حساب سے سب کچھ تو شامل ہے تو یہ ہمارا ہر طرح سے دوست بھی ہے اور استاد بھی ہے۔ آپ کی پوری ٹیم کے لیے ڈھیروں دعائیں......

☆راشدہ عفت احمد مطیع...... جرمنی

میں بتانا چاہتی ہوں کہ میں 2000ء سے پاکیزہ پڑھ رہی ہوں۔ سنگ سنگ چلیں پاکیزہ کے...... اس سلسلے کے لیے آپ نے لکھا ہے کہ کسی پرانے پاکیزہ کی فوٹو بھی روانہ کرسکتے ہیں دراصل پرانے پاکیزہ شفٹنگ کے باعث خراب ہوگئے تھے۔ لیکن میں عرض کرنا چاہتی ہوں کہ پاکیزہ مجھے بے حد پسند ہے۔

پاکیزہ کی مصنفات مثلاً محترمہ صائمہ اکرم چوہدری صاحبہ کے کئی افسانے، کہانیاں مثلاً کالا شاہ کالا اور جنجوعہ ہاؤس تو تین بار پڑھ چکی ہوں اور وہ رسالہ ابھی تک میرے پاس ہے۔ وہ اکتوبر 2015ء کا پاکیزہ ہے۔

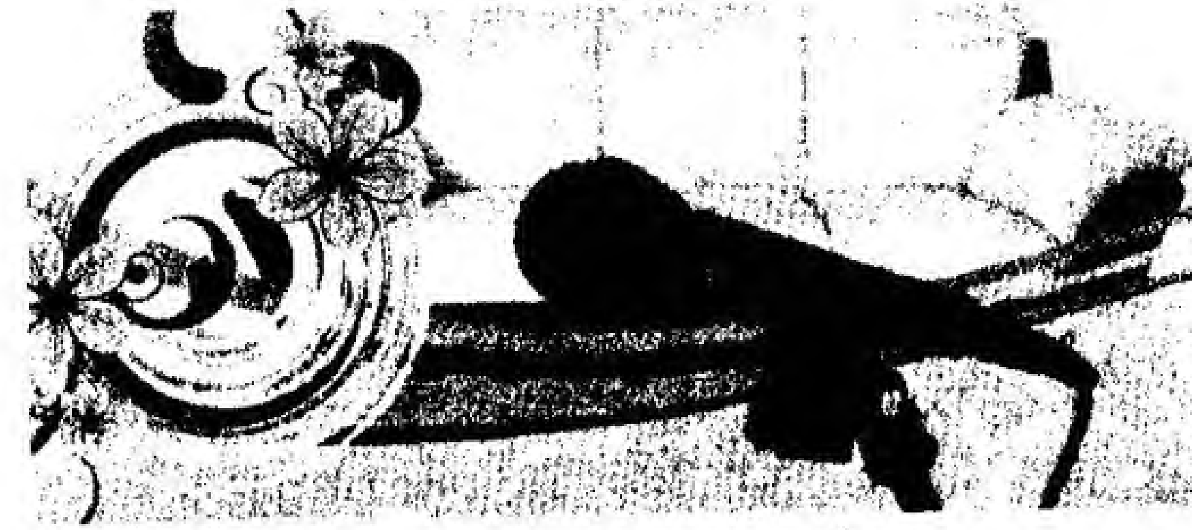
اسی طرح محترمہ شیریں حیدر صاحبہ کا کس کی شادی اور چندا کا شیری، نایاب جیلانی صاحبہ کا ترک وفا، رضوانہ پرنس صاحبہ کا اک نئے موڑ پر......

میرے دل میں ماہنامہ پاکیزہ کے لیے بہت قدر اور محبت ہے، محترمہ رفعت سراج صاحبہ کا امانت...... گویا کہ میں سنگ سنگ چل رہی ہوں پاکیزہ کے، 2011ء میں، میں سیڑھیوں سے گر گئی تھی اس لیے میرا چوٹ لگنے سے دایاں جسم کا حصہ مفلوج ہوگیا ہے اور میں اب وہیل چیئر پر ہوں...... look after کے لیے دن میں پانچ بار نرسیں گھر آتی ہیں۔

میری بوریت دور کرنے کے لیے پاکیزہ میرے لیے بہت ضروری ہے۔ خداتعالیٰ کے فضل سے میں نماز، قرآن پاک کی پابند ہوں، پاکستان میں پرائمری اسکول ٹیچر تھی (زمانہ گزر گیا ہے اب تو) میری ماشاءاللہ... چار بیٹیاں ہیں اور ماشاء اللہ نواسے، نواسیاں ہیں خداتعالیٰ ان کو سلامت رکھے اور صحت والی لمبی زندگی دے آمین......

فی امان اللہ...... والسلام آپ کی سات سمندر پار ایک قاری......

☆☆☆



پاکیزہ کے مہمان

شائستہ زریں



پری پیکر، وضع دار، مہذب، ملنسار اور اداکاری میں طاق

نامور فنکارہ لیلیٰ زبیری سے دلکش گفتگو

جانے غالبؔ نے کس کے لیے کہا تھا کہ
سادگی و پُرکاری بے خودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں جراَت آزما پایا
لیکن ہماری پاکیزہ کی مہمان پر یہ شعر صد فصد صادق آتا ہے۔ حُسنِ صورت اور حُسنِ سیرت سے مزین آپ کی شخصیت بہت دلنواز ہے۔ تقریباً چار عشروں سے آپ پاکستان کے ٹی وی ڈراموں میں اپنے فن کا لوہا منوا رہی ہیں۔ آپ کی اداکاری شروع سے ہی متاثر کُن

رہی اور اب تجربے کی بھٹی میں تپ کر کُندن بن چکی ہے۔ اپنی ظاہری و باطنی خوبیوں سے بے نیاز نہایت سادہ طبیعت کی مالک لیلیٰ زبیری اپنی ذات میں انجمن ہیں۔

اگرچہ ہماری مہمان لیلیٰ صاحبہ نے انٹرویو کے لیے فوری ہامی بھر لی تھی لیکن آپ کے شوٹس اور پھر دبئی کے سفر نے وقت لگا دیا اور بالآخر اپنی نجی و فنی اور رمضان المبارک کی شب وروز کی مصروفیات کے باوجود نہایت خوش دلی سے انہوں نے حسبِ وعدہ پاکیزہ کو شرفِ میزبانی بخش ہی دیا۔

پاکیزہ ✧......سب سے پہلے تو یہ بتائیں آپ کا شمار کیسی بچیوں میں ہوتا تھا...... پڑھاکو، کھلنڈری، شرارتی، خاموش طبع، جھگڑالو؟

لیلیٰ زبیری ❖...... پڑھنے کی شوقین تھی لیکن بہت کھلنڈری ہوا کرتی تھی۔ گڑیوں سے کھیلنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ کہانیاں پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا اور پھر یہی شوق میرا مشغلہ بن گیا۔

پاکیزہ ✧......ریڈیو تک رسائی کیسے ہوئی؟

لیلیٰ زبیری ❖......پاپا ریڈیو پاکستان سے منسلک تھے۔ پاپا کو دیکھ کر ہی ریڈیو پروگرام کرنے کا شوق ہوا... پاپا سے کہا تو انہوں نے کہا کہ آڈیشن دے دو۔

پاکیزہ ✧......آڈیشن کس نے لیا تھا؟ آڈیشن کے دوران جمیل زبیری صاحب کی صاحبزادی ہونے کی حیثیت سے رعایت کی گئی تھی؟

لیلیٰ زبیری ❖......ممتاز صداکار ایس ایم سلیم صاحب نے آڈیشن لیا تھا۔ پاپا نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ نہ بتانا تم کس کی بیٹی ہو؟ چنانچہ ہم نے آڈیشن سے پہلے بتایا ہی نہیں اور جب آڈیشن ہو گیا، اور ہم کامیاب ہو گئے تب بتایا۔

پاکیزہ ✧......واہ! آپ کی کامیابی پر جمیل زبیری صاحب کے تاثرات کیا تھے؟

لیلیٰ زبیری ❖......ہماری کامیابی پر پاپا بہت خوش ہوئے اور سب سے بڑھ کر خوشی تو یہ تھی کہ ہم نے یہ کامیابی اپنے بل بوتے پر حاصل کی' پاپا کے کام اور نام کے طفیل نہیں۔

پاکیزہ ✧...... بزمِ طلبا کے حوالے سے کوئی ایسا پروگرام جس میں آپ کی صلاحیتوں کو بہت سراہا گیا؟

لیلیٰ زبیری ❖...... بزمِ طلبا میں ا ں زمانے میں جشنِ طلبا ہوا کرتا تھا اور میں نے اس میں صہ لیا۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ سارے ڈرامے طلبا ہی نے لکھے، طلبا



لیلیٰ زبیری اپنی پیاری بیٹیوں اور نواسیوں کے ہمراہ

ہی نے ڈائریکٹ کیے اور طلبا ہی نے ایکٹ کیا اس میں مجھے فی میل آرٹسٹ کا اول انعام ملا تھا۔

پاکیزہ ✧...... ماضی میں ریڈیو کی کمرشل سروس سامعین میں بہت مشہور و مقبول تھی۔ آپ بھی کمرشل سروس کے کسی پروگرام کا حصہ بنیں؟ اور اس کے علاوہ بھی کون، کون سے پروگرام تھے؟

لیلیٰ زبیری ❖...... ریڈیو کی کمرشل سروس میں ایک پروگرام ہوا کرتا تھا۔ ''پوممیاں کے یہاں'' اس میں میں پوممیاں کا کردار کرتی تھی۔ ہر ہفتے وہ پروگرام ہوا کرتا تھا۔ اس میں خط نکالا کرتے تھے اور اس پر انعام ملا کرتا تھا۔ اس میں غزالہ رفیق مرحومہ میری والدہ بنتی تھیں اور فاطمہ خانم میری نانی بنتی تھیں۔ میں نے ریڈیو کے بہت



ایک ڈرامے میں بلوچی لڑکی کے کردار میں لیلیٰ زبیری

سارے پروگراموں میں حصہ لیا اسکول براڈ کاسٹ سے لے کر بچوں کا پروگرام، اسٹوڈیو نمبر ۹، کہکشاں اور کمرشل سروس کے پروگرام سب ہی میں حصہ لیا۔

پاکیزہ ✧...... ٹی وی سے وابستگی کیسے ہوئی؟ پہلا ٹی وی ڈراما کون سا تھا؟ ساتھی فنکار کون تھے؟

لیلیٰ زبیری ❖...... جب ٹی وی نیا، نیا آیا تو ریڈیو سے بہت سارے لوگ ٹی وی پر چلے گئے۔ چونکہ پاپا سے ان کی جان پہچان تھی تو انہوں نے اپنے ایک پروگرام میں شامل کیا۔ بچوں کا ایک ڈراما تھا جس میں میں پری بنی تھی۔ بچپن میں، میں نے ٹی وی پر کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کیا۔ اس وقت میں رجسٹرڈ نہیں ہوئی تھی۔ میرا اصل کیریئر شادی کے بعد شروع ہوا۔ میرا پہلا ٹی وی ڈراما 1985ء میں ہوا تھا اس کا نام آبرو تھا، یہ ایک کردار سیریز تھی۔ اس میں میرے ساتھ ایوب کھوسہ تھے۔

پاکیزہ ✧...... بچپن کے بعد کافی طویل مدت کے بعد ٹی وی اسکرین پر نظر آئیں...... بھلا کیوں؟

لیلیٰ زبیری ❖...... میرے دادا نے کہا بچی بڑی ہو رہی ہے۔ اب اس کو زیادہ ٹی وی پر بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پڑھائی کی طرف سے اس کا دھیان ہٹ جائے گا۔ یوں میں نے ٹی وی پر جانا بند کر دیا۔

پاکیزہ ✧...... ماضی اور حال کے ڈراموں میں بنیادی فرق کیا محسوس کرتی ہیں؟

لیلیٰ زبیری ❖...... پہلے ڈراموں کی کہانی بہت زبردست اور حقیقت پر مبنی ہوا کرتی تھی۔ کردار بھی حقیقی ہوتے تھے۔ آج کا ڈراما تکنیکی اعتبار سے بہت بہتر ہے اور اس میں بہت زیادہ گلیمر بھی ہے۔ کیونکہ پہلے اتنا گلیمر نہیں ہوتا تھا۔ آج مضبوط اسکرپٹ کی کمی ہے۔ پہلے پروفیشنلزم زیادہ تھا اور اب کمرشل ازم زیادہ ہو گیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا فرق ہے۔

پاکیزہ ✧...... کیا بات ڈرامے کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے؟

لیلیٰ زبیری ❖...... ڈرامے کی کامیابی میرے خیال میں اب ریٹنگ ہے (بے ساختہ ہنسی) جس ڈرامے کی ریٹنگ زیادہ آ رہی ہے وہی اچھا ڈراما ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن بہرحال آج کل ڈرامے کو ایسے ہی دیکھا جاتا ہے۔



لیلیٰ زبیری اپنے ہم سفر طارق زبیری کے ہمراہ

پاکیزہ ✧...... آج کے ڈرامے میں عورت کو بہت مظلوم کیوں دکھایا جاتا ہے؟

لیلیٰ زبیری ❖...... ہمارے ڈائریکٹرز اور پروڈیوسرز کا کہنا ہے کہ جب عورت پر ظلم دکھایا جاتا ہے۔ جب روتی دھوتی عورت دکھائی جاتی ہے تو اس ڈرامے کی ریٹنگ زیادہ ہوتی ہے۔

پاکیزہ ✧...... کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

لیلیٰ زبیری ❖...... بالکل بھی نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ جیسے حسینہ معین کے ڈرامے ہوتے تھے جس میں ہلکی پھلکی کامیڈی بھی ہوتی تھی اور ساتھ، ساتھ سنجیدہ سی بات بھی ہوتی تھی۔ تو ایسے ڈرامے مجھے بہت پسند تھے۔ اور ٹی وی دیکھنے والے جتنے بھی لوگ ہیں سب بہت زیادہ پسند کرتے تھے در اصل ٹیلی ویژن لوگوں کا معیار تبدیل کر سکتا ہے۔ جو آپ دکھائیں گے ناظرین کا وہی ٹیسٹ ڈیولپ ہو جاتا ہے اور وہ ایسے ہی ڈرامے پسند کرتے ہیں۔ رجحان میں واضح تبدیلی آئی ہے۔ اب پہلے جیسے ڈرامے نہیں بنتے۔ بہرحال آج بھی میں ان ڈراموں کو یاد کرتی ہوں اور ان کی کمی بھی محسوس کرتی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... ڈرامے کی ریہرسل کے حوالے سے بھی کافی تبدیلی آگئی ہے۔ آپ کے خیال میں کون سا طریقہ زیادہ بہتر ہے؟

لیلیٰ زبیری ❖...... پہلے پانچ، پانچ دن تک ریہرسل ہوتی تھی۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ مکالمے بہت اچھی طرح یاد ہو جاتے تھے اور مکالمے ازبر ہوتے تھے تو پرفارم کرتے وقت ایسا لگتا جیسے آپ اپنے ہی جملے بول رہے ہیں لکھے ہوئے نہیں۔ دیگر یہ کہ تمام کاسٹ کے ساتھ اچھی ذہنی ہم آہنگی ہو جاتی تھی۔ ایک کیمسٹری بن جاتی تھی۔ سب ایک فیملی کی طرح ہو جاتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ بہت جلدی ریکارڈنگ ہو جاتی تھی مگر اب نہ تو فنکاروں اور نہ ہی ڈائریکٹرز کے پاس ریہرسل کا وقت ہوتا ہے۔ سب ہی بہت زیادہ مصروف ہو گئے۔ پہلے ہم ایک وقت میں ایک ہی ڈراما کیا کرتے تھے۔ اب ایک وقت میں کئی، کئی ڈرامے کرنے پڑتے ہیں۔ اس حساب سے ریہرسل کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔ یہ فرق پڑا ہے۔ وہ دور میں بہت یاد کرتی ہوں شاید یہی وجہ تھی کہ اس وقت اپنے کام پر بہت توجہ دی جاتی تھی۔ اور یہ ہونا بھی چاہیے۔

پاکیزہ ✧...... وہ کردار جو آپ نے بہت دل سے کیا اور وہ جو بہت بے دلی سے کیا؟

لیلیٰ زبیری ❖...... ویسے تو میں جو بھی کردار کرتی ہوں بہت دل سے کرتی ہوں اور صرف کردار ہی نہیں بلکہ ہر کام دل لگا کر ہی کرتی ہوں ورنہ نہیں کرتی۔ البتہ ایک کردار جو مجھے پسند آیا اور کرنے میں بھی مزہ آیا تھا

ڈراما ''خاکجا'' تھا جس میں میں نے ایسی لڑکی کا کردار کیا تھا جو کچرے سے چیزیں چنتی تھی۔ اس کے علاوہ ''آشوب'' میں میں نے آرمی ڈاکٹر کا کردار کیا تھا۔ وہ بھی مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ اور بے دلی سے تو نہیں کہہ سکتے مگر ہاں جو کردار کر کے مجھے اتنی خوشی نہیں ہوئی تو وہ تھا ''راول جگنو'' میں جگنو کا کردار۔ حالانکہ وہ میں نے تین چار سال بعد کوئی ڈراما کیا تھا۔ ملبوسات، میک اپ اور گرمی پھر مشکل حالات میں کام کیا۔ گاؤں سا آباد کیا تھا وہاں ہماری ریکارڈنگ ہوتی تھی۔ ہیرو کی عدم موجودگی میں اکیلے میں رومینٹک مکالمے بولنے پڑتے تھے۔ مجھے بہت مشکل پیش آئی تھی اور پھر وہ اتنا اچھا بھی نہیں گیا تھا بالکل بھی مزہ نہیں آیا۔

پاکیزہ ✧......منفی کردار آپ پر سجتے نہیں لیکن آپ نے کیے۔ تب ناظرین کا کیا ردِعمل سامنے آیا؟

لیلیٰ زبیری ❖......منفی کرداروں میں نے بہت زیادہ نہیں کیے۔ پھر بھی کیے ضرور مگر ہلکے پھلکے۔ میری بڑی خواہش ہے کہ منفی کردار کروں کہ اس میں پرفارمنس کا زیادہ مارجن ہوتا ہے۔ لیکن ڈائریکٹرز کہتے ہیں ''آپ اتنی پوزیٹو لگتی ہیں کہ آپ پر منفی کردار اچھا نہیں لگے گا۔'' جن کرداروں میں منفی رنگ کا محض ٹچ ہی تھا اسے بھی لوگوں نے مجھ پر پسند نہیں کیا۔ ایک کردار تھا میرا جس میں میری بیوہ دیورانی کسی سے بات کر رہی ہوتی ہے، میں سمجھتی ہوں وہ کوئی غلط کام کر رہی ہے تو میں اپنی ساس کو اس کی بات سنوا دیتی ہوں۔ جب یہ ڈراما ٹی وی پر آیا تو اس کے بعد ایک صاحب مجھے مارکیٹ میں ملے اور انہوں نے مجھے اتنا ڈانٹا کہ ''آپ کو شرم نہیں آئی ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی'' میں سن کر پریشان ہوگئی کہ میں نے ایسی کیا حرکت کر ڈالی تو کہنے لگے ''آپ نے اپنی دیورانی کی بات سنوا دی۔'' تب میں ہنسنا شروع ہوگئی بھئی وہ تو ڈرامے میں لکھا تھا میں نے پرفارم کر دیا۔ کہنے لگے۔ ''پلیز آپ اس طرح کے کردار نہ کیا کیجیے آپ پر بالکل نہیں جچتے۔''

پاکیزہ ✧......آپ کے خیال میں اداکاری آسان کام ہے یا مشکل......مگر کیسے؟

لیلیٰ زبیری ❖......اداکاری بہت مشکل کام ہے کہ آپ کو اپنی ذات کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ اس کو ختم کر کے ایک نیا کردار کرنا پڑتا ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ آسان کام نہیں ہوتا۔ کیونکہ خود کو اس کردار میں ڈھالے بغیر اچھی اداکاری نہیں ہوسکتی۔ اگر میں کوئی کردار کر رہی ہوں اور لوگوں کو لگ رہا ہے کہ میں وہ کردار نہیں، لیلیٰ زبیری ہوں تو یہ میری ناکامی ہے۔ اس طرح سے مشکل تو ہوتا ہے لیکن اچھا فنکار وہی ہے جو اپنے کردار میں ڈھل جائے۔ اب تو خیر ایک وقت میں کئی ڈرامے ہوتے ہیں اس لیے یہ ممکن نہیں ہاں جب ایک وقت میں ایک ہی ڈراما ہوتا تھا ناں تو میں اسی کردار میں رہنا شروع کر دیتی تھی۔ گھر آنے کے بعد بھی میں اپنے آپ کو وہی محسوس کر رہی ہوتی تھی۔

پاکیزہ ✧......آپ اپنے فن کا سب سے بڑا نقاد کسے تسلیم کرتی ہیں؟

لیلیٰ زبیری ❖......میرے فن کے سب سے بڑے نقاد پہلے میرے پاپا تھے، نہایت باریک بینی سے رہنمائی کرتے تھے۔ کہاں صحیح کیا، کہاں غلط کیا۔ حتیٰ کہ جب میں شوز میں جاتی تھی تو کہتے تھے اتنا ہنستی کیوں ہو؟ اتنا مت ہنسا کرو بات سمجھ میں نہیں آتی۔ میری رہنمائی کرتے رہتے جو مجھے بہت اچھی لگتی۔ اور جب پاپا میری اداکاری کی تعریف کرتے تو مجھے بہت خوشی ہوتی اور صحیح معنوں میں لگتا کہ میں نے اچھا کام کیا۔ کیونکہ میرے لیے پاپا کی تعریف بہت اہم تھی۔ پاپا کے بعد میرے شوہر طارق بڑی عمدگی سے میری رہنمائی کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧......ذاتی پروڈکشن ہاؤس کا خیال کیسے آیا؟

لیلیٰ زبیری ❖......میں اسلام آباد میں رہتی ہوں اور وہاں نہ ہونے کے برابر ڈرامے بن رہے ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو کہ کام کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کو موقع نہیں ملتا۔ اس وجہ سے مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ اپنا پروڈکشن ہاؤس کھول لوں۔ الحمدللہ میں نے کام شروع کیا اور کافی کام کیا، بہت سارے لوگوں کو موقع دیا۔



پاکیزہ ✧......اس کے تحت کون، کون سے ڈرامے پیش کیے؟

لیلیٰ زبیری ❖...... شروع میں لانگ پلے کیے۔ میرے پہلے ڈرامے کا نام تھا جیسمین۔ اس کے بعد میں نے ''آپ کو کیا تکلیف ہے'' کیا...... یہ sitcom تھا اور سال بھر پی ٹی وی پر چلا اور بہت زیادہ پاپولر ڈراما تھا۔ اب کچھ لوگ اس کو دوبارہ بنوا رہے ہیں۔ میرا رائٹر ہی ان کے لیے لکھ رہا ہے اور وہی چیز لکھ رہا ہے مجھے افسوس ہے کہ انہوں نے ڈرامے کا نام بھی وہی رکھا ہے جو میرے ڈرامے کا تھا اور اسٹوری بھی اسی طرح کی ہے۔ حالانکہ وہ میرا ڈراما تھا جو آج بھی میری پراپرٹی ہے اور میں جب اور جہاں چاہوں چلا سکتی ہوں کہ اسے میں نے بیچا نہیں تھا۔ ٹائم لے کر چلایا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے مسٹر اینڈ مسز منسٹر کیا تھا۔ ایک سیریل کیا تھا جو پی ٹی وی پہ چلا اور ایک سیریز بھی چہرے کے نام سے وہ بھی پی ٹی وی پر چلی۔ ایک ہم پہ بھی چلا اس کے علاوہ کچھ اور بھی لانگ پلیز کیے۔

پاکیزہ ✧...... پروڈکشن بہت بڑی ذمّے داری ہے۔ یہ مشکل مرحلہ کرنے میں کن کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا؟ اور تجربہ کیسا رہا؟

لیلیٰ زبیری ❖......میں نے کام کیا اور بہت سارے لوگوں کو موقع بھی دیا لیکن اب ذرا سا مشکل ہو گیا۔ کیونکہ زیادہ تر فنکار کراچی میں ہیں جو اپنی فنکارانہ مصروفیت کی وجہ سے وقت نہیں نکال پاتے اور ڈراما بیچنے کے لیے مشہور و معروف نام چاہیے ہوتے ہیں تو دو تین تو کراچی سے بلانے ہی پڑتے ہیں۔ اور پروڈکشن وقت بہت مانگتی ہے۔ تجربے سے ثابت ہوا پروڈکشن آسان کام نہیں۔ محض فنکار ہی نہیں بہت سارے لوگ پروڈکشن میں ہوتے ہیں۔ سب کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ ایک ہی وقت میں سب کا خیال رکھنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ بہر حال ملا جلا تجربہ رہا۔

پاکیزہ ✧......شوٹس کے لیے کیے جانے والے سفر کبھی گراں گزرے؟

لیلیٰ زبیری ❖......شوٹس کے لیے سفر تو بہت کرنا پڑتا ہے کہ میں اسلام آباد میں رہتی ہوں جہاں اب کام نہیں ہوتا اس لیے شوٹس کے لیے اکثر کراچی جانا ہوتا

ہے۔گرمی میں کراچی کا سفر بہت گراں گزرتا ہے کہ اسلام آباد کا اچھا موسم چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔

پاکیزہ✧......ڈراموں کی شوٹنگ کے دنوں میں معمولاتِ زندگی متاثر ہوتے ہیں؟ آپ کس طرح وقت کو متوازن رکھتی ہیں؟

لیلیٰ زبیری ❖......ہر کام کے لیے ٹائم مینجمنٹ بہت ضروری ہے ۔خاص طور پر ہمارے کام میں کہ ہمارے ٹائمنگز بہت زیادہ ہوتے ہیں صبح دس بجے سے رات دس بجے تک اور کبھی ،کبھی تو اس سے بھی زیادہ تاخیر ہوجاتی ہے۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں بہت زیادہ کام نہیں کرتی۔ بہت منتخب کام کرتی ہوں۔جب مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میری بیٹی، امی ،نندیں یا اور کوئی مہمان وغیرہ میرے گھر ٹھہرنے کے لیے آئیں گے تو ان دنوں میں کوئی پروجیکٹ سائن نہیں کرتی۔

پاکیزہ✧......فلم میں کام کرنے کی جانب توجہ کس نے دلائی؟ اور کتنا کام کیا اب تک؟

لیلیٰ زبیری ❖......کبھی سوچا نہیں تھا۔شروع شروع میں بہت آفرز آئیں پھر جب شارجہ کپ کے لیے گئی تھی تو راج کپور صاحب نے فلم میں کام کرنے کو کہا تھا۔اس وقت تو میں نے یہی کہا تھا کہ فلم میں کام نہیں کرنا ۔یہاں سے بھی پیشکش ہوئی لیکن میں نے منع کردیا لیکن اب ایسی فلمیں بنی شروع ہوئی ہیں جو معیار کے لحاظ بہت بہتر ہیں اور پھر یہ کہ میں نے جو پہلی فلم سائن کی اس میں سارے ٹیلی ویژن کے لوگ ہیں اور اسی اسٹائل سے کام ہورہا ہے تو اسی وجہ سے دل چاہ رہا ہے کہ میں بھی کام کروں۔

پاکیزہ✧......اور اب چند باتیں نجی زندگی کے حوالے سے ہوجائیں کچھ اپنے والدین کے بارے میں بتائیے؟

لیلیٰ زبیری ❖......آج میں جہاں ہوں اپنے والدین کی وجہ سے ہوں۔پاپا کی وجہ سے میں اس فیلڈ میں آئی کہ ان کو دیکھ کر ہی شوق ہوا ریڈیو پر جانے کا اور پھر وہاں سے ٹی وی تک رسائی ہوئی۔پاپا آرٹسٹ آدمی تھے،قلمکار تھے۔میری امی بہت صابر عورت ہیں۔انہوں نے ہماری یعنی میری اور میری بہن بیلا کی بہت اچھی پرورش کی ۔اور ہمیں پیار کرنا اور صبر کرنا سکھایا۔اور امی کی اسی تربیت کی وجہ سے ہی میرے اندر اتنی برداشت ہے لوگ کہتے ہیں آپ ہر وقت مسکراتی رہتی ہیں یہ چیز میں نے اپنی امی سے سیکھی۔ پاپا تو اس دنیا میں اب نہیں ہیں لیکن ان سے متعلق جو بھی لوگ ہیں سب ہی ان کی بہت زیادہ تعریف کرتے ہیں۔مطالعے کے بہت شوقین تھے خود پڑھ کر ہمیں بھی کتابیں سنایا کرتے تھے۔

پاکیزہ✧......گھر کے ماحول کا اثر آپ نے کیسے قبول کیا؟

لیلیٰ زبیری ❖......ہمیں گھر میں تمیز اور تہذیب بہت سکھائی جاتی تھی۔یہاں تک کہ کوئی غلط لفظ بھی ہم منہ سے نہیں نکال سکتے تھے۔حتیٰ کہ ہمارے یہاں لفظ بدتمیز بھی گالی میں شمار ہوتا تھا۔ بدتمیز بھی کہہ دیا تو پاپا ناراض ہوتے تھے، یہ غلط لفظ تم نے منہ سے کیوں نکالا؟ یہی وجہ ہے کہ آج تک میں نے اپنی زبان سے کوئی گالی نہیں نکالی۔ پاپا کو عورت کے منہ سے گالی سخت بری لگتی تھی۔گھر کے ماحول کا یہ اثر آج تک ہمارے اندر ہے۔پاپا نے ایسا ٹوکا کہ اِن چیزوں کی عادت ہی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اگر کبھی کچھ غلط بولنے بھی لگیں تو ایسا لگتا ہے کہ اندر سے کوئی ٹوک رہا ہے۔امی پاپا کے مطالعے کے شوق کی بنا پر کتب بینی کی عادت پڑ گئی۔۔کوئی غلط اردو بولے تو پاپا بہت ٹوکتے تھے۔امی کو ہمیشہ ہم نے بہت صابر پایا۔

پاکیزہ✧......گویا کتب بینی کا شوق والدین کی وراثت ہے؟

لیلیٰ زبیری ❖......کتب بینی کا شوق والدین کی وراثت ہے لیکن مجھے افسوس ہوتا ہے کہ اب مطالعے کا وقت نہیں ملتا۔حالانکہ کتابوں کا کلیکشن بھی ہے میرے پاس۔ پاپا کے گھر ہر ماہ ایک ادبی محفل ہوتی تھی اس میں مختلف ادیب،شاعر،مزاح نگار،نقاد شرکت کرتے تھے۔ اور اپنی اپنی چیزیں سنایا کرتے تھے۔ مجھے بڑا مزہ آتا تھا۔اِن ادبی محافل میں شرکت کی وجہ سے میرا ادبی ذوق و



شوق بڑھا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کی ambassador book بھی ہوں۔

پاکیزہ✧......بچپن کی وہ خوبی اور خامی جو آج بھی موجود ہے اور وہ جو وقت کے ساتھ آپ ہی آپ ختم ہوگئی؟

لیلیٰ زبیری ❖......خوبی یہ ہے کہ ہمیشہ ہنستے رہنا، خوش رہنا۔میں بچپن سے آج تک ایسی ہی ہوں ۔مجھے بچپن سے ہی اچھے کپڑے پہننے اور بہت اچھی طرح تیار ہونے کا بڑا شوق تھا جو آج تک برقرار ہے۔اب آپ اسے خوبی سمجھ لیں یا خامی۔

پاکیزہ✧......شادی کے لیے آپ کا انتخاب کس نے کیا تھا؟

لیلیٰ زبیری ❖......جب میں نویں کلاس میں تھی اسی وقت سے میرے لیے بہت رشتے آنے شروع ہوگئے تھے۔اس وقت میں بچی ہی تھی تو ظاہر ہے کہ انتخاب والدین نے ہی کیا طارق میرے سیکنڈ کزن ہیں اور میرے چچا کے سالے بھی، چچا نے ہی طارق کا رشتہ دیا تھا۔امی پاپا سے بات کی تھی۔چونکہ فیملی میں سے اور بھی رشتے آئے ہوئے تھے۔اس لیے مجھ سے پوچھا ضرور گیا تھا کہ کسی اور رشتے میں انٹرسٹ تو نہیں ہے گویا انتخاب والدین کا تھا جس میں میری رضامندی بھی شامل تھی۔

پاکیزہ✧......منگنی کتنے عرصے رہی؟ اس دوران آپ دونوں کے مابین خطوط اور فون کے ذریعے نصف ملاقات اور تحائف کا تبادلہ ہوا؟

لیلیٰ زبیری ❖......ہماری منگنی تین سال رہی۔ان دنوں طارق کی پوسٹنگ کشمیر میں تھی۔تو طارق روز ایک خط لکھتے تھے۔اور خطوط میں وہاں کے دلکش نظاروں اور مقامات کی ڈرائنگ بھی بھیجتے تھے'طارق کی ڈرائنگ بہت اچھی ہے۔ڈاکیا کئی، کئی خطوط ایک ساتھ دے جاتا تھا۔پاپا کہتے تھے ''پتا کرو یہ لڑکا فوج میں بھی ہے کہ ایسے ہی فارغ ہے۔فوجی تو لگتا نہیں۔اتنے خطوط کیسے لکھ لیتا ہے۔''ممکن ہے موبائل فون ہوتا اس زمانے میں تو خط بھی نہ لکھتے' آج کل تو لوگ واٹس ایپ کرلیتے ہیں۔کشمیر میں ان کے پاس فون نہیں تھا لیکن جب بھی موقع ملتا فون ضرور کرتے۔جب آتے تو تحائف بھی لاتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس وقت یہ چیزیں بہت اچھی لگتی تھیں۔

پاکیزہ ✧...... شادی کے وقت طارق بھائی کی پوسٹنگ کہاں تھی؟ آپ اپنے ہم سفر کے ساتھ رہیں یا کچھ عرصہ سسرال میں گزارہ؟

لیلیٰ زبیری ❖...... جب ہماری شادی ہوئی تو طارق کی پوسٹنگ کھاریاں میں تھی۔ اور ظاہر ہے کہ شادی کی جلدی اسی لیے کی تھی کہ وہاں اکیلے تھے سو وہ مجھے اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے۔

پاکیزہ ✧...... نئی جگہ، نیا ماحول، اپنوں سے دور ابتدا میں کیسا محسوس ہوتا تھا؟ خود کو اس میں ڈھالنے میں کتنا وقت لگا؟

لیلیٰ زبیری ❖...... کھاریاں ایک چھوٹی سی جگہ جس کا میں نے کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ بالکل مختلف ماحول تھا۔ ساری عمر کراچی میں رہی۔ شروع میں تو بہت عجیب سا لگتا تھا۔ خاص طور سے کراچی میں تو اس زمانے میں رات ہی نہیں ہوتی تھی اور وہاں سب نو بجے ہی سو جاتے تھے، سب سے زیادہ تکلیف مجھے اسی بات سے ہوتی تھی۔ رات کو میرا جب کہیں جانے کو دل چاہتا تھا تو وہاں کوئی جگہ، کوئی بازار ہی نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے اپنا گھر تھا اس کو سجانا اچھا بھی لگتا تھا۔ ہاں یہ تھا کہ ایک کھلنڈری سی لڑکی پر ذمے داری آن پڑی تھی، گھر بھی دیکھنا ہے، کھانا بھی پکانا ہے۔ اس وقت کوئی کک وغیرہ تو تھا نہیں۔ اور کھانا پکانا مجھے بالکل بھی نہیں آتا تھا۔ لہٰذا آہستہ، آہستہ خود کو اس ماحول کے مطابق ڈھال لیا۔

پاکیزہ ✧...... شادی کے ابتدائی دور میں جب آپ کھانا پکانے کے معاملے میں اناڑی تھیں، کوئی ایسی دلچسپ غلطی سرزد ہوئی جس کو یاد کر کے آج بھی بے اختیار ہنس دیتی ہیں؟

لیلیٰ زبیری ❖...... کچھ بھی پکانا نہیں آتا تھا۔ امی سے ساری ترکیبیں معلوم کیں۔ میری ایک کزن ضوفشاں کی بھی نئی، نئی شادی ہوئی تھی۔ اس کے میاں کی پوسٹنگ بھی کھاریاں میں ہوگئی تھی۔ ہم دونوں مل، مل کر تجربات کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ہم نے سوچا سوپ بنایا جائے اور جب سوپ بنایا تو اس میں غلطی سے نمک کی جگہ چینی ڈال دی۔ سارا سوپ ضائع ہوگیا اس طرح کی حماقتیں ان دنوں میں بہت ہوئیں۔

پاکیزہ ✧...... ماں کے منصب پر فائز ہونے کے بعد آپ نے خود میں بنیادی تبدیلی کیا محسوس کی؟

لیلیٰ زبیری ❖...... میں سمجھتی ہوں کہ ماں بننا بڑے اعزاز کی بات ہے۔ اور میری زندگی کا وہ بہترین لمحہ تھا جب میں ماں بنی۔ بہت ہی اچھا لگا تھا۔ ناقابلِ بیان احساسات ہیں۔ اللہ کا شکر کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت مجھے بخشی۔ بنیادی تبدیلی ظاہر ہے شروع میں یہ ذمے داری بہت مشکل لگی تھی ہم سوا مہینے کی بچی کو لے کر کھاریاں چلے گئے تھے اس وقت میں خود ینگ تھی۔ ایک نئی تبدیلی، تجربہ بھی نہیں تھا اور کوئی بڑا بھی ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ شروع میں تو بہت مشکل لگتا تھا راتوں کو جاگنا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بچی کیوں رو رہی ہے؟ اسے کیا ہو رہا ہے؟ اس سے پہلے آزاد زندگی تھی گھوم رہے ہیں پھر رہے ہیں۔ ڈرائیو پر نکل گئے ظاہر ہے پھر وہ چیزیں نہیں رہیں۔ ذمے داری بڑھ گئی لیکن یہ ذمے داری بھلی لگتی تھی۔

پاکیزہ ✧...... ماں اور بیٹی کے مابین تعلقات کو مستحکم بنانے میں ماں کا سب سے اہم کردار کیا ہوتا ہے؟

لیلیٰ زبیری ❖...... ماں اور بیٹی کے مابین دوستی کا رشتہ بہترین رشتہ ہوتا ہے۔ ماں کو بیٹی کے ساتھ ایسا رویّہ رکھنا چاہیے کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے محض ماں ہی نہیں دوست بھی ہو، تاکہ وہ ماں پر بھروسا کر کے اپنی ہر بات کر سکے۔ خاص طور سے آج کل کے معاشرے میں تو یہ بہت ضروری ہے کہ اتنے زیادہ مسائل ہوگئے ہیں کہ اگر ماں بیٹی کا تعلق دوستوں والا ہوگا تب ہی بیٹی ہر بات ماں سے ڈسکس کر سکتی ہے۔

پاکیزہ ✧...... آپ کئی مرتبہ بیرونِ ملک گئیں؟ سب سے زیادہ کون سا ملک پسند آیا؟

لیلیٰ زبیری ❖...... بہت زیادہ سفر کیے ہیں میں نے، کئی ممالک گھومی لیکن مجھے سب سے زیادہ اپنا ملک پسند ہے۔ دیگر ممالک میں مجھے اٹلی بہت پسند ہے۔ کیونکہ تاریخی ملک ہے خاص طور پر روم بہت مزے

کا لگا وہاں دوبارہ جانے کو بھی دل چاہتا ہے۔ وہاں کی تاریخی عمارات مجھے بے حد پسند آئیں۔

پاکیزہ ✧...... گھر کو گھر بنانے میں میاں بیوی کا کردار مساوی ہوتا ہے یا کسی ایک فریق کی ذمے داری زیادہ ہوتی ہے؟

لیلیٰ زبیری ❖...... ویسے تو میاں بیوی گاڑی کے دو پہیوں کی طرح ہیں کیونکہ جب تک دونوں ساتھ، ساتھ نہ ہوں گاڑی نہیں چل سکتی اس لیے دونوں کو ہی گھر بنانے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے کردار مساوی ہی ہوتا ہے۔ اگر میاں دلچسپی نہ لے تو بیوی اکیلی کیا کر سکتی ہے؟ مگر بیوی کا کردار اس لیے زیادہ ہوتا ہے کہ گھر کا تصور عورت کے ساتھ ہے۔ اس لیے گھر کو گھر بنانے میں زیادہ عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... طارق بھائی کی جانب سے موصول ہونے والے اب تک کے عید تحائف میں سے آپ کا من پسند اور بہترین تحفہ کون سا ہے؟

لیلیٰ زبیری ❖...... طارق عید پر مجھے کوئی خاص تحفہ دیتے ہی نہیں، ہاں میں ان سے لڑ، لڑ کر عیدی ضرور لیتی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کی زندگی کی سب سے یادگار عید؟

لیلیٰ زبیری ❖...... ایک مرتبہ ہم لوگ لندن گئے ہوئے تھے تو وہاں پر عید آگئی تھی۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ وہاں خواتین بھی عید کی نماز کو جاتی ہیں تو ہم لوگ سب عید کی نماز کو گئے بڑا اچھا لگا تھا کہ عید کی نماز پڑھ کر سب سے ملاقات ہوگئی۔ مجھے یہ رجحان اچھا لگا میرا دل چاہتا ہے یہاں بھی ایسا ہی ہو۔

پاکیزہ ✧...... آپ کے سدابہار حُسن کا راز کیا ہے؟

لیلیٰ زبیری ❖...... اب میں کیا کہوں اس بارے میں! مثبت سوچ باطن کو خوب صورت بناتی ہے اور اندر کی خوب صورتی چہرے پر عیاں ہوتی ہے۔ سو میں بھی اپنے اندر کی پوزیٹیوٹی کو برقرار رکھتی ہوں۔ تھوڑا بہت ڈائٹ کا خیال رکھتی ہوں۔ تھوڑی ایکسرسائز کرتی ہوں اور سب سے بڑھ کر مصروف رہتی ہوں۔ کام کرتے رہنے سے فٹنس رہتی ہے۔ اور اس طرح انسان زیادہ دیر تک ینگ اور فٹ نظر آتا ہے۔ میں جب کام کر رہی ہوتی ہوں تو خود کو زیادہ شاداب محسوس کرتی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... طارق بھائی خود کو مجنوں زبیری بھی کہتے ہیں؟ محض اپنی ہم سفر لیلیٰ کے نام کی مناسبت سے؟ یا پھر اپنی لیلیٰ کے عشق میں مبتلا ہونے کے سبب؟

لیلیٰ زبیری ❖...... (بے ساختہ ہنستے ہوئے) طارق خود کو مجنوں زبیری دونوں ہی وجہ سے کہتے ہیں۔ مجنوں کا لفظ صرف لیلیٰ کی وجہ سے ذہن میں آیا۔ مگر ان کا مقصد دوسرا بھی ہوتا ہے۔ یہ ماشاء اللہ سے بہت پیار کرنے اور خیال رکھنے والے شوہر ہیں تو جچتا ہے ان پر یہ نام۔

پاکیزہ ✧...... بحیثیت شریکِ حیات طارق بھائی کی کون سی خوبی آپ کو بہت متاثر کرتی ہے؟ اور کون سی خامی کھلتی ہے؟

لیلیٰ زبیری ❖...... شروع سے اب تک میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اتنا خیال رکھتے ہیں کہ مجھے کچن تک نہیں جانے دیتے۔ سیڑھیاں بھی اتر رہی ہوں تو ہر دفعہ کہیں گے دھیان سے، گر نہ جاؤ دیکھنے والے ہنستے ہیں بچی تو نہیں ہے جو گر جائے گی۔ ہاتھ میں چھری بھی دیکھ لیں تو کہیں گے دیکھو کٹ نہ جائے۔ شروع سے اب تک ان کا یہی رویّہ رہا ہے۔ خامی یہ ہے کہ غصہ آجاتا ہے جلدی اور ایک دم سے اور زور کا غصہ آتا ہے۔ اور زور سے چیخنا شروع کر دیتے ہیں۔۔ چاہے سامنے کوئی بھی ہو اس کی پروا نہیں کرتے مگر تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈا بھی ہو جاتا ہے غصہ۔ ہاں یہ ہے کہ عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ پہلے کی بہ نسبت ان کا غصہ کم بھی ہوگیا ہے دعا کرتی ہوں کہ اللہ ان کا غصہ اور کم کر دے (آمین)

پاکیزہ ✧...... آپ کی بیٹیوں تانیہ اور کرن نے اداکاری کو برقرار کیوں نہ رکھا؟ حالانکہ تانیہ نے تو نہایت کم عمری میں پی ٹی وی ایوارڈ بھی حاصل کیا تھا؟

لیلیٰ زبیری ❖...... اس وقت تانیہ پانچ سال کی تھی جب اسے پی ٹی وی ایوارڈ ملا۔ ماشاء اللہ تانیہ میں خداداد صلاحیت بہت ہے۔ پیدائشی فنکارہ ہے۔ کرن کو تو

خیر شروع سے ہی شوق نہیں تھا۔ جب کوشش ڈراما چل رہا تھا کرن جب پارک جاتی تو بچے پہچان کر آواز لگاتے رانی، رانی (ڈرامے میں کرن کا نام رانی تھا) کرن کو یہ بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا، کہتی تھی یہ مجھے کیوں آوازیں دے رہے ہیں، پہچان رہے ہیں؟ تو کرن کو شروع ہی سے پسند نہیں تھا اس لیے یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکی۔

پاکیزہ ✧...... غیر ملکی ڈراموں کے اثرات ہمارے بچوں اور نوجوانوں پر کس طرح مرتب ہو رہے ہیں؟ اس کے تدارک کی کیا صورت ہے؟

لیلیٰ زبیری ❖...... بہت اچھا سوال ہے اور آج کل کا بہت اہم موضوع بھی۔ ہمارے بچوں اور نوجوانوں پر بہت منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں کیونکہ ہمارے اور ان کے کلچر میں بہت فرق ہے ویسے اس کی روک تھام کے لیے سرکاری سطح پر بھی اقدامات ہو رہے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کا پسندیدہ رشتہ، شخصیت، کتاب، مغنیہ، رنگ، خوشبو، موسم، وقت، تفریحی مقام، تہوار، مشغلہ، کھیل، موسم کے لحاظ سے مشروب اور ڈش؟

لیلیٰ زبیری ❖...... ماں، عبدالستار ایدھی، آبِ گم، عابدہ پروین، سرخ، بارش کے بعد گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو، بہار، شام کا، تفریحی مقام بہت سارے ہیں اپنے ملک میں بھی اور باہر بھی۔ ابھی حال ہی میں دبئی گئی تھی۔ وہاں ایک گارڈن ہے۔ اس میں اتنے پھول ہیں کہ جس کی کوئی حد نہیں، پھول مجھے بہت اچھے لگتے ہیں تو اس وجہ سے وہ مجھے بہت اچھا لگا۔ ہمارے تہوار تو عید، بقر عید ہیں لیکن مجھے چاند رات میں زیادہ مزہ آتا ہے مشغلہ کبھی کتب بینی تھا مگر اب وقت ہی نہیں ملتا لیکن میں اوروں کو بھی اس مشغلے کی جانب مائل کرتی ہوں۔ ایک زمانے میں کرکٹ بہت پسند تھا، بہت گرمی میں لسی اور سردی میں کافی اچھی لگتی ہے اور چائے مجھے..... بے حد پسند ہے جو ہر موسم کا پسندیدہ مشروب ہے۔ سادہ انسان ہوں۔ کھانے میں دال چاول پسند ہیں گرمی میں دوپہر کو دال چاول بہت مزہ دیتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ دہی ہو اور چٹنی بھی۔ ہاں البتہ سردی کے موسم میں باربی کیو اچھا لگتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... اداکاری کے میدان میں آنے کی خواہشمند لڑکیوں کے لیے آپ کا مشورہ؟

لیلیٰ زبیری ❖...... ہر شخص اداکار نہیں بن سکتا۔ یا تو انسان پیدائشی فنکار ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ زبردستی کسی کو فنکار نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر کسی لڑکی میں فنکارانہ صلاحیت ہے تو وہ یہ سوچ کر پیچھے نہ ہٹے کہ ماحول خراب ہے لڑکیوں کے لیے اچھا نہیں ہے۔ کوئی بھی شعبہ اچھا یا برا نہیں ہوتا ہم اسے اچھا یا برا بناتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... پاکیزہ کی قاری بہنوں کے لیے آپ کا پیغام؟

لیلیٰ زبیری ❖...... خواتین پاکستان کی آبادی کا نصف سے زائد ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ معاشرے کی تعمیر میں خواتین کا کردار بہت اہم ہے۔ سو آپ اپنے بچوں کی پرورش اور تربیت ان خطوط پر کریں کہ ان کو کامیاب اور کارآمد شہری بنائیں۔ یہ مہنگائی کا دور ہے محض مردوں کی کمائی سے اچھے طریقے سے گھر نہیں چل سکتا تو خواتین کو چاہیے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کام کریں اور اس کے لیے گھر سے باہر نکلنا ضروری نہیں، آپ گھر میں رہتے ہوئے بھی کام کر سکتی ہیں۔ کھانا پکا کر سپلائی کر سکتی ہیں۔ کپڑے سی سکتی ہیں، ڈیزائن کر سکتی ہیں غرض جو بھی ہنر ہے آپ کے پاس اس کے مطابق کام کریں۔

قارئین کرام! آپ کو پاکیزہ کی جانب سے عید کا یہ تحفہ یقیناً پسند آیا ہوگا۔ پاکیزہ مہمان سے ملاقات کیسی رہی؟ اپنی رائے سے آگاہ ضرور کیجیے گا۔ اپنی اور ادارۂ پاکیزہ کی جانب سے لیلیٰ زبیری صاحبہ کی بے حد ممنون ہوں کہ بے پناہ مصروفیات کے باوجود وقت نکالا۔ دلی دعا ہے کہ

تیرا خاورِ درخشاں رہے تا ابد فروزاں
تیری صبحِ نور افشاں کبھی شام تک نہ پہنچے
(آمین)

☆☆☆

بیادِ مشتاق احمد یوسفی

ادارہ

محترم قارئین! گزشتہ ایک سال سے ہم پاکیزہ میں گوشۂ ظرافت کے عنوان تلے اردو فکاہیہ ادب کے نامور و مقبول مزاح نگاروں کی شاندار نگارشات آپ کے ذوق کی نذر کرتے آ رہے ہیں۔ ان میں ایک تابندہ نام مشتاق احمد یوسفی کا بھی ہے۔ مگر آج ہم افسردہ ہیں کہ طنز و مزاح کی دنیا کا ایک بہت بڑا ادیب اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا۔ مشتاق احمد یوسفی کے بارے میں کچھ لکھنا ہماری بساط سے باہر ہے۔ اس قدر لطیف، سبک مگر تیکھا انداز شاید ہی کسی کا ہو۔ کردار نگاری و منظر نگاری کی باریکیاں سمیٹتے، سمیٹتے قاری اسی دنیا میں جا پہنچتا ہے...... کردار مجسم ہو جاتے ہیں مناظر آنکھوں کے سامنے رواں نظر آتے ہیں اور انہی تفصیلات میں کبھی نہاں اور کبھی عیاں طنز، دل کو حساس اور نظر کو روشن کر دیتا ہے۔ اگرچہ پاکستانی فکاہیہ ادب بظاہر ایک بڑے ادیب سے محروم ہوا مگر ان کی تحریریں، نگارشات اور مقالے سدا ان کی یاد دلاتے رہیں گے اور زانوئے ادب تہ کرنے والے شاگردان سے استفادہ کرتے رہیں گے۔ پروردگارِ عالم سے دعا ہے کہ مرحوم مشتاق احمد یوسفی کے درجات بلند کرے اور ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا ہو۔ الٰہی آمین۔

نامور دانشور، ڈاکٹر اسلم فرخی جو آج ہمارے درمیان نہیں وہ مشتاق یوسفی کے بارے میں کیا کہتے ہیں...... آپ بھی پڑھیے۔

"یوسفی کا مزاح شگفتگی، ہمدردانہ شعور اور فنی اظہار کے بانکپن سے عبارت ہے...... وہ بات میں سے بات پیدا نہیں کرتے۔ بلکہ بات خود کو ان سے کہلوا کر ایک طرح کی طمانیت اور افتخار محسوس کرتی ہے۔"

ایک اور نامور ادیب شفیق الرحمٰن کی رائے ملاحظہ کیجیے۔

"رابرٹ لوئی اسٹیونسن نے ولیم ہیزلٹ کے مضامین کے بارے میں کہا تھا۔ 'ہم سب بڑے باکمال ہیں، لیکن ولیم ہیزلٹ کی طرح کوئی نہیں لکھ سکتا۔' مشتاق احمد یوسفی کی لطیف و نفیس تحریریں پڑھتے وقت اسٹیونسن کا فقرہ یاد آتا ہے۔ اور یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ہم سب بڑے باکمال ہیں لیکن مشتاق احمد یوسفی کی طرح کوئی نہیں لکھ سکتا۔"

مجنوں گورکھپوری کی نظر میں......

"یوسفی کا قلم جس چیز کو بھی چھوتا ہے، اس میں نئی روئیدگی اور تازہ بالیدگی پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی کوئی سطر یا لفظی ترکیب ایسی نہیں ہوتی جو پڑھنے والے کی فکر و نظر کو نئی روشنی نہ دے جاتی ہو۔ یوسفی ایک ظرافت نگار کی حیثیت سے ایک نیا دبستان ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا بہہ رہا ہے جس کی لہریں مذاق کی چمک سے روشن ہیں اور جن کا منظر دل کی کلی کو کھلاتا ہے۔ کہیں مسکراہٹ پیدا کرتا ہے اور کہیں زور سے ہنسا دیتا ہے۔"

یہاں ہم مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "آبِ گم" سے ایک اقتباس آپ جیسے خوش ذوق قارئین کی نذر کر رہے ہیں۔

اسکول ماسٹر کا خواب

فیوڈل فینٹسی:

ہر شخص کے ذہن میں عیش و فراغت کا ایک نقشہ ہوتا ہے جو دراصل چربہ ہوتا ہے اس ٹھاٹ باٹ کا جو دوسروں کے حصے میں آیا ہے۔ لیکن جو دکھ آدمی سہتا ہے، وہ تنہا اس کا اپنا ہوتا ہے۔ بلا شرکتِ غیرے۔ بالکل نجی، بالکل انوکھا۔ ہڈیوں کو پگھلا دینے والی جس آگ سے وہ گزرتا ہے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں۔ جیسا داڑھ کا درد مجھے ہو رہا ہے ویسا کسی اور کو نہ کبھی ہوا، نہ ہو گا۔ اس کے برعکس، ٹھاٹ باٹ کا بلیو پرنٹ ہمیشہ دوسروں سے چرایا ہوا ہوتا ہے۔ بشارت کے ذہن میں عیش و تنعم کا جو صد رنگ و ہزار پیوند نقشہ تھا وہ بڑی بوڑھیوں کی اس رنگارنگ رلّی (سندھی

(Patchwork Quilt) کی مانند تھا جو وہ مختلف رنگ کی کترنوں کو جوڑ جوڑ کر بناتی ہیں۔ اس میں اس وقت کا جاگیردارانہ طنطنہ اور ٹھاٹ، بگڑے رئیسوں کا تیہا اور ٹھسّا، مڈل کلاس دکھاوا، قصباتی اترونا پن، ملازمت پیشہ نفاست، سادہ دلی اور ندیدہ پن...... سب بری طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ انہی کا بیان ہے کہ بچپن میں میری سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ تختی پھینک پھانک، قاعدہ پھاڑ پھوڑ کر مداری بن جاؤں۔ شہر شہر ڈگڈگی بجاتا، بندر، بھالو، بچہ جمورا نچاتا اور ''بچہ لوگ'' سے تالی بجواتا پھروں۔ جب ذرا عقل آئی، مطلب یہ کہ بد اور بدتر کی تمیز پیدا ہوئی تو مداری کی جگہ اسکول ماسٹر نے لے لی اور جب موضع دھیرج گنج میں سچ مچ ماسٹر بن گیا تو میرے نزدیک انتہائے عیاشی یہ تھی کہ مکھن زین کی پتلون، دو گھوڑا بوسکی کی قمیض، ڈبل کفوں میں سونے کے چھٹانک چھٹانک بھر کے بٹن، دنیا سولا ہیٹ جس پر میل خورہ غلاف نہ چڑھا ہو اور پیٹنٹ لیدر کے پمپ شوز پہن کر اسکول جاؤں اور لڑکوں کو صرف اپنی غزلیات پڑھاؤں۔ سفید سلک کی اچکن جس میں بدری کے کام والے بٹن نرخرے تک لگے ہوں۔ جیب میں گنگا جمنی کام کی پانوں کی ڈبیا۔ سر پر سفید کم خواب کی رامپوری ٹوپی۔ ترچھی مگر ذرا شریفانہ زاویے سے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ نرے شریف ہی ہو کے رہ جائیں۔ چھوٹی بوٹی کی چکن کا سفید کرتا جو موسم کی رعایت سے عطر حنا یا خس میں بسا ہو۔ چوڑی دار پاجامے میں خوبرو دوشیزہ کے ہاتھ کا بنا ہوا سفید ریشمی ازار بند۔ سفید زری کا سلیم شاہی جوتا۔ پیروں پر ڈالنے کے لیے اٹالین کمبل جو فٹن (تانگا یا بگھی) میں جتے ہوئے سفید گھوڑے کی دم اور دور ماربول و براز سے پاجامے کو محفوظ رکھے۔ فٹن کے پچھلے پائدان پر ''ہٹو! بچو!'' کرتا اور اس پر لٹکنے کی کوشش کرنے والے بچوں کو چابک مارتا ہوا سائیس، جس کی کمر پر زردوزی کے کام کی پٹی اور ٹخنے سے گھٹنے تک خاکی نمدے کی نواری پٹیاں بندھی ہوں۔ بچہ اب سیانا ہو گیا تھا۔ بچپن رخصت ہو گیا، پر بچپنا نہیں گیا۔

بچہ اپنے کھیل میں جیسی سنجیدگی اور ہمہ تن محویت اور خود فراموشی دکھاتا ہے، بڑوں کے کسی مشن اور مہم میں اس کا عشرِ عشیر بھی نظر نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی کسی کھیل میں منہمک بچے سے زیادہ سنجیدہ نہیں ہو سکتا۔ کھلونا ٹوٹنے پر بچے نے روتے، روتے اچانک روشنی کی طرف دیکھا تھا تو آنسو میں دھنک جھلمل، جھلمل کرنے لگی تھی۔ پھر وہ سسکیاں لیتے لیتے سو گیا تھا۔ وہی کھلونا بڑھاپے میں کسی جادو کے زور سے اس کے سامنے لا کر رکھ دیا جائے تو وہ بھونچکا رہ جائے گا کہ اس کے ٹوٹنے پر بھی بھلا کوئی اس طرح جی جان سے روتا ہے۔ یہی حال ان کھلونوں کا ہوتا ہے جن سے آدمی زندگی بھر کھیلتا رہتا ہے۔ ہاں، عمر کے ساتھ، ساتھ یہ بھی بدلتے اور بڑے ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ کھلونے خود بخود ٹوٹ جاتے ہیں۔ کچھ کو دوسرے توڑ دیتے ہیں۔ کچھ کھلونے پرموٹ ہو کر دیوتا بن جاتے ہیں اور کچھ دیویاں دل سے اترنے کے بعد گودڑ بھری گڑیاں نکلتی ہیں۔ پھر ایک ابھاگن گھڑی ایسی آتی ہے جب وہ ان سب کو توڑ دیتا ہے۔ اس گھڑی وہ خود بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

تراشیدم، پرستیدم، شکستم

آج ان طفلانہ تمناؤں پر خود ان کو ہنسی آتی ہے۔ مگر یہ اس وقت کی حقیقت تھی۔ بچے کے لیے اس کے کھلونے سے زیادہ ٹھوس اور اصل حقیقت ساری کائنات میں اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ جب خواب...... خواہ وہ خواب نیم شبی ہو یا خوابِ بیداری...... دیکھا جا رہا ہوتا ہے تو وہی اور صرف وہی اس لمحے کی واحد حاضر و موجود حقیقت ہوتی ہے۔ یہ ٹوٹا کھلونا، یہ آنسوؤں میں بھیگی پتنگ اور الجھی ہوئی ڈور جس پر ابھی اتنی مار کٹائی ہوئی، یہ جلتا بجھتا جگنو، یہ تنا ہوا غبارہ جو اگلے لمحے ربر کے گلگلے ٹکڑوں میں تبدیل ہو جائے گا، میری ہتھیلی پہ سرسراتی یہ مخملی بیر بہوٹی، آواز کی رفتار سے بھی تیز چلنے والی یہ ماچس کی ڈبیوں کی ریل گاڑی، یہ صابن کا بلبلا جس میں میری سانس تھرا رہی ہے، دھنک پر یہ پریوں کا رتھ جسے تتلیاں کھینچ رہی ہیں...... اس پل، اس آن بس یہی اور صرف یہی حقیقت ہے۔

اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ

تمام حمد و ستائش اس ذات والا صفات کو زیبا جو کُل کائنات کا خلق کرنے والا ہے۔ یکتا و وحدہٗ لاشریک ہے اور کروڑوں درود و سلام حبیب خدا رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ کی ذاتِ اقدس پر جو وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ پروردگار عالم کے حضور دست بستہ دعا گو ہیں کہ اپنے خزانہ غیب سے وہ سب کچھ عطا کرے جو ہمارے حق میں بہترین ہو۔ ہمارے وطن پاکستان میں امن و آشتی کی فضا اور خوش حالی رہے اور تمام اہل وطن اس کی ترقی و نیک نامی کے لیے کوشاں رہیں۔ (الٰہی آمین)

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

پیاری بہنو! سلام اور پُرخلوص دعائیں لیے آپ کی محفل میں حاضر ہوں، امید ہے کہ آپ نے عید بھرپور طریقے سے منائی ہوگی اور اگر کسی وجہ سے مثلاً طبیعت وغیرہ کی خرابی کے باعث عید کی خوشیاں ادھوری رہی ہوں تو صبر شکر کر کے اسے اللہ کی مصلحت جانیں جیسا کہ کئی بہنوں نے بتایا کہ وہ بیمار رہیں یا کسی عزیز رشتے دار کا انتقال ہو گیا تو یہ سب تو من جانب اللہ ہوتا ہے۔ میری خود پورے رمضان کافی طبیعت خراب چلتی رہی اور عید کے دو روز بعد ہی ایک چھوٹی سی سرجری سے بھی گزرنا پڑا۔ جس کی وجہ سے آج کل گھر پر آرام کر رہی ہوں۔

پچھلے دنوں حیا بخاری سے فون پر بڑی تفصیلی گفتگو رہی، بہت اچھا لگا، حیا اب تم فون کرتی رہنا جیسا کہ تم کہہ رہی تھیں کہ ڈرتے، ڈرتے فون کیا تو اب ڈرنا نہیں اور فون کر لیا کرنا۔ تم اپنے ناول کے بارے میں میری رائے جاننا چاہ رہی تھیں تو جناب میں اپنے ہی رائٹرز کی خود ہی تعریف کرتی رہوں تو لوگ کہیں گے کہ اپنے ہاں چھپنے والے میٹر کی خود ہی تعریف کرتی رہتی ہیں اگرچہ اکثر دل چاہا کہ تحریروں پر اپنی رائے دوں جیسا کہ آج کل میں دیکھ رہی ہوں، نئی و پرانی تمام لکھنے والیاں بہت اچھا لکھ رہی ہیں، بڑی سبق آموز اور میچور تحریریں ہیں خاص طور پر اس دفعہ اسما قادری کی تحریر پھوہڑ پڑھ کر مجھے ہارٹ اٹیک ہوتے، ہوتے رہ گیا۔ اس قدر شدید پھوہڑ پن کا نقشہ اور ایسی بے ترتیبی کہ میرے لیے تو پڑھنا ہی جان لیوا ہوا نہ کہ سامنے دیکھنا۔ اسما بہت اچھی منظر نگاری اور عمدہ مکالموں سے سجا افسانہ بہت خوب تھا۔ امید ہے تم جلدی، جلدی اپنی تحریریں دیتی رہو گی۔ ہماری سینئر ترین رائٹر نگہت سیما کی تحریر کا اختتامی حصہ بھی لاجواب تھا میں نے تو پہلا حصہ ہی پڑھ کر بذریعہ فون تعریف پہنچا دی تھی۔ نگہت سیما اتنا کم، کم کیوں لکھتی ہو، ہمیں تمہاری تحریر کا انتظار رہتا ہے، شیریں حیدر نے بھی فون پر مجھ سے اپنے ناول کے سلسلے میں بات کی اور اس دفعہ انہوں نے قارئین کے لیے بطور خاص خط بھی لکھا ہے، زہرہ جنید تم کہاں غائب ہو تمہاری عید کی مبارک باد مجھے مل گئی بلکہ ان تمام بہنوں کا شکریہ جنہوں نے رمضان المبارک کی دعاؤں میں یاد رکھا اور عید الفطر کی مبارک بادیں بھی دیں۔ اچھا بہنو کافی باتیں ہو گئیں، اب آپ اپنی محفل کے خطوط پڑھنے کو بے چین ہوں گی، لہٰذا اجازت چاہتی ہوں، انشاء اللہ اگلے ماہ پھر مزید باتیں ہوں گی۔

اللہ نگہبان......!

دعا گو عذرا رسول......!

☆☆☆

عیدالفطر کی مبارک بادیں تو آپ نے وصول لیں...... اب تو سویوں کا ذائقہ بھی ماند پڑ چکا ہوگا چلیں کوئی بات نہیں اب بقرعید کی تیاریاں کیجیے بلکہ شادیوں کا بھی سیزن شروع ہوگیا ہے۔ عید کے ایک ہفتے بعد ہی تمام بازار کھل گئے اور خریداروں کا رش شروع ہوگیا۔ بس اس سب خریداری میں اپنے گھریلو بجٹ کو ضرور مدنظر رکھیے گا کہ عید پر کافی خرچہ ہو چکا ہے، ویسے بھی الیکشن کا دور، دورہ ہے، دیکھیں ملک کی باگ ڈور کس کے ہاتھ آتی ہے مگر اس سب میں محض تماش بین نہ بنیے بلکہ اپنا حقِ رائے دہی ضرور استعمال کریں۔ اپنی عقل سے کام لیں جو امیدوار ووٹ مانگنے آرہے ہیں ان سے وعدہ لیں کہ الیکشن کے بعد غائب نہ ہوں اور علاقے کے مسائل بھی ضرور حل کریں۔ اگر خدمتِ خلق کا شوق ہے تو عملی مظاہرہ بھی تو کریں۔ ملک کی خیرخواہی اور عوام الناس کا درد بھی کسی، کسی کو ہوتا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے وطن کے حکمرانوں میں حبّ الوطنی اور خدمت خلق کا جذبہ پیدا کردے تاکہ ہمارا ملک خوشحالی وترقی کی طرف گامزن ہو، الٰہی آمین......

پیاری بہنو! اپنے پیغام سلام، رائے مشورے اور شکایات کے لیے بھی مندرجہ ذیل نمبر حاضر ہیں۔

0331626661 2,021.35386783.021.35802552.Ext:122.107 ہیں۔

اور حسب روایت نت نئی خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوص دل سے درود ابراہیمی اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہل وطن کو بھی یاد رکھیں۔ اللہ رب العزت عالم اسلام کی تمام پریشانیوں کو رفع کرے اور تمام مسلمانانِ عالم کو کامیابی نصیب ہو۔ (الٰہی آمین)

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ قابل صد احترام ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا نعتیہ کلام کا مجموعہ بعنوان عشق نبیؐ شائع ہوگیا ہے۔ یہ کلام صرف ڈیڑھ ماہ کے مختصر عرصے میں لکھا گیا۔ ملنے کا پتا القریش پبلی کیشنز سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور ہے۔

☆ مصنفہ ریما نور رضوان کے ہاں فرزند کی ولادت ہوئی ہے۔ (مبارک باد)

☆ عظمٰی افتخار، لکی مروت نے سیکنڈ ائیر کے پیپرز دیے ہیں اور وہ اپنے پاکیزہ قارئین سے دعا کا کہتی ہیں۔ (اللہ آپ سمیت سب طالب علموں کو کامیاب کرے)

☆ حمیرا وحید، واہ کینٹ کے والدین نے ماشاءاللہ عمرے کی سعادت حاصل کی۔ (بہت، بہت مبارک ہو)

☆ مستقل قاری مسز یسین، لیہ کے بھائی حفیظ کو اللہ تعالیٰ نے بیٹے کی نعمت سے نوازا ہے۔ جس کا نام محمد ریان رکھا گیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عصمت آپا، اوکاڑہ کی پیاری بھانجی شفق کے ہاں شادی کے بارہ سال بعد فرزند تولد ہوا ہے۔ (بہت مبارک ہو)

☆ مصنفہ عقیلہ حق نے ماشاءاللہ رمضان المبارک میں عمرے کی سعادت حاصل کی۔ (مبارک ہو)

☆ مصنفہ اُمِ عثمان، لاہور کی کتاب میرا جینا میرا مرنا کا دسواں ایڈیشن الھدیٰ پبلی کیشنز اسلام آباد کے تحت شائع ہوا ہے۔ کتاب ملنے کا پتا AK.7 بروہی روڈ 11/4۔H اسلام آباد اور فون نمبر 0514866125 ہے۔ کتاب میں آپ کو اپنی عاقبت سنوارنے کے بہت سے سامان ملیں گے۔

☆ ان دنوں ہماری پیاری مصنفہ صائمہ اکرم چوہدری کے لکھے کئی سیریلز مختلف چینلز پر بہت دھوم مچا رہے ہیں۔ (مبارک باد)

☆ مصنفہ نزہت جبیں ضیا کے خوب صورت افسانوں کا مجموعہ محبت اب بھی باقی ہے۔ علم وعرفان پبلشرز کے تحت شائع ہوگیا ہے۔ ملنے کا پتا الحمد مارکیٹ 40 اردو بازار، لاہور، فون نمبر 04237223584 کتاب کے ٹائٹل پر بنی منتظر حسینہ آپ کے مطالعے کی منتظر ہے۔ کتاب کا انتساب نزہت جبیں نے اپنے شوہر نامدار ضیا صاحب اور بچوں کے نام کیا ہے۔

☆ نئی ابھرتی ہوئی شاعرہ نبیلہ خان کی نظموں کا مجموعہ تمہاری یاد کے جگنو ادارہ اشاڈیرہ اسماعیل خان کے تحت شائع ہوگیا ہے اس کی تزئین وآرائش محمد وسیم سہیل نے کی ہے کتاب کی قیمت صرف چار سو روپے ہے۔ رابطہ نمبر 03440913786 ہے

☆ ہماری سینئر رائٹر سیدہ عطیہ پروین المعروف عطیہ ہدایت اللہ کی انوکھی اور سبق آموز تحریروں پر مشتمل کتاب دادی اماں کی کہانیاں نیاز علی ناشر کے زیراہتمام شائع ہوئی ہے جس میں بہت خوب صورت مواد شامل ہے۔ کتاب کی قیمت صرف 200 روپے ہے عمدہ صفحات سے مزین یہ کتاب آپ کے بچوں کے لیے بھی نہایت دلچسپی کا باعث ہوگی۔ رابطہ نمبرز 03129108845-03339108845 ہیں۔

☆ عطیہ صاحبہ کی دوسری کتاب دوستی کا سفر ایک طرح سے سفرنامہ ہے۔ پشاور سے تہران تک کا۔ اس میں بے حد معلومات اور نہایت دلچسپ حقائق ہیں۔ کتاب کا انتساب عطیہ آپا نے اپنے شوہر ہدایت اللہ ایڈووکیٹ اور پیارے بیٹوں کے نام کیا ہے۔

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ہماری پیاری دوست ڈاکٹر ممتاز ضیا کی طبیعت اب پہلے سے بہتر ہے۔

☆ مصنفہ رفعت سراج کی آنکھ کا آپریشن پچھلے دنوں ہوا مگر اس کے باوجود رفعت صاحبہ نے اپنی کمٹ منٹس پوری کیں...... (بہت شکریہ رفعت، اللہ آپ کی بینائی بحال رکھے)

☆ ہماری پیاری شاعرہ فریدہ جاوید فری ان دنوں کافی بیمار ہیں۔

☆ پاکیزہ قاری شازیہ سرفراز، کراچی کی بیٹی کے لیے خصوصی دعا کی درخواست۔

☆ مستقل قاری نادیہ راولپنڈی کے بچوں خصوصاً چھوٹے بیٹے کی طبیعت اکثر خراب رہتی ہے۔

☆ پیاری پاکیزہ شاعرہ شگفتہ شفیق پچھلے دنوں کافی بیمار رہیں۔

☆ پیاری سہیلی دیرخلوص دوست امینہ عندلیب، سلانوالی کو آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔

☆ پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی شائستہ اعجاز کے شوہر کی طبیعت الحمدللہ اب بہتر ہے۔

☆ ہماری ہونہار پاکیزہ شاعرہ فریدہ خانم، ان دنوں کافی بیمار ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری، مصنفہ وکالم نگار نرگس نسیم، صابہ موہڑہ پچھلے دنوں ٹائیفائیڈ بخار میں مبتلا رہیں۔

انتقال پُرملال

☆ فکاہیہ ادب کی دنیا کا عظیم نام...... ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کی عمر کی نقدی تمام ہوئی۔ اور وہ اپنے مدّاحوں کو سوگوار چھوڑ کر راہیِ ملک عدم ہوئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے،

☆ اس ماہ ہماری مستقل تبصرہ نگار حدیث اختر کے شوہر کی اکتیسویں برسی ہے۔

☆ پاکیزہ کی پُرخلوص ساتھی عصمت آپا، اوکاڑہ کے کزن محمد اکرم 30 رمضان المبارک بروز جمعہ برضائے ربی انتقال کر گئے۔

تمام مرحومین کے.... درجات کی بلندی کے لیے دعائے مغفرت کی استدعا ہے۔

☆☆☆

☆ اب آتے ہیں آپ بہنوں کے کھٹے میٹھے خطوط کی جانب......

✍ شمیم فضل خالق، پشاور سے۔ ''سب سے پہلے بہنوں کی محفل پڑھی بلکہ ہمیشہ پہلے وہ ہی پڑھتی ہوں...... اپنی تحریروں پر تبصرے پڑھنا بھی اچھا لگتا ہے چاہے تعریف ہو یا تنقید، رابعہ عمران چوہدری، آپ کو میرا نام پڑھ کر اپنائیت کا احساس ہوتا ہے تو پیاری...... اپنے تو ہم ہیں ناں...... پڑھنے والے اور لکھنے والے کے درمیان محبت کا ایک اَن دیکھا رشتہ ہوتا ہے شکریہ آپ کا...... فریدہ افتخار بھابی...... آپ کو میں فون کر کر کے تھک گئی پھر میں نے سوچا کہ آپ باہر گئی ہوئی ہوں گی پاکیزہ میں آپ کو دیکھا تو خوشی کے ساتھ، ساتھ حیرانی بھی ہوئی آپ نے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ آپ نے میرے افسانے پر تبصرہ کیا، بہت شکریہ...... آپ مجھ سے رابطہ بھی کیجیے۔ آپ انجم انصار سے ناول لکھنے کے لیے بھی ضرور بات کریں۔'' (جی انشاءاللہ)

✍ شیریں حیدر، اسلام آباد سے۔ ''پیاری بہنو السلام علیکم۔ امید ہے آپ سب بخیریت ہوں گی۔ کافی عرصے سے

کوشش کر رہی تھی کہ آپ لوگوں سے مخاطب ہوسکوں، اپنے حالیہ ناول، امرت پر آپ لوگوں کی ملی جلی رائے پڑھتی رہتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ ان کے جوابات دوں، مگر فرصت ہی نہیں نکل پاتی تھی۔ بیٹے کی شادی اور پھر شادی کے بعد کی مصروفیات بہ مشکل اتنا ہی وقت نکال پاتی تھی کہ اپنا باقاعدہ ہفتہ وار کالم اور ناول کی قسط لکھ سکوں۔ عذرا جی اور نزہت پیاری سے فون پر رابطہ رہتا ہے اور ان سے اپنے ناول اور دیگر تحریروں پر رائے ملتی رہتی ہے، ان کی بھی اور آپ لوگوں کی بھی۔ نزہت ہی کی طرف سے ای میل موصول ہوئی کہ مجھے ایک خط لکھنا چاہیے......

پہلا اور سب سے زیادہ کیا جانے والا اعتراض بہنوں کو یہ ہوتا ہے کہ اس ناول میں کرداروں کی بہتات ہے، میں نے پہلے بھی اس کے بارے میں کہا تھا کہ کردار وقت کے ساتھ، ساتھ کم ہوتے جاتے ہیں، ناول ایک نہیں بلکہ کئی لوگوں کی زندگیوں کا احاطہ کرتا ہے اور ہم سب کی زندگیوں میں کتنے ہی کردار ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں، مثال کے طور پر، اگر میں اپنی زندگی کی کہانی لکھنا چاہوں، ہم آٹھ بہن، بھائی ہیں، ان کے شریک حیات ہیں، ان کے بچے ہیں، میرے والدین ہیں، ان کے والدین ہیں، میرے شوہر اور سسرال کا خاندان ہے، پھر میرے بچے ہیں، ان کے شریک حیات ہیں، سمدھیانے ہیں......ان کرداروں میں سے کوئی بھی ساری زندگی ہمارے ساتھ نہیں ہوتا مگر ان سب کا ہماری زندگی پر کوئی نہ کوئی اثر ہوتا ہے، ان کی کوئی اہمیت ہوتی ہے، ان سیکڑوں لوگوں میں سے کتنے کردار میں لکھتے ہوئے منہا کر سکتی ہوں؟ جوں، جوں کہانی آگے بڑھتی گئی، اس میں سے وہ کردار ختم ہوتے گئے جن کا ماضی میں اہم کردار تھا، اس سے ایک خاندان کے پس منظر کا علم ہوتا ہے، میں نے بہت کم کرداروں پر بھی ناول کی کہانی تعمیر کی ہے کیونکہ اس میں اہمیت اتنے ہی کرداروں کی تھی اب تو کہانی بہت کم کرداروں کے گرد گھوم رہی ہے اور امید ہے کہ جلد ہی اختتام پزیر بھی ہوجائے گی۔ میں کسی بھی کہانی، افسانے، ناول یا ناولٹ کو اپنے دماغ سے نہیں بناتی بلکہ اس کے تانے بانے کسی کی حقیقی زندگی سے بُنتی ہوں، اس میں ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کو اعتراض ہو کہ ایسا ہو نہیں سکتا......شرعی مسائل پر بھی لوگوں کی رائے مختلف ہوسکتی ہے کیونکہ بدقسمتی سے ہم نے مذہب کی اصل روح کو فرقوں میں بانٹ کر زائل کر دیا ہے، مختلف معاملات میں مختلف علماء کی رائے میں اختلاف بھی اسی لیے آجاتا ہے کیونکہ کم علمی کے باعث ہر کوئی مفتی بنا بیٹھا ہے، سنی سنائی بات کو بلا تحقیق آگے بڑھا دیا جاتا ہے، بالخصوص شادی بیاہ اور طلاق کے مسائل، جہاں خاندان ٹوٹ رہا ہوتا ہے، وہاں ڈوبتی ہوئی کشتی کی طرح ہر کوئی اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے لیے سر توڑ کوشش کی جاتی ہے یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اگر کسی اور فرقے میں گنجائش نکلتی ہو تو ہم اس فرقے کو اپنا لیتے ہیں۔ میں ٹیلی وژن پر ایک ڈراما دیکھ رہی تھی جس میں شوہر، بیوی کو کئی بار طلاق دے کر گھر بھیجتا ہے اور ماں، باپ اسے واپس بھیج دیتے ہیں کہ جاؤ ایسا تو مرد کرتے ہی رہتے ہیں۔ ٹیلی وژن جیسے میڈیا پر ایسی بات کا کہا جانا، تصور کریں کہ ہماری ڈراما دیکھنے والی بچیاں کیا سیکھ رہی ہیں۔ مذہب کو نا سمجھتے ہوئے بالخصوص طلاق کا مذاق بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ میں نے جس کہانی پر اس ناول کی بنیاد رکھی ہے اس میں ایسا ہی ہوا، لڑکی کے شوہر نے سمجھا کہ اس نے اپنی دوست کو خوش کرنے کے لیے بیوی کو جو طلاق دی ہے وہ واقع نہیں ہوئی۔ مگر جب شوہر اس طرح بقائمی ہوش وحواس طلاق دیتا ہے تو طلاق ہوجاتی ہے۔ اس کے پاس اس بات کی سہولت تو تھی کہ اس کا مطالبہ نہ مانتا اور دوست کو چھوڑ دیتا مگر جس نشے میں وہ دھت تھا وہ بے حیائی کا تھا اور اس نے اپنی زندگی کے لیے اس غلط راہ کا انتخاب کیا، اس کے بارے میں جو کچھ مفتی صاحب سے پوچھا گیا اور جو حل انہوں نے بتایا، ساتھ میں امرت کو یہ اختیار بھی دیا کہ رجوع دونوں فریقین کی مرضی سے ہوتا ہے۔ سو اس نے اپنے لیے رجوع نہ کرنے کا انتخاب کیا اور اس کی شادی کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ سب کچھ اس لیے لکھ رہی ہوں کہ نزہت نے بتایا ہے کہ کچھ قاری بہنوں نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ مذہب کے مسائل کو مفتیوں پر چھوڑ دینا چاہیے، میں ہرگز مفتی یا عالم نہیں بن رہی بلکہ اپنی کہانی میں آنے والی صورتِ حال کو اسی طرح واضح کیا ہے جس طرح کہ وہ حقیقت میں واقع ہوئی تھی۔ جن مسائل کے بارے میں قرآن میں تفصیل موجود ہے ان کے بارے میں ہمیں قرآن سے رجوع کر کے رہنمائی مل سکتی ہے، جہاں ہمارے فہم کو کوئی گمان ہو وہاں پر کسی عالم یا مفتی سے رائے لینا ضروری ہوتا ہے اور اہم بات یہ ہے کہ وہ عالم یا مفتی کتنا جانتا اور سمجھتا ہے۔ اللہ سب ہم کو راہ ہدایت پر رکھے اور جو علم ہمیں اپنے کرم سے عطا کرتا ہے اس میں سے ہمیں دوسروں کی مثبت راہنمائی

کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ (بہت شکریہ شیریں! اب کافی قارئین کا ابہام دور ہوگیا ہوگا)

عنیزہ سید، ڈسکہ سیالکوٹ سے۔ ''ڈیئر نزہت پاکیزہ روز بروز نکھرتا جا رہا ہے۔ بے حد ادبی و اصلاحی رنگ لیے کہانیاں دل کو بھا رہی ہیں، اس مرتبہ دردانہ نوشین خان کی تحریر سدا بہار سرائے دل کو چھوگئی اس قدر متاثر کن انداز بیان جواب کم کم ہوتا جا رہا۔ رواں تحریر بہت ہی خوب صورت انداز میں رائٹر نے بہت بڑی بات کہی میری طرف سے دردانہ کو ضرور سراہیے گا، ایسی کہانیاں جس میں پرانی تہذیب کا رچاؤ ہو بہت اٹریکٹ کرتی ہیں، ویسے تو سب ہی اچھا لکھ رہی ہیں مگر کبھی کبھی کوئی تحریر آؤٹ اسٹینڈنگ لگتی ہے۔'' (ڈیئر عنیزہ آپ کی معتبر رائے ہماری رائٹرز کے لیے ایوارڈ کا درجہ رکھتی ہے، میری ہمت بڑھانے کا بے حد شکریہ)

تسنیم کوثر، کراچی سے۔ ''سب سے پہلے عقیلہ حق کے افسانے زکواۃ تو دینی ہوگی کی کیا بات ہے بہترین دلائل سے بھرپور مکمل اور جامع تحریر دل کو لگی۔ ویسے نزہت نوٹ کر رہی ہوں کہ پاکیزہ میں افسانے بہت ہی عمدہ ہوتے جا رہے ہیں، جیسے شمع تفسیر کا انعام رمضان واللہ کتنے پرفیکٹ ٹاپک پر قلم اٹھایا ہے، ہاتھ تو صرف اللہ کے سامنے پھیلایا جاتا ہے اور یہاں تو لگتا ہے کہ مانگنے کا مقابلہ ہو رہا ہے کہ فقیروں کو بھی شرم آجائے توبہ، توبہ...... (شکریہ ویسے اس دفعہ یہ سلسلہ کم رہا) اور جناب حنا بشریٰ نے چاند مسکرایا ہے بھی نہایت معصومانہ انداز میں لاجواب لکھا ہے، بہت پسند آیا اور غزالہ عزیز کا ٹھوکر پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسی بھی کیا محبت کہ خود کو بالکل ڈی گریڈ کر کے شان سے کنویں میں کود پڑی، آبیل مجھے مار ٹائپ کے افسانے دل کو نہیں بھاتے، مگر اسما قادری نے پھوہڑ بہت اچھا لکھا پڑھ کر بہت مزہ آیا، اور جناب مانگنے کی جنت طیبہ عنصر مغل کی اسٹوری تو شاندار ترین لگی۔ ویسے یہ ہمیشہ نہایت بہترین لکھتی ہیں، (جی بالکل) اسی طرح نزہت جبیں ضیا نے ہم ہیں اسیر خواب بہت اچھا لکھا ہمیں تو بہت پسند آیا۔ اور عورت کہانی تو اس ماہ کی بیسٹ کہانی لگی، ناولٹ میں نگہت سیما کا ناول کوئی شہریار وفاؤں کا، کی آخری قسط بہت اچھی لگی۔ مصنفہ مبارک باد کی مستحق ہیں، حیا بخاری کا دلکش ناول محبت لفظ ہے لیکن واقعی دلنشیں ہوتا جا رہا ہے، باقی امرت اور یہ کہاں بچیں کہ دل ہے بھی آہستہ آہستہ نکھر رہا ہے، ویسے اوورآل پاکیزہ بہترین رہا۔'' (بہت شکریہ آپ کے تبصرے رائٹرز کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث ہوتے ہیں)

نادیہ تملی، کراچی سے۔ ''انجم باجی اور عذرا رسول صاحبہ کی پُرخلوص اور بے لوث کاوشوں کا ثمر ماہنامہ پاکیزہ اب اور پھلنے پھولنے لگا ہے آپ کی نگرانی میں، اپنی نئی ذمے داریاں سنبھالنے اور پاکیزہ کا معیار برقرار رکھنے میں آپ کو مبارک دیتی ہوں کہ آپ نے اسے اپنی محنت، لگن اور خلوص سے خوب سے خوب تر بنایا ہے۔ اللہ آپ کو اور زیادہ ترقی عطا فرمائیں اور کامیابیاں دیں آمین۔ بے شک یہ ایک معیاری اور اصلاحی ڈائجسٹ ہے جو اپنے پڑھنے والوں کے لیے ایک مشعل راہ کی سی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ اس کی سبق آموز کہانیاں شعور و آگہی کے نئے در وا کرتی ہیں، اسی لیے پاکیزہ اتنا مشہور اور ہر دلعزیز ہے۔ پہلے سے زیادہ اس کا معیار بڑھتا جا رہا ہے۔ (بس آپ لوگوں کا تعاون ہے)

حدیث اختر، حاصل پور سے۔ ''پاکیزہ کو رنگ روپ دینے والی بہنا سدا یونہی اس کو سنوارتی رہنا اور ہم کو بس یہی کہنا ہے کہ ابھی آپ نے پاکیزہ کی گرتی صحت کی مالش والش کر کے پھر سے اس کو نکھار دیا ہے۔ ہر تحریر اپنی، اپنی جگہ انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہے اور جگمگا رہی ہے، اللہ اور کامیاب کرے، ہماری طرف سے آپ سب کو دلی عید مبارک......اس ماہ میرے شوہر کی برسی بھی ہے میں نے عمر کے یہ کٹھن دن اپنے پاکیزہ کی رہنمائی میں گزارے، میری رائٹرز نے مجھے زندگی جینا سکھایا۔'' (حدیث اللہ تعالیٰ کا ساتھ ہو تو ہر مشکل آسان ہوجاتی ہے)

درد راحیل، نورنگ سے۔ ''آپ بہت بہترین طریقے سے پاکیزہ سنوار رہی ہیں، مئی، جون کے شمارے میں ناولٹ کوئی شہریار وفاؤں کا زبردست تھا۔ سب افسانے اچھے تھے، ایک ریکوئسٹ ہے کہ ایک دکھیا سا ناول کسی رائٹر سے لکھوائیں۔'' (ارے لوگ تو ہلکے پھلکے افسانے پسند کر رہے ہیں، آپ دکھی ناول کا کہہ رہی ہیں آپ کا اصل نام ویسے کیا ہے؟)

عاصمہ، شریفہ اور زائشہ، اباخیل سے۔ ''ہم بہت جلد پاکیزہ پڑھ لیتے ہیں، پانچ کو مل جاتا ہے۔ اس بار ایسا لگ رہا تھا کہ کہانیاں نہیں بلکہ کلاس کے دوران مضامین کا مطالعہ کر رہے ہیں، رائٹرز سے نئے، نئے ٹاپک لکھوائیں (کیوں آپ کو

سبق آموز اور مثبت کہانیاں اچھی نہیں لگتیں تو آپ ہی موضوع بتا دیں) کہیں پر تو ہیرو، ہیروئن کو جدا کر دیا کریں۔ (پھر آپ کہیں گی کہ روتی دھوتی کہانی ہے) ایسا کہ رونا آجائے ہر جگہ ایسی ہی کہانیاں آتی ہیں، حسینہ معین سے ملاقات اچھی رہی حیا بخاری سے افسانے بھی لکھوائیں۔ (یہ تو تمام قارئین کی پسند کی ملی جلی کہانیاں شامل ہوتی ہیں)

✍ **ماریا بخاری**، کے پی کے سے۔ ’’دریا ناولٹ ٹاپ کا تھا ویلڈن...... پاکیزہ کے سارے سلسلے بہت پسند ہیں۔‘‘

✍ **زہرہ جنید**، کراچی سے۔ ’’بہت پیاری نزہت السلام علیکم (وعلیکم السلام) آپ کو میری جانب سے دلی عید مبارک، عذرا باجی کیسی ہیں انہیں سلام اور عید مبارک کہہ دیں۔ انشاء اللہ کسی وقت تفصیلی بات کروں گی۔‘‘ (جی ضرور عذرا صاحبہ آپ کو یاد کرتی ہیں، آپ کو بھی عید کی خوشیاں مبارک ہوں)

✍ **مسز یسین**، لیہ سے۔ ’’آپی طبیعت کی خرابی کے باعث اس دفعہ رسالہ پورا نہیں پڑھ پائی۔ (اللہ آپ کو صحت دے) آپ سب کو بہت، بہت عید مبارک۔ پروین افضل باجی، بہت اچھی ہیں، آپ اولاد کے لیے ہر نماز کے فرضوں کے بعد میں اول و آخر گیارہ مرتبہ درود پاک پڑھ کر اکتالیس دفعہ سورہ والشمس پڑھیں اور دعا مانگیں (جزاک اللہ)

✍ **فاطمہ**، کامرہ اٹک سے۔ ’’آج پاکیزہ بڑی دعاؤں اور بہت رونے کے بعد ملا کیونکہ لا کر دینے والا کوئی نہیں تھا۔ میاں ٹیلر ہیں اس لیے بہت مصروف رہتے ہیں تو خصوصاً ان دنوں میں۔ مجھے پاکیزہ بہت پسند ہے۔‘‘ (چلیں آپ کے رونے کا کچھ تو اثر ہوا، اب میاں بیچارے مصروف ہیں کیا کریں۔ رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ)

✍ **سعدیہ وحید سعدی**، اسلام آباد سے۔ ’’باجی بہت شکریہ آپ نے میسج کا جواب پاکیزہ میں دیا، بہت خوشی ہوئی۔ اللہ آپ کو صحت و تندرستی سے رکھے اور مزید کامیابیاں عطا کرے، آمین۔ (آپ لوگ وقت نکال کر میسج کرتے ہیں، خط لکھتے ہیں تو اتنا سا جواب تو حق ہے آپ کا)

✍ **فریدہ سیفی**، اسلام آباد سے۔ ’’میں آپ لوگوں کے رسالے کی بہت بڑی فین ہوں ہر آدمی مہنگی کتابیں خرید کر نہیں پڑھ سکتا لیکن آپ نے ہم لوگوں کا کتاب سے رشتہ برقرار رکھا ہوا ہے۔ ادب کی چاشنی سے ہمیں شناسا کرتے ہیں یہ ایک بہت بڑا کام ہے۔ (بہت شکریہ)

✍ **سیما محمد عالم**، کراچی سے۔ ’’میں پاکیزہ کی بہت پرانی قاری ہوں، لکھنا لکھانا بھی کرتی تھی مگر ریگولر نہیں...... آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے...... آپ کی بہت، بہت مہربانی اور شکریہ کہ آپ نے مجھے صرف میسج کرنے پر یاد رکھا اور میرا ذکر کیا۔ میرے والدین اور بھائی کے لیے دعا کروائی۔ اللہ پاک آپ کو اس کا اجر ضرور دے گا۔ آمین۔ اپریل اور مئی کا پاکیزہ پڑھا، بہت پسند آیا۔ خاص طور پر پپی برتھ ڈے تیمور عقیلہ حق کی کہانی، سائرہ مشال کی رئیس ڈے، نفیسہ سعید کی ماں جی، ہما بیگ کی پپی انیورسری، ہالہ احمد کی آخر تو ماں ہے غرض کہ ساری کہانیاں بہت ہی اچھی اور پسند آئیں۔ مجھے سنبل ملک اعوان اور سعدیہ ہما شیخ کا موبائل نمبر چاہیے مجھے اپنے مسئلے کے لیے ان سے رابطہ کرنا ہے۔‘‘ (ان سے پوچھ کر بتا دیا جائے گا) آپ پاکیزہ میں ایسا کوئی سلسلہ بھی شروع کریں جس میں کوئی ہنر اور ایسا کچھ بتایا یا سکھایا جائے جس سے گھر بیٹھے بھی لوگ کما سکیں...... ان کے ذریعۂ معاش کی گھر بیٹھے کوئی سبیل بن سکے۔ آپ کو اور سب بہنوں کو رمضان کی مبارک باد اور عید کی مبارک باد قبول ہو۔‘‘ (سیما صاحبہ آپ نے میسج کیا اور ہم نے بہنوں کی محفل میں ذکر کر دیا۔ یہ آپ کا ہی رسالہ ہے سب قارئین ایک خوب صورت رشتے میں بندھے ہوئے ہیں آپ کی تجویز اچھی ہے مگر...... آج کل تو بہت سے ادارے بہت کچھ سکھا رہے ہیں پاکیزہ کے ذریعے ہم ایک باہوش، باشعور اور ذمے دار انسان بنانے کی کوشش کرتے ہیں)

✍ **عائشہ گل**، حیدر آباد سے۔ ’’رمضان کی مصروفیات کے باوجود پاکیزہ وقت پر مل گیا بہت اچھا لگا۔ لمبی دوپہر اور پھر روزے کی وجہ سے دن کی فراغت، صرف تین چار دن میں ہی پورا پاکیزہ پڑھ لیا۔ بور ہوئے تو اشتہارات بھی سارے دیکھ لیے۔ کاش پاکیزہ ہر پندرہ دن بعد آتا، قسط وار ناول دونوں مجھے بہت پسند ہیں مگر جب ختم ہوں گے تو مکمل تبصرہ بھیجوں گی۔ جس میں تھوڑی سی تنقید ہو شاید تو پلیز ناراض نہ ہونا اپیاں‘‘ (تنقید ہی تو بہتری کی راہیں مرتب کرتی ہے آپ بلا جھجک لکھیں) سب سے پہلے پڑھا محبت لفظ ہے لیکن...... ابراہیم اور مینے انتقام لگ رہا ہے قدرت کا۔ حیا بخاری میری فیورٹ بن

گئی ہیں۔ کیا ان کا فون نمبر مل سکتا ہے۔ (آپ ان کے نام خط لکھ دیں رائٹر کے فون نمبر نہیں دے سکتے) طیبہ عنصر اس بار پھر آئیں اور چھا گئیں۔ جوؤں کا پڑھ کر تو میرے منہ سے بھی چیخ نکل گیا۔ باقی پاکیزہ سارے کا سارا سو پر سے اوپر رہا۔ نزہت آپی پلیز منال خان کا انٹرویو شائع کریں۔‘‘ (جی ضرور)

✍ **فریدہ جاوید فری**، لاہور سے۔ ’’پاکیزہ کیا ملا جیسے ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی۔ اس میں اپنی فیورٹ رائٹرز کے افسانے دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ عقیلہ حق اور طیبہ عنصر مغل، تمثیلہ زاہد، خولہ عرفان اور بیچاری فریدہ میرا..... ہم نام نزہت جبیں کے افسانے واہ کیا بات ہے پڑھ کر مزہ آگیا خوش رہیں۔ مجھے کچھ کہنا ہے نزہت جی بہت اچھا لکھا اور ذکیہ بلگرامی کا اللہ اور اس کا نور پڑھ کر تو دلی سکون ملتا ہے ڈائری میں اپنی شاعری دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ اپنی پیاری بھابی پروین افضل کو دوسرا انعام ملنے پر مبارک باد...... عذرا آپی آپ کو بے حد سلام دعا اور معراج صاحب اور ان کی بہن کو اللہ تعالیٰ صحت سے نوازے آمین۔ بس اتنا ہی لکھا جا رہا ہے سب کو دعا اور سلام۔‘‘ (بہت شکریہ، اللہ آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے پھر تفصیلی تبصرہ لکھیے گا) اور ہاں یہ میری بچپن کی خواہش ہوتی تھی کہ میرے نام سے ڈراما یا فلم بنے جیسے بیچاری مہر النساء جو کہ اقبال بانو نے لکھا جو کہ بے حد مشہور ہیں اور فلم کا نام جیسے حمیدہ تھا تو میں کہتی تھی کہ کاش فریدہ ہوتا اور جیسے فائزہ بیوٹی کریم ہے اور فریدہ بیوٹی کریم ہوتا مگر اب فہمی فردوس احمد جی نے میری خواہش پوری کر دی بیچاری فریدہ لکھ کر دل خوش کر دیا خوش رہو فہمی فردوس جی دل کرتا ہے کہ میں آپ کے ہاتھ چوم لوں، مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا اور پڑھ کر بے حد اچھا لگا۔ تمام بیمار جو ہیں اللہ تعالیٰ ان کو صحت یاب کرے سب کو رمضان مبارک اور عید مبارک بھی...... میرے لیے بھی سب بہنیں دعا کریں، شکریہ......‘‘ (ارے بڑی عجیب خواہش بتائی اب تو خوش ہو، بہنوں فریدہ کے نام پر ایک اور افسانہ لکھ ڈالیں کیوں ٹھیک ہے ناں......)

✍ **عظمیٰ فگار**، لکی مروت سے۔ ’’اس دفعہ پورا پاکیزہ رسالہ بیسٹ تھا۔ ہر کہانی اپنی مثال آپ تھی۔ تمام رائٹرز بہت زبردست لکھ رہی ہیں، حیا بخاری ہر قسط میں دل جیت رہی ہیں، عقیلہ حق کا ہر افسانہ بے مثال ہوتا ہے، ان کے افسانوں سے میں نے زندگی گزارنے کا ہنر سیکھا، میں ان سے بات کرنا چاہتی ہوں، (آپ ان کے نام خط پاکیزہ میں بھیج دیں)

✍ **حمنہ علوی**، ہالانیون، سندھ۔ ’’جون کا پاکیزہ پڑھا سچ پوچھیں مزہ نہیں آیا (کیوں بھئی) امرت سے شیریں کو کیا دشمنی ہے، اب تو اس پر رحم کریں ادھر رفعت سراج تنگ کر رہی ہیں کہ کہانی آگے بڑھتی ہی نہیں (ڈیئر زندگی بھی تو کبھی کسی دوراہے پر کھڑی ہو جاتی ہے ایسے ہی یہ کہانیاں بھی چلتی رہتی ہیں آگے قدم اٹھانے کے لیے یہ تو ہوتا ہی ہے ناں) حیا بخاری بھی بور کر رہی ہیں ہم تفریح چاہتے ہیں (ضرور چاہیے تفریح مگر زندگی کی حقیقتوں اور نشیب و فراز سے نبرد آزما ہونے کے طریقے بھی تو معلوم ہوتے ہیں، خیر سب کی الگ الگ پسند ہوتی ہے) ہم سائرہ رضا، سمیرا حمید، صائمہ اکرم، سحر ساجد، نایاب جیلانی کو پڑھنا چاہتے ہیں، (بس پھر تو آپ کی دعا قبول ہونے والی ہے حمنہ)

✍ **ام حمزہ**، گوجرانوالہ سے۔ ’’رمضان اور عید کے ملے جلے سرورق کے ساتھ پاکیزہ ملا دل مہک اٹھا۔ پاکیزہ یہاں کبھی لیٹ تو کبھی بہت جلدی مل جاتا ہے۔ سارا ماہ ہاکر کا راستہ دیکھنا پڑتا ہے۔ حمزہ تھا تو ہاکر کی ضرورت ہی کب پڑتی تھی۔ جن بہنوں نے دعا میں یاد کیا ان کے لیے اجر کی دعا...... پاکیزہ کی لسٹ تو روز بروز نکھرتی جا رہی ہے۔ دل خوش ہو جاتا ہے نام دیکھ کر...... سب سے پہلے محبت لفظ ہے لیکن...... یہ لڑکی تو جیسے موتی پروتی ہے قلم سے۔ ایک قسط بھی نہ ناغہ کیا نہ بور...... بہت عرصے بعد حویلی کی لال داستان بہت عمدگی سے لکھی۔ میری طرف سے حیا کو بہت پیار...... افسانے سبھی بیسٹ...... نزہت، حنا، خولہ اور تمثیلہ نے متاثر کیا...... قسط وار ناول تو وہی بات کہ نام ہی کافی ہے زبردست بھئی، انشاء اللہ پاکیزہ کی محبت بھری محفل میں حاضری دیتے رہیں گے۔‘‘ (بہت شکریہ)

✍ **عائشہ خان**، حیدر آباد انڈیا سے۔ ’’میں پاکیزہ موبائل پر پڑھتی ہوں اور میری کزن انزلہ میمن کراچی کی بدولت...... وہ اتنی محنت اور محبت سے ایک، ایک میسج واٹس ایپ کرتی ہے...... (بہت خوب بھئی) انزی پاکیزہ کے ذریعے بھی تمہیں بہت شکریہ...... نزہت جی، اور عذرا آپی، میں تقریباً دس سال سے پاکیزہ کی مستقل قاری ہوں اور آج آپ کی محفل میں حاضری کی وجہ ہے حیا بخاری کا محبت لفظ ہے لیکن...... میں نے حیا کو جب بھی پڑھا بہت اچھا لگا۔ ان کا سادہ سا انداز بیان اور سب سے بڑھ

کرنہ کسی اور ملک کی فینٹسی نہ کچھ...... پھر بھی ان کی کہانیاں دل پر اثر کرتی ہیں...... اور ان کی یہ تحریر کے لیے تو ان کا بہت، بہت شکریہ...... انتقام اور مکافاتِ عمل اور زر، زن، زمین کے پلاٹ پر بہت کہانیاں پڑھیں لیکن جس طرح یہ ناولٹ لکھا ہے یوں لگتا ہے کہ ایسے ہی خاندان کا فرد بن گئے ہیں۔ لال اینٹوں والی اس حویلی میں خود کو چلتا پھرتا محسوس کیا ہے میں نے کئی بار خود کو...... پاکیزہ سپرہٹ جا رہا ہے ماشاء اللہ...... فرحین اظفر کا لکھا بھی کمال ہے...... اور ایک درخواست بھی تھی کہ پلیز عذرا رسول کے پاکیزہ کی نئی اور پرانی رائٹرز کے بارے میں خیالات بھی شامل کریں۔ انہیں خود کس طرح کی تحاریر اور کس رائٹر کا انداز کیوں پسند ہے؟ وہ کس طرح کا پلاٹ زیادہ منتخب کرتی ہیں اور اپنی ایڈیٹر کو کتنا ہیلپ آؤٹ کرتی ہیں۔ میں اس کا شدت سے انتظار کروں گی۔'' (جی ضرور عذرا صاحبہ اکثر بتاتی تو رہتی ہیں اپنی باتوں میں اب کہ خصوصی بات چیت بھی آپ کے لیے ضرور کریں گے۔ یہ جان کر ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ آپ پاکیزہ کی مستقل قاری ہیں آپ کی قیمتی رائے کا انتظار رہے گا۔)

فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔ ''پاکیزہ کے سارے ہی افسانے، ناولٹ بہترین ادب کا نمونہ پیش کرتے ہیں مگر ایک بات رہ، رہ کر جو سوچنے پر مجبور کر رہی ہے وہ یہ کہ تقریباً ہر ایک کہانی میں ماؤں کی پریشانیاں کہ ان کی بیٹیوں کے جلد از جلد رشتے طے ہو جائیں وہ اپنے گھر کی ہو جائیں۔ آج تبصرے کے بجائے یہی ضروری بات کروں گی۔ میں حیران ہوتی ہوں کہ ماؤں نے بیٹی کی شادی کو اپنے سر پر سوار کر کے سب کو بالخصوص اپنے شوہروں کو خوب پریشان کیا ہوتا ہے...... ارے بھئی...... ربِّ ذوالجلال نے جس کام کے لیے جو وقت دن مہینہ سال مقرر کیا ہوتا ہے اسی وقت وہ کام ہو جاتا ہے، یقین کریں ہم سات بہنیں، کبھی ماں باپ نے بوجھ نہیں سمجھا۔ جس، جس کا نصیبہ جاگا، وہ اپنے گھر کی ہو گئی، نہ ماں نے راتوں کی نیند اپنے اوپر حرام کی نہ ابا نے...... بلکہ رشتہ والے آتے تو ابا ہمیں اپنے ساتھ لپٹا لیتے کہ ہم نہیں کرتے اپنی بٹیا کی شادی...... مگر وقت آنے پر ہو ہی جاتی، کسی کو اچھا ملا کسی کو بہت اچھا مگر وقت آنے پر ساتوں بہنوں کی شادیاں ہو گئیں، الحمدللہ...... بطور مسلمان ہمارا اپنے اللہ پر پختہ ایمان ہونا چاہیے کہ اس کے ہر کام میں بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے۔ بیٹوں کی شادی پر بھی لوگ ضرور کہتے کب کریں گی شادی میرا جواب یہی ہوتا جب اور جس وقت اللہ کو منظور ہوگا۔ اور الحمدللہ اسی توکل پر میرے اللہ نے بچوں کی شادیاں ہمیں کرنا نصیب کیں۔ تو میری پیاری بہنو! بچیاں پڑھ رہی ہیں، پڑھنے دیں ملازمت کر رہی ہیں کرنے دیں...... جب اللہ کی طرف سے کُن ہوگا تو جب فیکون ہو جائے گا انشاء اللہ اور خدارا بیٹیوں کو بوجھ کہہ کر ان کی سبکی نہ کریں کہ یہی بیٹیاں دس بیٹوں پر بھاری ہوتی ہیں، ہمدرد اور مشکل میں کام آنے والی یہی ''بوجھ'' ہی والدین کا بوجھ ہلکا کرتی ہیں، بس ان کے نصیب کی دعا کریں۔'' (بہت پیاری بات کی ہے توکل بر اللہ ہی تو ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے)

طیبہ عنصر مغل، راولپنڈی سے۔ ''سب سے پہلے تو میں اپنی تمام قاری اور مصنفین بہنوں کی شکر گزار ہوں جو مجھے مس کرتی ہیں، میری تحریر پڑھنے کی مشتاق رہتی ہیں، سب کو دل کی گہرائیوں سے دعا۔ بہت ہی حسین ماں جی موقع کی مناسبت سے لکھی گئی رواں تحریر، کیسے اولاد ماں کے لیے بے حسی کی انتہا تک پہنچ جاتی ہے بہترین عکاسی، سلامت رہے قلم آپ کا اور ماشاء اللہ زرخیز ذہن، نفیسہ سعید بہت ساری دعائیں، عقیلہ حق ایک ایسی مصنفہ جن کا لکھا اس بات کا مکمل ثبوت ہوتا ہے کہ تحریر یقیناً بہت خاص ہوگی تحریر پہلی بر تھ ڈے تیمور نے بہت ہی مزہ دیا اگرچہ کہانی کا موضوع ایسا تھا کہ آنکھوں میں آنسو بھی آئے لیکن اس مصنفہ کی تحریر بذاتِ خود ایک حیرت کدہ ایک طرف یہ عورت کے کردار کی پختگی اور مضبوطی کو ظاہر کر رہی ہے تو دوسری طرف بہتان باندھنے والیوں کو سمجھا گئی ہیں، کہیں اگر وہ بچت کا طریقہ سکھا رہی ہیں تو کسی جگہ وہ شکرانے کا سبق پڑھا گئی ہیں، ایک ہی تحریر میں وہ ہمیں دوسروں کی مدد کے جذبے کو بھی مہمیز کر رہی ہیں، پیار محبت کے سبق دے رہی ہیں حقوق العباد کے متعلق روشنی ڈال رہی ہیں اور سب سے بڑھ کر کیا بات ہے اندازِ تحریر کی کہ بار، بار تحریر میں ٹوئسٹ آپ کے تجسس کو ہوا دے رہا ہے، تنہا عورت بھی معاشرے میں سروائیو کر رہی ہے اور تعلیم کی کمی سے کیا پریشانی ہو رہی ہے یہ بھی اسی تحریر میں بتا دیا۔ ہما بیگ جی بھی بہت ہی قابلِ ستائش انداز میں جلوہ گر ہیں ایک حساس موضوع پر بہت روانی سے لکھا مرد ذات کی فطرت اور عورت کی معصومیت بھرے اعتماد کے نام بہت خاص تحریر، نگہت سیما جی کی تحریر نے جادو یہ کیا کر دیا کہ انتظار کرنا مشکل لگ رہا ہے کوئی شہر وفاؤں کا، واہ کیا جاندار تحریر...... دردانہ نوشین کی سدا بہار سرائے نے پرانے زمانے کی تحاریر کی یاد

دلا دی اور بہت اچھا لگا پڑھ کر مرد کے عمومی رویوں پر ہلکی سی نظر، آنکھوں میں آنسو لے آئی کیوں عورت عمر بھر سینت کر گھر بناتی ہے، آہ ارجمند بیگم درد آئے گا دبے پاؤں اچھی کہانی تھی کچھ اتفاق رنگ تھا لیکن افسانہ تو اتفاقات سے ہی وجود میں آتا ہے۔ ہالہ احمد نے مختصر لکھا لیکن پُر اثر لکھا۔ سیما رضا ردا میرا خیال ہے آپ اجنبی نہ بنا لکھتی رہا کریں کتنے حساس موضوع پر لکھا جس کی ضرورت بھی ہے فی زمانہ کہ آج کل لڑکے منگنی کے فوری بعد فون پر بات کرنے کی ضد کرتے ہیں اور ہم جیسے والدین یہ نہیں مانتے پھر چاہے کوئی ہمیں کنزرویٹو کہے۔ رئیس ڈے پڑھتے مجھے پچھلے سال یکم مئی کی اپنی ایک نظم کی نثر کا احساس ہوتا رہا بالکل یہی چیزیں میں نے بھی محسوس کی تھیں اور نظم میں اتار دی تھیں۔ فرحین اظفر تو حروف تہجی کو لے کر عورت کے المیوں پر کمال اظہار کر رہی ہیں اس بار تو میلا لوٹ لیا، ہاجرہ ریحان کی تحریر میں بھی پرانی تحریروں کی چاشنی تھی اور مرد کا ایک اور مکار روپ بھی...... تعویذِ حب اچھی تحریر رہی جملے اور اقتباسات متاثر کن تھے لیکن کہانی بس اچھی تھی۔ نبیلہ نازش راؤ سلامت رہو اچھی تحریر اور رواں اور سادہ بیانیہ دل پر اثر کر گیا مبارک باد۔ ایک دن نادرہ کے ساتھ عمر بھر کے لیے آنسو دے گیا اف بہت دلگداز تحریر مصنفہ کو میرا اسلام...... عالیہ حرا کا مکمل ناول بھی اچھا لگا۔ بس طوالت کبھی، کبھی تکلیف دہ بن جاتی ہے۔ محبت کی راہ گزر پر قرۃ العین کی تحریر اچھی تھی امید ہے اگلی بار بہت اچھی اور بامقصد تحریر لائیں گی مزید پختگی کے ساتھ۔ تبصرہ بہت طویل ہو گیا ہے باقی سرورق سے لے کر اشتہارات تک پاکیزہ جیسا کوئی نہیں ہے یہ بات پکی ہے پاکیزہ ٹیم کو بہت مبارک باد...... قسط وار کہانیوں والی رائٹرز کے تو ہاتھ چومنے کا دل چاہ رہا ہے، رفعت سراج، حیا بخاری، اور پیاری شیریں حیدر بہت لاجواب دل خوش کر رہی ہیں۔'' (بہت شکریہ طیبہ تھوڑی بہت قینچی تو چلتی ہے ناں بھئی......)

آسیہ عامر، کراچی سے۔ ''جو کہوں گی سچ کہوں سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی۔ سب سے پہلے اسما قادری کا پھوہڑ پڑھ کر دل اتنا دکھا کہ اگر اچھی ساسیں مل جائیں تو بہویں نامراد مل جاتی ہیں، ایسی ساسیں کہاں ہوتی ہیں کہ بہو کی فیلنگز کو سمجھ کر ساتھ مدد کرے اور اسما جی میوہ بھری پوری بنانے کی ترکیب کا شکریہ سردی میں ٹرائی ماروں گی (جی ضرور) اس کے بعد انٹرویو پڑھا حسینہ معین صاحبہ کی تعریف تو سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے کتنی پیاری بیٹی ہیں کہ BA تک اپنی ماں کی پسند کے کپڑے پہنتی رہیں آپس کی بات ہے میں ابھی تک اپنی امی کی پسند کے کپڑے پہنتی ہوں (اچھا) امرت شاندار جا رہا ہے اور شیریں جی گھر تو بڑا خوب صورت دلایا ہے امرت کو دعا کریں اسے خوشیاں بھی مل جائیں، ویسے صبر کا پھل ملنا تو شروع ہو گیا ہے، عقیلہ جی جیسا کہ آپ کے نام کا مطلب ہی سمجھدار عورت ہے آپ نے بہت اچھے موضوع پر لکھا لیکن یہ ٹھیک ہے کہ جس کے پاس دو تولہ سونا ہے وہ زکوٰۃ نہیں لے سکتا لیکن زکوٰۃ بھی اسی پر واجب ہے جس کے پاس ساڑھے سات تولہ سونا ہے، ویلڈن شمع تفسیر آپ نے صحیح کیا رمضان المبارک کا مہینہ تو عبادت کا ہے جو رحمتیں ہم گھر بیٹھے وصول سکتے ہیں وہ انعام ادھر ادھر کہاں اور شوز کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے۔ یہی لگتا ہے ماڈرن فقیر گھس آئے شو میں۔ مجھے تو یہ حرکتیں دیکھ کر ہی شرم آ جاتی ہے۔ بھٹکے ہوئے مسافر اب تو ہر طرف یہی حال ہے روزہ ہو نہ ہو دستر خوان لمبا چوڑا سجتا ہے وہ بھی روزے دار بہو کے ہاتھ کے بنے ہوئے پکوانوں سے۔ بیچاری فریدہ خدا کا واسطہ ہے ساس، بہو کے رشتے کو اتنا ڈراؤنا نہ بنا کر پیش کیا کریں کہ ہمیں بہو سے ہی خوف آنے لگ جائے حالانکہ ابھی بہو آنے میں کافی لمبا عرصہ درکار ہے یہ تو سب جانتے ہیں کہ آم کی گٹھلی اگائیں گے تو جامن کا پیڑ نہیں اگے گا اس میں سے آم ہی اگیں گے۔ اب اس رشتے کی خرابیاں کس طرح دور کی جائیں یہ سمجھایا کریں کیونکہ پاکیزہ پڑھنے والی بچیاں اس سے زیادہ اثر لیتی ہیں۔ (اسی لیے تو دیتے ہیں ایسی کہانیاں کہ منفی نہیں مثبت پہلو دیکھو) مانگے کی جنت، طیبہ عنصر مغل کا کہانی شروع شروع ہی انجام نظر آ گیا تھا پرانا آئیڈیا ہے، لیکن سبق اچھا تھا۔ ارم کمال نے عہد و پیام اچھا لکھا پڑھ کر مزہ آیا نیچے سے اوپر (پاکیزہ ڈائری میں) سنگ، سنگ چلیں میں نرگس نسیم نے اپنے دکھوں کے متعلق بتایا تو پیاری بہن پاکستان کی نوے فیصد عورتوں کو سسرال والے کام والی سمجھ کر رکھتے ہیں اور جب بچے چھوٹے ہوتے ہیں صحیح طرح کام کاج خدمت مدارات نہیں کر سکتیں تو ہر عورت کے ساتھ یہی ہوتا ہے اسی لیے میں نے پہلے لکھا کہ اب اس بارے میں مثبت لکھا جائے تاکہ ہم بہویں ہی اپنا آپ بدلیں ہماری سوچ اچھی ہوگی تو دیر سے سہی گھر کا ماحول اچھا ہو جائے گا۔ اس میں چاہے زندگی کے خوب صورت دن ہی کیوں نہ گزر جائیں حیا بخاری کا تبصرہ بہت اچھا لگا ان کا

ناولٹ بھی اچھا جا رہا ہے تحفۂ عید بھی اچھا ہے۔'' (تبصرے کا شکریہ)

ایمن رائی، کمالیہ سے۔ ''سالگرہ نمبر اپنی مثال آپ تھا، بہنوں کی محفل میں کمالیہ سے ساجدہ ظفر کے ساتھ ، ساتھ مجھے اور حمنیٰ قندیل کو بھی یاد رکھا۔ اور بزم پاکیزہ میں ہمارے انعام جیتنے کا بھی ذکر کیا۔ آپ کا بے حد شکریہ آپی آپ کی یادداشت پر بے اختیار منہ سے داد نکلی آپ کا بے حد شکریہ......'' (امید ہے انعام بھی مل گئے ہوں گے)

سلمیٰ غزل، کراچی سے۔ ''اس مرتبہ ہر افسانہ انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ اور اتفاق سے گزشتہ مرتبہ شادی تو اس مرتبہ زکواۃ موضوع رہا جو درست جامع اور ایمان افروز تھا۔ عین ضرورت کے مطابق عقیلہ حق تو چھا گئیں، انعام رمضان غنیمت لگا حنا بشریٰ کا چاند مسکرایا ہے بھی بہتر رہا۔ غزالہ عزیز نے ٹھوکر میں بزرگوں کا کہنا نہ ماننے والوں کو اچھا سبق دیا، اسما قادری ہمیشہ خوب لکھتی ہیں، مریم شہزاد نے طریقے سے ساس کو سبق دیا لیکن اس طرح کے شوہر کہانیوں میں ہی ملتے ہیں، بیچاری فریدہ نے بالکل مزہ نہیں دیا اتنا طویل افسانہ، مانگے کی جنت، طیبہ عنصر مغل نے خوب لکھا مگر حقیقت سے کوسوں دور ناقابل فہم ناقابلِ یقین...... کم از کم میاں، بیوی کے درمیان یہ ممکن ہی نہیں کہ مصنوعی ناخن، پلکیں اور بال چُھپ سکیں کیونکہ یہ میاں بیوی کا رشتہ ہے بہت نزدیک کا دور کا نہیں...... بھٹکے ہوئے مسافر مقصدی افسانہ مگر کاش ساسیں اس سچائی کو ہضم بھی کرلیں کہ حرا نے کچھ زیادہ ہی تلخی سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ نگہت سیما اور حیا بخاری نے کمال کا لکھا ہے مگر حیا بخاری نے ضیا پر اعتماد دکھا کر زیادتی کر دی لالہ سے اس بے وقوفی کی امید نہ تھی مگر پھر ناول آگے کیسے بڑھتا حسینہ معین کا انٹرویو کوئی خاص نہیں لگا پتا نہیں بہت سارے سوال ان سے کیے ہی نہیں گئے یا انہوں نے جواب دینا پسند نہیں کیا۔ (رائٹر کی مرضی ہوتی ہے جو سوال کے جواب نہ دینا چاہیں نہیں دیتیں ان پر زور نہیں) یقین کیجیے نزہت رمضان شریف کا شیڈول اتنا سخت ہوتا ہے کہ اس میں رسالہ پڑھنے کے لیے وقت نکالنا میں اپنی ہمت کی خود داد دیتی ہوں کیونکہ یہی مہینہ ہے جب ہم دل کھول کر عبادت اور تسبیحات کرتے ہیں (جی بالکل) نیند بھی پوری نہیں ہوتی اور یقین بھی نہیں ہوتا کہ اگلا سال نیچے ہوگا کہ اوپر ہوگا اس لیے جتنی عاجزیاں اور عبادتیں کرلی جائیں غنیمت ہے۔ (جی یہ تو ہے)

یاسمین کنول، پسرور سے۔ ''ماڈل کا بہت ہی پیارے انداز میں آنکھیں جھکائے سرورق پر آنا کمال کر گیا۔ جیولری زبردست رہی، میک اپ زیادہ اور نہ ہونے کی وجہ سے پیارا لگ رہا تھا۔ علاوہ ازیں ہیر اسٹائل بھی نمایاں رہا۔ الغرض سرورق گرین شیڈ میں بہت دلکش لگا آخر سالگرہ نمبر 2 تھا۔ ٹائیفائیڈ کی وجہ سے پاکیزہ سے کافی ماہ دور رہی اب طبیعت کچھ بہتر ہے۔ پاکیزہ کی سالگرہ کی مبارک باد قبول فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ اسے دن دگنی رات چگنی ترقی دے۔ (بہت شکریہ اللہ آپ کو صحت سے رکھے) مجھے کچھ کہنا ہے اداریہ میں آپ نے کراچی کی گرمی کا ذکر کیا تو خبروں میں اس کی تصدیق ہو رہی ہے واقعی کراچی ان دنوں سخت گرمی کی لپیٹ میں ہے اللہ اپنا کرم کرے، رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہو چکا ہے اللہ تعالیٰ اس کی برکات سے فیض یاب فرمائے۔ (آمین ثم آمین) عنیزہ سید کا افسانہ درد آئے گا دبے پاؤں، بہت دکھی کر گیا، ایسے اتفاقات بھی دنیا میں ہوتے ہیں زندگی کی اک تصویر ہے۔ ماں کے حوالے سے یمنیٰ احمد کی نظم پسند آئی ماں تجھے سلام تمثیلہ لطیف کی اچھی کاوش ہے۔ کوثر خالد کی نظم تجلیاں عقیدت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بہنوں کی محفل اچھی لگی روحانی مشورے پسند آئے۔ باجی انجم انصار یاد آئیں سالگرہ کے لیے خصوصی اہتمام کیا کرتی تھیں آپ نے بھی مجھے یاد کیا ہے وہ اپنی بہنوں کو بہت پیار سے بلایا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے پسرور کی شہزادی کہا تھا میں اتنے میں ہی خوش ہو گئی تھی ہر انسان حوصلہ افزائی پسند کرتا ہے۔ عزت کی تمنا کرتا ہے اللہ تعالیٰ انجم انصار صاحبہ کو صحت و تندرستی کے ساتھ طویل عمر دے۔ آمین ثم آمین۔'' (جی، پاکیزہ کی محبت بھری روایات ہمیشہ برقرار رہیں گی انشاء اللہ)

پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ''اس بار پاکیزہ مئی کا شمارہ سالگرہ نمبر دو عظمٰی کے سرورق سے سجا میں نے پڑھا، دین کی باتیں اللہ اور اس کا نور پڑھ کر روح کو غسل دیا مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے کراچی کے حالات کا بتایا اللہ تعالیٰ اپنا رحم فرمائے۔ (ارے لوڈ شیڈنگ تو پورے ملک کا المیہ ہے) مبارک مہینہ شروع ہو چکا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس کا احترام اور اپنی عبادت کرنے کی توفیق دے اور حقوق العباد بھی پورے کرنے کی توفیق دے، آمین۔ پاکیزہ کے مہمان

میں شیف ثمینہ جلیل سے ملاقات پسند آئی آپ سے گزارش ہے کسی ٹی وی آرٹسٹ سے بھی ملاقات کرا دیں۔ (اس دفعہ آپ کی خواہش پوری ہوئی۔) سنگ، سنگ چلیں میں بہنوں کے جوابات پسند آئے۔ ایڈووکیٹ سعدیہ ہما شیخ کے بارے میں اپنے میاں جانی سے جیسا سنا تھا انہیں ویسا ہی پایا۔ میرے میاں نے انہیں اسلام آباد میں ایک تقریب میں دیکھا تھا ان کی تعریف کی تھی واقعی یہ تعریف کے قابل ہیں۔ سعدیہ ایوارڈ کی اور بیٹی نور العین کے ٹاپ کرنے پر مبارک باد قبول کریں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ معراج رسول صاحب کو اور میری نند فریدہ جاوید فری کو اور اپنہ عندلیب کو صحت دے۔ آمین...... اللہ تعالیٰ آپی عذرا رسول کی پیاری ممانی جان کو جنت میں جگہ دے، آمین۔ رابعہ عمران چوہدری دس سال بعد دوبارہ ہمیں آپ کو دیکھ کر خوش ہوئی۔ (ڈیئر آپ کے مراسلات لگتے رہتے ہیں، تبصرے کا شکریہ)

غزالہ عمران، مرید کے لاہور سے۔ ''خوب صورت سرورق سے سجا پاکیزہ ملا۔ میری طرف سے سب پڑھنے والوں کو مبارک باد اور آپ سب محنت کرنے والوں کو بھی اللہ سلامت تا قیامت رکھے، اپنا پسندیدہ، یہ کہاں بچیں کہ دل ہے بڑی بے تابی سے پڑھا۔ بہت پسند آیا اس کے بعد جلدی سے بہنوں کی محفل میں دوڑ لگائی۔ عذرا آپی کی خوب صورت باتیں، رائٹرز کو خراج تحسین اور نزہت آپی آپ نے تو سالگرہ نمبر میں خوب محنت کی تمام رائٹر کے نام لے لے کر یاد کیا۔ جو اس دنیا میں نہیں اللہ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے، جنت میں ان کے درجات بلند کرے۔ باقی سب رائٹرز اور ریڈرز کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ بہت خوب صورت محفل جہاں سے جانے کو دل نہیں کرتا، سب بہنوں کی باتیں، یادیں، خوب صورت انداز۔ رضوانہ پرنس خوب صورت مسکراہٹ کی مالک ہیں، ماشاء اللہ خود بھی بہت اچھی ہیں، ہاں اپنے شوہر کے ساتھ ان کی تصویر نہیں، ان کو اور ان کے بچوں کو اللہ پاک صحت و سلامتی سے رکھے۔ بنت سحر، سحر ساجد، اور حیا بخاری کی خوب صورت تحریریں ..... دل کو چھو گئیں، شیریں حیدر کا امرت بھی خوب صورت جا رہا ہے، بزم پاکیزہ کے دلچسپ سوالات اور تیکھے جوابات ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ روحانی مشورے لازمی پڑھتی ہوں ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔'' (بہت شکریہ)

حمیرا اقبال، کراچی سے۔ ''اس دفعہ کا پاکیزہ ہمیشہ کی طرح سے بہت خوب صورت لگا، ہر کہانی اپنی جگہ خوب تھی...... رائٹر کا انداز تحریر ہی تو ہوتا ہے جو پڑھ کر دل میں جگہ پاتا ہے اور پھر شخصیت کو بدل دیتا ہے اور نکھار پیدا کرتا ہے۔ غزالہ عزیز کا افسانہ ٹھوکر ایک اچھی کاوش تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ ٹھوکر کھا کر ہی بندہ سنبھلتا ہے لیکن عقلمند انسان وہی ہے جو دوسرے کے تجربے سے سیکھ کر اپنی زندگی کو بہترین طریقے سے گزارتا ہے اور اپنی زندگی کو ایسے بنانا چاہیے کہ دوسرے اس سے سبق حاصل کر کے اس سے راہ ہدایت پائیں۔ (جی بالکل درست کہا) عقیلہ حق نے زکواۃ تو دینی ہوگی بہت اچھا افسانہ لکھا...... ایسی تحریروں سے ایمان تازہ ہوتا ہے اور جن کو آگاہی نہیں ان کو بھی آگاہی ہو جاتی ہے۔ بہت خوب عقیلہ...... ہم ہیں اسیرِ خواب، نزہت جبیں ضیا کا افسانہ بھی اچھا تھا، ہلکی پھلکی تقریباً ہر گھر کی کہانی تھی۔ حنا بشریٰ کا افسانہ بھی بہت اچھا لگا، با مقصد، اچھے کام کے لیے ثابت قدم رہنا چاہیے چاہے کتنی بھی رکاوٹیں آئیں ہر اچھے کام کے لیے اللہ مدد کرتا ہے۔ عید کی مناسبت سے دیگر رائٹرز جیسے مریم شہزاد، شمع تفسیر، شمسہ الطاف کی کہانیاں بھی خوب رہیں۔ طیبہ عنصر مغل نے مانگے کی جنت میں ہمیں بہت اچھا سبق دیا ہے کہ شوق وہ کرو جو آپ کو تکلیف نہ دے، ایسے شوق نہ کرو جو ہمارے لیے بعد میں باعثِ شرم ہوں اور ہمیں مسلسل تکلیف میں رکھیں اور آپ کم از کم یہ تو سمجھیں کہ آپ مسلمان ہیں اور اسلام کی رو سے آپ پر یہ فیشن جائز ہے یا نہیں لیکن بہر حال بہت اچھا افسانہ تھا طیبہ عنصر مغل صاحبہ کا۔ اسما قادری کی کہانی پھوہڑ پڑھ کر بہت اچھا سبق ملا...... ان کی کہانی سبق آموز ہوتی ہے اور بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔ شیریں حیدر، رفعت سراج، حیا بخاری، نگہت سیما کے ناول اور ناولٹ سے سجا پاکیزہ اس گرمی میں بھی ہمیں راحت و سکون دے گیا۔ مستقل سلسلے سارے ہی بہترین اور زبردست رہے۔ جن میں ... سرِ فہرست ذکیہ بلگرامی، اختر شجاعت صاحبہ ہیں، جن کی تحریر ہمارے ایمان کو مزید مضبوط بنا دیتی ہے۔ حسینہ معین سے ملاقات بہت شاندار رہی۔'' (بہت شکریہ دقیق سے تبصرے کا)

مسز زاہد، اسلام آباد سے۔ ''انجم انصار کے بعد نزہت اصغر آپ نے بہت خوش اسلوبی اور ذمے داری سے پاکیزہ سنبھالا ہے۔ (بہت شکریہ سراہنے کا) اس میں شامل کہانیوں کے موضوعات نہایت مختلف اور پُر اثر ہیں، باقی کے سلسلے

بھی اچھے ہیں، اللہ آپ کو پاکیزہ کی بہتری کی ان کوششوں میں کامیاب کرے، آمین۔ عذرا رسول صاحبہ کی گفتگو پڑھ کر لگتی ہے جیسے وہ سب سے سامنے ہی بات کر رہی ہوں، سالگرہ نمبر تو دونوں اچھے تھے اور اب جون میں رمضان اور عید کے حوالے سے جو کہانیاں تھیں وہ سب ہی پسند آئیں۔ نئے نام نظر آتے ہیں مگر تحریر سے لگتا ہے کافی تجربہ کار ہیں، کبھی اسلام آباد آنا ہو تو ضرور بتایئے گا۔'' (جی ہاں ضرور، مختصر سے خط کا شکریہ)

✍ کراچی سے ایک حساس قاری کہہ رہے ہیں۔ ''شیریں حیدر نے امرت میں طلاق جیسے شرعی مسئلے کو اتنی آسانی سے طے کر دیا۔ ہم نہیں چاہتے کہ اتنا اچھا جریدہ متنازع ہو پاکیزہ میں اس طرح کے موضوع ڈسکس نہ کیے جائیں تو بہتر ہے۔'' (اس مرتبہ شیریں حیدر نے تفصیلی جواب دیا ہے۔ ہماری رائٹرز مکمل تحقیق اور تصدیق کے بغیر ان مسائل کو فوکس نہیں کرتیں۔ یہ بڑی ذمے داری ہوتی ہے جس سے وہ آگاہ ہیں)

✍ **عاصمہ**، تیمر گرہ سے۔ ''حیا بخاری کا ناولٹ پسند ہے، دین کی باتیں بہت زبردست، اداریہ پسند آتا ہے۔ سلسلے وار ناول بھی پسند ہیں۔ میں نے بہت کچھ سیکھا ہے، بہت اچھا ہے پاکیزہ۔'' (بہت شکریہ)

✍ **اقرا فاطمہ، ارم فاطمہ**، لاڑکانہ سے۔ ''پاکیزہ بہت بہت اچھا لگتا ہے۔ میری امی بھی پڑھتی ہیں، ہم اس سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔'' (شکریہ، تبصرہ بھی لکھیں)

✍ **زینب فاطمہ**، پشاور سے۔ ''پاکیزہ میرا پسندیدہ رسالہ ہے، حیا بخاری کا ناولٹ زبردست جا رہا ہے۔''

✍ **شمع فلک**، ڈری غظیم خان سے۔ ''جون کا پاکیزہ پڑھ کر اچھا محسوس ہوا، میری پسندیدہ رائٹرز کے افسانے ناول سب کچھ وہی لگا جو دو سال پہلے تھا۔ میں جب باہر جا رہی تھی تو مجھے یاد ہے آپ نے ثمینہ عظمت علی کا انٹرویو کیا تھا۔ وہ آئے بزم میں...... ماشاءاللہ سے آپ نے بہت احسن طریقے سے چلایا۔ اور اب پاکیزہ میں مدیرہ کے طور پر بھی سپر جا رہی ہیں، اللہ پاک آپ کو ترقی دے۔ (بہت، نوازش) پاکیزہ کی قیمت بے شک بڑھا دیں مگر اس کے صفحات کم نہ کریں اس طرح کافی کچھ ادھورا رہ جائے گا۔ (جی انشاءاللہ غور کریں گے صفحات پر بھی) رمضان کے حوالے سے اس شمارے میں زبردست ڈشز بنانے کی ترکیبیں تھیں۔ باقی سلسلے پاکیزہ ڈائری، شعر و شاعری، غزلیں، سوالات، روحانی مشورے زبردست تھے۔ بہنوں کی مصروفیاتِ زندگی سے بھی آگاہی ہوئی۔ ایک اچھا معیاری ڈائجسٹ پیش کرنے پر آپ مبارک باد کی حقدار ہیں۔'' (بہت شکریہ، یہ سب آپ لوگوں کا تعاون ہے)

✍ **حمیرا وحید**، واہ کینٹ سے۔ ''اللہ پاک زندگی کے اتار چڑھاؤ میں آپ کو کامیابی عطا فرمائے۔ آمین! پاکیزہ کے تمام سلسلے ہی اچھے ہیں مگر قسط وار ناول بہت زبردست جا رہے ہیں، افسانے بھی معیاری اور اچھے ہوتے ہیں۔ میری طرف سے تمام قارئین اور پاکیزہ کے رائٹرز کو رمضان المبارک اور عید کا مہینہ مبارک ہو، اللہ پاک ہمارے تمام کبیرہ و صغیرہ گناہ معاف فرمائے، اس مہینے کے صدقے اور تمام بیماروں کو شفائے کاملہ عطا فرمائے خاص طور پر معراج صاحب کو صحت و تندرستی عطا فرمائے، آمین) '' (دعا کے لیے جزاک اللہ)

✍ **تمنا بلوچ**، عمر کوٹ، سندھ سے۔ ''پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں بہت اچھا جا رہا ہے، اللہ اور اس کا نور دین کی باتیں میری فیورٹ ہیں، ناول تو بہت بہترین ہیں، ہم گاؤں میں رہتے ہیں مگر بہت شوق سے پڑھتے ہیں، مجھے بہنوں کی محفل بہت پسند ہیں۔ عذرا آپی بہت اچھی لگتی ہیں، ان کی باتیں بہت اچھی ہوتی ہیں، پاکیزہ کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ آپ کی باتیں بھی بہت اچھی ہوتی ہیں عمل بھی کرتے ہیں آپ اسی طرح پاکیزہ کو اچھے سے اچھا بناتی رہیں۔'' (اتنی تعریفوں کے لیے بہت شکریہ...... بس آپ لوگ پاکیزہ پڑھتی رہیں اور اس سے اچھی، اچھی باتیں سیکھتی رہیں۔)

✍ **ماہا سعید**، منگلا سے۔ ''آپی پاکیزہ بہت زبردست ہو گیا ہے، محبت لفظ ہے لیکن...... حیا بخاری کیا کمال کا لکھ رہی ہیں، پلیز ایک ریکوئسٹ لیے پہلی بار شرکت کر رہی ہوں کہ لالہ اور ضیاء کے ساتھ کچھ برا نہ کیجیے گا۔ میرا کسی بھی ڈائجسٹ میں یہ پہلا تبصرہ ہے پلیز میری بات مان لیجیے گا۔'' (پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ارے آپ پڑھتی جائیں دیکھیں حیا کہانی کو کس منزل تک پہنچاتی ہیں، کردار کا حتمی انجام تو دکھانا ہوتا ہے۔)

✉ **فائزہ شیخ**، سلونی...... رسالہ پسند کرنے کا شکریہ آپ تفصیلی رائے بھی ضرور دیں اور مراسلات بھی بھیجیں۔

✉ **حریم فاطمہ**، لاہور۔ پاکیزہ پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ رسالہ باقاعدگی سے پڑھتی رہیں اور رائٹرز سے سیکھ کر کہانی لکھیں، جتنا اچھا مطالعہ اتنا اچھا بیان۔

✉ **حمیرا تبسم**، مقام نامعلوم۔ آپ امتحان کے باعث مصروف رہیں اب اپنی رائے ضرور بھیجیے گا۔

✉ **نسیم ناہید رحمان**، پشاور۔ آپ پہلے خوب مطالعہ کریں پاکیزہ کی کہانیوں کا اندازِ بیاں دیکھیں پھر لکھیں۔

✉ **سمیرا سرفراز**، کراچی۔ آپ کو جلد ہی کہانی کی اشاعت کے بارے میں مطلع کر دیا جائے گا۔ پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ۔

✉ **آغا اویس احمد**، زبیر عباس۔ میرپور خاص رسالے کی پسندیدگی کا بہت شکریہ...... یہ اچھی بات ہے کہ پاکیزہ آپ کی ہر طرح رہنمائی کرتا ہے۔

✍ **صبا آصف**، کراچی سے۔ ''مئی کا شمارہ گو کہ کافی دیر سے ملا لیکن حسین سرورق دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی، سالگرہ نمبر 2 سالگرہ نمبر ایک سے زیادہ شاندار اس کے لیے آپ کو کتنی محنت کرنی پڑی اس کا ہمیں احساس ہے اور خوشی بھی کہ آپ اس میں کامیاب رہیں اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ کامیابی دے (آمین ثمہ آمین) مجھے کچھ کہنا ہے ہمیشہ کی طرح شاندار اس بار کچھ مزاح کا رنگ لیے ہوئے جملوں نے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی واہ کیا جملے اس گرمی کو مزید گرمانے میں ہمارا بجلی کا محکمہ...... ذخیرہ کرنے کو ملک میں اور مال جو ہے آپ طنز و مزاح لکھیں سچ بہت کامیاب رہیں گی (مفت مشورہ) (بہت شکریہ مشورے پر غور کیا جا سکتا ہے) مزدور ڈے کے حوالے سے تلخ حقیقت بیان کی واقعی ایسا ہی ہوتا ہے، ماہ شعبان کے حوالے سے بھی معلومات حاصل ہوئیں۔ بہنوں کی محفل کے آغاز میں عذرا رسول صاحبہ سے ملاقات ہوئی ان کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ اللہ سے دعا ہے ماہ مبین اور معراج رسول صاحب دونوں کو شفائے کلی عطا فرمائے۔ آمین...... ان کی بیماری کے دوران عذرا رسول صاحبہ کی ہمت کو داد دینے کو دل چاہتا ہے ایک اچھی بیوی بلکہ بہترین بیوی کے یہی اوصاف ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر دے، آمین...... پاکیزہ کی سالگرہ کے موقع پر نگہت آصف کی نظم بہت اچھی لگی، انجم کے لیے ظل شاہین کی نظم بہت اچھی لگی۔ ماں کے حوالے سے ماں تجھے سلام، کلام تمثیلہ لطیف اور یمنیٰ احمد کی نظم ماں پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ عقیلہ کا افسانہ پپی برتھ ڈے تیمور بہت اچھا تھا۔ بچے ساتھیے ہوتے ہیں فرح نے ثابت کر دیا۔ رئیس ڈے سائرہ مثال کا افسانہ تلخ حقیقت کی عکاسی کرتا ہوا نفیسہ سعید ماں جی بہترین تحریر حقیقت سے بہت قریب اور یہ حقیقت دل کو دکھاتی ہوئی ویلڈن نفیسہ سعید......''

☆☆☆

اچھا تو پیاری بہنو! اب اجازت چاہتے ہیں انشاءاللہ اگلے ماہ آب و تاب اور سج دھج سے آپ کے پیارے نامے لیے پھر حاضر ہوں گے۔ پروردگار ہم سب کو صحت و سلامتی سے رکھے اور اے ہمارے رب اپنے پیارے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ کے صدقے میں ہمارے گناہانِ کبیرہ، صغیرہ کو معاف فرما، ہماری توفیقاتِ دینی میں اضافہ فرما اور ہمارا خاتمہ ایمانِ کامل پر ہو بے شک تو علیٰ کُلِّ شئی قدیر ہے۔

آپ کی خیر خواہ

نزہت اصغر

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783,021-35802552 EXT 107,118

پاکیزہ ڈائری



عظمیٰ آفاق سعید

حمد

الٰہ کہوں یا علّتِ اولیٰ کہوں اسے
یزداں کہوں یا ایزدِ اعلیٰ کہوں اسے
وہ متمکن علی العرش العظیم ہے
وہ ذوالجلال والاکرام ہے
لا یزال اور آفریدگار ہے وہ
مجیب الدعوات اور معبودِ حقیقی ہے وہ
واحداور ہستیِ مطلق ہے فقط رب تعالیٰ کی ذات
متبرک اور معبود ہے فقط رب تعالیٰ کی ذات
وہ رزاق اور مسبب الاسباب بھی ہے
وہ حکیم، کریم، رحیم اور بصیر بھی ہے
حکمت، نیکی اور عدل سب اسی سے ہے
حق، محبت اور رحم سب اسی سے ہے
وہ منعم حقیقی اور خالقِ کل کائنات ہے
وہ علاّم الغیوب اور محافظِ حقیقی ہے

کاوش، نعیم حیدر

انتخاب: صبانور، لیہ

نعت رسول مقبول

تصویر میں مصور خود آپ جگمگائے
صورت تو ہے بشر کی سایہ نظر نہ آئے
کعبے کا ہے وہ کعبہ دربار مصطفیٰ
جبرائیلِ امین جہاں پر قرآن لے کر آئے
کملی ہے کالی انؐ کی وہ نوری نور والے
سب ہی جہانوں پر ہیں رحمت وہ بن کر آئے
بھیجے درود انؐ پر ربِ جلیل خود سے
اعلیٰ ہے ذات انؐ کی انؐ پر سلام آئے
ہیں حبیبِ کبریا وہ ہوئی ختم انؐ پہ نبوت
مقتدی نبی تھے سارے، وہ امام بن کے آئے

شاعر: صوفی اللہ دتہ

مرسلہ: ہمشیرہ قاسم، مغل پورہ لاہور

احادیث نبویؐ

☆مصعب بن سعد اپنے والد حضرت سعدؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم رسولؐ کی خدمت میں حاضر تھے تو آپ نے فرمایا ”کیا تم میں سے کوئی ہر دن ہزار نیکیاں کرنے سے عاجز ہے؟“ آپؐ کی خدمت میں حاضر صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے پوچھا ”ہم میں سے کوئی آدمی ہزار نیکیاں کیسے کرسکتا ہے؟“ آپؐ نے فرمایا ”جو آدمی (سبحان اللہ) 100 مرتبہ پڑھتا ہے اس کے لیے ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں یا اس کی ہزار خطائیں مٹا دی جاتی ہیں۔“

صحیح مسلم حدیث نمبر 6747

نبی کریمؐ نے فرمایا ”جب اللہ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو جبرائیلؑ کو آواز دیتا ہے کہ اللہ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو۔ جبرائیلؑ بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر وہ تمام آسمان والوں میں آواز دیتے ہیں کہ اللہ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو پھر تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد وہ زمین میں بھی (اللہ کے بندوں کا) مقبول اور محبوب بندہ بن جاتا ہے۔“

صحیح بخاری شریف 6040

میٹھے الفاظ

ہمیشہ میٹھے الفاظ بولو تاکہ کبھی واپس لینے پڑیں تو کڑوے نہ لگیں۔ (حضرت علیؓ)

از: سعدیہ وحید سعدی، اسلام آباد

سنہری باتیں

☆سخی کبھی مفلس نہیں ہوتا۔ کیونکہ جو مخلوق میں جتنا بانٹتا ہے اللہ اسے اتنا ہی نوازتا ہے۔ (قولِ حضرت علیؓ)

☆اچھے انسان کی تعریف کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا۔

☆دولت اور عہدے انسان کو عارضی طور پر بڑا کرتے ہیں لیکن...... انسانیت اور اچھا اخلاق انسان کو ہمیشہ بلند درجے پر رکھتا ہے۔

☆جو لوگ دوسروں کے درد کو محسوس کرتے ہیں وہ دوسروں کے لیے درد کی وجہ نہیں بنتے۔

☆قربِ الٰہی کے راستوں پر چراغاں کرنے والے موتی انسان کے آنسو ہیں۔ ان چراغوں اور موتیوں کی قیمت یہ ہے کہ ان کا خریدار خود پروردگار ہے۔ سبحان اللہ!

از: نادیہ، راول پنڈی

نماز اور اذان

برسوں سے دنیا میں سب سے زیادہ سنی جانے والی آواز، اذان کی ہے جو بندے کو خدا کی طرف بلاتی ہے۔ اور وہ ہر کام چھوڑ کر عبادت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ لفظ مسجد جس کے معنی ہیں سجدہ کرنے کی جگہ۔ سورج کے طلوع ہوتے ہی چرند پرند سب انسان اپنے، اپنے طور پر خدا کی عبادت میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ عبادت سے دل کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ دن کی شروعات اچھی ہونے کی خوشی انسان کو دل سے ہوتی ہے چلنا، پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا ہر چیز نماز سے سیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں تک کہ عبادت میں خضوع وخشوع، توجہ وہ بھی ہم نماز سے سیکھتے ہیں۔ اس وجہ سے مسجد اور نماز کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ خداوند تعالیٰ خود قرآن شریف میں فرماتا ہے کوئی مسلمان اگر ایک چڑیا کی مسجد میں بیٹھنے کی جگہ بنانے میں مدد کرتا ہے تو میں اس کے لیے جنت کا ضامن ہوں۔ اگر ہر مسلمان پانچوں وقت کی نماز برابر ادا کرے تو دنیا کتنی خوب صورت اور حسین ہو جائے۔ اس لیے کہ ایک سچا نمازی خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا کو نعمتِ خداوندی سمجھ کر اس کا حق ادا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ یعنی اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے۔

کاوش: فریدہ فضل ڈالاس، یو ایس اے

چھوٹی سی بات

پھول بننے کی دعا مت مانگو
کیونکہ
خوشبو ہر ایک پھول کا مقدر نہیں
مگر
مرجھانا تو ہر ایک پھول کی قسمت میں ہے

از: صائمہ پرویز، ملیر سعود آباد

انوکھی خواہش

بہت خواہش ہے تیری
کہ تجھ سے پہلے میں مرجاتی
اگر میرے بس میں ہوتا
تو ایسا بھی کرجاتی
تیری خوشی کی خاطر
تجھ سے پہلے میں مرجاتی

ایک عید کا شعر
میری دوست پروین کے نام

ڈبے میں ڈبا ڈبے میں کیک
میری سہیلی لاکھوں میں ایک

ازطرف: آسیہ عامر، کراچی

غزل

ہر آنکھ میں بینائی ہے حیراں ہو کس لیے
ہر سو اداسی چھائی ہے حیراں ہو کس لیے
ترتیب تو نے دی ہیں یہ سب خود اداسیاں
اب جان پہ بن آئی ہے، حیراں ہو کس لیے
ہر لفظ چیختا ہے میرا آہ و کرب میں
لفظوں کی یہ دُہائی ہے حیراں ہو کس لیے
خاموش ہیں آنکھیں مگر روتی ہیں لہو رنگ

اس دل نے چوٹ کھائی ہے حیراں ہو کس لیے
رشتوں کو سب بچھاڑ کر تو نے خرید لی
اب شام ہے، تنہائی ہے، حیراں ہو کس لیے

شاعرہ: غزنہ مہناز گل، راول پنڈی

صحت مند رہنے کا راز

ایک صحت مند بوڑھے سے جب اس کے خوش رہنے کا راز پوچھا گیا تو اس نے کہا۔

''میں نے کبھی اپنے گھر والوں اور رشتے داروں سے ہونے والی ناراضی کو دل میں نہیں رکھا، کبھی اپنے سے بلند مرتبے والے شخص سے حسد نہیں کیا اور نہ ہی کبھی کسی کا نقصان ہونے پر خوشی منائی ہے۔''

مرسلہ: ارم کمال، فیصل آباد

تصدیق

ایک مفلوک الحال پروڈیوسر بڑی مشکلوں سے اپنی فلم مکمل کر رہا تھا۔ ایک روز اسے کسی شخص سے ہیرو کی لڑائی کا منظر فلم بند کرنا تھا۔ اس نے سوچا کہ کسی دوسرے شخص کو کاسٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے، اس نے ہیرو سے کہا۔

''وہ سامنے بس اسٹاپ پر جو شخص غالباً اپنی بیوی کے ساتھ کھڑا ہے کسی طرح اس سے جھگڑا شروع کر دو۔ ہم جھگڑے کا منظر فلم بند کرلیں گے۔''

ہیرو اس شخص کے قریب پہنچا اور اپنے آپ کو گھونسے اور تھپڑ کھانے کے لیے تیار کرتے ہوئے بولا۔

''یہ تمہاری بیوی ہے...... ایسی منحوس اور چڑیل نما عورت کے ساتھ کوئی ایک لمحے کے لیے بھی کھڑا ہونا پسند نہیں کرے گا۔''

اس شخص کے چہرے پر بجائے ناراضی کے رونق سی آگئی۔ بیوی کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

''دیکھا...... جو بات میں برسوں سے تم سے کہتا آرہا ہوں اب تو وہ بات دنیا بھی کہنے لگی ہے۔''

مرسلہ: ساجدہ ظفر، کمالیہ

بہت خوب

لڑکی: ''پتا ہے...... میں اچھے نمبروں سے پاس ہوئی تو میرے پاپا نے مجھے ساڑھے تین ہزار کا سوٹ لے کر دیا۔''

لڑکا: ''بس اتنی سی بات...... میں فیل ہوا تو میرے پاپا نے مجھے ساڑھے تین لاکھ کا رکشا لے کر دیا...... سی این جی ہے بیٹا!''

از: ممتاز خانم، کراچی

خوب صورت باتیں

☆ یا اللہ! تو واحد بادشاہ ہے جو مانگنے پر خوش ہوتا ہے اور نہ مانگنے پر ناراض...... اے شہ رگ سے قریب میرے رب آج ہم سے خوش ہو جا۔

☆ اپنے ظرف کے پیمانے کا حساب خود نہیں کیا جاتا، اسے آزمانے والے پر چھوڑ دو۔

☆ اچھی امید اور اچھا گمان، قدرت کی ایسی عطا ہے جو انسان کو اپنے دامن میں پناہ دے کر مایوسی کے سمندر میں ڈوبنے سے بچاتی ہے۔

از: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

غزل

قلم و قرطاس میں گم ہوں
درد و احساس میں گم ہوں
خودکشی سوچوں نے کرلی
اِک غمِ یاس میں گم ہوں
دورِ کربل، دل تنہا
پانی کی آس میں گم ہوں
کھو گئی جذبوں کی خوشبو
میں ہوا، باس میں گم ہوں
بُت بھی ہیں کسی کے لیے
پوجا اور داس میں گم ہوں
ڈھونڈتا ہے تُو مجھے دور
میں کہیں پاس میں گم ہوں
قلبِ بسمل لائی خانم
کربِ افلاس میں گم ہوں

کلام: فریدہ خانم، لاہور

محبت

☆ محبت ایک ساز ہے جو دلوں کی دھڑکن سے بجتا ہے۔

☆ محبت کے بغیر زندگی بیکار اور بے سود ہے۔

☆ زندگی ایک پھول ہے اور محبت اس کی خوشبو ہے۔

☆ سچی محبت کے راستے میں نشیب و فراز ضرور آتے ہیں۔

☆ دل میں سچی محبت ہو تو نفرت کی ہر زنجیر ٹوٹ جاتی ہے۔

☆ محبت ایک ایسی تتلی ہے جو ہمیشہ کانٹے کی نوک پر گھر بناتی ہے۔

☆ جس دل میں محبت نہیں وہ دل نہیں، پتھر ہے۔

☆ محبت کسی فلسفے، کسی مذہب کی محتاج نہیں ہوتی۔

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

غزل

ہر پل تیرے خواب سجاتی رہتی ہوں
مٹی پر تصویر بناتی رہتی ہوں
اِک لڑکے کے عشق نے مجھ کو مار دیا
ہر اِک کو یہ زخم دکھاتی رہتی ہوں
کون تھا جس نے میرے خواب چرائے تھے
کس پر یہ الزام لگاتی رہتی ہوں
میں نے غم کی فصلیں کاٹیں راتوں میں
دل میں غم کا بیج اگاتی رہتی ہوں
جانے کتنے زخم ہیں میرے سینے میں
غم کا ہر اک بوجھ اٹھاتی رہتی ہوں
تنہائی میں تیری یادیں ڈستی ہیں
تنہائی میں غزلیں گاتی رہتی ہوں
میں بھی یار فریدہ فریؔ سپنوں کے
جانے کتنے محل بناتی رہتی ہوں

کلام: فریدہ جاوید فریؔ، لاہور

عید مبارک دوستو

خوشیاں لے کر آرہا ہے یہ تہوار
یہ دن بھی آتا نہیں ہے بار، بار
خوش رہو تم عید کے لمحات میں
سارے جہاں کا مل جائے تمہیں پیار

از: ساجدہ ظفر، کمالیہ

ماں

صبح سے آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ اسکول میں چھٹی ہوئی تو اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بچہ بارش میں بھیگتا بستہ سنبھالتا ہوا گھر پہنچا تو اس حال میں دیکھ کر بڑا بھائی برہمی سے بولا۔ ''کیا حلیہ بنا لیا ہے...... راستے سے کوئی پلاسٹک شیٹ یا بوری لے کر سر پر نہیں اوڑھ سکتے تھے؟''

بڑے بیٹے کی آواز سن کر بیمار باپ بھی کمرے سے نکل آیا اور ملامت کے ساتھ بچے کو تادیب کی: ''صبح سے گھٹا چھائی ہوئی تھی تو تمہیں چھتری لے کر جانا چاہیے تھا۔ کپڑے اور کتابیں تو نہ بھیگتیں۔''

بہن بولی۔ ''کچھ دیر اسکول میں ہی رک کر بارش تھم جانے کا انتظار کر لیتے۔''

ماں کو کپڑوں اور کتابوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے اپنے لختِ جگر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اپنے دوپٹے سے اس کے چہرے اور بالوں سے پانی صاف کرتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''بھگو دیا میرے لعل کو...... یہ نگوڑی بارش ذرا سی دیر بعد شروع ہو جاتی تو کیا بگڑ جاتا...... میرا بچہ تو بھیگنے سے بچ جاتا۔''

از: یاسمین اقبال، لاہور

مجھے پسند ہے

عبادتِ الٰہی کرنا
بزرگوں کو ہنسانا
پرندوں کا چہچہانا
دکھوں کا مسکرانا
روتے کو گلے سے لگانا
غریبوں کی مدد کرنا
سب کے دکھ بانٹنا
حُسنِ اخلاق سے پیش آنا

محبت کے پھول چہار سو کھلانا
بڑوں کی راہوں میں عقیدت کی نظریں بچھانا
باپ کا میرے لیے فکر مند ہونا
بہنوں کا میرے لیے لڑنا
بھائیوں کا میرے لیے محتاط رہنا
اساتذہ کے دل میں گھر کرنا
ماں کے آنچل میں چھپ جانا
مجھے پسند ہے!

از: اقرا جٹ...... منچن آباد

واک

شوہر: ''تم میرے ساتھ واک پر چلوگی۔''
بیوی: ''تمہارا مطلب ہے کہ میں موٹی ہوگئی ہوں۔''
شوہر: ''اوکے، نہیں پسند تو مت چلو۔''
بیوی: ''تمہارا مطلب ہے کہ میں سست ہوگئی ہوں۔''
شوہر: ''غصہ کیوں کر رہی ہو؟''
بیوی: ''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں ہر وقت جھگڑا کرتی رہتی ہوں؟''
شوہر: ''میں نے ایسا تو نہیں کہا۔''
بیوی: ''تمہارا مطلب ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟''
شوہر: ''اوکے بابا! مت جاؤ، میں اکیلا ہی چلا جاتا ہوں۔''
بیوی: ''مجھے یہ بتاؤ کہ تم اکیلے ہی کیوں جانا چاہتے ہو؟''
شوہر: ''اُف'' (شوہر نے اپنے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لیے)

بہت بڑا نصیب

ایک انسان کے بااعتماد ہونے کے لیے یہی حقیقت کافی ہے کہ اس سے پہلے نہ تو کوئی اس جیسا دنیا میں آیا نہ اس کے بعد اس جیسا آئے گا یہ عظیم انفرادیت بہت بڑا نصیب ہے۔

مرسلہ: ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ

غزل

لفظوں کی جائداد لیے پھرتے ہیں
ہم غیبی امداد کے لیے پھرتے ہیں
غم جتنے بھی آئے گھاس نہیں ڈالی
دل اپنا ہم شاد لیے پھرتے ہیں
ان کی خاطر لاکھ دعائیں مانگیں گے
دل کو جو برباد لیے پھرتے ہیں
اس دہقاں کے سو، سو صدقے جائیں ہم
جو فصلیں اور کماد لیے پھرتے ہیں
فقیری کے ملبوس میں روٹی کی خاطر
ہائے بچے ناشاد لیے پھرتے ہیں
امیر ہو دردمند، غریب غیرت مند
سودا پھر سب سواد لیے پھرتے ہیں

کلام: کوثر خالد سودا، فیصل آباد

جان بھی چاہے لے جانا

جب کانچ اٹھانے پڑ جائیں
تم ہاتھ ہمارا لے جانا
جب سمجھو کہ کوئی ساتھ نہیں
تم ساتھ ہمارا لے جانا
جب دیکھو کہ تم تنہا ہو
اور رستے ہیں دشوار بہت
تب ہم کو اپنا کہہ دینا
بے باک سہارا لے جانا
جو بازی بھی تم جیتو گے
جو منزل بھی تم پاؤ گے
ہم پاس تمہارے ہوں نہ ہوں
احساس ہمارا لے جانا
گر یاد ہماری آجائے
تم پاس ہمارے آجانا
بس اک مکان ہمیں دینا
پھر جان بھی چاہے لے جانا

پسند: کلثوم علی، تحصیل لاوہ، ضلع چکوال



☆حمیرا وحید...... واہ کینٹ
میں نے چاہا تجھے اس عید پہ کیا پیش کروں
جس میں احساس کے سب رنگ ہوں روشن، روشن
جس میں آنکھوں کے تراشے ہوئے موتی رکھوں
جس میں شامل ہو میرے قلب کی دھڑکن دھڑکن

☆آمنہ نثار...... فیصل آباد
یہ ایک چیز جہاں میں کہیں نہیں ملتی
ہلالِ عید دلوں کا قرار لے آیا

☆ظل شاہین...... رحیم یار خان
گلاب کے پھول آپ کو عید کا پیغام دیتے ہیں
عید کا چاند دیکھ کر ہم آپ کو سلام کہتے ہیں

☆عرشیہ جنید...... کراچی
کسی کو راز مت دینا اگر رہنا ہے دنیا میں
یہ دنیا اک نقارہ ہے تجھے بدنام کردے گی

☆بلقیس جعفر...... کوئٹہ
آنکھ نم کر گیا بچھڑے ہوئے لوگوں کا خیال
دردِ دل دے کے ہمیں ڈوب گیا عید کا چاند

☆تہمینہ ریاض...... بہاولپور
بعد مدت کے جو فلک پہ نظر آتا ہے
عید کا چاند ہوگئے ہیں آپ

☆یاسمین کنول...... پسرور
عید کے چاند تیری آمد پر
یوں دریچے دلوں کے کھلتے ہیں
کچھ دیے روشنی دکھاتے نہیں
کچھ دیے تیرگی پہ پلتے ہیں

☆حمنیٰ قندیل...... کمالیہ
عید کے چاند میں کھو کر جانے
کتنی ماؤں نے اپنے چاندوں کو تلاشا ہوگا

☆سعیدہ بانو...... مری
محفلِ زیست میں پھر عید کی آہٹ پاکر
آج کچھ زخم میرے دل کے مہک اٹھے ہیں
گلشن دل میں تمناؤں کے آزردہ طیور
مژدہ عید سے شہ پا کے چہک اٹھے ہیں

☆خولہ عرفان...... کراچی
منتظر ہوں کہ ستاروں کی ذرا آنکھ لگے
چاند کو چھت پہ بلالوں گا اشارہ کرکے
میں وہ دریا ہوں کہ ہر بوند بھنور ہے جس کی
تم نے اچھا ہی کیا مجھ سے کنارہ کرکے

☆فریدہ فری...... لاہور
ہر سو ہجر کے مارے لوگ
گھوم رہے ہیں سارے لوگ
اس دھرتی کو چھوڑ گئے ہیں
فری کتنے پیارے لوگ

☆فرح طاہر...... ملتان
تو سمجھتا ہے کہ تو نے مجھے ٹھوکر ماری
میں تو دانستہ ترے پاؤں سے ٹکرائی ہوں

☆عروبہ ناز...... کوٹلی
اب خوشی دے کے آزمالے مجھے
ان غموں سے تو میں نہیں مرتی

☆غزالہ عمران...... کراچی
پہلے مجھے تلاش تو کرلیجیے صاحب
پھر بے نیاز ہو کے گنوا دیجیے مجھے

☆غزنہ مہناز گل...... راولپنڈی
خود ہی کو چھوڑ دیا ہم نے تھک کے اے غزنہ
خود ہی کو قتل کیا پھر تیرا وصال ہوا

☆اقرا جٹ......مچن آباد

درویش کو طلب تھی، متاعِ خلوص کی
مخلوق چپ رہی کہ یہ مشکل سوال تھا

☆شاہینہ مسعود......کمالیہ

یہ کہہ کر کاٹ دیں زبانیں اہلِ دانش نے
نہ ہو مصرف کسی شے کا تو وہ بیکار ہوتی ہے
سروں کی فصل پکنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا
کبھی مطلق صداقت بھی زمیں پر بار ہوتی ہے

☆حرا قریشی......ملتان

پہلے رقیب کم تھے کہ اک ظلم یہ ہوا
قاصد رقیب بن گیا انہیں دیکھنے کے بعد

☆ثوبیہ ظہور......ضلع اٹک

جن کے آنگن میں امیری کے پھول کھلتے ہیں
ان کا ہر عیب زمانے کو ہنر لگتا ہے

☆نادیہ......راولپنڈی

سو بار کہا دل سے چل بھول بھی جا اس کو
سو بار کہا دل نے تم دل سے نہیں کہتے

☆تسنیم......ایف بی ایریا کراچی

اے ماہِ عید مجھ کو پیغام کچھ سنا دے
بچھڑے ہوئے دلوں کو اک بار پھر ملا دے

☆دلنواز رانی......گوجرہ

جب تصور میں کسی کی دید کر لیتے ہیں ہم
عید ہو جاتی ہے اپنی عید کر لیتے ہیں ہم

☆زرینہ مشتاق......منڈی بہاؤ الدین

قاصد پیام کو تو بے جا نہ طول دینا
بس اس قدر ہی کہنا آنکھیں ترس گئی ہیں

☆تسنیم کوثر......کراچی

قاصد کے آتے آتے خط ایک اور لکھ رکھوں
ہم جانتے ہیں جو وہ لکھیں گے جواب میں

☆سیدہ عروج فاطمہ......ملتان

اب اس کو زندگی کہنے کا حوصلہ بھی نہیں
وہ جس کو ہم نے گزارہ ہے زندگی سی ہے

☆شمع فلک......ڈری عظیم خان

اس جہاں سے اس جہاں تک اک سانس کا ہے فاصلہ
آ گئی تو یہ جہاں رک گئی تو وہ جہاں

☆صائمہ سجاد نگش......کوہاٹ

کون سی چیز تجھے عید کا تحفہ بھیجوں
اشک بھیجوں یا سسکتی ہوئی آہیں بھیجوں
دل مجروح کی پاکیزہ دعائیں بھیجوں
بربطِ قلب کی پُرسوز صدائیں بھیجوں

☆سائرہ ارم ڈوگر......کمالیہ

کتابیں اور سند بیچ دیں بقا کے لیے
کہ ماں کے واسطے پیسے نہ تھے دوا کے لیے

☆نازیہ نیازی......نوشہرہ کینٹ

کب تیرے ملنے کی تقریب بنا عید کا دن
تیری یاد آئی تو دیکھا نہ گیا عید کا چاند
غم کے بادل فضاؤں میں کچھ ایسے چھائے
دل کی دنیا میں منور نہ ہوا عید کا چاند

☆ساجدہ ظفر......کمالیہ

نئے کپڑے نئے ہوتے کہاں ان کے مقدر میں
دیہاڑی کرنے والوں پر یہ عیدیں کتنی بھاری ہیں

☆جبیں نیاز......ملتان

کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اس سے
وہ جو اک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا

☆کوثر خالد......جڑانوالہ

دل کا آئینہ لیے ہم بھی حاضر ہوئے
دوستو اپنے چہرے کی ضو دیکھ لو
امن کی کارروائیاں سلامت رہیں
اپنے کردار کی خوشبو دیکھ لو

☆شمع......فیصل آباد

مسلک میرا وفا ہے وفاؤں کی آن ہوں
بیتے ہوئے دنوں کی میں اک داستان ہوں
میں شاخِ مصلحت تو نہیں ہوں کہ جھک پڑوں
میں عزم و حوصلے کی اک سنگی چٹان ہوں

☆☆☆



نمکین گوشت

اشیا: بکرے کا گوشت، چربی والا ایک کلو۔ ٹماٹر، دو عدد۔ نمک، حسب ذائقہ۔ ادرک، (باریک کٹی ہوئی) ایک کھانے کا چمچ۔ ہری مرچ، چار سے پانچ عدد۔ (باریک کٹی ہوئی)۔ آئل، آدھا کپ۔ کالی مرچ، چند دانے۔

ترکیب: گوشت اور چربی کے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ کڑاہی میں گوشت، نمک، کالی مرچ، اور چھ کپ پانی ڈالیں، ہلکی آنچ پر گوشت گلنے تک پکائیں۔ درمیان میں تین، چار مرتبہ چمچ چلائیں اور پھر اس میں تیل، ادرک اور ہری مرچ شامل کر کے تین، چار منٹ تک فرائی کریں آخر میں اس میں ٹماٹر باریک کاٹ کر شامل کریں اور دس پندرہ منٹ پکانے کے بعد آنچ تیز کر لیں، مزیدار نمکین گوشت تیار ہے۔

از: سنبل ملک، لاہور

لُطفی کباب

اشیا: قیمہ، ایک کلو۔ پیاز، آدھا کلو۔ ادرک، پچاس گرام۔ ہری مرچ، پانچ سے چھ عدد۔ لہسن، پچاس گرام۔ سفید زیرہ، ایک کھانے کا چمچ۔ اجوائن، ایک کھانے کا چمچ۔ گرم مسالا پاؤڈر، دو کھانے کے چمچ۔ پسی لال مرچ، ایک کھانے کا چمچ۔ دھنیا ثابت، ایک کھانے کا چمچ۔ میٹھا سوڈا، دو کھانے کے چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔

ترکیب: قیمہ، ادرک، لہسن اور ہری مرچ کو ایک بار مشین سے نکلوا کر الگ رکھ دیں اور پھر پیاز کو پیس کر اس کا پانی اچھی طرح نچوڑ لیں، اب پیاز کے ساتھ باقی تمام مسالا قیمے والے آمیزے میں ملا کر ہاتھوں سے اچھی طرح مکس کر کے بیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ اب مٹھی بھر قیمہ لے کر سیخوں پر چڑھاتے جائیں اور کوئلوں پر بھون لیں۔ گرما گرم کباب دہی اور دھنیے کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

گریل

اشیا: گوشت گائے کا، ایک کلو۔ (پارچے کٹوا لیں) دہی، دو کپ۔ پیاز، چار عدد۔ (درمیانے سائز کی لیں) سرخ مرچ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ کالی مرچ پاؤڈر، دو چائے کے چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ ادرک کا پیسٹ، دو چائے کے چمچ۔ کوکنگ آئل، دو کپ۔

ترکیب: گوشت اچھی طرح دھو کر اس میں پسی ہوئی پیاز اور تمام مسالے ملا دیں۔ دہی بھی پھینٹ کر ملا لیں اور اب ایک کڑاہی میں کوکنگ آئل ڈال کر گرم کر لیں اور گوشت کے پارچے مسالے سمیت کڑاہی میں ڈال دیں۔ چمچ چلانے کے بعد آنچ دھیمی کر دیں اور اسے ایک گھنٹے تک پکائیں۔ جب گوشت کے پارچے گل جائیں تو آنچ تیز کر کے اسے بھون لیں۔ منفرد اور لذیذ ڈش گریل تیار ہے اگر آپ گریوی پسند کرتی ہیں تو حسبِ پسند پانی ڈال کر مزید دس منٹ تک پکائیں۔

از: عرشیہ جنید، کراچی

ہنی سویا ونگز

اشیا: چکن ونگز، آدھا کلو۔ سویا ساس، چار کھانے کے چمچ۔ لہسن، ادرک پیسٹ، ایک چائے کا چمچ۔ چاول، (ابلے ہوئے) دو پیالی۔ سفید تل، ایک کھانے کا چمچ۔

ترکیب: ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں پھر اس میں مرغی کے بازو ڈال کر دس منٹ تک فرائی کریں۔ چمچ برابر چلاتی رہیں اور ساتھ میں نمک چھڑک دیں، جب بازو گولڈن ہونے لگیں تو اس میں سویا ساس، پسا ہوا لہسن، ادرک اور شہد ڈال کر مزید چند منٹ پکائیں۔ (آنچ دھیمی رکھیں) پھر تل چھڑک کے ایک منٹ مزید فرائی کریں پھر ابلے ہوئے چاولوں کے درمیان میں چکن ونگز رکھیں اور ہرے دھنیے سے گارنش کریں۔

از: رابعہ شاہد، یو اے ای

کھوئے کی سویّاں

اشیا: سویاں، ایک کلو۔ بالائی، آدھا کلو۔ دودھ، آدھا کلو۔ چینی، آدھا کلو۔ کھویا، ڈیڑھ پاؤ۔ زعفران (پسی ہوئی)، آدھا چائے کا چمچ۔ سبز الائچیاں، دو عدد۔ لونگ، دو عدد۔ گھی، ایک پاؤ۔ کیوڑا، ایک بڑا چمچ۔ بادام کی گری، ایک چھٹانک۔ کشمش، آدھا چھٹانک۔ پستہ، ایک چھٹانک۔

ترکیب: دیگچی میں گھی کڑکڑائیں، اس میں لونگ پستہ اور سبز لائچیاں ڈال کر بھونیں پھر سویّاں توڑ کر ڈالیں اور اوپر سے دودھ ڈال دیں اور آنچ ہلکی رکھیں اور پکنے دیں۔ بالائی اور کھوئے کو ایک ساتھ ملا کر پھینٹ لیں اور زعفران ملا دیں۔ اب سویّوں میں بالائی اور کھویا شامل کریں۔ چینی کی ایک تار کی چاشنی تیار ہو جائے اور سب کچھ یکجان ہو جائے تو بادام، پستہ اور کشمش ڈال دیں پھر کیوڑا ڈال کر چند منٹ کے لیے ڈھک دیں۔ چاندی کے ورق، پستہ اور بادام سے ڈیکوریٹ کر کے پیش کریں۔

از: کلثوم عباس، کراچی

بریڈ پڈنگ

اشیا: دودھ، ایک کلو۔ انڈے، چار عدد۔ توس، چار عدد۔ چینی، حسبِ ضرورت۔ کیوڑا ونیلا، چند قطرے۔ (خوشبو)

ترکیب: انڈوں کی سفیدی اور زردی الگ، الگ کر کے بہت اچھی طرح پھینٹیں ....

...... دودھ کو تیز گرم کریں اور اس میں توس کی تکونی کو بھگو دیں۔ جب دیکھیں کہ توس اچھی طرح بھیگ گئے ہیں تو ان میں چینی کی آمیزش کر دیں اور ساتھ ہی انڈے کے آمیزے کو اس میں ملا دیں۔ ان ساری اشیا کو کسی ایسے برتن میں ڈالیں جس کا ڈھکنا بالکل برابر ہو کہیں سے ڈھیلا نہ ہو۔ پھر اس برتن کو کوئلوں کی دھیمی آنچ پر رکھ کر اس کے ڈھکنے پر دہکتے کوئلے رکھ دیں۔ پندرہ بیس منٹ بعد کوئلے ہٹا کر ڈھکنا کھولیں اور دیکھیں کہ پڈنگ پر سرخی آنے لگی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پڈنگ درست طریقے سے تیار ہو رہی ہے۔ اگر پڈنگ پر سرخی نہ آئی ہو تو ڈھکنے کو دوبارہ دبا کر بند کر دیں اور اس پر دوبارہ دہکتے کوئلے رکھ دیں۔ آنچ ہمیشہ دھیمی رکھیں تاکہ جلنے کا امکان نہ ہو۔ کچھ دیر بعد جب دیکھیں کہ اس پر سرخی آ رہی ہے تو چولھے سے اتار لیں۔ اس پڈنگ کو اوون میں تیار کیا جائے تو بہت جلد تیار ہو جائے گی۔

☆ انڈے وغیرہ پھینٹنے سے قبل اوون کھول دیں تاکہ گرم ہو جائے پھر اس کے اندر پڈنگ کا برتن رکھ لیں اگر اوون خوب گرم ہو تو پڈنگ کو تیار ہونے میں صرف دس منٹ لگتے ہیں۔

از فضہ بتول، بہارہ کہو

کیک آئس کریم رول

اشیا: انڈے، چار عدد۔ بیکنگ پاؤڈر، ڈیڑھ چائے کا چمچ۔ میدہ، دو کپ۔ چینی، ایک کپ۔ ونیلا ایسنس، ایک چائے کا چمچ۔ اسٹرابیری آئس کریم، ایک لیٹر۔ نمک، ایک چٹکی۔

ترکیب: ایک برتن میں انڈے ڈال کر پھینٹ لیں۔ اب انڈوں میں بیکنگ پاؤڈر اور نمک شامل کر کے بیٹر کی مدد سے اتنا پھینٹیں کہ آمیزہ گاڑھا ہو جائے گا پھر چینی اور ایسنس بھی آہستہ، آہستہ کر کے شامل کر دیں۔ اب میدہ ڈال کر مکس کریں۔ ایک بیکنگ ٹرے کو چکنا کر لیں اور یہ آمیزہ پھیلا دیں۔ بیس منٹ کے لیے اوون گرم کریں۔ پندرہ منٹ کے لیے 180,C پر بیک کریں۔ اب کیک کو علیٰحدہ پلیٹ میں نکال کر ٹھنڈا کر لیں اور برابر سے دو، تین لمبے سلائس کی طرح کاٹ لیں پھر اس میں آئس کریم کی تہ لگائیں اور کیک رول کریں اور جمنے کے لیے فریزر میں رکھ دیں۔

☆ فریش کریم اور چاکلیٹ سیرپ سے سجا کر پیش کریں۔

مرسلہ: عروبہ ناز، کوٹلی ستیاں

بزمِ پاکیزہ

پاکیزہ بہنیں



پہلا انعام یافتہ سوال

☆ نسیم منظر... بفرزون، کراچی

سوال: غموں کی دھوپ سے بچنے کے لیے کون سی چھتری استعمال کرنی چاہیے۔

جواب: صبر کی، حوصلے کی اور اللہ تعالیٰ کے حضور ہتھیلیاں پھیلا کر خوشیوں کی چھاؤں مانگو۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ ساجدہ ظفر۔ کمالیہ

سوال: عید کو یادگار بنانے کے لیے کیا، کیا جائے؟

جواب: خوب اچھا سا تیار ہو، مہمانوں کی خاطر کرو اور چھوٹوں میں عیدی بانٹو...... سمجھیں!

☆ حمنیٰ قندیل... کمالیہ

سوال: عید کا انتظار اتنا طویل اور دورانیہ اتنا مختصر......؟

جواب: یہ تو تم پر ہے اس انتظار میں بھی لطف لے لو۔

☆ فرخندہ جعفری...... گجرات

سوال: عید مبارک زیادہ خوشی لاتی ہے یا دید مبارک......

جواب: دونوں بھئی۔

سوال: ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ دولت کے اندھے کو کیا سوجھتا ہے؟

جواب: ہرے، نیلے، لال، اورنج نوٹ ہی نوٹ۔

سوال: آج کے دور میں شریف انسان کو اللہ تعالیٰ کی گائے کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب: ہاں گائے بیچاری ایک مظلوم جانور کی حیثیت سے جانی جاتی ہے جو فائدے تو ہزار دیتی ہے لیکن بالآخر ذبح کر دی جاتی ہے۔

سوال: اے نامہ بر تو ہی بتا وہ کیسے ہوتے ہیں سوال جن کے انعام آتے ہیں؟

جواب: فرخندہ جعفری کے چٹ پٹے سوالات کے انعام بھی جلد ہی آئیں گے۔ تیکھا سا سوال کرو۔

☆ حمیرا وحید۔ واہ کینٹ

سوال: نجمہ خالہ تسبیح میں مسلسل کیا پڑھتی رہتی ہیں؟

جواب: اللہ میری بھانجی حمیرا کو نیک بنا۔ بھئی تمہارے لیے ہی دعا کرتی ہیں۔

☆ ناعمہ تحریم... کراچی،

سوال: عید کے دن زیادہ سے زیادہ عیدی کے حصول کا کوئی آسان ترین گُر بتا دیں؟

جواب: مقررہ ریٹ سے تو زیادہ عیدی نہیں مل سکتی ناں...... ہاں اگر منگنی ہوئی ہو تو پھر چانس بن سکتا تھا۔

سوال: میرا اسکول جانے کو دل نہ چاہے تو کون سا بہانہ کروں؟

جواب: وہی ازلی بہانہ پیٹ میں درد......

سوال: جب دیواروں میں دراڑ پڑتی ہے تو دیوار گر جاتی ہے مگر جب دلوں میں دراڑ پڑتی ہے تو؟

جواب: رشتے ٹوٹ جاتے ہیں...... ناتے بھسم ہو جاتے ہیں نتیجتاً تنہائی کی وحشت مقدر بن جاتی ہے۔

☆ شمع فلک... رحیم یار خان

سوال: رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے، کیوں، کیا مجبوری ہے؟

جواب: قید میں پھڑکتی بلبل کا رقص ظالموں کو بہت پسند جو ہے۔

سوال: گلاب کے پھول کو جس نام سے بھی پکاریں اس میں سے خوشبو گلاب ہی کی آئے گی...... اگر اسے گوبھی کا پھول کہا جائے تو کیسا رہے گا؟

جواب: اس سے تو کہنے والے کی بدذوقی ظاہر ہوگی ناں۔

سوال: خوب صورت چہروں کو سب پسند کرتے ہیں تو سیاہی مائل چہرے کہاں جائیں گے؟

جواب: اللہ نہ کرے کسی کے چہرے پر کردار کی سیاہی ہو...... قدرتی سیاہی میں بھی تو حسن ہوتا ہے۔

☆ ماہ رخ......حیدر آباد

سوال: ہر عید پر میری ساس بڑی بدمزہ سوّیاں پکاتی ہیں، کیا کروں؟

جواب: اس دفعہ تم اپنے ہاتھوں کے جوہر دکھاؤ ناں۔

سوال: اس عید پر کیسا جوڑا سلواؤں کہ مجھے دیکھتے ہی وہ بے ساختہ کہہ اٹھیں کہ......؟

جواب: کچھ بھی سلوا لو اُن کا یہی کہنا ہوگا کہ کوئی ڈھنگ کا لباس پہن لیا ہوتا وہی ہمیشہ کی طرح اول جلول بنی ہوئی ہو۔

سوال: عید والے دن عیدی لینے میں مزہ ہے یا ...دینے میں؟

جواب: بچوں کو لینے میں مزہ آتا ہے اور بڑوں کو دینے میں...... دینے والا ہاتھ ہی تو اچھا ہوتا ہے ناں۔

☆ نسرین یاسین..لطیف آباد

سوال: سیاں جی کا موڈ عید پر سوّیاں دیکھ کر خراب ہوتا ہے یا عیدی بچانے کا جدید طریقہ ہے یہ؟

جواب: اب تمہارے سیّاں جی ہیں...... اتنا تو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا تمہیں۔

سوال: عید پر سوّیاں کھانے کا آسان طریقہ بتائیں؟

جواب: تمیز سے پیالے میں نکالو اور چھوٹے چمچ سے آرام، آرام سے تھوڑی تھوڑی کھاؤ...... حد ہوگئی بھئی......اس عمر میں بھی سوّیاں کھانا نہ آئیں۔

سوال: میری نند میری حرص کیوں کرتی ہے کوئی دو وجوہات بتائیں؟

جواب: تم بھی تو اپنی بھاوج کی کرتی ہو ناں......دوسرے تم یہی تو سوچتی رہتی ہو اسی لیے لگتا ہے۔

☆ نسیم منظر..بفرزون، کراچی

سوال: وہ ہر سال عیدی گول کر جاتے ہیں اس بار کیسے لوں؟

جواب: اب انہیں گول، گول گھومنے نہ دینا...... تار کی طرح سیدھا کر کے عیدی وصول لو۔

سوال: ساس، نندوں سے عید پر کیسے بھگتوں؟

جواب: ساس صاحبہ کا جوڑا بناؤ اور نندوں کو چوڑیاں اور جیولری دلواؤ......دل کو بڑا کرو بہن......

☆ ساجدہ ظفر..کمالیہ

سوال: اس عید میں کیا انوکھی فرمائش کروں کہ میرے میاں میری ذہانت کے قائل ہو جائیں؟

جواب: اب اس عمر میں بیچارے کیا قائل ہوں گے جانے دو، یقین پھر بھی نہیں آئے گا۔

☆ مریم بنت کاشف..حیدر آباد

سوال: کالے بندے کے دانت زیادہ سفید کیوں ہوتے ہیں؟

جواب: اس کا سارا زور دانت صاف کرنے پر ہوتا ہے۔

سوال: جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے تو یہ کیا زبان پر سفر کرتی ہے؟

جواب: ہم کیا جانیں، تمہیں زیادہ تجربہ ہے جبھی تو کہہ رہی ہو۔

سوال: جہاں کسی کو ایک قدم پیچھے دیکھتی ہوں خود دس قدم دور ہو جاتی ہوں ایسا کیوں ہوتا ہے؟

جواب: سوال لکھ کر پڑھ بھی لیا کرو لکھنا کیا چاہتی ہو۔

☆ پروین افضل شاہین..بہاول نگر

سوال: واہ آپی! عید کے حوالے سے سج دھج ہی نرالی ہے آپ کی، کس پارلر سے فیشل کروایا؟

جواب: بہن ابھی ہماری صورت دیکھ تو لو پھر پوچھنا۔

☆☆☆



حسن نکھاریے

مہ جبیں

اپنی صحت کا خیال رکھنا اچھی بات ہے مگر اس خیال رکھنے میں انسان مٹاپے کی جانب بتدریج بڑھتا چلا جاتا ہے، متوازن غذا کے استعمال سے جسم میں طاقت آتی ہے چربی نہیں چڑھتی، چربی اگرچہ توانائی کے لیے ضروری ہے مگر غیر ضروری چربی تو نقصان ہی دیتی ہے۔ آج کل تو ویسے ہی ناخالص غذائیں ہیں، اوپر سے مصنوعی ذائقے اپنا کر ہم نے اپنی صحت کا خود بیڑا غرق کر دیا ہے۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے استفادہ ضرور کریں مگر اعتدال کے ساتھ۔ صبح کا ناشتا توانا ہو اور غذائیت سے بھرپور جس میں جو، گندم کا دلیا، دودھ اور کوئی موسمی پھل ضرور شامل ہو۔ سبزیاں بہت بڑی نعمت ہیں کوشش کریں اپنا کچن گارڈن خود ترتیب دیں۔ اس کے لیے وسیع و عریض زمین کی ضرورت نہیں بلکہ چھوٹے، چھوٹے گملوں یا ٹین کے خالی ڈبوں میں بھی یہ کام ہو سکتا ہے۔ دالیں، اناج، اور سبزی موٹے اور پھولے پیٹ کو کم کرتی ہیں، کھانا ہمیشہ بھوک روک کر کھائیں، چبا، چبا کر آہستہ، آہستہ کھائیں، آملے کا اچار وہ بھی کم تیل کا، مٹاپا کم کرنے میں مفید ہے۔ سفید چینی کے بجائے گڑ کی شکر استعمال کریں وہ بھی کم......پھلوں کے جوس اور شیک بنانے میں اضافی چینی نہیں ڈالیں۔

آج کل زیادہ تر بچیاں نوعمری سے ہی مٹاپے کا شکار ہو رہی ہیں اس کی وجہ مصنوعی مشروب اور کاربوہائیڈریٹس...... اور نشاستے والی غذاؤں کا کثرت سے استعمال ہے۔ جتنے جدید کھانوں کے آؤٹ لیٹس ہیں وہ پیٹ نہیں بھرتے بلکہ جیب خالی کرتے ہیں اور چربی جسم میں انڈیلتے ہیں۔ اس سے اجتناب کریں۔ مٹاپا آپ کے قدرتی حسن کا دشمن ہے۔ جسمانی ورزش بھی بہت ضروری ہے مگر اس میں باقاعدگی ہو، گھریلو کام اگر تیزی اور پھرتی سے کیے جائیں تو اس میں اضافی حرارے زائل ہو جاتے ہیں، آج ہر کام مشین سے ہو رہا ہے، اسی لیے مٹاپا بھی بڑھ رہا ہے اور ڈپریشن بھی۔

چہرے اور گردن کی رنگت صاف کرنے کے لیے چند ٹوٹکے

☆ تازہ پودینے کی پتیاں ابال کر اس کا پانی چھان کر فریج میں رکھ لیں اور نہار منہ آدھا کپ پی لیں۔

☆ سوجی اور دودھ کے ساتھ پیسٹ بنا کر چہرہ ہاتھ اور گردن پر مساج کریں اور پھر دھولیں۔

☆ آج کل گرمیوں میں پسینے کی وجہ سے چہرہ اور گردن چپ چپا ہو جاتا ہے اس کے لیے بیسن دودھ یا پانی کے ساتھ ملا کر فیس واش کی طرح استعمال کریں۔

☆ چہرے پر چھائیاں ہونے کی صورت میں سفید تل، بکری کے دودھ میں ڈال کر سل پر رگڑ لیں اور رات سوتے وقت چہرے پر مل لیں اور صبح اٹھ کر بیسن سے منہ دھولیں۔

☆ بالوں میں تیل مالش کرنے کے بعد بار، بار شیمپو کر کے بھی چکنائی رہ جائے تو بالوں کو پہلے بیسن سے دھوئیں پھر شیمپو کریں۔

☆ اکثر لوگوں کی چہرے کی رنگت صاف ہوتی ہے مگر گردن سیاہی مائل ہوتی ہے۔ اس کے لیے انڈے کی سفیدی میں لیموں کا عرق ملا کر اس آمیزے کو گردن پر لگائیں اور پندرہ بیس منٹ بعد دھولیں۔ اس طرح بیسن اور دودھ کے پیسٹ کو ابٹن کی طرح گردن پر ملیں پھر پندرہ منٹ بعد چہرہ اور گردن دھولیں۔ یہ عمل نہانے سے قبل با آسانی کر سکتی ہیں۔

☆☆☆

روحانی مشورے

ادارہ

ہر جائز حاجت کے لیے......

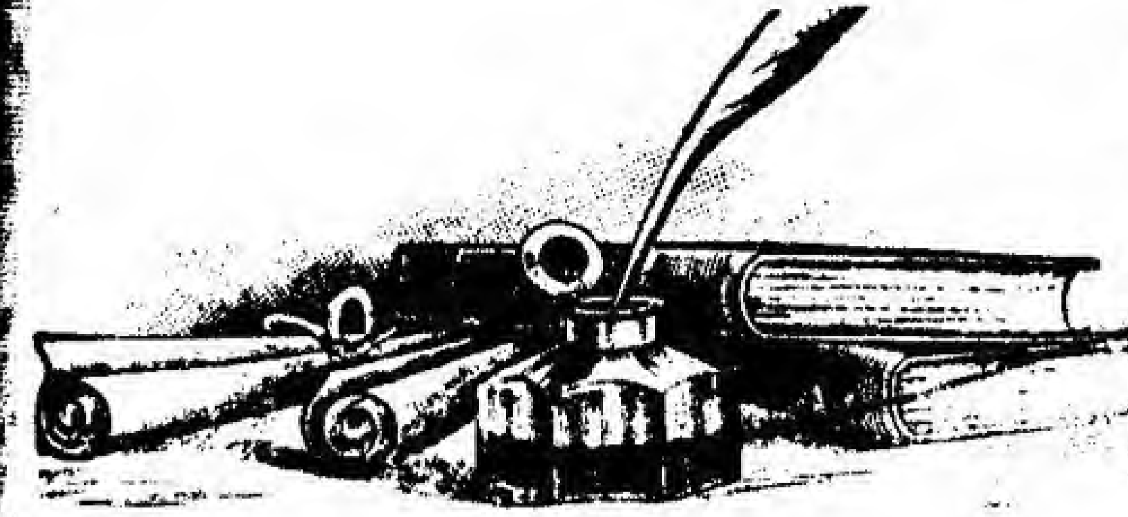
نماز ظہر اور عصر کے درمیانی سورۂ والضحیٰ پانچ مرتبہ صدقِ دل سے اس کے معنی سمجھ کر تلاوت کریں اور پروردگارِ عالم سے دعا کیجیے۔اس سورۂ میں خوش خبری کا واضح ذکر ہے۔اللہ پاک رحم و کرم کرے گا۔(انشاءاللہ)

قضا روزوں کی ادائیگی

ماہ رمضان المبارک کے واجب روزے کسی غیر شرعی وجہ سے قضا ہو جائیں تو ماہ شوال سے ہی قضا روزوں کی نیت سے رکھنا شروع کردیں۔روزوں کا فدیہ نکالنے کے بعد بھی اگر صحت اجازت دے اور کوئی شرعی عذر نہ ہو تو قضا روزوں کو ضرور ادا کیجیے......اللہ تعالیٰ بے شک غفور الرحیم ہے مگر اس کی واجب عبادات سے غفلت خود ہم مسلمانوں کے لیے تباہی کا باعث ہے۔لٰہذا افضیلت و فرائض سے کوتاہی برت کر ہم دعاؤں کی جلد قبولیت کی امید کیسے رکھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حقوق اللہ اور حقوق العباد احسن طریقے سے ادا کرنے کی توفیق دے، الٰہی آمین......

وظیفہ برائے شادی

عشا کی نماز کے بعد بچی کی ماں اول اور آخر پانچ مرتبہ درود شریف پڑھ کر پانچ سو مرتبہ یا صمد پڑھ کر بچی پر سر سے پاؤں تک دم کردے۔تین دن تک یہ عمل کرے۔اگر اس عرصے میں کوئی رشتے کی بات نہ چلے تو پندرہ دن بعد تین دن تک دوبارہ اسی طرح پڑھیں۔انشاءاللہ مراد بر آئے گی۔تسبیح پر دانے گن لیں کہ سو دانے ہیں اگر ننانوے ہیں تو پانچ تسبیح پڑھنے سے پہلے یا بعد میں پانچ دانے اور پڑھ لیں۔



کثرت سے تکبیر (اللہ اکبر) کہنا

وسعتِ رزق کے لیے نہایت مجرب ہے۔

شرط فقط یہ ہے کہ اس (اللہ اکبر) کو اعتقاد اور دل کی گہرائیوں میں جگہ دے کر کہے۔

امام جعفر صادقؓ فرماتے ہیں۔

"جب تم اللہ اکبر کہو تو سوائے خدا کے تمام چیزیں تمہاری نگاہ میں حقیر ہو جانی چاہئیں اور اگر انسان صرف زبان سے اللہ اکبر کہے اس کا دل کسی اور طرف مائل ہو تو وہ شخص جھوٹا اور مکار ہے اور اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے ذکر کی شیریں کلامی کی توفیق کو سلب کرلیتا ہے۔"

خدا کی نعمتوں پر شکر ادا کرنا

خلیفہ چہارم حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں۔

"کثرتِ شکر اور صلہ رحم نعمتوں کو بڑھا دیتا ہے اور موت کو دور کردیتا ہے۔

جسے شکر کی توفیق عطا ہوتی ہے وہ (نعمت میں) اضافے سے محروم نہیں ہوتا۔"

کیا فقط زبانی شکر ادا کرنا کافی ہے؟

"مومن کا شکر اس کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے جب کہ منافق کا شکر صرف اس کی زبان کی حد تک ہوتا ہے۔

ہر نعمت کا شکر اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے بچنے میں ہے۔

یہ بھی فرمایا کہ:"نعمت میں مست ہونے کے بجائے اس کے شکر میں مشغول ہو۔"

امام محمد باقرؓ فرماتے ہیں کہ:"جب تک بندوں کی طرف سے شکر کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا تو اللہ کی طرف سے نعمتوں کا سلسلہ بھی منقطع نہیں ہوتا۔" لٰہذا خدا کی عطا کردہ نعمتوں اور صلاحیتوں کو اس کی راہ میں خرچ کرنا بھی اصل

شکر شمار ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ شکر خدا کس، کس طرح ادا ہوسکتا ہے؟

مال و دولت کا شکر: اگر خدا نے کسی کو مال و دولت سے نوازا ہے تو وہ اس مال کو خدا کے دین کی ترویج اور تبلیغ میں خرچ کرے، غریبوں کی امداد کرے، صاحبانِ علم کی کمک کرے، حج و عمرہ و زیارات، مسجد و مدرسہ کے لیے وقف کردے۔

صحت و تندرستی کا شکر: اگر خدا نے کسی کو صحت و تندرستی دی ہے تو اس صحت و تندرستی کو خدا کی اطاعت میں خرچ کرے، عبادتیں انجام دے۔ خدا کی مخلوق کی خدمت بحکم ربی انجام دے۔

تعلقات کا شکر: اگر کسی مسلمان مومن کے تعلقات بہت ہیں تو دوسروں کی مدد کرے۔

زبان کا شکر: زبان کا شکر حمد و تسبیح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

دل کا شکر: تمام بندوں کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کا ارادہ ہے۔

عقل کا شکر: غور و فکر کرنا ہے۔

آنکھوں کا شکر: علم کا حصول، قرأتِ قرآن و حدیث اور نامحرموں سے آنکھوں کی حفاظت ہے۔

سر کا شکر: سر کا سجدے میں رکھنا ہے۔

جب انسان رکوع میں اللہ کے سامنے جھک گیا تو گویا آدھے جسم کا شکر ادا ہوگیا اور جب سجدے میں سر رکھ دیا تو پورے اعضا بھی بچھ گئے اور سجدے میں پورا شکر ادا ہوگیا اس لیے اتنا قربِ خدا بندے کو کہیں نہیں ملتا جتنا سجدے میں ملتا ہے۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ دیکھیے اگر کوئی حاجی آپ کو ٹوپی پہناتا ہے تو آپ بار، بار اس کا شکر ادا کرتے ہیں کہ خدا آپ کو جزائے خیر دے آپ نے ہمیں مدینے کی ٹوپی پہنائی لیکن افسوس جس نے سر بنایا اس کا شکر ادا نہیں کیا اگر خدا سر نہ دیتا تو آپ ٹوپی کہاں رکھتے؟ کیا آپ گردن پر رکھتے؟

لٰہذا سر کا شکریہ، یہ ہے کہ سجدہ بحضورِ ربّی ادا کیجیے۔

☆☆☆

سنہری کرنیں

☆ امید ایک چلتا پھرتا خواب ہے۔

☆ دیوار کا پتھر خواہ کتنا بھی چھوٹا ہو اپنی اہمیت ضرور رکھتا ہے۔

☆ وقت ایک ایسی زمین ہے جس پر محنت کے بغیر کچھ پیدا نہیں ہوتا۔اگر محنت کی جائے تو زمین پھل دینے لگتی ہے اگر بیکار چھوڑ دی جائے تو اس میں خاردار جھاڑیاں اگ آتی ہیں۔

☆ کچھ لوگ برائیوں کو ڈھونڈنے کے شائق ہوتے ہیں بالکل اس مکھی کی طرح جو پورے خوب صورت جسم کو چھوڑ کر صرف زخم کا انتخاب کرتی ہیں۔

☆ لوگ اپنی ضرورت پر غور کرتے ہیں قابلیت پر نہیں......

☆ دکھی دل بھرے ہوئے گلاس کی طرح ہوتا ہے جو معمولی ٹھیس سے چھلک پڑتا ہے۔

☆ اعتماد ایسا شیشہ ہے جو ایک بار ٹوٹ جائے تو پھر کبھی نہیں جڑتا۔

☆ اگر تمہارا مقروض تنگدست ہے تو اسے مہلت دو اور اگر وہ دینے کے لائق نہیں ہے تو اسے معاف کردو......

☆ بدلہ لینے سے تم میں اور دشمن میں کوئی فرق نہیں رہتا۔خدا کے نزدیک دونوں برابر ہوتے ہیں۔

☆ کسی سے خواہ مخواہ دشمنی رکھنا اپنے کو روگ لگانے کے برابر ہے کیونکہ دوست اور دشمن ہر وقت ذہن پر سوار ہوتے ہیں۔

☆ راز ایک ایسی چیز ہے جس کی حفاظت کرنا مشکل ہے۔مجھ پر لوگوں کا کتنا بڑا احسان ہے میرے تجربات انہی کے دم سے ہیں۔

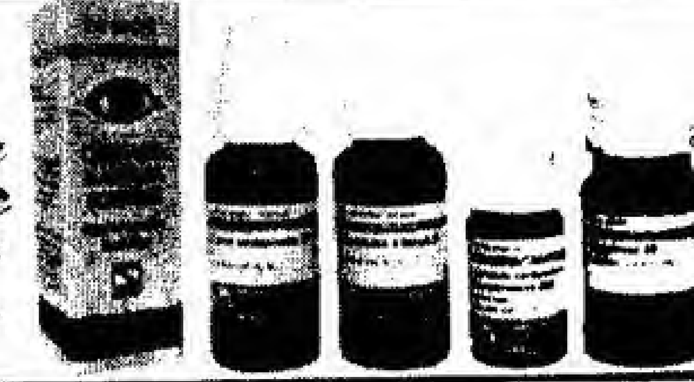
☆ ناکامی کا خوف ہی ناکامی کا آغاز ہے۔

☆ وقت ایک ایسا آوارہ گرد ہے جس نے آج تک کہیں قیام نہیں کیا۔

از: نگہت غفار، کراچی



شوابے ہومیو کلینک





اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔(اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

بخار کے لیے دوا

انعم...... مغلپورہ

کیا ہومیو پیتھی میں بخار کے لیے کوئی دوا ہوتی ہے؟

جواب: بی بی، بخار مرض نہیں بلکہ علامت ہے۔ اور یہ علامت کئی وجہ سے پیدا ہوسکتی ہے۔ مثلاً ٹھنڈ یا گرمی لگ جائے، گلا خراب ہوجائے، نزلہ، زکام یا فلو ہوجائے، ٹائیفائیڈ، ڈینگیو، چکن گونیا، ملیریا، ٹی بی، گردے کا انفیکشن، کن پھیڑ، کالی کھانسی، خسرہ وغیرہ۔ یہ تشخیص کرنا ایک ماہرِ فن کا کام ہے کہ بخار کی وجہ کیا ہے؟ بعض اوقات یہ تشخیص فوری ہوجاتی ہے اور کبھی اس میں کچھ دن لگتے ہیں اور بعض اوقات اس کی تشخیص کے لیے ٹیسٹ وغیرہ کروانے پڑتے ہیں۔ پھر تشخیص کے بعد ہومیو پیتھک دوا تجویز کی جاتی ہے تو مریض بہت جلد صحت یاب ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی
Aconitum Pentarkan Ptk 2
اسے فوری نوعیت کے بخاروں کے لیے جب جلد خشک گرم ہو، لال چہرہ ہو، سوجن ہو، سخت خشک کھانسی ہو، گرمی کی لہریں اٹھتی ہوں، چکر ہوں اور نزلاوی کیفیت ہو تو ابتدائی درجوں کے بخار میں یہ بہت اچھا کام کرتی ہے۔اس کی ایک گولی دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔

بواسیر

تفسیر...... راولاکوٹ

گزشتہ دس سال سے مجھے بواسیر کی شکایت ہے۔ درد بہت ہوتا ہے اور جب تک بلیڈنگ نہیں ہوجاتی درد ہوتا رہتا ہے۔ قبض کی شکایت اکثر رہتی ہے۔ بعض اوقات خارش بھی ہوجاتی ہے۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ زخم ہوگئے ہیں۔

جواب: محترم پانی کا استعمال بڑھائیں، کم از کم دس گلاس روزانہ پئیں۔ جو کی روٹی یا چکی کے آٹے کی روٹی استعمال کریں۔ فروٹ اور سبزیوں کا استعمال بڑھائیں۔ رات کھانے کے بعد چہل قدمی کریں۔ روز صبح نہار منہ یعنی نماز فجر کے بعد بھی چہل قدمی کریں اور وزن کم کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Aesculus Pentarkan Ptk3 کے 10 قطرے ایک گھونٹ سادہ پانی میں ڈال کر استعمال کریں دن میں 3 مرتبہ اور ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

کان کا بہنا

سمیہ قربان...... گولارچی بدین

میں پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور خاص کر شوابے ہومیو پیتھک کلینک شوق سے پڑھتی ہوں جس میں آپ ہر قسم کی بیماری کی تشخیص کرکے لوگوں کی رہنمائی اور مدد کرتے ہیں۔ میرا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور میں بہت زیادہ پریشان رہتی ہوں۔ میرے کان 20 سال سے خراب ہیں۔ ان میں بہت ریشہ بہتا ہے۔ اب رات کو کان سے خون آتا ہے، میں اس تکلیف سے سو نہیں پاتی، کان کے اندر روئی رکھ کر سوتی ہوں۔ سماعت بھی بہت متاثر ہے، کبھی کچھ بھی سنائی نہیں دیتا بہت شرمندگی ہوتی ہے۔ کان سن ہوجاتے ہیں رات کو، صبح اٹھ کر کچھ سمجھ نہیں آتا۔ میں نے کوئی ڈاکٹر نہیں چھوڑا عارضی طور پر



میڈیسن کھا کر کان کا ریشہ خشک ہوجاتا ہے، پندرہ دن کے بعد پھر سے وہی کنڈیشن شروع ہوجاتی ہے۔ میرے اس مسئلے کا علاج تجویز کریں۔ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔

جواب: بی بی پریشان مت ہو اللہ بڑا مہربان ہے۔ پانچ وقت کی نماز پڑھ کر اللہ سے دعا کرو وہ شفا دینے والا ہے۔ کان میں کسی قسم کی کوئی دوا نہ ڈالو اور نہ ہی تیل وغیرہ۔ ٹھنڈی چیزوں شربت، پانی سے پرہیز کریں — ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calcarea Sulph 30 اور Chamomilla 30 کے 5، 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

یہ ادویات آپ کو سکھر، حیدرآباد سے مل جائیں گی۔

ہومیو پیتھک دوا سے شوگر

کوثر...... کراچی

میں نے سنا ہے کہ ہومیو پیتھک ادویات جو کہ شکر سے بنتی ہیں ان کے استعمال سے شوگر کی بیماری ہوجاتی ہے؟ کیا یہ صحیح بات ہے؟

جواب: بالکل غلط بات ہے (۱) لبلبہ کی خرابی سے ذیابیطس کی بیماری ہوتی ہے نہ کہ شکر کے استعمال سے (۲) دوائی میں شکر کی مقدار انتہائی قلیل ہوتی ہے (۳) ان ہی ادویات سے شوگر کے مریضوں کا کامیابی سے علاج کیا جاتا ہے لہٰذا یہ بات مکمل طور پر غلط ہے۔

ضدی بچہ

عروسہ ناصر...... بنوعاقل کینٹ

میرے بیٹے کی عمر چار سال ہے۔ ماشاللہ کافی ایکٹیو ہے مگر کمزور ہے۔ وزن 16kg ہے۔ syrup اور دوائیاں بہت مشکل سے پیتا ہے۔ مہربانی فرما کر اس

کے لیے ہومیو پیتھک کی دوا تجویز کردیں۔ بیٹا چڑچڑا بھی ہے اور ضد بھی بہت کرتا ہے۔شکریہ۔

جواب : ہر ماں کو اپنا بچہ کمزور نظر آتا ہے اور یہی لگتا ہے کہ کھاتا پیتا نہیں۔عمر کے حساب سے آپ کے بچے کا وزن نارمل ہے۔آپ نے مقدار خوراک نہیں لکھی کہ بچہ کھانے اور ان کے درمیان کیا، کیا کھاتا پیتا ہے، پانی کتنا پیتا ہے۔کونسی دوائیاں مشکل سے کھاتا ہے۔ بچے کو متوازن خوراک دیں۔بہت زیادہ لاڈ پیار کرنے سے بچے چڑچڑے اور ضدی ہوجاتے ہیں اور بلا وجہ ڈانٹنے سے بھی یہی ہوتا ہے۔اس لیے جہاں پیار کی ضرورت ہو پیار کریں جہاں ڈانٹنے کی ضرورت ہو سرزنش کریں۔ اچھی باتوں کی حوصلہ افزائی اور غلط بات کو حکمت کے ساتھ منع کریں۔ پھر بھی کوئی مسئلہ ہو تو ہم حاضر ہیں۔

ڈپریشن

رابعہ احسان......ڈیرہ غازی خان

میرا مسئلہ آج سے چار سال سال پہلے شروع ہوا جب میرا جبری ٹرانسفر ایک اسکول سے دوسرے اسکول میں کیا گیا۔ میں دوسرے اسکول میں ایڈجسٹ نہ ہوسکی اور مجھے ڈپریشن کا مرض لاحق ہوگیا۔ ہر وقت ٹینشن' پریشانی رہنے لگی۔ خیر میں نے ایلو پیتھک ڈاکٹر سے اپنا علاج شروع کروایا۔ انہوں نے اینٹی ڈپریسنٹ گولیاں دیں ان کا استعمال جاری رکھوں تو طبیعت ٹھیک ہوجاتی ہے۔جب طبیعت بہتر محسوس ہوتی ہے تو میں وہ گولیاں چھوڑ دیتی ہوں۔ گولیاں چھوڑنے کے بعد سے پھر وہی حال ہوجاتا ہے۔ آج جب میں یہ خط لکھ رہی ہوں مجھے دوا چھوڑے 20 دن ہو چکے ہیں اور میری طبیعت پھر سے خراب ہے۔اب جو کیفیات ہیں وہ یہ ہیں کہ دماغ پر ہروقت بوجھ رہتا ہے۔منفی خیالات بہت ہی زیادہ آتے ہیں۔جسم میں بے چینی اور اضطراب محسوس ہوتا ہے۔ دماغ پر بوجھ ہونے کی وجہ سے تھکن ہوجاتی ہے کوئی کام ٹھیک طریقے سے کرنے کو دل نہیں کرتا۔ مجھے ہومیو پیتھک دوائیاں تجویز کریں کیونکہ انگریزی ادویات کے استعمال سے میرا وزن کافی بڑھ گیا ہے۔

جواب : اللہ سے جب ہم دعا کریں اور بظاہر وہ پوری نہ ہو تو عموماً ہمارے ذہن میں منفی خیال آتا ہے کہ اللہ نے ہماری سنی نہیں۔یہ کم لوگ سوچتے ہیں کہ ہماری بھلائی اسی میں تھی' اس کو کہتے ہیں کہ اللہ کی رضا پر راضی رہنا، اس طرح صبر آجاتا ہے اور صبر آتا ہے تو پھر مایوسی ختم ہوجاتی ہے جو ڈپریشن کی ایک بڑی وجہ ہے۔ نماز پڑھتے ہوئے خیال کریں کہ آپ اللہ کے سامنے کھڑی ہیں اور اس سے بات کررہی ہیں وہ آپ کو دیکھ رہا ہے اور قرآن پڑھتے ہوئے ذہن میں یہ رکھیں کہ اللہ نے اپنی باتیں لکھی ہوئی ہیں جنہیں آپ نے پڑھنا اور سمجھنا ہے لہٰذا ترجمے کے ساتھ پڑھیں پھر دیکھیں آپ پر کیسے کیسے انکشاف ہوں گے۔

غذا میں نمک کم استعمال کریں۔ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Natr. mur 200 کی ایک خوراک یعنی 7 قطرے ایک گھونٹ پانی میں لیں۔اس کے ایک دن بعد LAIKAN کی ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ دن میں 3 مرتبہ لیں۔ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

پیریڈ سے پہلے لیکوریا

راحت......چکوال

میں پاکیزہ میں شوابے کلینک کئی سال سے پڑھ رہی ہوں۔یہ بہت اچھا سلسلہ ہے اور ہم جیسے لوگ جو چھوٹے شہروں میں رہ رہے ہیں ان کو بہت فائدہ ہورہا ہے۔میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے ماہانہ پریڈ سے ایک ہفتہ پہلے لیکوریا ہوجاتا ہے،ساتھ ہی کمر اور ٹانگوں میں درد ہوتا ہے۔ مجھے دماغی اُلجھن بہت زیادہ ہے۔ کچھ فیملی کے مسئلے مسائل بھی ہیں اور کچھ سوچتی بھی بہت زیادہ ہوں۔کھانا پینا بس نارمل ہے۔آپ مجھے اچھی سی دوائی

بتائیں اور یہ بھی کہ دوائی کتنے عرصے کھانی ہے۔ ہمیشہ آپ کی شکرگزار رہوں گی۔

جواب : اپنی پریشانی پر اللہ کی طرف راغب ہوں۔متوازن غذا کھائیں۔درج ذیل ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی استعمال کریں Kali.phos 30 , Bovista 30 , Pulsatilla 30 کے 5,5 قطرے ایک کپ پانی میں ڈال کر تین مرتبہ استعمال کریں۔ Magnesium Phos Pentarkan Ptk 60 کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ تین ماہ تک لیں۔

دمہ......اورالرجی

ریحان احمد خان......شجاع آباد ملتان

ڈاکٹر صاحب! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں جسمانی لحاظ سے بہت کمزور ہوں۔ زیادہ سردی ہو یا گرمی میرا یہ الرجی و دمہ کا مرض بڑھ جاتا ہے۔ایک بار ٹی بی کا کورس بھی کرواچکا ہوں۔بچپن سے لے کر آج تک ایلو پیتھک علاج کروا رہا ہوں۔ جب تک دوائیں استعمال کرتا رہوں فائدہ رہتا ہے لیکن دوا چھوڑنے کے ساتھ ہی مرض شدت اختیار کرلیتا ہے۔ ہمارے علاقے میں ڈسٹ گردو غبار بھی بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے کافی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ پہلے پان بھی کھاتا تھا اب تو کافی مہینے سے وہ بھی چھوڑ دیئے ہیں۔بس کبھی کبھار نسوار رکھ لیتا ہوں۔

پچھلے مہینے ...میری طبیعت بہت خراب ہوگئی جس وجہ سے ایک ہفتے تک ہاسپٹل میں داخل بھی رہا ہوں، ڈاکٹر کہتے ہیں مجھے ٹی بی تو نہیں ہے لیکن میرے پھیپھڑے بہت کمزور ہوچکے ہیں جس وجہ سے آئے دن یہ مسئلہ ہوجاتا ہے۔رات میں نیند بھی بہت دیر سے آتی ہے۔کیا ہومیو پیتھک طریقہ علاج میں اس مرض سے نجات ممکن ہے؟

جواب : علاج کے سلسلے میں تشخیص کی بڑی اہمیت



ہے بغیر سوچے سمجھے مفروضوں پر علاج فائدہ دینے کے بجائے نقصان دہ ہوتا ہے۔آپ اتنے عرصے سے ایلو پیتھک علاج کرا رہے ہیں۔ ٹی بی نہ ہونے کے باوجود ٹی بی کا کورس؟ ہمارے ہاں عام خیال ہے کہ ایلو پیتھی میں علاج بہت فاسٹ ہوتا ہے جبکہ ہومیو پیتھی میں بہت سلو۔اپنے ہی کیس میں دیکھ لیں کہ بچپن سے علاج چل رہا ہے اور اب آپ 33 سال کے ہیں۔صحت بہتری کے بجائے گرتی جارہی ہے۔ اللہ سے دعا کریں' پانچ وقت نماز کی پابندی کریں، استغفار کریں۔ ٹھنڈے کے بعد گرم اور گرم کے بعد ٹھنڈا نہ لیں چینی اور میدے سے بنی ہوئی چیزوں سے پرہیز کریں۔ ہومیو پیتھی میں دمہ کا مکمل علاج ہے اور یہ بات بالکل غلط ہے کہ ہومیو پیتھک ادویات کے بعد کوئی دوا اثر نہیں کرتی۔ یاد رکھیے بظاہر یہ معمولی نظر آنے والی دوا آپ کے جسم میں مدافعت بھی بڑھاتی ہے اور قوت بھی۔ آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Grindellia Pentarkan Ptk 51 کے 10 قطرے سادہ پانی میں ڈال کر .... دن میں 3 مرتبہ لیں۔حملہ کی صورت میں ایک گھنٹے سے بھی لے سکتے ہیں۔ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

چھینکیں

رضی......کوٹ ادّو

ڈاکٹر صاحب میری عمر 20 سال ہے اور میں طالب علم ہوں۔میرا مسئلہ یہ ہے کہ حد سے زیادہ چھینکیں آتی ہیں اور صبح کے وقت تو بے تحاشا۔ چھینک کی وجہ سے گلے میں بھی شدید درد ہوجاتا ہے۔تھکاوٹ بہت زیادہ ہوجاتی ہے حتیٰ کہ کبھی کبھار بخار بھی ہوجاتا ہے۔ناک سے پانی بھی بہتا ہے۔میری صبح کی کلاس تقریباً چار گھنٹے کی ہوتی ہے۔ میں لیکچر پر اس طرح توجہ نہیں دے پاتا جتنی اس کی ضرورت ہے۔ میں پوزیشن ہولڈر ہوں اور

اسکالرشپ لیتا ہوں مگر ان چھینکوں اور الرجی کے ہاتھوں نہایت تنگ اور پریشان ہوں۔ کوئی اچھی سی دوا تجویز کردیں۔

جواب: نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر ناک میں تین مرتبہ چڑھائیں۔ گرم چیز پینے یا کھانے کے بعد کوئی ٹھنڈی چیز استعمال نہ کریں اسی طرح نہانے کے بعد فوراً ہوا میں نہ آئیں۔ ٹھنڈک سے گرمی میں اور دھوپ سے ٹھنڈی جگہ فوراً نہ جائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کرنے کے بعد دوبارہ حالت سے مطلع کریں Belladona 30 اور Nat. mur 30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر چار مرتبہ لیں۔

فسچولا (Fistula)

احمد......کوہاٹ

میں پہلی دفعہ اپنا مسئلہ لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ کا بورڈ رہنمائی کرے گا۔ میں کافی عرصے سے Fistula کا شکار ہوں میں نے شروع میں کوئی دھیان نہ دیا اور طرح طرح کے مرہم، کریم لگاتا رہا مگر بے سود۔ پھر سرجن کو دکھایا انہوں نے معائنہ کرکے بتایا کہ یہ فسچولا ہے اس کا آپریشن ہوگا۔ جب یہ دانہ بنا کافی خون نکلا مگر دانے میں نہ کوئی جلن ہے نہ درد۔ نہ جلن۔ پھر ہومیو علاج کرایا مگر دانہ ختم نہ ہوا۔ آپ سے ..... گزارش ہے کہ بورڈ ایسی دوا تجویز کرے کہ جڑ سے یہ مرض ختم ہوجائے۔ بڑا گوشت، انڈا، مچھلی، تلی ہوئی چیزیں، بیکری آئٹم سب بند کردیے ہیں۔ بادی چیزوں سے بھی پرہیز کرتا ہوں۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا کہ اس کا حل تجویز کردیں۔ اللہ آپ کو اس کی جزا دے گا۔ آمین!

جواب: تیز مرچ مصالحوں کے علاوہ سب کچھ کھائیں، قبض نہ ہونے دیں۔ تازہ پھل اور سبزیاں زیادہ سے زیادہ کھائیں۔ Sulphur 200 کی ایک خوراک پانچ قطرے صبح نہار منہ لے کر درج ذیل دوا ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی استعمال کریں Peonia 30 - پندرہ دن بعد دوبارہ حالت بتائیں۔

خود سے علاج/سیلف میڈیکیشن بالکل نہ کریں

جب کوئی معالج بنتا ہے تو اس کے لیے اسے لازمی طور پر انسانی جسم کی ساخت / بناوٹ (کہ وہ کس طرح بنی ہے) افعال (یعنی جسمانی اعضا کس طرح کام کرتے ہیں) اور ان میں (علم الامراض) ہونے والی تبدیلیوں (بیماریوں) کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہوتی ہیں۔ اور اس کے بعد ان بیماریوں کو کس طرح اور کیسے تشخیص کرنا ہے اور ان کا علاج کیا کیا جاسکتا ہے۔ (علم العلاج) کے بارے میں جاننا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے جب کوئی مریض معالج کے پاس آتا ہے تو وہ نہ صرف اس کے مرض کی تشخیص کرتا ہے بلکہ اس کا علاج بھی تجویز کرتا ہے۔ اور یہ کسی بھی طور ضروری نہیں کہ ایک مرض کے مریضوں کو ایک جیسی دوا ہی تجویز کی جائے اور بالخصوص ہومیوپیتھی میں ایسا شاذو نادر ہی ہوتا ہے کہ ایک مرض کے دو مریضوں کو ایک جیسی دوا تجویز کی جائے۔ بلکہ اکثر اوقات ایک دوا دو مختلف امراض میں استعمال ہوتی ہے۔ وجہ مریض کی اپنی انفرادیت اور دوا سے مریض کی علامات کی مماثلت ہے۔

لہٰذا کوئی بھی دوا ہومیوپیتھک ڈاکٹر سے مشورہ کیے بغیر استعمال نہ کریں کیونکہ وہی بہتر فیصلہ کرسکتا ہے کہ آپ کے لیے کون سی دوا بہتر ہے۔

☆☆☆